دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

# جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اگست 2009

نگران اعلیٰ

معراج رسول

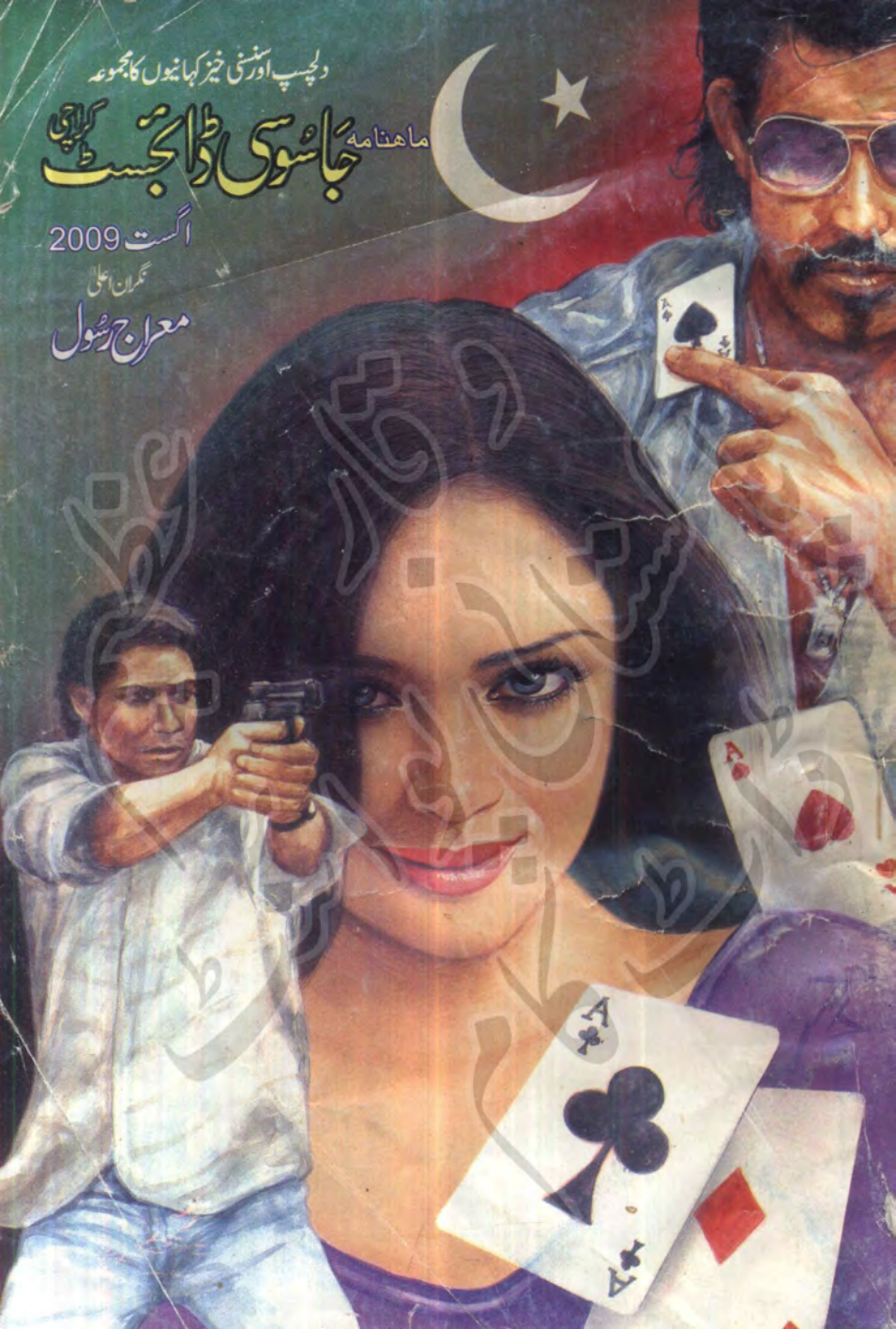

مدیر اعلیٰ
چینی نکتہ چینی 11
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

محی الدین نواب
بدستِ زندہ 18
ہوس کی آگ جرم کی راہ اور پیار کی آڑ میں سودے بازی کرنے والے سرکشوں کی عبرت آموز کہانی

مرزا ظفر بیگ
جل پری 59
اس جرم کا ماجرا جس کی منصوبہ بندی نہایت مہارت سے کی گئی تھی

ظفر سعید یوسفی
انمول 71
کچھ یادگار و انمول لمحات کی عکاسی سات سمندر پار سے تازہ سوغات

رضوانہ منظر
لٹیرے 81
سراغ رسی کی باریکیوں کو اجاگر کرتی ایک مختصر کتھا ئے جرم

طاہر جاوید مغل
پرواز 86
ایک دلربا کی جستجو میں سحر... اور اسی کے خیال میں شام کرنے والے پجاری کا احوال

مریم کے خان
سعیٔ رائگاں 131
وہ کوششیں جو تکمیلی مراحل طے کرنے کے باوجود ادھوری رہ جاتی تھیں


مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

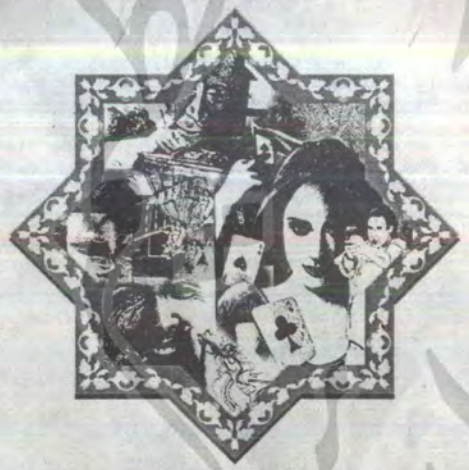




کاشف زبیر
سفید ہاتھی 141
شب تاریک میں ایک ماہر فن کے دوسرے ماہر سے ٹکراؤ کا دلچسپ احوال

اسما قادری
گرداب 158
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

احمد صغیر صدیقی
کھیل 199
ایک انوکھے کھیل کے آغاز اور دلچسپ انجام کی پُراثر کتھا

ثمر عباس
ہم پیشہ 205
ایک مجرم کی آپ بیتی جو اپنی مجرمانہ زندگی سے فرار چاہتا تھا

حسام بٹ
مثلث 217
محبت اور نفرت کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ایک پولیس آفیسر کی زندگی کے تغیرات و تجربات

سلیم فاروقی
رخِ تقدیر 246
جبر کا ہر انداز مسترد کر دینے والے نوجوان کی فنکاریاں

ادارہ و قارئین
تراش خراش 000
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریح طبع اور تواضع کے لیے



جلد 38 • شمارہ 08 • اگست 2009 • زرِ سالانہ 500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 5895313 (021) فیکس 5802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

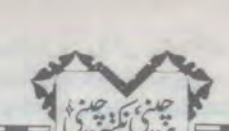

# چٹنی، نکتہ چینی

## مدیرِ اعلیٰ

عزیز قارئین! السلام علیکم

گزرتے وقت کے ہمراہ ہم ماہِ اگست میں آپہنچے ہیں۔ پاکستانیوں سے اس ماہ کی اہم بات پوچھی جائے تو ایک ہی جواب ملتا ہے ''آزادی'' یعنی ''قیامِ پاکستان''۔ کانگریسی رہنما اور مسلمان عالمِ دین مولانا ابوالکلام آزاد پاکستان کے قیام کے سخت مخالف تھے۔ پھر یوں کہ ان کی ہی نہیں بہت سے لوگوں کی مخالفت کے باوجود آخرکار پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک شان سے اُبھرا۔ پاکستان کے صدر مرحوم فضل الٰہی چوہدری کا یہ کہنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ملے تو مولانا کا کہنا تھا کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور پاکستان ایک تجربہ۔ اب یہ تجربہ ہو ہی چکا تو اسے آپ کامیاب بنائیں۔''

خیر سے آج پاکستان عمر کی ساتویں دہائی میں ہے لیکن ہماری یہ مختصر سی تاریخ اس بات کی عینی شاہد ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد چند سال چھوڑ کر ہم نے پاکستان کو مستقل طور پر ایک ایسی تجربہ گاہ بنا رکھا ہے جہاں ''ہر تجربہ'' یہ کہہ کر شروع ہوتا ہے کہ ملک کی تقدیر بدل جائے گی اور ناکامی کی خبر ایک مزید نئے تجربے کی نوید دے جاتی ہے۔ ناکامی کی ذمے داری جانے والوں کے سر تھوپ کر نئے سرے سے نئی مہم کا آغاز کیا جاتا ہے۔ ترقی، سماجی نظام، توانائی، صنعت کاری، زراعت ...... کس کس شعبے کی بات کریں ہر چیز ''تجربے'' کی زد میں تھی اور ہے۔ رہا ہمارا سیاسی نظام تو کبھی آمریت' کبھی جمہوریت اور کبھی پارلیمانی تو کبھی صدارتی نظام اور کبھی تو ان سب کے رنگ میں رنگے پیراہن اسے پہننے پڑتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں فیض احمد فیض نے کہا تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

...... اور اب ہم اپنا ایک اور جشنِ آزادی منا رہے ہیں۔ پاکستان جو بنا گئے انہیں اس تحفے پر ہزار ہا خراجِ تحسین اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پاکستان کو حقیقی معنوں میں وہ ملک بنانے کی توفیق دے، جس کے لیے بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی قیادت میں ہمارے اسلاف بنا گئے تھے، تاکہ ہم 14 اگست کے موقع پر سچے دل سے خود کو آزادی کی مبارک باد دے سکیں۔ بات سوچنے کی ہے۔ سوچیے گا ضرور۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی ''بزمِ نامہ'' میں جہاں دور دراز سے آنے والے سندیسے منتظرِ اظہار ہیں...

پہلے انعام کے حقدار قرار پائے ہیں عبدالسلام صدیقی، ملتان سے لکھتے ہیں ''اگر میں یہ کہوں کہ میں جاسوسی اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب یہ صرف پانچ روپے کا ملتا تھا تو شاید آپ یقین نہ کریں کیونکہ پانچ روپے کا یہ کبھی تھا ہی نہیں لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں یہ اس وقت سے پڑھتا ہوں جب یہ بالکل فری تھا یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمسائیوں سے لے کر بلکہ چھین ہمسائی سے لے کر... واہ! کیا دن تھے، وہ باتیں... وہ ملاقاتیں اور وہ فراق وصال کے لیل و نہار... وہ وعدے قسمیں اور وہ لاسٹ ڈریم... بہرحال، باتیں تو آپ سے بہت ساری کرنی ہیں لیکن کیا کریں اتنی جگہ نہیں ہے، باقی باتیں اگلی دفعہ۔ آتے ہیں ذرا تبصرے کی طرف۔ محفل نکتہ چینی میں کہانیوں سے زیادہ تبصرہ نگاروں میں آپس میں علیک سلیک زیادہ ہوتی ہے شاید یہی جاسوسی کی ریت ہے... لیکن میں دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلوں گا کیونکہ میں جب تک ہر کہانی پر تبصرہ نہ کرلوں تو میرے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگتے ہیں۔ یعنی میں پیٹ کا ہلکا ہوں... سرورق پر صنفِ نازک کا کچھ تو اپنے حسن کا جادو تھا اور کچھ وہ کالا جادو کر رہی تھی جس کی بدولت ایک صنفِ کرخت گدھے کی طرح دانت نکال رہا تھا اور دوسرا بندر کی طرح قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اپنی پیاری محفل میں پہنچے۔ ٹرپل ایس کے اسماعیل صاحب خطوط وہی قارئین پڑھتے ہیں جو کہانیاں پڑھتے ہیں اس لیے کہانیوں کی سمری بیان کر کے جگہ ضائع کرنے کے بجائے اپنے تاثرات وغیرہ بیان کیا کریں۔ مجھے حیرت ہے قارئین پر کہ اتنے اہم پوائنٹ کی طرف سوائے نوشی چودھری صاحبہ کے کسی کی توجہ نہیں گئی۔ محمد سلیم شبلی صاحب اور سنائیں ملتان کا کیا حال ہے۔ یقیناً گرمی، حبس اور لامحدود لوڈشیڈنگ سے انجوائے کر رہے ہوں گے۔ ہمیں بھی یاد رکھیں، ہم بھی راہوں میں پڑے ہیں کیا ہوا پردیسی ہو گئے۔ نقالوں کو آپ کیوں بلاتے ہیں، ان کو تو دلپسند سیال صاحب نے ایسا رگڑا لگایا ہے کہ یہ نسوار سے مکھن تک سب کچھ چھوڑ کر بس صرف باعزت طور پر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے... ڈاکٹر تنویر عباس تابش صاحب! آپ اپنی فکر کریں، دوسروں کو کیوں بلاتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے قارئین گڑے مردے اکھاڑنا نہیں چاہتے۔ حافظ وقار اعظم صاحب دیوی اور پرواز میں بڑا فرق ہے، فرصت کے لمحات میں تفصیلی ڈسکس ہوگی... اس ماہ کے لیے بس اتنا ہی۔ اب کچھ کہانیوں کی طرف... گرداب کا آغاز تو اچھا ہے دیکھو انجام کیسا ہوتا ہے۔ اگر چودھری افتخار عالم شاہ کو چودھری کے بجائے مخدوم بناتے تو کتنا مزہ آتا۔ خوابوں میں رہ کر دنیا فتح کرنا بھی ذہانت ہے۔ یہ کام ہر کوئی نہیں کر سکتا اپنی عیاشی کو کوئی رنگ تو دینا ہوتا ہے، چاہے اس کے لیے شیطان کے چیلے بننا پڑے یا مذہبی چھاپ لگانی پڑے۔ مارک نے مونیکا کے لیے سوائے افسوس کے کچھ نہیں کیا بلکہ آخر میں خود مونیکا کا محتاج ہوگیا۔ اپنے انکل کے خلاف کوئی ایکشن لیتا تو پھر مزہ آتا۔ پرواز کا تبصرہ فی الحال آف دی ریکارڈ ہے۔ لامحدود اختیارات اور دائمی زندگی حاصل کرنے کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا اگر تھوڑا سا صبر کریں تو یہی چیزیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ سائیڈ بزنس میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ سیدھی سادی کہانی تھی، بہتر ہوتا اسی کو کھدائی کا کام ملتا۔ حادثہ، اس قسم کی کہانیاں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ ان میں نام اتنے مشکل ہوتے ہیں کہ اکثر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ ان کہانیوں کو سمجھنے کے لیے مجھے کم از کم تین بار پڑھنا پڑتا ہے جبکہ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے سو میں اس پر کیا تبصرہ کروں۔ وہمی، وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ تلافی، مجھے تو ارشد نیازی بے وقوف لگتا تھا، بھلا اتنی سی بات بھی نہیں

سمجھ سکتا تھا۔ نیا نشہ، مارٹن کا شروع میں انداز اور تھا اور آخر میں اور۔ وہ تو کہیں سے بھی اسمگلر نہیں تھا بس پروین خان صاحبہ نے زبردستی بنا دیا۔ ناکامی کا سہرا، اس کردار پر مبنی کہانی اقبال صاحب نے طویل عرصے بعد لکھی ہے۔ شاید اس کا احساس اقبال صاحب کو بھی تھا اس لیے ہر کردار کا تعارف دوبارہ کروایا ہے، بہر حال اچھی کہانی تھی۔ جنونِ طلب، مکار ہندو بنیے کی مکارانہ چالیں جو صرف پاکستانی عوام سمجھ سکتی ہے نہ کہ ہمارے حکمراں۔"

رشید الیس کے مردان سے لکھتے ہیں "جاسوسی سے ملاقات ایک گرم سہ پہر 6 تاریخ کو ہوئی۔ سرورق جاسوسی سے بھرپور تھا۔ مہ جبیں خوب صورت انداز میں انگلیوں سے پستول کی شکل بنا کر ہمیں ڈرا کر نال سے دھواں پھونک رہی ہے۔ صنفِ کرخت عجیب انداز میں ایک نیچے کی طرف جاتے اور دوسرا اوپر سے دھاڑتا نظر آرہا ہے۔ سرورق از فنٹاسٹک۔ کہانیوں میں پہلے سب سے پسندیدہ کہانی پرواز پڑھی۔ لگتا ہے پرواز اب ائرلائن سے بھی تیز جا رہی ہے۔ خاور ایک ناکردہ جرم میں بری طرح پھنس گیا۔ قسط بہت شان دار رہی۔ سرورق کی پہلی کہانی کچھ خاص کہانی نہیں تھی البتہ رہی سہی کسر کاشف زبیر کے دوسرے رنگ نے پوری کی۔ حادثہ مجموعی طور پر ایک اچھی (مغربی) کاوش تھی۔ اسما قادری نے اس مرتبہ حیران کر دیا کیا کہانی لے کر آئی ہیں۔ پڑھنے کو بیٹھا تو ایسا بیٹھا کہ اٹھنے کا خیال ہی نہیں رہا اور جب خیال آیا تو اپنے آپ کو "جاری ہے" کے پُل پر کھڑے پایا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے بھی زیادہ انتظار رہے گا۔"

الیف، اے حسنی یوگوی کا کراچی سے شکایت نامہ "یہ چار جولائی کی ایک تپتی دوپہر ہے۔ ہم صدر میں ایک بک اسٹال کے پاس کھڑے بے تابی سے اسٹال پر رکھے رسالوں کے درمیان جاسوسی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ یاہو! بے ساختہ ہمارے منہ سے ایک پُرمسرت چیخ برآمد ہوئی۔ پتا نہیں جاسوسی کے دیدار پر یا سرورق پر براجمان رخِ روشن کی زیبائی پر۔ محفلِ یاراں میں موسم کے برعکس خاصی سردی تھی۔ بس وہی بلیوں کی میاؤں میاؤں اور مرغوں کی ککڑوکوں... ہم نے پورے ایک سال بعد انٹری دی اور انکل نے بھرپور طریقے سے ویلکم کرتے ہوئے ہمارا وفاقی کابینہ جتنا تبصرہ کاٹ کر تکّی اکانومی کی طرح مختصر کر کے شائع کیا تھا۔ تھینکس۔ (صفحات کی قید ہے، آپ کے بہت سے دوست انتظار میں ہوتے ہیں اس لیے اختصار کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے)۔ کرسیِ صدارت پر بلیک زیرو اپنا بلیک سا تبصرہ لے کر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ پھر بھی رسم دنیا نبھانا تو پڑے گا۔ مبارک ہو! باقی تبصروں میں چودھری سرفراز، مس روز، حفیظ اللہ قیصرانی، اے جے کسانہ اور توشی چودھری کے تبصرے بھرپور تھے۔ بشریٰ افضل صاحبہ، شاید ہماری آمد کی اطلاع سن کر ملک سے بجلی کی طرح غائب تھیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایف سولہ کی سی تیزی سے پرواز کرتی پرواز پڑھی۔ ہمیں خدشہ ہے کہ اگر یہ اسی رفتار سے پرواز کرتی رہی تو کہیں کریش نہ ہو جائے۔ بہر حال، شہوار کی موت پر دکھ ہوا۔ خاور نے اب خوار ہونا شروع کیا ہے۔ پھر حادثہ پڑھی۔ یقیناً یہ ایک حادثہ ہی تو ہے کہ کافی عرصے بعد جاسوسی کے شایانِ شان کوئی تحریر پڑھنے کو ملی۔ جتنی کی کوتاہی پہلی قسط میں تھی، اتنی ہی سسپنس اور حیرانی اس قسط میں تھی۔ اثر نعمانی پر اللہ کی رحمت کی برکھا برسے جنہوں نے اتنی خوب صورت تحریر قارئین جاسوسی کو ورثے میں دی۔ سرورق کے دونوں رنگ شان دار تھے۔ بزدل صاحب کی بزدلی نے وہ کارنامے انجام دیے کہ شاید بڑے بڑے بہادروں کی بہادری بھی نہیں دے سکتی۔ اتنی عمدہ اور شگفتہ تحریر لکھنے پر احمد اقبال صاحب کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کی ایک بہترین کاوش تھی۔ انہوں نے پڑوسی ملک کی سازشوں کو جس طرح طشت ازبام کیا اس سے ان کے خلاف ہماری نفرت مزید گہری ہو گئی۔ انشاء اللہ، دشمنوں نے جو گڑھے ہمارے لیے کھودے ہیں وہ خود اس میں گر جائیں گے۔ مختصر کہانیوں میں بابر نعیم صاحب کی ناراض محبت، محبت کے موضوع پر ایک انتہائی عمدہ تحریر تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

ٹرپل ایس کے اسماعیل کی دستک خیبر ایجنسی شاہ کس سے "ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میں خود بک اسٹال کی چکریں نہیں لگا سکتا اس لیے چھوٹے بھائی کو بھیج دیا اور وہ کامیاب ہو کر لوٹا، یعنی ڈائجسٹ ساتھ میں تھا۔ ٹائٹل نے توجہ اپنی طرف کھینچی اور ہم بھی کھنچے چلے گئے اور دونوں صنفِ کرخت کو نظر انداز کر دیا اور صنفِ نازک پھر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ جو بہت لگاوٹ سے میری طرف دیکھنے میں مصروف تھی۔ (زخمی جو تھے)۔ محفلِ دوستاں میں بلیک زیرو کامیاب قرار پائے ایک مہینے کے لیے۔ مبارک ہو بھئی۔ مصدق محمود لڑکی کی دستک کو اچھا ہی کہا جاتا ہے، ہاہاہا۔ مس روز، تابش صاحب صرف نام کے ڈاکٹر ہیں کام کے نہیں۔ چودھری اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ انکل! آپ نے لیتی کو لاڈلی کیا، ہمیں بھی کہا کریں نا! ویسے انکل زیادہ فری مت ہونا لڑکیوں کے ساتھ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پرواز پڑھی۔ خاور بے چارہ دو لڑکیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف پیار دوسری طرف بیوی۔ شہوار کے گلے شکوے روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف بلقیس بے چاری خاموشی سے تماشائی بنی ہوئی ہے۔ چودھری صاحب کی موت نے غم زدہ کر دیا مگر بدلہ بھی لیا گیا۔ شہوار کو کس نے قتل کر دیا۔ حادثہ میں وکیل میسن نے بہت خوب صورتی سے کیس لڑا۔ بینک ڈکیتی نے سارا مسئلہ حل کر دیا اور یوں میسن نے اپنی مؤکلہ کو بہت اچھی طرح بچایا اور دو پیار والوں کے ملانے کا ذریعہ بھی بن گیا۔ گرداب شاید ایک نئے سلسلے وار کہانی ہے۔ کہانی کی ابتدا اے سی شہریار سے ہوئی جو ایک فرض شناس اور اچھا اے سی ہے اور اپنا فرض اچھی طرح نبھاتا ہے۔ غریب لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی جس کی شکار ایک تعلیم یافتہ لڑکی بھی ہو گئی۔ چودھری ہر طرف سے پیسا لوٹ رہا ہے اور آخر میں اس تعلیم یافتہ لڑکی کو بھی لوٹنے کی کوشش شروع کی۔ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں، اگلے ماہ پتا چلے گا۔ پہلا رنگ کافی مزاحیہ تھا اور خوب ہنسایا جہاں بزدل نے بہت دلیری کے ساتھ اپنی منگیتر کی دوست کا کیس حل کیا۔ دوسرے رنگ میں کاشف زبیر نے کافی سنسنی خیز انکشاف کیے اور پاکستان میں ہونے والے دھماکوں کا سری لنکن ٹیم پر حملے کا ٹریننگ سینٹر پر حملہ، ذمے دار بھارت کو قرار دیا۔ ذہانت میں ایک کم عقل کو غلط کاموں کی وجہ سے اپنی منگیتر سے ہاتھ دھونا پڑے۔ شیطان کے چیلے میں مورن نے بہت مہارت سے شیطان کے چند چیلوں کو پولیس کے ذریعے پکڑوا دیا جو غلط کام کر رہے تھے۔ سہارا میں اٹلی کے حالات دکھائے کہ وہ جرمنی کے غلام بن جاتے ہیں اور چند غدار فائدہ اٹھاتے ہیں۔ منتظر میں دو دوست بہت طاقت حاصل کرنے کے لیے عجیب کام کرتے ہیں۔ ایک دوست دوسرے کو اسی کے کہنے پر مارتا ہے اور جیل کی ہوا کھاتا ہے۔ سائیڈ بزنس میں ایڈ اپنی ڈیوٹی کو غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے اور پکڑا ڈالتے وقت وہاں لاشیں بھی چھپاتا ہے مگر وہ زمین ملک کے دفاعی کام کے لیے لی جاتی ہے اور اس طرح ایڈ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ناراض محبت میں ایلس اپنی ماما سے بچھڑنے کے بعد نانا کے ساتھ جاتی ہے۔ نانا اسے ڈاکو کے ہاتھ نہیں لگنے دیتے جو ٹرین پر حملہ کیے ہوئے ہیں، اس طرح نانا کی بہادری کی وجہ سے سب بہادر ہوتے ہیں اور ڈاکوؤں کو بھگاتے ہیں۔ وہمی میں ایک لڑکے کو وہم ہوتا ہے جس میں ایک لڑکی کو مارنا ہوتا ہے۔ وہ اسے خبردار کرتا ہے مگر یہی وہم اس کے ساتھ ہو کر حقیقت میں بدل جاتا ہے۔ نیا نشہ میں پیرس اپنی قابلیت کی وجہ سے اپنی بہن کا قاتل اور اس کا ساتھی



پکڑتی ہے اور ان سے کافی مقدار میں منشیات برآمد کرتی ہے۔"

رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی سے بھرپور تبصرہ کرتے ہیں "ماہ جولائی کا شمارہ یکم کو ملا۔ سرورق پر مس جاسوسی کی انگلیوں سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ پاس ہی ایک ہیرو نجی ٹائپ جاسوس بڑے مضحکہ خیز پوز میں بیک وقت حسینہ اور دھوئیں کی طرف متوجہ ہے، اور دوسرا جاسوس ہنستے ہوئے منہ کھول کے غالباً چانبزو ہیرو نجی کو ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ جاسوسی کی چھتی، نکتہ چینی میں شامل ہونے کی کوشش کی ہے جو کہ آپ نے بڑی مہارت کے ساتھ ناکام بنا دی۔ چاچو جی آپ کے مختصر لیکن پُراثر تبصرے سے بات کروں گا کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ پائندہ قوم ہیں، ٹیم کی کھنڈروں سے نکل کر آنے والی خوشی پورے پاکستان کی خوشی ہے۔ محمد آصف، طاہر جاوید مغل کی قلابازیاں، طرح داریاں، شعبدہ بازیوں کا ذکر خیر کر رہے تھے۔ بھئی آصف مغل صاحب رائٹر ہیں مداری نہیں۔ اسما قادری نیا سلسلہ گرداب لے کر آئیں۔ وہی روایتی چودھری جس کے ہاتھوں سے غریبوں کی جان و مال کو خطرہ ہے، اے سی شہریار چودھری افتخار کا کھونٹا مضبوط، کمشنر کا پتا بھاری۔ کچھ بھی تو نیا پن نہیں ہے۔ (انتظار کیجیے) طاہر جاوید مغل کی پرواز بڑے زبردست ٹریک پر آ پہنچی ہے۔ اثر نعمانی کا حادثہ، پہلی قسط کا تسلسل دوسری قسط میں برقرار نہ رہ سکا۔ سارا وقت مقدمے کی کارروائی میں صرف ہو گیا۔ رضوانہ منظر کی تلافی، ارشد نیازی، جہانگیر کے بجائے رقم بھجوانے کے لیے خود ہی چلا جاتا تو فاطمہ کی جان نہ جاتی۔ یعقوب جمیل کی وہمی، شک و شبہے میں مبتلا ایک وہمی کی داستان واجبی سی کوشش تھی۔ احمد اقبال کا پہلا رنگ، ناکامی کا سہرا بلاشبہ ایک زبردست کہانی تھی کہ جس کو کہانی آف جاسوسی کہا جا سکتا ہے۔ سطر سطر پھلجھڑی چھوڑتی ہوئی تحریر۔ بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی عرف بزدل کو کیس حل کرنے کا انعام کتنا شاندار ملا۔ احمد اقبال صاحب کو زبردست خراجِ تحسین۔ کاشف زبیر کی دوسرا رنگ جس میں جہاں ہندو کی عیاری و مکاری کا ذکر ہے تو وہیں اپنے بھی غداروں کا تذکرہ ہے۔ تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ عالمِ اسلام کو جب بھی نقصان ہوا، اپنی ہی صفوں میں موجود کالی بھیڑیں جو کہ غدار ابنِ غدار ہیں، ان کی وجہ سے ہوا۔"

اے اے شام، مردان سے توصیف و تنقید کے ساتھ "سرورق پر نظر کی تو کھائی میں گرتے آدمی کا تاثر تو کچھ عجیب سا لگا، ہاں اوپر کھڑے حضرت کی خوشی دیدنی ہے۔ رہیں محترمہ 007، تو وہ تو تصور ہی تصور میں گولی مارنے کی پریکٹس فرما رہی ہے، اللہ بچائے۔ ہاؤ ہو میں بلیک زیرو اور مصدق محمود دانش کے تبصرے قریب قریب یکساں پاور کے ہیں۔ بہر حال، بلیک زیرو کو مبارک ہو۔ ابتدا پیری میسن کی عدالت سے کی۔ یہ خدا گارڈنر نے تو تجسس کی انتہا ہی کر دی۔ لیکن کہانی غضب کی تب ہوئی جب فیرن ڈرسکل کی انٹری ہوئی۔ کیا بات ہے آپ کی نعمانی صاحب! پرواز الجھی ہی گئی ہے۔ شہوار کے قتل نے خاور کو مشکلوں اور دشمنوں کی فوج کے آگے لا کھڑا کیا ہے۔ احمد اقبال صاحب کا پہلا رنگ مزاح کی چاشنی لیے خاصا پُراثر رہا اور آخر میں بزدل کے انصاف نے سینے میں ٹھنڈی سی ڈال دی۔ کاشف زبیر نے وطن کے غداروں اور ابن الوقتوں کی خاصے کھلے انداز میں نشاندہی کی۔ شیطان کے چیلے اور منتظر جاسوسی میں شائع نہ کریں تو بہتر ہو گا۔ ذہانت اچھی کاوش ہے۔ سائیڈ بزنس میں ایڈ کے بزنس نے متاثر کیا۔ ناراض محبت آخر میں نانا کی بہادری کے سبب مزہ دے گئی۔ وہمی کا ہیرو اگر سادھنا کو قتل کر دیتا تو کہانی بھی قتل ہو جاتی۔ تلافی میں تلافی تو نہ ہو سکی ہاں سرور اور شہلا کو سزا ضرور ہو گئی ہو گی۔ سہارا اگرچہ پیشتر ایک مووی میں انجوائے کر چکے ہیں لیکن بہ طور تحریر یہ اس ماہ کی بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ نیا نشہ میں جوائے کی حرکات نے پہلے سے کہانی آشکارا کر دی تھی۔ گرداب آگے چلے گی تو انشاء اللہ پھر بات کریں گے۔"

عابد خان بلوچ کی آمد خانیوال سے "خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ جاسوسی کی آمد ہوئی۔ اندر داخل ہوئے جہاں ہماری محفل چینی، نکتہ چینی میں ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کا جشن منایا جا رہا ہے۔ کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں جانے پہچانے بچ کے بلیک زیرو، مبارکباد۔ دیگر دوست احباب جس محبت و چاہت کے ساتھ محفل کی رونق بڑھائے ہوئے ہیں ان سب کے لیے میری طرف سے وزارت کا اعلان۔ اسما قادری کی تحریر واقعی گرداب میں لائی ہوئی تھی۔ مدیحہ شاہ کی ذہانت خواب و خیالوں میں گھرے نوجوانوں کے لیے باعثِ عبرت، شیطان کے چیلے نمٹا کر ثمر عباس کا سہارا پڑھنے کے بعد خاور کی پرواز میں داخل ہوئے، لطف آگیا۔ منتظر میں نام پر بے حد ترس آیا۔ ایڈ نے سائیڈ بزنس کے لیے غلط راستہ اختیار کیا۔ ناراض محبت اور وہمی اپنے موضوع کے اعتبار سے بہترین تھیں۔ رضوانہ منظر کی تلافی نے حیران کر ڈالا۔ نیا نشہ میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پھرتیاں کارآمد ٹھہریں۔ پہلے رنگ میں احمد اقبال صاحب ناکامی کا سہرا لے کر آئے اور کامیابی کے جھنڈے گاڑ گئے۔ چہکتے مہکتے لفظوں نے رنگ میں ترنگ ڈال دیا۔ دوسرا رنگ جنونِ طلب کاشف زبیر کی موجودہ حالات کی عکاسی کرتی ہوئی تحریر تھی۔"

ندا مغل جی مرغزار کالونی گجرات سے تجزیہ کرتی ہیں "اس بار جاسوسی 3 جولائی کو ملا۔ سرورق دیکھ کر ہمارا نازک دل ڈر گیا جبکہ گرمی اور اس پر لوڈشیڈنگ سے پہلے ہی برا حال تھا۔ ایک بدحال مفلوک الحال اور بدحواس شخص بلندی سے بڑے خوفناک انداز میں گر رہا تھا جبکہ اوپر کھڑا پُرہیبت اور عیار آدمی اس کی بے بسی پر منہ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ مارے دہشت اور خوف کے ہماری سانس دل سے باغی ہو جاتی کہ ہماری آنکھیں ایک مغربی دوشیزہ سے چار ہوئیں۔ تو صنفِ نازک کی موجودگی میں ہمارے حواس کچھ بحال ہوئے۔ پھولوں اور کلیوں کی زندہ دل محفل میں بڑی آس اور خوش فہمی سے حاضری دی تو ساری خوش فہمی دم توڑ گئی۔ اس بار بھی ہماری شنوائی کرسیِ صدارت کے لیے نہیں ہو سکی۔ بلیک زیرو گجرات کرسیِ صدارت پر براجمان تھے۔ اس بات پر تھوڑی خوشی بھی ہوئی کہ اول خط ہمارے شہر گجرات کا تھا، مبارک باد بلیک زیرو بھائی۔ سارے رسالے پر مختصر تبصرہ بھی اچھا تھا۔ اوگاڈ! دوسرا خط بھی ہمارے گجرات کے ایک گاؤں کا تھا۔ مصدق محمود دانش کرسیِ وزارت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ تبصرہ درمیانے درجے کا تھا۔ تیسرا خط مس روز قصبہ گجرات کا تھا۔ جو شاید سیکریٹری صاحبہ کا عہدہ سنبھالے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ مریم خٹک صاحبہ! جی آیاں نوں۔ حفیظ اللہ قیصرانی تو ماشاء اللہ رسالہ پڑھتے پڑھتے بائیک بھی چلا لیتے ہیں (چہ خوب)۔ ایف اے حسنی یوگوی کا تبصرہ بہت جان دار تھا۔ آمنہ پٹھانی بھی چودہ طبق روشن کر رہی تھیں۔ توشی چودھری کا خط ہمیشہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ وہ میری فیورٹ ہیں۔ کہانیوں میں اسما قادری کی گرداب سے آغاز کیا۔ روایتی کرداروں میں ڈوبی یہ تحریر یقیناً زبردست ثابت ہوئی اور آگے چل کر حالات کیا کروٹ لیتے ہیں، پتا چلتا جائے گا۔ پرواز میں شہوار کا قتل بہت بھیانک صورت حال لیے ہوئی تھی۔ خاور کی زندگی میں آنے والی شہوار بیگم کا انجام پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خاور مسلسل گرداب میں پھنس رہا ہے۔ حادثہ میں پیری میسن کی ذہانت اور بہادری کی تعریف نہ کرنا ناانصافی کے زمرے

میں آئے گا۔ جس طرح پیری میسن نے ملاڈرڈ کریسٹ کا کیس ہینڈل کیا، قابلِ تعریف ہے۔ سرورق کے رنگوں میں احمد اقبال کا پہلا رنگ ناکامی کا سہرا بزدل یعنی بدیع الزماں ولنواز لالہ موسوی کی موجودگی میں بہت زیادہ مزاح لیے ہوئے تھا۔ ہنستی مسکراتی یہ کہانی بہت پسند آئی۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کا جنونِ طلب حقیقت پسندانہ تحریر تھی۔ چھوٹی کہانیوں میں ثمر عباس کی سہارا، بابر نعیم کی ناراض محبت اور یعقوب جمیل کی وہمی اچھی لگیں۔"

ڈاکٹر محمد منیر مرزا کا تجزیہ لاہور سے "عرصہ دراز سے خوب صورت کہانیوں کے خوب صورت گلدستے، جاسوسی ڈائجسٹ کو میں محض اس لیے پسند کرتا آرہا ہوں کہ اس میں جنسیات کے معاملے میں بہت محتاط انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس گئے گزرے دور میں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ماہ جولائی کے شمارے میں عمیر شاہ کی عبرت انگیز کہانی منتظر پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ منشیات کی لعنت اب اسکولوں، کالجوں سے ہوتی ہوئی یونیورسٹیوں تک بھی جا پہنچی ہے۔ اچھی کہانی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی دیوی کی طرح پرواز بھی ان کا شاہکار تصور ہوگی جس میں پنجاب کی دیہاتی زندگی کی بہت خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔ خاور اور بلقیس جیسے واقعات دیہات میں ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم منظرِ عام پر آتے ہیں۔ بقیہ ستار العیب کی رحمت سے پردے میں رہ جاتے ہیں۔ خاور کو حالات کی گردش نے گوڈے گوڈے تک پھنسا دیا ہے دیکھیں کیسے نکلتا ہے؟ طاہر جاوید مغل ٹھیٹھ پنجابی کہاوتیں استعمال کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو دان طبقہ ان کو کیسے سمجھ سکے گا۔ جیسے جن جپھا، لشکارا وغیرہ۔ طوائفوں کے معاملے میں انہوں نے ڈسکے کو بوار گیدا ہے غالباً وہ اسی علاقے کے آس پاس کے رہنے والے ہیں۔ ان کی خدمت میں سلام کے بعد ایک شعر کا مصرعِ ثانی نذر کر رہا ہوں۔

چوم ہی لیتا ہاتھ تمہارا پاس میرے گر تم ہوتے۔"

آمنہ پٹھانی فتح پور لیہ سے حاضر ہیں "جولائی کا شمارہ حسبِ معمول 3 تاریخ کو ملا۔ سرورق کا سرسری سا جائزہ لیا۔ محفلِ دوستاں میں وکٹری اسٹینڈ کی پہلی تینوں پوزیشنوں پر گجرات کے قبضہ جمائے نظر آئے۔ بلیک زیرو! بھئی مبارک، رسم دنیا نبھانے کو۔ ورنہ محمد آصف کراچی، چودھری محمد سرفراز جتوئی، ندا مغل جی اور اے جے کسانہ کے تبصرے لاجواب تھے۔ انکل! ٹرپل ایس کے کو ادارے میں مستقل ملازمت دلا دیں، کہانیوں کا اختصاریہ لکھنے کے لیے۔ (ہمیں بھی آپ کا تجزیہ درست لگتا ہے) مریم خٹک خوش آمدید اور پلیز جلدی سے ادھر ہماری طرف آجائیں۔ ڈاکٹر تنویر عباس خیر سے آپ ڈاکٹر اور پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لیکن آپ نے اپنے خط میں حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی یار کہہ دیا... پلیز ذرا سنبھل کے۔ ابتدائی صفحات پر اسما قادری کی گرداب، اٹھان تو بڑی اچھی ہے۔ آگے دیکھیں کہانی کیا رنگ لاتی ہے۔ کہانی میں شہریار اور ماہ بانو کا کردار پسند آیا۔ پرواز میں خاور بےچارہ ایک ناکردہ جرم میں ملوث ہوتا نظر آرہا ہے۔ لگتا ہے شہوار کے قتل کی سازش سے ثمینہ ضرور چونکا دینے والے انکشافات کرے گی۔ ناکامی کا سہرا میرے پسندیدہ فنکار احمد اقبال کا لکھا ہوا پہلا رنگ بہت پسند آیا۔ طویل عرصے کے بعد بزدل اور ڈاکٹر صائمہ ایکشن میں نظر آئے۔ کاشف زبیر بھی خوب لکھتے ہیں۔ وطنِ عزیز میں مستقبل قریب میں رونما ہونے والے واقعات کو کاشف زبیر نے کہانی میں خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے۔"

اے جے کسانہ کی یادآوری سرگودھا سے "جولائی کا شمارہ 5 جولائی کو ملا۔ ٹائٹل گرل خوب صورت تھی۔ ذاکر انکل صرف ایک بار اپنی صنف کو انسانوں کے روپ میں پیش کر دیں۔ اس دفعہ کرسی صدارت بلیک زیرو میں سما گئی۔ آپ کا نام پڑھ کر نہ جانے کیوں بلیک ہولز یاد آجاتے ہیں۔ بہرحال، مبارک قبول کیجیے۔ اب تبصرہ ہو جائے کہانیوں پر۔ جنونِ طلب، اچھی تجزیاتی کہانی تھی۔ موجودہ حالات ایسی ہی کہانیوں کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ ہم عوام الناس اچھے اور برے کی تمیز کر سکیں، مادرِ وطن کے مسائل سمجھ سکیں۔ کاشف زبیر صاحب یو آر گریٹ۔ ناکامی کا سہرا، کچھ ناکامیاں اصل میں بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ بزدل کے لیے تو یہ ہر لحاظ سے کامیابی ہی کامیابی تھی اور صائمہ کے لیے بھی۔ اس ناکامی نے بہت ساری زندگی کو جلا بخشی، مرزا اختر کا انجام اچھا تھا۔ حادثہ، یہ کہانی غیر ضروری، غیر اہم، غیر متعلق تھی کیونکہ اس میں جاسوسی نہیں بلکہ سسپنس ہی سسپنس تھا جو آخر تک قائم رہا، انجام بھی چونکا دینے والا تھا۔ ملاڈر کریسٹ کو وکیل، عقل مند مل گیا تھا، خود تو سدا کی بےوقوف تھی۔ پرواز، اچھا ہوا شاہ خاور بھی بیوہ ہو گیا۔ اب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ مغل صاحب کا ارادہ ہے کہ حامد کے ذریعے شادی کرا دی جائے بالآخر شاہ خاور سرخرو ہو جائے گا۔ گرداب، لگتا ہے اس کہانی میں بھی چودھریوں کی خیر نہیں۔ انکل! کبھی کبھار ہی سہی بےچارے چودھریوں کو بھی اچھا رول دے دیا کریں۔ کاش، ماہ بانو زبان پر کنٹرول کر سکتی۔ ماسٹر آفتاب کا کردار مثبت ہوگا اور شاید شاہ نواز کا کردار منفی ہوگا۔"

نوشی چودھری سیالکوٹ سے حاضر ہیں "آج میں اپنی محفل میں ایک عارضی مہمان کے ساتھ شرکت کر رہی ہوں۔ یعنی اپنے برادرِ محترم کے ہمراہ۔ میرے بدذوق بھائی کی فرمائش تھی کہ ذرا ہمیں بھی اس دنیا کی سیر کراؤ جو بہ قول اس کے ہم جیسے ویلے لوگوں کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ خود تو اسے بزنس فیلڈ میں کیریئر بنانے اور کمپیوٹر ماسٹر بننے کے جنون سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ حالانکہ ہمارا خیال ہے اعتدال یعنی میانہ روی اختیار کرنی چاہیے لیکن یہ ہماری پاکستانی قوم کا المیہ ہے جی بھر کے بےاعتدالی۔ یعنی کوئی بھی کام کم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا۔ ہمارے حکمرانوں کے اعمال اور جولائی کی گرمی نے ماحول دو آتشہ کر رکھا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ہم عوام بھی اپنے حکمرانوں سے کسی طور کم نہیں ہیں کیونکہ قوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان پہ حاکم مسلط ہوتے ہیں۔ ٹائٹل میں کوئی خاص دم خم نہیں ہے۔ خطوط کی پربہار محفل ہمیشہ کی طرح سرسبز و شاداب ہے کیونکہ مابدولت نے صفحہ نمبر 17 کو چار چاند لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بلیک زیرو کا صدارتی ایوارڈ یافتہ تبصرہ ان کے نام ہی کی طرح ہے یعنی بلیک۔ پھر بھی مبارک ہو عارضی صدارت، کل یہاں کوئی اور ہوگا۔ شاید ندا مغل، صدارت کی سب سے بڑی طلب گار۔ لیکن انکل! آج کل میل شاؤنزم کا شکار ہیں۔ سوندا حوصلہ جوان رکھو۔ آمنہ پٹھانی آپ کا جذبہ قابلِ قدر ہے لیکن نوشی آئے یا جائے آپ اپنے دعوے کی لاج رکھنا۔ اے جے کسانہ صاحب کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے آپ کو دعائیں ہی نہیں صدائیں بھی دی تھیں یہ اور بات کہ آپ تک نہ پہنچ پائیں۔ حفیظ اللہ قیصرانی صاحب بڑا دل تو بیماری کی نشانی ہے محتاط اور خوش رہا کریں۔ فاطمہ گل کا تبصرہ پڑھتے ہوئے لگا حبیب بنا سپتی کا اشتہار پڑھ رہے ہیں۔ دھک دھک کرتا ہوا۔ اونو، ٹرپل ایس کے اسماعیل آپ پھر آگئے بور کرنے۔ مریم خٹک کا ادھورا تبصرہ الفاظ کے برمحل استعمال سے خاصا جان دار تھا۔ ویلکم مریم! اب آتی رہنا۔ چودھری محمد سرفراز مجھے آتے رہنے کا کہہ کے آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مصدق محمود محبت نامہ صرف اپنی محبوبہ کو بھیجا کریں، جاسوسی کی محفل میں تو خلوص نامہ لایا کریں۔ لبنیٰ کنول مجھے آپ کے الفاظ سجنو، ہیلیو پر اعتراض ہے لیکن جیسے آپ خوش ہوں۔ اس جادونگری سے میں نے سید حامد پرواز میں لینڈ کیا۔ بڑا زبردست ٹوئسٹ آیا ہے۔ شہوار کی موت سے مجھے بھی خاور ہی کی طرح شاک لگا۔ شہوار کا مطالبہ برحق تھا لیکن انداز



غلط۔ بزدل صاحب کی شکل میں احمد اقبال عرصے بعد تشریف لائے ہیں، مزہ آگیا۔ سرآسمی چھا گئے او۔ ممبئی کے ڈرامے اور حالیہ بھارتی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو عیاں کرتی سرسی ست جیسے دشمنوں سے خبردار کرتی کاشف زبیر کی جنونِ طلب بہترین کاوش تھی۔ حادثہ کا دوسرا حصہ خاصا تیز رفتار اور چونکا دینے والے انجام کا حامل تھا۔ اچھی دلچسپ تحریر تھی۔ مختصر مغربی تحریروں میں ذہانت اور شیطان کے چیلے عمدہ کاوشیں تھیں۔ مجموعی طور پر میرے دو فیورٹ رائٹرز سے سجا جاسوسی متاثر کن ہے۔"

کراچی سے دل آویز کی آمد "امید ہے خیریت سے ہوں گے کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے یہ میرا پہلا خط ہے، تھوڑی نروس ہوں کہیں کوئی غلطی ہو تو پیشگی معذرت۔ جاسوسی کے ٹائٹل پر ہمیشہ کافی خوب صورت دوشیزائیں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر اس بار جولڑکی تھی وہ ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ ذاکر انکل نے حسن و دلکشی سے توجہ کم کر کے جاسوسیت پر زیادہ توجہ مرکوز کر دی ہے خیر، اب میں محفل کے دوستوں سے اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام دل آویز کیانی ہے اور میں فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ آپ کی محفل میں یہ میری فرسٹ انٹری ہے سو امید ہے ویلکم کیا جائے گا... نہیں کریں گے تو بھی میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انشاء اللہ اب میری آمد ہوتی رہے گی، مسندِ صدارت سنبھال رہے تھے بلیک زیرو... جو دوسروں کو تو کافی کچھ کہتے رہتے ہیں مگر خود اتنا چاپلوسی بھرا خط لکھا کہ فوراً ہی صدارت کی کرسی پر قبضہ جما لیا... ایں وے، دیگر تبصروں پر تبصرے سے گریز کرتے ہوئے کہانیوں کی طرف آؤں گی۔ جاوید صاحب کی تحریر پرواز پڑھی بلکہ پڑھی کیا بھگتائی... جاوید صاحب سے اس قدر بور، بےمقصد اور بےمعنی تحریر کی توقع نہیں تھی۔ وہ میرے فیورٹ رائٹر ہیں مگر اب ان کی کہانیاں یکسانیت کا شکار ہوتی جا رہی ہیں، پہلے دیوی اور اب پرواز۔ اثر نعمانی کی حادثہ زبردست تھی۔ اینڈ چونکا دینے والا تھا۔ مختصر کہانیوں میں سائیڈ بزنس اچھی تھی۔ بس اگر آخر میں ایڈ پکڑا جاتا تو زیادہ مزہ آتا۔ ناراض محبت بھی کافی اچھی لگی... عمیر شاہ کی منتظر میں میرا خیال تھا کہ شاید اینڈ میں رالف سچ سچ زندہ ہو جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا مایوسی ہوئی شیطان کے چیلے بھی واقعی شیطان کے چیلے ہوتے ہیں مگر وہ بھی نکمے اور نالائق نوجوان نکلے۔"

قاری عبدالماجد اشرفی، رحیم یار خان سے "جولائی کا شمارہ 2 تاریخ کو بعد از مغرب ہاتھ لگا۔ سرورق پر موجود دونوں حضرات تو بھوتوں کی عملی تصویر پیش کر رہے تھے۔ چینی، نکتہ چینی کے آنگن میں پہنچے۔ بلیک زیرو کرسی صدارت ڈالے سامنے ہی بیٹھے تھے، مبارکاں، شبارکاں بھئی بلیک زیرو! پر اب جلدی سے کرسی خالی کرو کہ اور بھی ہیں اس لیلیٰ کے شیدائی۔ چودھری محمد سرفراز آپ کی باتیں اچھی لگیں۔ قندیل رضوان آپ کو ہمارے لکھے حروف پسند آئے، شکریہ۔ ٹرپل ایس کے آپ ایک بار پھر اپنے انداز میں نظر آئے جبکہ نوشی چودھری آپ کو باادب مشورہ دے رہی ہیں کہ اپنا انداز بدلیں۔ آمنہ پٹھانی اچھا کیا کہ آپ نے اپنی حقیقت کھول دی کہ میں کاغذی پٹھانی ہوں نا کہ اصلی۔ نکتہ چین احباب کی چینی و بےچینی والی باتیں پڑھتے، سنتے طاہر جاوید مغل کے پاس جا پہنچے جنہوں نے خاور کو مشکلوں میں ڈالا ہوا ہے کہ محبوبہ چھنی، بیوی چھنی اور آخر میں گھر چھین کر اسے دربدر کر دیا۔ حادثہ کی دوسری کڑی پڑھتے ہوئے سر دکھنے لگ گیا کہ بار بار ایک جیسے سوالات۔ لیکن کہانی کے اینڈ نے بلکہ ڈرامائی اور دلچسپ اینڈ نے ساری ذہنی کوفت ختم کر دی۔ اسما قادری کی گرداب لگتا ہے کہ نئے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ قسطِ اول تو دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔ آگے دیکھیے کیا تاثر بنتا ہے۔"

لبنیٰ کنول ڈھڈیال، ضلع چکوال سے بڑی تیزی میں دکھائی دیتی ہیں، محترمہ لکھتی ہیں "راج دلارا جاسوسی کی ناز برداری 4 تاریخ کو شروع ہوئی۔ اشتہارات کو ان کے حال پر چھوڑ کر فہرست دیکھی یہاں سے عقیدت، محبت اور خوش مزاجی، خوش کلامی والی محفل میں آئی جو ہمیشہ سے تروتازہ ہے۔ بلیک زیرو کو ڈھیروں مبارک باد کے گلدستے۔ انکل جی کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں آپ گجرات والوں پر۔ کیوں ٹرپل ایس ڈائجسٹ کوئی کھانے کی چیز ہے جو مزہ نہ آئے۔ انکل جی کی قینچی کا کمال تھا یا پھر آپ کی قلم کو کچھ شرم آگئی۔ دل بہت خوش ہوا، آپ کے کچھ کم تبصرے پر۔ مریم باجی کا تبصرہ اچھا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے ویلکم باجی جان۔ فاطمہ گل کیا بات ہے؟ دل بہت دھک دھک کر رہا ہے۔ اے جے کسانہ محفل میں نظر آئے، بہت خوشی ہوئی ایمان سے۔ اب زیرو اینڈ فیضی اور لعل شاہ رخ کو بھی آجانا چاہیے۔ اوہ، ہاں یاد آیا۔ لعل شاہ رخ لالہ کی 26 اگست کو سالگرہ ہے تو پیپی برتھ ڈے ٹو یو برادر ایڈوانس میں۔ جشنِ آزادی بھی آرہی ہے تو سب کو مبارک۔ بلیک کیٹ ہماری محفل میں شیر اور شیرنیاں ہیں۔ آپ کی خوراک چوہے نہیں ہیں خالہ جی۔ کہانیوں کی جادونگری میں آئی۔ پرواز، یہ کیا طاہر انکل! اتنی جلدی شہوار کا قتل بھی ہو گیا ہے۔ ہو نہ ہو، یہ کام چودھری عزیز کا ہے۔ گرداب کچھ خاص نہیں لگی اس لیے تھوڑی سی پڑھ سکی۔ دونوں رنگ شان دار ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اثر نعمانی کی تحریر حادثہ میں کچھ زیادہ ہی حادثے ہوئے۔ ذہانت میں رضوان میں ہمت تھی لیکن ذہانت نام والی کوئی چیز نہیں تھی۔"

مہراے ڈی سیال خانیوال سے حاضری دیتے ہیں "اس ماہ شمارہ 2 تاریخ کو حاصل کیا۔ ٹائٹل کو چھوڑتے ہوئے جب ہم فہرست میں پہنچے تو یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس مرتبہ تقریباً ہمارے سارے موسٹ فیورٹ رائٹر موجود تھے۔ سب سے پہلے پہنچے محفلِ یاراں میں جہاں پر بلیک زیرو صاحب کو عنایت خاص کا حق دار پایا۔ بلیک صاحب آپ کو اس دور میں 40 روپے کی بچت پر مبارک باد۔ محمد آصف صاحب آپ کے خیالات بہت اچھے ہیں مگر ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کالی بھیڑوں کو چارہ کون ڈالتا ہے؟ ہم عوام... یا...؟ خیر جانے دیجیے۔ مس نوشی چودھری آپ کا شعر بہت اچھا تھا۔ بلیک کیٹ صاحبہ! آپ کا نام انگلش میں تو کچھ اچھا لگے مگر اس کا اردو ترجمہ کچھ اچھا نہیں۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ اس کے علاوہ شہناز شانزے سیال، دلپسند سیال اور باقی سب سیالوں سے ہماری گزارش ہے کہ آپ سب لوگ مجھے اس طرح اکیلا تو نہ چھوڑیں۔ اگر آپ کو ایک اور سیال کا اضافہ اتنا ہی برا لگتا ہے تو ہم واک آؤٹ کر جاتے ہیں مگر آپ تو آئیں۔ اس کے بعد پہنچے پرواز کے درشن کرنے جہاں پر انکل طاہر جاوید مغل صاحب نے شاہ خاور کو چند مہینوں کا دولہا بنا کر اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں پھنسوا دیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ ہیرو صاحب کون سی نئی سازش سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد جنونِ طلب کا نمبر آیا جہاں پر ہمارے آئیڈیل رائٹر نے حالاتِ حاضرہ کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا۔ اور اسما قادری صاحبہ نے گرداب میں ہمارے معاشرے کی لعنت وڈیرا شاہی کا اصل چہرہ دکھایا۔"

سمعیہ سندھو، قصور سے لب کشائی کرتی ہیں "اس دفعہ کا جاسوسی بڑی منتیں ترلے کر کر کے منگوایا ہے۔ ٹائٹل پر کافی دیر غور و فکر کرتے رہے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا سوائے اس بات کے کہ ذاکر انکل کی پچھلے چند ماہ سے اپنی صنف کے ساتھ کوئی ان بن چل رہی ہے جو ان کی شکلیں اتنی خوفناک بنا دیتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی خوفناک، تھوڑی تھوڑی مضحکہ خیز، واہ بھئی واہ، کیا حسین امتزاج ہے اور کیا اعلیٰ حسن کا ذوق ہے۔ ٹائٹل پر غور و فکر کے بعد اندر کی جانب دوڑ لگائی اور

اشتہارات کے اوپر سے ہائی جمپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیدھا چینی، نکتہ چینی میں جا گرے۔ بھائی بلیک زیرو کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ نیکی بھائی مبارک ہو۔ ویسے یہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بھائی ہی کیوں صدارت کی کرسی پر موجود ہوتا ہے۔ اب کوئی بھائی میری اس بات سے یہ نہ سمجھ لے کہ مجھے خوشی نہیں ہوتی۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ ایک بھائی کی خوشی میں ایک بہن خوش نہیں ہوگی تو کیا ذاکر انکل ہوں گے جوان کی اتنی خوفناک تصویریں بناتے ہیں۔ اس دفعہ ہمارا ارادہ تو نہیں تھا کہ تفصیلی محبت نامے کو لکھنے کا لیکن برا ہو ہماری امریکی طبیعت کا جسے چین نہیں، ذہن میں خود بہ خود پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔ میرے خیال میں جاسوسی کی مقبولیت کا راز چینی، نکتہ چینی ہی ہے۔ سارے جن، بھوت بھائیوں اور چڑیل بہنوں کی نوک جھونک بہت مزہ دیتی ہے۔ پرواز میں اس دفعہ کچھ کمی لگ رہی تھی۔ خاور اور بیگم بلقیس کا تعلق اب کوفت میں مبتلا کر رہا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ چھوٹے میاں یعنی حامد کا کردار خاور اور شہوار کے درمیان کیدو سا لگا۔ شہوار کی ڈرامائی موت نے دکھی کر دیا، اسے اتنی جلدی مرنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کی وجہ سے تو کہانی میں تھوڑا سا چینج آیا تھا۔ گرداب کا پہلا حصہ بہت متاثر کن لگا۔ شہریار کا کردار بہت پاورفل لگا اور چودھری افتخار انسانی قالب میں ڈھلا ہوا ایک بھیڑیا۔ حادثہ ایک حادثے کی طرح کا ہی لگا۔ حادثہ ہوا اور گزر گیا، اب بندہ بھلا اس پر کیا تبصرہ کرے۔ ناراض محبت ایک یادگار تحریر ہے جو مدتوں یاد رہے گی۔ سائیڈ بزنس ایک شاہکار تحریر۔ ایک تیر کے ساتھ دو شکار یا پھر دس انگلیاں گھی میں سر کڑاہی میں۔ سرورق کے دونوں رنگ اچھے تھے۔"

ثاقب ظہیر گاؤں پانہ آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں "جولائی کا شمارہ 5 تاریخ کو ہی مل گیا۔ رسالہ لے کر جلدی جلدی گھر پہنچے کیونکہ پاکستان اور سری لنکا کے درمیان جاری ٹیسٹ میچ کے دوسرے دن کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ جب دوسرے دن کھیل کا اختتام ہوا تو فوراً جاسوسی لیا اور کمرے میں گھس گیا۔ سب سے پہلے چینی، نکتہ چینی کا رخ کیا جہاں کرسی صدارت پر بلیک زیرو موجود تھے۔ تبصرہ اچھا تھا۔ مبارک ہو۔ اے جے کسانہ اور نوشی چودھری کا تبصرہ پسند آیا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ محفل میں تڑکے، خوشبو، نسوار، آگ اور مکھن کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد کہانیوں کا جائزہ لیا جہاں کافی عرصے کے بعد بزدل سے ملاقات ہوئی۔ بزدل صاحب نے جس طرح الجھا ہوا کیس حل کیا، وہ قابل تعریف تھا۔ کہانی کا اینڈ توقع کے برعکس ثابت ہوا۔ اختر مرزا کو خود سزا دینے کے بجائے قانون کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ جنونِ طلب کاشف زبیر کی شان دار تحریر تھی۔ کاشف صاحب جس بھی موضوع پر لکھتے ہیں، لگتا ہے اس موضوع پر ان سے بہتر کوئی اور لکھ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً جو بھی ہمارے ملک کی طرف میلی نظروں سے دیکھے گا اس کا انجام سری ست جیسا ہوگا۔ پرواز میں خاور کا راستہ صاف ہو چکا ہے، اب وہ بلقیس بیگم کے بارے میں جتنا سوچے، سوچ سکتا ہے اب دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کیا کرتے ہیں۔"

ایم احمد ہاشمی، ضلع بونیر سے لکھتے ہیں "بچنا اے حسینو! کہیں پاؤں تلے روند نہ جائیں۔ میں آ رہا ہوں۔ سب کو محبتوں بھرا اسلام۔ شمارہ بڑی تاخیر سے ملا۔ اس لیے سرورق نظرانداز کرتے ہوئے اشتہارات کو بالائے طاق رکھا اور فضا میں فرنٹ سمر سالٹ لگاتے ہوئے محفل کے دروازے پر سانس بحال کی۔ وننگ اسٹینڈ پر کالے خان یعنی بلیک زیرو قابض تھے۔ ان کا تبصرہ پسند آیا۔ مبارک ہی مبارک۔ لبنیٰ کنول جی! آپ کے نام سے مجھے عشق ہوا ہے۔ یہ نام میرے دل کے نہاں خانوں میں ارتعاش پیدا کرنے لگتا ہے۔ اے جے کسانہ صاحب کو خوش آمدید۔ جیل سے رہائی کب ملی ہے جناب! آمنہ پٹھانی صاحبہ اگر آپ پٹھان نہیں پنجابن ہیں؟ مریم خٹک کا بکا نا سا تبصرہ پسند آیا۔ کالی بلی! واہ جی، خود گونگی ہے اور میاؤں میاؤں کسی اور سے کرواتی ہے۔ سوری، آپ واپسی کی راہ لیں۔ آپ کو یہاں چوہے نہیں ملیں گے۔ پرواز بڑے خوب صورت انداز میں اپنی منزل کی جانب محوِ پرواز ہے۔ شادی نے خاور کو راہِ راست پر گامزن کر دیا تھا مگر معلوم نہیں، کشتی کے پیندے میں کس نے سوراخ کر کے کشتی کو طوفانی موجوں کے سپرد کر دیا۔ اسما قادری کی گرداب زبردست تو تھی مگر فی الحال سمجھ سے بالاتر ہے۔ چند ایک اقساط کے بعد تبصرہ کریں گے۔ ذہانت مدیحہ شاہ کی تھی۔ فائزہ اور رضوان کے خطوط کا سلسلہ بڑا مزیدار تھا۔ کاشف زبیر کا دوسرا رنگ پسند آیا۔"

چاچا نجم نجومی نجم پورے ادھورے تبصرے کے ساتھ "3 جولائی بروز جمعہ ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ سرورق کو دیکھتے ہی دو شکاری اور ایک شکار والی کہانی یاد آ گئی۔ ایک طرف ناگن حسینہ اپنی آنکھوں سے شاید ہوائی فائرنگ کر رہی تھی اور دوسری طرف ایک شخص چیل کی طرح جھپٹ رہا تھا اور درمیان میں ایک بونا نما آدمی کیا کروں، کہاں جاؤں کی عملی تصویر بنا ہوا تھا۔ سرورق کے بعد فہرست اور اشتہارات پر سرسری نظر دوڑاتے ہوئے محفل چینی، نکتہ چینی میں اڑا لگایا۔ جہاں بھتیجے اور بھتیجیوں کے خطوط کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پہلا خط بلیک زیرو کا تھا۔ ستاروں کی گردش ان کے حق میں تھی سو کرسی صدارت ان کے حصے میں آئی، مبارک ہو۔ تمام خطوط پڑھنے کے بعد پرواز پڑھی جہاں خاور ایک دفعہ پھر مشکل میں پھنس چکا ہے۔ خاور نے جاگیر کے لیے اپنی محبت کی قربانی دیتے ہوئے شہوار سے شادی کی لیکن یہ قربانی الٹا اس کے گلے پڑ گئی۔ خاور کو مفرور ہونا پڑا۔ اب دیکھتے ہیں کہ مغل صاحب حالات کو کیسے معمول پر لاتے ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد اثر نعمانی مرحوم کی حادثہ پڑھی جو واقعی ایک شان دار کہانی تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ احمد اقبال صاحب کی تحریر تھی۔ جو واقعی ایک عمدہ تحریر تھی لیکن ہمیں احمد اقبال صاحب سے جتنی توقع ہوتی ہے، یہ کہانی اس کے مطابق نہیں تھی۔ باقی تحریریں ابھی پڑھنی ہیں۔"

چودھری محمد سرفراز کی خامہ فرسائی جتوئی سے "اس ماہ ٹائٹل کی صورت حال خاصی مضحکہ خیز رہی۔ ٹائٹل گرل کے انگلیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی وجہ سے کوٹ والے موصوف کا ہنستا اور نیچے موجود عجیب الخلقت انسان کے خوف کے اظہار نے عجیب و غریب صورت حال پیدا کر دی۔ چینی، نکتہ چینی پہنچے جہاں گجرات والے بلیک زیرو صاحب کے جاسوسانہ تبصرے کو محفل کی نمائندگی مل ہی گئی، مبارک باد ہو جناب۔ ڈاکٹر تنویر عباس صاحب چینی، نکتہ چینی کی صدارت ہے نہ کرۂ ارض پاکستان کے وزرا کا چناؤ کہ قرعہ اندازی والا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ٹری ایس کے اسماعیل کہانیوں کی تلخیص خوب کر لیتے ہیں۔ اس خوشی میں انہیں 'بس کر' ایوارڈ ملنا چاہیے۔ مریم خٹک صاحبہ! آپ کی پہلی انٹری ہے لہٰذا صرف ویلکم ہی کہیں گے۔ ایف اے حسنی یو کوئی لگتا ہے بخار بھاگنے کے بجائے دماغ کو چڑھ گیا تھا جس کا عکس آپ کے خط میں نظر آ رہا ہے۔ آمنہ پٹھانی بھی نوشی چودھری کی طرح کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے فوبیا میں مبتلا نظر آئیں جبکہ مجھے مستقبل قریب میں ایسا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ واہ بھئی واہ! اے جے کسانہ صاحب! کیا خوب کہا ہے، ترکی ایشیائی ہو، یورپی ہو یا امریکی عقل کے معاملات میں مساوی ہوتی ہے۔ لاسٹ خط بلیک کیٹ صاحبہ کا تھا جو کہ بلیک لسٹ ہوتے ہوتے بچیں۔ پرواز میں شہوار کی موت نے تحریر کو نیا رنگ دے دیا ہے۔ خاور چاروں طرف سے خطرات میں گھر چکا ہے۔"



ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی کینٹ سے لکھتے ہیں "جولائی کا ٹائٹل زبردست تھا کہ دہشت گرد اور سازشوں کے شہنشاہ سے ایک صنفِ نازک، خوب صورت حسینہ نے کسی طرح چھٹکارا پایا اور دنیا کو بتا رہی ہے کہ میری خوب صورتی کا مطلب یہ نہیں کہ میں احمق ہوں، عقل اور دونوں انگلیوں کی طرح آخرکار پسٹل استعمال کر کے دشمن سماج لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہوں۔ جاسوسیت سے بھرپور لاجواب تھا۔ چینی، نکتہ چینی کی گرما گرم محفل میں گرمیوں میں گھسنا بھی ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔ بلیک زیرو مبارک ہو۔ شکر ہے بلیک میلر نہیں ہو۔ پھر بھی تبصرہ خوب تھا۔ مس روز بڑے دن کے بعد حاضری دی ہے؟ ہاں ٹری ایس کے ذرا نوشی چودھری کی نصیحت پر عمل کرو۔ مریم خٹک آپ کو محفل میں خوش آمدید۔ حفیظ اللہ قیصرانی آتے رہا کرو یار۔ یہ تماوکر کے ندا مغل جی کہیں دہشت گردی کا الزام نہ آ جائے۔ سنبھل کے۔ ایف اے حسنی یو کوئی اچھی طرح یاد کرو دادی نہیں پڑدادی بشریٰ افضل کے خط سنایا کرتی ہوں گی۔ بھئی اتنی بھی نہ چھوڑو۔ آمنہ خود ساختہ پٹھانی حاضری اچھی لگی۔ آیا کریں۔"

محمد کبیر جرانی، مری سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ "ایم بی اے لاسٹ سمسٹر کا آخری پرچہ تین جولائی کو دیا تو لگا جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اسی خوشی میں جولائی کا شمارہ اور پچھلے چند ماہ کے کچھ شمارے خریدے اور کچھ ایک دوست کے گھر سے پار کر لیے۔ ٹائٹل گرل تو کھلے عام ہم سے اشارے بازیاں کر رہی تھی۔ ہم نے بھی سیٹی بجائی اور جلدی سے محفل کی طرف نکل لیے۔ اداریے میں بڑے عرصے بعد آپ کو کسی مسئلے کے بجائے خوشی شیئر کرتے ہوئے پایا۔ تبصرے پڑھے مگر یہ کیا؟ یہاں تو سب لوگ امن کے پیامبر بنے بیٹھے تھے۔ نہ کوئی پیار بھرا طنز نہ کوئی کسی کی ٹانگ کھینچتا ہوا پایا گیا۔ دس از ناٹ فیئر۔ ڈیئر فیلوز کم آن! محفل کی رونق واپس لانے میں اپنا کردار ادا کرو۔ ہم بھی کچھ اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ کسی کو برا لگے تو بتا دیں، میں سوری کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔ کرسی صدارت پر فائز تھے زیرو صاحب اور وہ بھی بلیک یعنی کڑوا کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ مصدق محمود آپ نے محلے میں تانکا جھانکی کرتے کرتے چینی، نکتہ چینی میں بھی شروع کر دی۔ بری بات پٹو گے کسی دن۔ مس روز، آپ انگریزی والا روز ہیں یا اردو والا۔ چودھری سرفراز کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگا۔ لبنیٰ کنول، والسلام ڈائریکٹ دل سے۔ قندیل رضوان ویلکم اگین۔ مریم خٹک آپ کے نزدیک حسن اور جاذب نظری میں کیا فرق ہے؟ ندا مغل اور فاطمہ گل کے احمقانہ سے تبصرے پڑھے۔ ایک ہر وقت ٹھاہ ٹھاہ کرتی رہتی ہیں اور دوسری دھک دھک۔ آمنہ پٹھانی اور نوشی چودھری صنفِ نازک کو محفل میں کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کرتی ہوئی پائی گئیں۔ چودھری نعمان کا تبصرہ پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایک ہی دن میں پرواز کی تمام اقساط پڑھیں۔ حسب معمول مغل صاحب کی منظر نگاری اور کردار نگاری پورے عروج پر ہے۔ والی جی کا کردار حقیقت کے انتہائی قریب تھا۔ ان کی موت اور گڈی کی کہانی نے حقیقتاً خون کے آنسو رلا دیا۔ پہلی پانچ اقساط میں دیگر واقعات تو کچھ خاص نہ تھے مگر شاہ خاور اور بلقیس کی فیلنگز کو ہم نے بالکل ایسے محسوس کیا جیسے مغل صاحب چاہتے تھے اور یہ بلاشبہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ ان کے خوب صورت اندازِ تحریر کی بنا پر پرواز بہت پُرلطف لگی۔ اس قسط میں کہانی نے سنسنی خیز موڑ اختیار کیا۔ اینڈ بے چین کر گیا۔ احمد اقبال صاحب، بزدل کا کارنامہ بڑے عرصے بعد لائے۔ واقعات تو کچھ خاص نہ تھے البتہ طنز و مزاح کی وجہ سے بڑا لطف آیا۔ دوسرا رنگ حالات حاضرہ کی خرابی کے پیچھے خفیہ ہاتھ کے بارے میں کاشف زبیر کی سوچ لیے ہوئے تھا۔ رائٹر نے بڑے مدلل انداز میں حالات کا تجزیہ کیا مگر واقعات کی ترتیب کا خیال نہ رکھ پائے۔ بہرحال مجموعی طور پر دونوں رنگ پُرلطف رہے۔ اسما قادری کی گرداب روایتی سی تحریر ثابت ہو رہی ہے۔ بہرحال، مکمل تبصرہ کہانی مکمل ہونے پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مدیحہ شاہ کی ذہانت ایک بالکل ہی مختلف انداز میں تحریر کی گئی اور یقیناً یہ انتہائی دلچسپ تحریر تھی۔ پروین خان کی نیا نشہ میں واقعات تو عام سے تھے مگر رواں اندازِ تحریر کی بنا پر پڑھنے کا لطف آیا۔ عمیر شاہ کی مختصر، کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ بابر نعیم کی ناراض محبت ایک حساس کہانی تھی جو اداس کر گئی۔ تلافی از رضوانہ منظر بس ٹھیک ہی لگی۔ اور اب ذکر ہو جائے شمارے کی سب سے خاص تحریر حادثہ کا۔ انگلش کہانیوں کا ترجمہ تو ہم انتہائی شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں کم از کم ایک طویل ترجمہ کہانی ضرور شامل ہونی چاہیے۔ بہ قول آپ کے یہ تحریر واقعی سطر سطر تجسس اور تحیر میں ڈوبی تھی مگر انجام ہمیں چونکا نہ سکا کیونکہ پیری میسن کی طرح ہم نے بھی پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ جس طرح فیرن کے کردار کو پیش کیا گیا تھا، وہ مرنے والی لڑکی سے میل نہیں کھاتا تھا اور یقیناً فیرن زندہ ہوگی۔ میسن کے اختتامی جملے نے بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔"

محمد وقاص کی لب کشائی تحصیل نوشہرہ ورکاں ضلع گوجرانوالہ سے "ماہ جولائی کا جاسوسی 4 جولائی کی شام کو ملا۔ سرورق پر نگاہ دوڑائی تو حسینہ اپنی قاتل ادا سے کسی کو گھائل کرنے کے بعد شرمندہ ہوئے بغیر بڑے مطمئن انداز میں اپنی انگلیوں کو پھونک مار رہی تھی۔ باقی اشخاص کی طرف ہم نے دھیان نہیں دیا۔ اس کے بعد دوستوں کی محفل میں پہنچے تو کرسی صدارت تو بلیک ہو چکی تھی تو بلیک زیرو صاحب کرسی تو آپ نے کالی کر ہی دی پھر بھی مبارک ہو۔ مریم خٹک صاحبہ بہت احتیاط کے ساتھ محفل میں وارد ہوئیں۔ بہرحال، آپ کی احتیاط کام آ گئی۔ ندا مغل جی لگتا ہے آپ کو ہماری گستاخی پسند نہیں آئی اور آپ نے بڑی گستاخی سے ہمیں وارننگ بھی دے دی۔ اے جے کسانہ صاحب ہماری گستاخی نے آپ کا دل خوش کر دیا اور ساتھ ساتھ شرمندہ بھی۔ بہرحال، آپ شرمندہ مت ہوں کیونکہ ہم نے گستاخیاں کرنا چھوڑ دی ہیں حالانکہ کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ گستاخی کرنے کی کوشش بھی کی ہے چلو ہم ان کو بھی معاف کرتے ہیں۔ آمنہ پٹھانی جی آپ اتنی جلدی جلدی کیوں لکھتی ہیں؟ اس کے بعد کہانیوں میں سب سے پہلے پرواز پڑھی جس میں شہوار اپنے شوہر کے ساتھ کچھ دن لڑائی کے بعد پراسرار طور پر قتل ہوئی ہے اور سارا الزام شاہ خاور پر آ گیا ہے۔ خاور اس وقت بہت ہی مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد رنگوں پر پہنچے۔ پہلا رنگ ناکامی کا سہرا کافی رنگ دار تھا جہاں پر بزدل صاحب اپنی بہادریاں دکھا رہے تھے، دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کی اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد نیا سلسلہ گرداب پڑھی جو کہ ہمارے دیہات کے جاہلانہ اور جاگیردارانہ نظام کی عکاس تھی۔ ابھی تک تو کہانی نارمل ہے۔"

ان قارئین کے نام جن کے نام شاملِ بزم نہ ہو سکے۔

زاہد رشید، اوکاڑہ۔ ذیشان بدر منیر، دینہ۔ مصدق محمود دانش، ضلع گجرات۔ مریم خٹک، تحصیل و ضلع کرک۔ حفیظ اللہ قیصرانی، ڈیرہ غازی خان۔ انجم فاروق، لاہور۔ قیصر عباس تانوری، جھنگ۔ عبدالاحد جنجوعہ، آزاد کشمیر۔ بلیک زیرو، گجرات۔ محمد عمران، اوکاڑہ کینٹ۔ محمد انور، واہ کینٹ۔ محمد اجمل خان، ڈسٹرکٹ جیل رحیم یار خان۔ ایم افضال ذوالفقار، سرگودھا۔ ضیاء الرحمٰن خان نیازی، خانیوال۔ انعام علی مہمند، بلوچستان۔ ساگر تلوکر، میانوالی۔ سمیرا نثار، فیصل آباد۔ حافظ محمد بلال حیدر، خانیوال۔ عدیل حامد، جہلم۔ رخسانہ اسلم، نامعلوم مقام۔ شاداب خان، لانڈھی۔

# بدست زندہ

محی الدین نواب

فیصلے کی آزادی اور ذاتی خوشی کا حصول انسان کو خود غرض بنا دیتا ہے۔ بعض لوگوں کا مطمح نظر فریب ، جھوٹ اور دھوکا دہی کا دامن تھام کے سکون حاصل کرنا ہوتا ہے ۔ لیکن ایک دن یہ خام خیالی اپنی حقیقت خود ہی بے نقاب کر ڈالتی ہے ۔ تب تک ڈھیروں پانی پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہوتا ہے ۔ باقی بچتا ہے تو صرف پچھتاوے کا دکھ اور سچ کی اٹل حقیقت ... ایسے ہی لوگوں کا ماجرا جو دولت کے بل بوتے پر اپنا گناہ چھپانے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور پھر شروع ہوتا برائیوں کا سفر۔ گناہ در گناہ کا عمل ظالموں پر کفارے کا ہر در بند کر ڈالتا ہے اور ملتی ہے آخری فتح مظلوم کو ...جس کے چہرے پر وقت کا ہر گھاؤ ظلم کی اک نئی داستان بیان کر رہا ہوتا ہے۔

**ہوس کی آگ جرم کی راہ اور پیار کی آڑ میں سودے بازی کرنے والے سرکشوں کی عبرت آموز کہانی**

انسان کو انسان مارتا ہے' بدنصیبی کبھی نہیں مارتی۔ جب تک زندہ رہتا ہے' زندہ لوگوں کے ہاتھوں بدترین حالات کی صلیب پر چڑھتا رہتا ہے۔ ویسے کچھ شامت کے مارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو پیدا ہونے سے پہلے ہی حالات کی سولی پر چڑھا دیے جاتے ہیں۔

جب وہ پیدا ہوا تو گھر کی چار دیواری میں نہیں تھا۔ میٹرنٹی ہوم میں بھی نہیں تھا۔ کچرا گھر میں یا کسی فٹ پاتھ پر بھی نہیں پڑا تھا۔ انسان کا بچہ تھا۔ کسی جانور نے اسے پیدا نہیں کیا تھا۔ زندہ لوگوں نے ایک کوکھ کی کال کوٹھری سے نکال کر اسے جیل کی کوٹھری میں پہنچا دیا تھا۔

ابھی وہ اپنے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ پیدا ہو چکا ہے اور اس کا ایک وجود بھی ہے۔ مکاری کیا ہے' جرم کیا ہے اور معصومیت کیا ہوتی ہے' وہ نہیں جانتا تھا۔ اس معصوم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ غلطی اس کے باپ کی تھی۔ باپ نے اسے ایک قیدی ماں کے پیٹ میں پہنچا دیا تھا۔

بعض لوگ کوئی جرم نہیں کرتے۔ اس کے باوجود ناکردہ گناہوں کی سزائیں پاتے رہتے ہیں۔ جیل کے رجسٹر میں اس قیدی عورت کا نام صبا رانی لکھا ہوا تھا۔ وہ کسی راجا کی رانی نہیں تھی۔ عالی شان کوٹھیوں میں کام کرنے والی ایک نوکرانی تھی۔

وہ ماں، باپ کے اچھے دنوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے نام صبا رانی رکھا گیا تھا۔ جب حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور فاقوں کی نوبت آ گئی تو بدنصیبی نے رانی کے نام میں نوک چھو دی اور وہ رانی سے 'نوک' رانی بن گئی۔

کوٹھی کے مالک شہباز درّانی کا بیٹا بہزاد درّانی عیاش تھا۔ کبھی کبھی اسے چھیڑنے لگا۔ اس نے مالکن سے شکایت کی۔ ''آپ چھوٹے صاحب کو سمجھائیں۔ وہ مجھے چھیڑتے رہتے ہیں۔''

مالکن نے پوچھا۔ ''وہ تجھے کیسے چھیڑتا ہے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا بتاؤں' وہ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔''

''اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ میرا بیٹا جوان ہے۔ ذرا دل لگی کرتا ہے۔ اسے کرنے دے۔ تیرا کچھ بگڑتا تو نہیں ہے نا...''

''مگر مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ میں کام چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔''

مالکن نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ''تجھے ماہانہ تین سو دیتی ہوں۔ اب چھ سو دوں گی۔ یہ باتیں اپنے ماں باپ سے

نہ کہنا۔"

باپ بیمار تھا۔ محنت مزدوری نہیں کر سکتا تھا۔ ماں دوسرے گھروں میں ماسی کا کام کرتی تھی۔ وہ بھی ماہانہ تین سو روپے کماتی تھی۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ مالکن نے ایک دم سے تنخواہ دگنی کر دی تو وہ صرف دل لگی کی حد تک چھوٹے صاحب سے راضی ہوگئی۔

وہ روز صبح کام کرنے آتی تھی۔ دوپہر کو چلی جاتی تھی۔ چودہ برس کی تھی۔ بچپن اور جوانی کی درمیانی دہلیز پر کھڑی تھی۔ دوسری بار چھوٹے صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ دونوں بازوؤں میں دبوچ کر پتا نہیں کیا کرنا چاہتا تھا؟ وہ بڑی مشکلوں سے خود کو چھڑا کر وہاں سے بھاگتی ہوئی مالکن کے بیڈروم میں آگئی۔

مالکن نے پوچھا۔ "اس طرح کیوں ہانپ رہی ہے؟"

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "وہ بیگم صاحبہ...! وہ چھوٹے صاحب..."

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا میرے بچے کو...؟"

"انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرے ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔ وہ مجھے پھر چھیڑ رہے ہیں۔"

بیگم نے گھور کر کہا۔ "تین سو زیادہ دے رہی ہوں پھر کیوں شکایت کر رہی ہے؟"

"وہ کچھ زیادہ ہی دل لگی کر رہے ہیں۔ آج انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "جب میں تیری عمر کی تھی تو اس کے باپ نے میرے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ ہنس رہی ہیں۔ کیا یہ ہنسنے کی بات ہے؟"

"رونے کی بھی بات نہیں ہے۔ نوجوانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جا تجھے چھٹی دیتی ہوں۔ گھر کا کام نہ کر۔ اس کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہ..."

ایسے وقت شہباز درّانی کمرے میں آیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

بیگم نے کہا۔ "میں بتا چکی ہوں' بیٹا آپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اور یہ بُرا مان رہی ہے جبکہ تین سو روپے زیادہ دے رہی ہوں۔"

شہباز درّانی نے سینہ تان کر کہا۔ "میرا بیٹا ہے۔ میرے ہی نقش قدم پر چلے گا۔ یہ اعتراض کیوں کر رہی ہے؟"

بیگم نے کہا۔ "معاملہ کچھ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی تنخواہ کچھ اور بڑھانی ہوگی۔"

شہباز نے صبا رانی کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہوں... اور چار سو روپے بڑھا دو۔"

پھر اس نے صبا رانی سے کہا۔ "اے...! تجھے ہر مہینے پورے ایک ہزار روپے ملیں گے۔ چل جا یہاں سے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ "کبھی تیرے باپ نے بھی ایک ہزار روپے دیکھے ہیں...؟ کہا نا جا یہاں سے..."

وہ ڈانٹ سنتے ہی وہاں سے چلی گئی۔ شہباز نے حقارت سے کہا۔ "اونہہ... یہ کام کرنے والیاں بھی پارسا بننے لگی ہیں۔ کیا دوسری کوٹھیوں والے انہیں چھوڑ دیتے ہوں گے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "دوسروں کو جانے دیں۔ ہمارا بیٹا تو اسے نہیں چھوڑے گا۔"

اس بات پر وہ دونوں فاتحانہ شان سے قہقہے لگانے لگے۔ پھر بیگم نے کہا۔ "یہ تو میں یقین سے کہتی ہوں' رانی کو کسی نے میلا نہیں کیا ہے۔ ابھی یہ بچی ہے۔ ہمارا بیٹا حد سے بڑھے گا تو یہ نہیں مانے گی۔ ان لوگوں کی تو نہ کوئی اوقات ہے' نہ کوئی عزت ہے۔ یہ باہر ہماری عزت اُچھالتی پھرے گی۔ ہمیں آگے کی بھی سوچنا چاہیے۔"

"اس بچی کو تنہائی میں بٹھا کر سمجھایا کرو۔ آخر کوئی تو اسے جوان بنائے گا۔ میں نہیں چاہتا' ہمارا بیٹا باہر سے بیماریاں لے کر آئے۔ بیماری سے پہلے ہی گھر میں علاج ہوتا رہے تو اچھا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں رانی کو تنخواہ کے علاوہ کچھ دیتی دلاتی رہوں گی تو وہ راضی رہے گی۔"

بیٹے کو باہر بھٹکنے اور بھٹکنے سے بچانا ضروری تھا۔ بیگم روز ہی رانی کے کانوں میں یہ بات پھونکتی رہی کہ جوان لڑکے لڑکیاں اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہیں تو کوئی باہر والا دیکھنے نہیں آتا۔ کوئی بدنامی نہیں ہوگی اور ہوگی تو ہم پردہ ڈالیں گے۔

رانی کو ان کا بیٹا بہزاد ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ مگر ماہانہ ایک ہزار روپے ان غریبوں کے لیے بہت تھے۔ پھر بیگم اسے بخشش بھی دیتی رہتی تھی۔ اس لیے ایک حد تک بہزاد کو برداشت کر رہی تھی لیکن ایک دن وہ حد سے بڑھ گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈے مشروب میں نشے کی دوا گھول کر اسے پلا دی۔

وہ کوئی بے ہوشی کی دوا نہیں تھی۔ اس پر مدہوشی طاری



ہوگئی۔ یعنی ہوش میں تھی مگر نہیں تھی۔ ایسے وقت اس کا ذہن ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ وہ اپنے اختیار میں نہیں تھی۔ دھند میں لپٹی ہوئی دیکھ رہی تھی کہ زیادتی ہو رہی ہے۔ نشے کی مستی سمجھا رہی تھی، جو ہو رہا ہے، ہونے دیا جائے۔ اس کے بچپن کی پارسائی انکار کر رہی تھی۔ "نہیں... یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے... ایسا نہیں ہونا چاہیے..."

اسی کشمکش میں وہ ایک چیخ مارتے ہوئے بے ہوش ہوگئی۔ بہزاد درّانی نے اس کی حالت دیکھی تو گھبرا گیا۔ وہ اناڑی نوجوان تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا ظلم کیا جائے تو ایک بچی لہولہان ہو جاتی ہے۔ بیگم اور شہباز درّانی کو معلوم ہوا تو انہوں نے وہاں آکر دیکھا۔ وہ نوآموز عیاش بیٹے کے بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔

اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ جبراً منہ کھول کر حلق میں لیمن جوس کے قطرے ٹپکائے گئے۔ تب اسے آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا' بیڈروم کی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ اس نے دائیں بائیں سر گھما کر بیگم صاحبہ کو، بڑے صاحب کو پھر کارنامہ انجام دینے والے صاحب زادے کو دیکھا تو ایک دم سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اپنے لباس پر نظر ڈالتے ہی چیخنے لگی۔ چیخ چیخ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہائے... میں برباد ہوگئی۔ ہائے مر جاؤں گی۔ میں زندہ نہیں رہوں گی..."

وہ بہزاد درّانی پر انگلی اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ماں جی اور بابا جی کے پاس جاؤں گی۔ دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہوں گی، اس نے مجھے برباد کیا ہے۔"

شہباز درّانی نے اس کے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ مارتے ہوئے، گرجتے ہوئے کہا۔ "یو شٹ اپ! اب اگر ایک آواز بھی منہ سے نکالی تو گولی مار دوں گا۔"

وہ بولی۔ "ہاں مار دو۔ مجھے مار ڈالو۔ میں مرتے مرتے بھی اس پر تھوکتی رہوں گی۔ آخ تھو...!"

اس نے بہزاد کی طرف منہ کر کے تھوک دیا۔ دونوں باپ بیٹے طیش میں آکر اس کی پٹائی کرنے لگے۔ اسے بیڈ پر سے کھینچ کر فرش پر گرا کر ٹھوکریں مارنے لگے۔ وہ پہلے ہی نیم مردہ سی ہوگئی تھی۔ مار کھاتے کھاتے اور آدھی جان نکل گئی۔ چیخنے چلّانے کی سکت بھی نہ رہی۔

وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے باتھ روم میں لے آئے۔ وہاں فرش پر پھینک کر شاور کھول دیا۔ شہباز نے بیگم سے کہا۔ "اس کے لباس سے داغ دھبے اچھی طرح دھو ڈالو۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

اس نے ڈرائنگ روم میں آکر فون کے ذریعے ایک پولیس افسر سے بات کی۔ اسے صبا رانی کے تمام حالات بتائے۔ پھر کہا۔ "ہمیں اس لڑکی سے نجات دلاؤ۔ میں ابھی تمہیں پچاس ہزار روپے دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی ایک پولیس انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے آگے پچاس ہزار کی ایک گڈی رکھ دی گئی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "سونے کا ایک آدھ زیور ہمیں دیں۔ اس پر چوری کا الزام لگایا جائے گا۔ اس طرح اس کا اور اس کے گھر والوں کا منہ بند کیا جائے گا۔"

پچاس ہزار روپے قانون کا حلیہ بگاڑنے کے لیے بہت تھے۔ صبا رانی کو وہاں سے اٹھا کر حوالات میں پھینک دیا گیا۔ اس کے ماں باپ روتے پیٹتے ہوئے وہاں آئے۔ ان سے کہا گیا۔ "اب سے دو دن پہلے شہباز درانی کے گھر سے چالیس ہزار کے زیورات چرائے گئے تھے۔ شہباز صاحب کو تمہاری بیٹی پر شبہ تھا۔ انہوں نے ہماری خدمات حاصل کیں۔ ہم تمہاری بیٹی کی نگرانی کرنے لگے۔"

پھر انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ان کا شبہ درست نکلا۔ آج یہ لڑکی جڑاؤ کنگن چرا کر لے جا رہی تھی۔ ہم نے اسے چوری کے مال کے ساتھ پکڑا ہے۔"

باپ نے کہا۔ "یہ سراسر الزام ہے۔ میری بیٹی کبھی چوری نہیں کر سکتی۔"

ماں نے کہا۔ "میں نے اسے پیدا کیا ہے۔ ہم اسے بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ آٹھ برس کی تھی' تب سے کوٹھیوں میں کام کرتی آ رہی ہے۔ سب ہی کوٹھیوں کے مالکان اس سے خوش رہتے ہیں۔ کبھی کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "ہم نے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ ان سب کا بیان ہے، رانی جب تک کام کرتی رہی، ان کے ہاں سے کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی چیز چوری ہوتی رہی۔"

"ہم کیسے یقین دلائیں کہ ہماری بیٹی ایسی نہیں ہے؟"

"تم کیا یقین دلاؤ گے؟ وہ بچی ہے اور تم بڑے چور ہو۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں وارداتیں کرنے کے لیے بیٹی کو وہاں بھیجتے ہو۔ اس کے ذریعے معلوم کرتے ہو کہ بڑے گھروں میں نقدی اور زیورات کہاں چھپا کر رکھے جاتے ہیں؟ پھر وہاں نقب لگاتے ہو۔ اب سے دو دن پہلے تم ہی نے وہاں سے چالیس ہزار کے زیور چرائے ہیں۔"

اس کے بوڑھے اور بیمار باپ کو بھی چوری کے الزام

میں پکڑ لیا گیا۔ حوالات میں پہنچا کر اس کی اچھی طرح پٹائی کی گئی۔ وہ اپنی اور بیٹی کی قسمیں کھا رہا تھا۔ اس بے چارے کے پاس چالیس ہزار تو کیا چالیس پیسے بھی نہیں تھے۔

آخر انسپکٹر نے کہا۔ ''چلو، کوئی بات نہیں۔ مال واپس نہ کرو۔ بس یہ بیان لکھ دو کہ تم نے اور تمہاری بیٹی نے چوری کی ہے۔''

وہ خوامخواہ چوری کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔ اتنی تو عقل تھی کہ نا کردہ جرم کے الزام میں پھنسا دیے جائیں گے۔ اس بوڑھے کو حوالات میں بند کر کے دن رات اس کی پٹائی کی جا رہی تھی۔ اس طرح مظالم ڈھائے جا رہے تھے کہ جسم پر کوئی زخم نہ آئے۔ قانون کے محافظوں پر یہ الزام نہ آئے کہ ایک بے گناہ پر خوامخواہ تشدد کیا گیا ہے۔

اس کی ماں روتی پیٹتی محلے والوں کے پاس جاتی تھی۔ علاقے کے کونسلر سے ملتی تھی۔ بڑی بڑی کوٹھیوں والوں کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی۔ سب ہی سے گڑگڑا کر کہتی تھی۔ ''میری معصوم بچی کو، میرے بیمار خاوند کو ان ظالموں سے نجات دلاؤ۔''

بڑے لوگوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے معاملے میں خوامخواہ خود کو الجھاتے۔ محلے کے لوگ روز کماتے روز کھاتے تھے۔ پولیس کچہری کی دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد کرنے کے لیے خود کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کتنے ہی کوٹھی والوں نے کہا۔ ''کوئی کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگاتا۔ تمہاری بیٹی نے یقیناً چوری کی ہوگی۔ اسی لیے ان کی گرفت میں آئی ہے۔''

قدرتی آفات نازل ہوتی ہیں تو ان سے کسی طرح بچاؤ ممکن ہوتا ہے۔ پولیس والوں کے ذریعے آفات نازل ہوں تو رشوت اور سفارش کے بغیر نجات نہیں ملتی۔ ان غریبوں کی کوئی سفارش نہیں کر سکتا تھا اور ان کے پاس رشوت دینے کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔

بے شک، ہماری دنیا میں لوگ نا کردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔ ان سے کہا جا رہا تھا' چالیس ہزار روپے کے زیورات واپس کرو اور یہ ظلم بھی ہو رہا تھا کہ بیٹی سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ وہ بے چارے نہیں جانتے تھے کہ بڑی کوٹھی میں ان کی بیٹی کی عزت لوٹی گئی ہے۔ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ حوالات میں رکھ کر اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟

مار کھاتے کھاتے بیمار باپ کی حالت ایسی ہوگئی، جیسے اب تب میں مرنے ہی والا ہو۔ صبارانی کو سلاخوں کے پیچھے سے نکال کر دور سے باپ کی حالت دکھائی گئی۔ وہ بے چارہ فرش پر نیم مردہ سا پڑا ہوا تھا۔ ہلنے جلنے کی سکت نہیں تھی۔ سر گھما کر بیٹی کو دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''اگر اپنے باپ کی بہتری اور اس کی رہائی چاہتی ہے تو اس بیان پر دستخط کر دے کہ تُو نے چوری کی ہے اور بیگم شہباز درانی کے جڑاؤ کنگن بھی چرائے ہیں۔''

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''جو کہیں گے' وہ لکھوں گی۔ جو حکم دیں گے' وہ کروں گی۔ مگر خدا کے لیے میرے ابّا کو چھوڑ دو۔ ان کا علاج کراؤ، نہیں تو یہ مر جائیں گے۔''

انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہم اتنے نادان نہیں ہیں کہ اسے حوالات میں مرنے دیں گے اور اپنے سر کوئی الزام رکھیں گے۔ اسے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں یہ اپنا علاج کرائے یا مر جائے، ہماری بلا سے...''

وہ ان کے حکم کے مطابق بیان لکھنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ بھی لکھو کہ شہباز درانی اور ان کا بیٹا بہزاد درانی انتہائی شریف لوگ ہیں۔ وہ تمہیں بیٹی اور بہن کی طرح سمجھتے تھے۔ یہ لکھنے کے بعد تم اپنی بے آبروئی کی شکایت نہیں کر سکو گی۔''

صبارانی نے غریبی اور مفلسی کے باوجود چھ جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ قانون کے محافظوں نے اس سے جو کہا' اس نے وہاں بیٹھ کر سب کچھ لکھ دیا۔ اس کے بعد باپ بیٹی کو ملنے کی اجازت دی گئی۔ پہلی بار ڈھنگ کا کھانا کھانے کے لیے دیا گیا۔ بعد میں باپ سے بھی وہی لکھوایا گیا جو بیٹی سے لکھوایا گیا تھا۔

چونکہ انہوں نے چوری کا تحریری اعتراف کیا تھا، اس لیے باپ کو رہا کیا گیا مگر بیٹی کو اہنی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا۔ مجبور باپ سے کہا گیا۔ ''جب تک چالیس ہزار کے زیورات واپس نہیں ملیں گے، تمہاری بیٹی سلاخوں سے باہر نہیں آسکے گی۔''

باپ روتا پیٹتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ بھلا چالیس ہزار کے زیورات کہاں سے لاتا؟ دو دنوں کے بعد ہی بیمار رہ کر دواؤں کے بغیر مر گیا۔ کوئی صبارانی کی وکالت کرنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اسے حوالات سے نکال کر جیل کی چار دیواری میں بھیج دیا گیا۔ اس نے سنا تھا' باپ دواؤں کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکا ہے۔ وہ روتی بلکتی رہی اور کہتی رہی۔ ''مجھے باپ سے ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ مر چکا ہے مگر ماں تو زندہ ہے۔ مجھے ایک بار اس سے ملنے دو۔''

ماں جانتی تھی' بیٹی سینٹرل جیل میں ہے۔ وہ احاطے کے بڑے گیٹ تک آتی تھی مگر کوئی اسے اندر جا کر بیٹی سے ملنے کی



اجازت نہیں دیتا تھا۔

جواد اکبر ضلع کی تمام جیلوں کا انسپکٹر جنرل تھا۔ جیلر نے اس سے کہا۔ ''سر! ایک نوخیز لڑکی آئی ہے۔ سنگِ مرمر کی طرح شفاف ہے۔ ابھی ہم میں سے کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ حضور! کبھی وقت نکال کر آئیں اور اسے ایک نظر دیکھیں۔ آپ کے مزاج کے مطابق دل بہلانے کا سامان ہے۔''

جواد اکبر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ذرا شبہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ جانتے ہو، میں کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔ سچ بتاؤ، کسی نے اسے ہاتھ تو نہیں لگایا ہے؟''

وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ہماری کیا مجال ہے... ہم تو آپ کا جھوٹا کھانے والوں میں سے ہیں۔''

جواد اکبر دوسرے ہی دن جیل کا معائنہ کرنے وہاں پہنچ گیا۔ زنانہ وارڈ میں صبارانی کو سب سے الگ رکھا گیا تھا۔ جیلر نے اسے بتایا۔ ''جواد اکبر صاحب بہت بڑے عہدے دار ہیں۔ وہ چاہیں تو تجھے ماں سے ملا سکتے ہیں۔ تیرا کیس اپنے ہاتھوں میں لے کر رہائی بھی دلا سکتے ہیں۔ اگر تُو اپنا دل نکال کر ان کے آگے رکھ دے گی تو وہ بھی تیرے لیے رحم دل بن جائیں گے۔''

جب جواد اکبر جیل کی چار دیواری میں قدم رکھتا تھا تو وہاں کا تمام عملہ بری طرح سہما ہوا' الرٹ رہتا تھا۔ اس کے مزاج میں ایسی گرمی تھی جیسے کھوپڑی کے اندر انگارے دہکتے رہتے ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر ماتحتوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ ان کے منہ پر تھوک دیا کرتا تھا۔ کوئی اس کے سامنے شکایت کرنے کی تو کیا، زبان ہلانے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے صبارانی کے کمرے میں آیا تو وہ اس پہاڑ جیسے شخص کو دیکھ کر سہم گئی۔ وہ آگ تھا مگر رانی کو دیکھتے ہی برف کی طرح پگھل گیا۔ عاشق مزاج نہیں تھا لیکن رانی اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ جواد اکبر نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت کم سن ہے۔ بہت ہی معصوم ہے۔ جیل میں کیسے آگئی؟''

اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی رانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''کیا بتاؤں جناب! بے چاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ قانون کے محافظ ہیں۔ اس بے چاری کو انصاف دلا سکتے ہیں۔''

جواد اکبر نے رانی کو سر سے پاؤں تک چبا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''انصاف ہوگا اور ابھی ہوگا۔ اسے ہمارے کمرے میں پہنچا دو۔''

وہ حکم صادر کر کے وہاں سے چلا گیا۔ جیلر نے رانی کے پاس آ کر کہا۔ ''تو بڑی نصیب والی ہے۔ تیرے تو دن پھر گئے۔ ابھی دو سپاہی تجھے ان کے پاس لے جائیں گے۔ بڑے صاحب کو ناراض نہ کرنا۔ انہیں خوش کرے گی تو سمجھ لے تجھے رہائی مل گئی۔ پھر اپنی ماں کا بھی منہ دیکھ سکے گی۔''

وہ اسے اچھی طرح سمجھا کر وہاں سے چلا گیا۔ نہ سمجھاتا، تب بھی اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بڑے صاحب بہت اچھے ہیں۔ اسے معصوم بچی کہہ رہے تھے۔ اس جہنم سے ضرور نکالیں گے۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک ائرکنڈیشنڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں فوم کا بڑا ہی آرام دہ صوفہ کم بیڈ تھا۔ سینٹر ٹیبل پر تازہ پھل، خشک میوے، شراب سے بھری بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جواد اکبر اپنے لیے ایک پیگ بنا رہا تھا۔ وہ بوتل کو اور بڑے صاحب کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''رک کیوں گئیں؟ آؤ، میرے پاس بیٹھو۔''

وہ اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے آکر اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس نے بھاری بھرکم گرجتی ہوئی سی آواز میں حکم دیا۔ ''میرے قریب آؤ۔''

وہ لرزسی گئی۔ ایک ذرا ہچکچاتی ہوئی کھسکتی ہوئی قریب آگئی۔ وہ اسے ایک بازو کی گرفت میں لے کر اور قریب کھینچتے ہوئے بولا۔ ''ہوں... جیلر نے درست کہا تھا۔ تمہیں سنگِ مرمر سے تراشا گیا ہے۔ میں تو دیکھتے ہی پھسل گیا۔''

وہ اس کی قربت سے گھبرا رہی تھی۔ ایک ذرا کتراتے ہوئے بولی۔ ''یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''معصوم بچی دکھائی دیتی ہو مگر بالکل ہی نادان تو نہیں ہو۔ میرے ارادوں کو اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ تم مجھے خوش کرو گی تو میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ تمہاری ماں کو تم سے ملاؤں گا۔ یہاں کی چار دیواری سے باہر نکالوں گا۔''

اس دنیا میں پیسا بھی ملتا ہے، روٹی بھی ملتی ہے اور بدن ڈھانپنے کو کپڑا بھی ملتا ہے۔ لیکن پیسوں کے بغیر مصیبتوں سے نجات نہیں ملتی۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ مگر کچھ دے کر کچھ لینے کے لیے بس ایک حسن تھا اور جوانی تھی۔ مردوں کی دنیا میں عورتوں کو پیش ہونے کے لیے بس یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔

صبارانی نے پہلی بار اپنی مرضی سے خود کو داؤ پر لگا دیا۔

مرد کبھی عورت کے ہاتھ نہیں لگتا۔ عورت کو اپنے ہاتھ میں کرتا ہے۔ جواد اکبر جیسے جیسے اس کے ساتھ وقت گزار رہا تھا ویسے ویسے اس کے اندر یہ بات پک رہی تھی۔ ''یہ تو واقعی زبردست ہے۔ بالکل الگ سی چیز ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں لے رہی ہے۔''

اس نے ذرا سی ہار مانتے ہوئے سوچا۔ 'میں نے سوچا تھا اسے چبا کر تھوک دوں گا۔ مگر یہ تو حلق سے اتر رہی ہے۔'

اس نے طے کرلیا، اس لڑکی کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ نہ ہی کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت دے گا۔ جب تک دل نہیں بھرے گا، اپنے لیے ریزرو رکھے گا۔

صبا رانی نے پوچھا۔ ''کیا مجھے یہاں سے رہائی مل جائے گی؟ کیا میں اپنی ماں سے مل سکوں گی؟''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''کل ہی ملاقات کرادوں گا مگر رہائی کے معاملے میں قانونی رکاوٹیں ہیں۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''آپ تو حاکم ہیں۔ کیا آپ کے سامنے بھی رکاوٹیں آجاتی ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''امیر ہو یا غریب' حاکم ہو یا محکوم' قانون سب کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔ تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم نے چالیس ہزار کے زیورات نہیں چرائے۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں' میں نے اس کوٹھی سے ایک تنکا بھی نہیں چرایا ہے۔''

''قسمیں کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم نے تھانے میں جو تحریری بیان دیا ہے، عدالت میں اسے تسلیم کیا جائے گا۔''

وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ ''میں کیا کروں؟ تھانے دار نے مجبور کردیا تھا۔ اگر یہ بیان نہ دیتی تو وہ میرے ابا کو حوالات میں مار مار ڈالتے۔''

''کیا تم نے اپنے ابا کو بچالیا؟ کیا وہ زندہ ہے؟''

''نہیں... وہ تو رہائی پانے کے دو دن بعد ہی مر گئے تھے۔''

''تو پھر جھوٹا بیان لکھ کر تم نے کیا حاصل کیا؟ اپنے لیے مصیبت مول لے لی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولی۔ ''میں کیا کرتی؟ یہ سمجھ رہی تھی' ابا حوالات میں آدھے مر چکے ہیں۔ ان پر اور ظلم ہوتے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں' ہم غریبوں پر کس طرح مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔''

''میں مانتا ہوں مگر تمہیں بھی قانون کو سمجھنا چاہیے۔ تم نے تھانے میں جو کاغذ لکھا ہے' اسی کو درست مانا جائے گا۔ فی الحال کوئی وعدہ نہیں کرسکتا مگر کوشش کروں گا۔ تم نے میرا دل خوش کیا ہے۔ میں ضرور تمہارے کام آؤں گا۔ بس ذرا صبر کرو اور انتظار کرو۔ میں بھی تمہاری رہائی چاہتا ہوں۔ تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔''

ایسی باتوں سے امید بندھ رہی تھی۔ وہ پھر اس کی مجبوریوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری رہائی کے لیے کچھ ہیرا پھیری کروں گا۔ تب تک یہیں رہنا ہوگا۔ مگر یہاں تمہیں میرے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تم قیدی بن کر نہیں میری منظورِ نظر بن کر رہو گی۔ جیلر بھی تمہیں آنکھیں دکھانے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

وہ بڑے صاحب جو کہہ رہے تھے' اسے مان لینے میں ہی بہتری تھی۔ یہ امید تھی کہ اسے جلد ہی چوری کے الزام سے بری کردیا جائے گا۔ تب تک ایک داشتہ بن کر رہنے کے عذاب سے گزرنا ہوگا۔ دوسرے ہی دن اسے ماں سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔

تقریباً چار ماہ بعد وہ ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس نے ماں کو یقین دلایا کہ بڑے صاحب اس پر بہت مہربان ہیں۔ وہ جلد ہی چوری کا جھوٹا کیس ختم کرادیں گے۔ اسے رہائی ملے گی تو وہ ماں بیٹی پہلے کی طرح اپنے نصیب میں لکھی ہوئی زندگی گزارتی رہیں گی۔

وہ پھر سے غریبوں کی طرح ہی سہی... مگر ایک شریفانہ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی رہی اور ماں بڑے صاحب کو دعائیں دیتی رہی۔ انہیں زیادہ دیر تک ملنے اور باتیں کرنے کی اجازت دی گئی تھی مگر جدا تو ہونا ہی تھا۔ ماں روتی ہوئی آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

جواد اکبر نے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ گھر کے کام کاج کے لیے صبا رانی کو اس کی کوٹھی میں بھیج دیا جائے اور اپنے ماتحتوں کو یہ سمجھایا کہ جب بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ' کمشنر یا ڈپٹی کمشنر اور فلاحی تنظیم کے وکلا اور اہم کارکن معائنے کے لیے جیل میں آئیں تو اس سے پہلے ہی صبا رانی کو کوٹھی سے وہاں منتقل کردیا جائے گا۔

وہ اس حکم کے مطابق جیل سے نکل کر کوٹھی میں آگئی۔ وہاں بڑے صاحب کی داشتہ بن کر رہنے لگی۔ جواد ایک قد آور صحت مند گٹھا جوان تھا مگر اب جوانی سے بڑھاپے کی طرف آنے والا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی عمر کا چالیسواں کر رہا تھا مگر شادی نہیں کر رہا تھا۔

موٹچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بڑے فخر سے کہتا تھا۔

"جب ایسے ہی مل جاتی ہیں تو پھر بیوی کے نام کی دردسری کیوں مول لی جائے؟ بیوی ایک ہوتی ہے مگر فتنے ہزار لاتی ہے اور داشتائیں ہزار ہوتی ہیں مگر کبھی کسی فکر اور پریشانی میں جتلا نہیں کرتیں۔ آتی ہیں' گل کھلاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔"

اسے اپنی نسل آگے بڑھانے کا شوق نہیں تھا۔ بچے اسے بکواس لگتے تھے۔ اگر بیٹی ہوتی ہے تو بستر پر آنے والی کم سن لڑکیاں سوالیہ نشان بن جاتی ہیں۔ زبان بے زبانی سے پوچھتی ہیں۔ "کیا ہم تمہاری بیٹی کے برابر نہیں ہیں؟"

لعنت ہے۔ کوئی داشتہ ایسا سوال کرے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ جوانی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ دانش مندی یہی ہے... نہ شادی کی جائے، نہ بیٹیاں پیدا کی جائیں۔

بیٹوں کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ یہ خود غرض ہوتے ہیں۔ جوان ہو کر بیویوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ماں باپ کو گھر کی پھٹی پرانی چیزیں سمجھ کر اسٹور روم میں ڈال دیتے ہیں۔ جو والدین سمجھ دار ہوتے ہیں، وہ اپنی زندگی میں دولت اور جائیداد کبھی ان کے نام نہیں لکھتے۔ اپنے ہی نام رکھتے ہیں۔ اس طرح بیٹے بڑی سعادت مندی سے والدین کی آخری سانسوں تک ان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ یہ یقین ہوتا ہے' آخر ان بوڑھوں کا سب کچھ اپنے ہی نام ہونے والا ہے۔ لہٰذا ایسی لالچی اولاد کو پیدا ہی نہ کیا جائے۔

عیش و عشرت سے بھری ہوئی زندگی میں ساری مصیبت ایک بیوی ہی لے کر آتی ہے۔ نہ وہ کبھی آئے' نہ ایسی مصیبتیں پیدا ہوں۔ وہ دوسروں سے سب کچھ چھین لینا جانتا تھا۔ اپنی طرف سے کچھ دینے کی غلطی کبھی نہیں کرتا تھا۔ شادی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت اور جائیداد بیوی بچوں کو کبھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ سوچتا تھا۔ 'میری دولت اور جائیداد کی لوٹ مار میرے اپنے ہی کریں گے۔ جو کچھ چھوڑ کر جاؤں گا' اس کے لیے لڑتے مرتے رہیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ لڑنے مرنے والے پیدا ہی نہ ہوں۔ آخری وقت میں اپنی تمام دولت اور جائیداد محکمہ اوقاف کے نام کر جاؤں۔ پتا نہیں بھی بھولے بھٹکے زندگی میں کوئی نیکی ہو سکے گی یا نہیں؟ مگر آخری وقت اپنی عاقبت کے لیے یہ نیکی کر جاؤں گا۔'

وہ ایک ہی چھت کے نیچے اپنی پھوپھی کی بیٹی ستارہ جبیں کے ساتھ بچپن سے رہتا آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ستارہ بھی اس کی ہم مزاج تھی۔ نہ شادی کرنا چاہتی تھی، نہ بچے پیدا کر کے ان کی پرورش کر کے اپنے حسن و شباب کا کباڑا کرنا چاہتی تھی۔

جب جواد نے پہلی بار ستارہ کو اپنی آغوش میں جکڑا تو وہ خود کو چھڑاتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو ہمیں کرنا چاہیے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ بولی۔ "میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو کر بھی نہیں رہ سکتی۔"

"کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی ہوگا۔"

"تم بچپن ہی سے چالباز اور مکار ہو۔ جو چیز چاہتے ہو' چھین لیتے ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے۔ مگر کیا کروں؟ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے' پہلے اسے مانگتا ہوں۔ نہ ملے تو چھین لیتا ہوں۔"

وہ کترا کر وہاں سے بھاگتی ہوئی دروازے پر آگئی۔ وہ بولا۔ "ستارہ' میری جان! آجاؤ..."

"تم جو چاہتے ہو، اسے دنیا والے نہیں مانیں گے۔"

"میں نے کبھی دنیا والوں کی پروا نہیں کی۔ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیتا ہوں۔ تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔"

وہ ٹھینگا دکھاتے ہوئے بولی۔ "تمہیں یہ ملے گا۔"

وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ وہ دن گزر گیا۔ رات کو معمول کے مطابق وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھا پی رہا تھا۔ گھر کے تمام افراد کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ ستارہ ایک باریک نائٹی پہن کر وہاں آگئی۔ پھر بولی۔ "میری انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔ دن کو یہاں آئی تھی۔ شاید یہیں کہیں ہوگی۔"

وہ بولا۔ "میں نے نہیں دیکھی۔ تم تلاش کر لو۔"

وہ اندر آ کر تلاش کرنے لگی۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر اس کے پاس آیا تو وہ کترانے لگی۔ "پلیز! مجھے جانے دو۔"

وہ بولا۔ "تم بھی میری طرح مکار ہو۔ انگوٹھی کے بہانے مجھے للچانے اور بھڑکانے یہاں آئی ہو۔"

وہ اسے للچا رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ آرہی تھی' کبھی پھسل رہی تھی۔ وہ ضدی تھا۔ اسے اور چنگیز خان بنا رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر بولی۔ "بس میں یہی چاہتی ہوں۔ جیتتے رہو گے تو ملتی رہوں گی۔ مانگتے رہو گے تو ٹھینگا دکھاتی رہوں گی۔"

گناہ گاروں کی سوچ یہ ہے کہ رشتے جائز یا ناجائز نہیں ہوتے۔ جو چیز اچھی لگے، اسے منہ لگا لیتے ہیں۔ دینی اور دنیاوی قوانین کی گرفت میں نہیں آتے۔ ان کے قانون کے مطابق گناہ وہی ہے جو ظاہر ہو جاتا ہے۔ جو ظاہر نہ ہو، وہ جائز ہے۔ اسے رواں دواں رکھا جا سکتا ہے۔



ان کے خفیہ تعلقات ایک عرصے تک قائم رہے۔ کوئی
کنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔ وہ چوری چھپے
تھے۔ گھر کی چار دیواری میں موقع نہ ملتا تو آؤٹنگ کے
، شاپنگ کے لیے لندن یا پیرس چلے جاتے تھے۔
وں اور خاندان والوں کو یہ یقین تھا کہ وہ ایک دوسرے
شادی نہیں کرنا چاہتے اس لیے کبھی ایسی ویسی کوئی غلطی
ں کریں گے۔

ایک غلط عمل مسلسل جاری رہے تو پھر نہیں چھپتا۔ گناہ کا
وتے رہو تو وہ ایک دن پھوٹ پڑتا ہے۔ ایسے ہی ایک
ستارہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو یہ خبر
ں کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ تب یہ بھید کھلا کہ ستارہ اور جواد
نے اپنے بزرگوں کے اعتماد کو اور رشتوں کے تقدس کو پامال
ہے۔

پھوپھی نے اپنے بھتیجے جواد اکبر کو باتیں سنائیں۔ وہ
باتیں ہی سنا سکتی تھی، اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی کیونکہ
کے ماں باپ مر چکے تھے۔ وہ خود مختار تھا۔ ایک سرکاری
عہدے دار تھا۔ اس نے اپنی بیٹی ستارہ سے کہا۔ "تمہاری
بے حیائی پر مٹی ڈالنی ہوگی۔ ہماری فیملی ڈاکٹر بڑی
داری سے یہ کام کرے گی۔"

ستارہ نے کہا۔ "پہلے میں سوچتی تھی... نہ شادی
روں گی، نہ بچے پیدا کروں گی لیکن جواد کی محبت نے
ری سوچ بدل دی ہے۔ میں اپنے اس بچے کو ضائع نہیں
نے دوں گی۔"

"کیا ہماری ناک کٹواؤ گی؟ ساری دنیا ہم پر تھوکے
ں۔ مجھے کیا معلوم تھا، تم دونوں بڑے ہو کر ایسی بے حیائی
روگے۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔ یہ بات ابھی اس گھر کی چار
اری سے باہر نہیں گئی ہے۔ اس بدنامی کو ظاہر ہونے سے
ے ختم کرنا ہوگا۔ تم میری بات نہیں مانو گی تو میں تمہیں اپنی
م دولت اور جائیداد سے محروم کر دوں گی۔"

یہ بہت بڑی دھمکی تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ اس نے دو سو
روڑ روپے کی جائیداد اس کی ماں کے نام لکھی تھی۔ ماں کے
د یہ سب کچھ اسے ملنے والا تھا۔ مگر اس کی دھمکی کہہ رہی تھی
۔ بچہ پیدا کرو یا دو سو کروڑ روپے حاصل کرو۔ ہونے والی
نامی کو ضائع نہ کیا گیا تو اسے جائیداد میں سے ایک تنکا بھی
یں ملے گا۔

وہ بولی۔ "ممی! میں آپ کی ایک ہی بیٹی ہوں۔ آپ
ے اس دولت اور جائیداد سے محروم کر کے دنیا والوں کی
ظروں سے نہیں گرا سکتیں۔"

"اور تم جو مجھے اور میرے پورے خاندان کو نظروں سے گرانا چاہتی ہو... کیا یہ درست ہے؟"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "ممی! آپ میری جان لے لیں۔ مجھ سے دنیا کی کوئی بھی بات منوا لیں۔ میں مان لوں گی... مگر بچے کے خلاف نہ بولیں۔ اگر اسے ختم کرنا چاہیں گی تو میں بھی اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤں گی۔"

ماں نے اسے بڑی مجبوری سے' بڑی محبت سے دیکھا۔ وہ اس کی بیٹی تھی۔ اسے غصے میں دھمکیاں دے سکتی تھی مگر اسے تباہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "تمہاری شادی جواد سے کبھی نہیں ہو سکے گی۔ ہمارا خاندان یہاں سے یورپ اور امریکا تک پھیلا ہوا ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ تم اور جواد ایک دوسرے سے شادی نہیں کرنا چاہتے اور بہن بھائی کی طرح رہتے ہو۔ کیا پورے خاندان کو ہم سے بدظن کر دینا چاہتی ہو؟"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جواد سے شادی نہیں کروں گی۔ اس کے ساتھ کسی رشتے کے بغیر زندگی گزارتی رہوں گی۔"

"اور زیادہ بے حیائی کی باتیں نہ کرو۔ اس بچے کو کس باپ کے نام سے پیدا کرو گی؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ "میرے پاس ان باتوں کا جواب نہیں ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے، مجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہیں' میری خوشی چاہتی ہیں تو کچھ بھی کریں۔ اس بچے کو ضائع نہ ہونے دیں۔"

ماں بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ "ایک ہی راستہ ہے۔ میں نعیم صدیقی کو اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اب میرے اس فیصلے سے انکار نہ کرو۔ اس سے شادی کر لو۔"

"میری شادی جواد سے نہیں ہو سکے گی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی اور سے شادی کر لوں۔"

"کسی اور سے نہیں کرو گی تو بچے کو باپ کا نام نہیں ملے گا۔ دنیا والوں سے کیا کہو گی کہ تم نے کس کا بچہ پیدا کیا ہے؟"

نعیم صدیقی دور کے رشتے سے ستارہ کا کزن تھا۔ ستارہ کے باپ نے اس کی پرورش کی تھی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور اب وہ ان کا کروڑوں کا کاروبار بڑی دیانت داری سے سنبھال رہا تھا۔ اس کی ممی نے کہا۔ "نعیم ہمارا احسان مند ہے۔ ہم اسے بچپن سے جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں کبھی کسی معاملے میں دھوکا نہیں دیا۔ بڑی دیانت داری سے تمہارے ڈیڈی کا کاروبار سنبھال رہا ہے۔ وہ تمہاری غلطی کو بھی سنبھال

لے گا۔"

"کیا اسے بتایا جائے گا کہ میں ماں بننے والی ہوں؟"

"نہیں۔ ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ کوئی آنکھوں دیکھی بھی نہیں نگلتا۔ بے شک! نعیم نے ہمیں کبھی کسی معاملے میں دھوکا نہیں دیا مگر ہم مجبور ہیں۔ اسے دھوکا دیں گے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمہارا نکاح اس سے پڑھایا جائے گا۔ اسے کبھی شبہ نہیں ہوگا۔ وہ اس بچے کو اپنا ہی بچہ سمجھے گا۔"

"خاندان کے سب ہی لوگ حیرانی سے پوچھیں گے کہ اچانک اتنی جلدی شادی کیوں کی جارہی ہے؟"

"یہ سب ہی جانتے ہیں کہ میں نعیم کو اپنا داماد بنانے والی ہوں۔ کل تمہارے ڈیڈی کی برسی ہے۔ انہوں نے خواب میں آکر کہا ہے کہ برسی کے دوسرے یا تیسرے دن تمہاری شادی نعیم سے کرائی جائے۔"

ستارہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا واقعی ڈیڈی نے خواب میں آکر ایسا کہا ہے؟"

"وہ کبھی خیالوں میں نہیں آتے، خواب میں کیا آئیں گے؟ رشتے داروں سے تو یہی کہنا ہوگا۔"

ستارہ نے سر جھکا لیا۔ اس کی ممی نے دانش مندانہ فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح جواد کا بچہ اس کی گود میں ہنستا کھیلتا رہتا۔ جواد نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ نعیم صدیقی کو ایک لیبل بنا کر بچے کی پیدائش کو جائز بنا لو۔ آئندہ بھی بچے پیدا کرتی رہو گی تو وہ سب نعیم کے نام سے پھلتے پھولتے رہیں گے۔

ایسے شرمناک سمجھوتے کے مطابق شادی ہوگئی۔ ستارہ نے ایک سائن بورڈ کے طور پر نعیم کو اپنا شوہر بنا لیا۔ وہ اپنے مرحوم سسر کو یعنی ستارہ کے باپ کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس کا احسان مند تھا۔ مرحوم کے کاروبار پر اس کا پورا کنٹرول تھا۔ وہ منافع کی شرح بڑھا رہا تھا۔ اس کی فطرت میں لالچ اور منافع خوری نہیں تھی۔ وہ کاروبار میں کسی طرح کی ہیرا پھیری نہیں کرتا تھا۔

وہ تیس برس کا جوان تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ یہ جانتا تھا کہ ستارہ کی ممی اس سے بہت خوش ہیں اور اسے اپنا داماد بنانا چاہتی ہیں کیونکہ بیٹی نک چڑھی اور مغرور تھی، اس لیے اسے منانے میں کچھ وقت لگ رہا تھا۔

جب ستارہ اچانک ہی راضی ہوگئی اور ایک ہفتے کے اندر ان کی شادی ہوگئی تو نعیم کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کوئی نادان بچہ نہیں تھا۔ کروڑوں کا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ دنیا کی ہیرا پھیریوں کو خوب سمجھتا تھا۔

ستارہ اور اس کی ممی نے جو ہیرا پھیری کی تھی، اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ اگرچہ فرشتہ نہیں تھا۔ دیانت دار تھا۔ اس کے باوجود بالکل فرشتہ نہیں تھا۔ ایک انسان تھا جس کے اندر کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ایک کمزوری تھی کہ اس نے اس خاندان کی ایک فیملی ڈاکٹر سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

ستارہ سے اچانک ہی شادی ہوئی تھی۔ ایسے وقت فیملی لیڈی ڈاکٹر موجود نہیں تھی۔ جب ایک ہفتے بعد وہ لندن سے واپس آئی تو اس نے ہنستے ہوئے نعیم سے پوچھا۔ "تم نے ستارہ سے شادی کی ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

اس کی داشتہ ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "مبارک ہو... ہاتھ ملاؤ... تم تو شادی سے پہلے ہی ایک بچے کے باپ بن گئے ہو۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اب سے دس دن پہلے میں نے ستارہ کا معائنہ کیا تھا اور اس کی ممی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ سنتے ہی میرا منہ بند کرنے کے لیے مجھے پچاس ہزار روپے دیے گئے تھے۔"

نعیم نے پوچھا۔ "تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ چٹ منگنی' پٹ بیاہ کرائیں گے اور تمہارے ساتھ دھوکا کریں گے۔ ابھی معلوم ہوا ہے تو تمہیں بتا رہی ہوں۔"

وہ آگے بڑھ کر اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "جو پچاس ہزار مجھے دیے گئے ہیں، میں ان کے منہ پر مار دوں گی مگر دلدار کو دھوکا نہیں کھانے دوں گی۔"

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔ "واقعی تم نے ایک محبوبہ ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ میں بالکل ہی اندھا بن کر دھوکا کھانے والا تھا۔ تم نے مجھے بچا لیا ہے... آئی لو یو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "پھر کیا ارادہ ہے... ستارہ سے اپنی جان چھڑاؤ گے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "میں بزنس مین ہوں۔ گھاٹے کا سودا نہیں کروں گا۔ اب تک ان کے ساتھ دیانت دار رہا مگر انہوں نے بے ایمانی اور فریب دینے کی ابتدا کی ہے۔ میں انتہا کر دوں گا۔ دو سو کروڑ کی جائیداد ہے اور پچاس کروڑ بزنس میں گردش کر رہے ہیں۔ میں اس کا شوہر بن کر اور ساسو ماں کا داماد بن کر یہ سب کچھ رفتہ رفتہ حاصل کرتا رہوں گا۔"



"بے شک! تمہیں یہی کرنا چاہیے۔"

"میرا مرحوم سسر بہت ہی نیک دل شخص تھا۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس نے جو دولت اور جائیداد چھوڑی ہے' اس کی حفاظت نہیں کروں گا تو ستارہ یہ سب کچھ کسی یار کے حوالے کر دے گی۔"

وہ اسے بڑی محبت اور عقیدت سے چومتے ہوئے بولا۔ "آفرین! تم آئندہ بھی میرے بہت کام آتی رہو گی۔"

وہ جذباتی انداز میں بولی۔ "تم دن رات مجھے کام میں لاتے رہو۔ میں خوش ہوتی رہوں گی۔ بولو' آئندہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا۔ "تم فیملی ڈاکٹر ہو... ستارہ کی زچگی ہونے تک اس کی دیکھ بھال کرتی رہو گی۔ علاج کرتی رہو گی اور بچے کی پیدائش کے وقت موجود رہو گی۔"

"ہاں۔ آگے بولو۔"

"آگے تم سمجھ دار ہو۔ اس بچے سے مجھے نجات دلاؤ گی۔ میں کسی ناجائز بچے کا باپ کہلانا پسند نہیں کروں گا۔"

"فکر نہ کرو۔ تم جو چاہتے ہو' وہی ہوگا۔ میں زچگی کا کیس اس حد تک بگاڑ سکتی ہوں کہ بچے کے ساتھ ماں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "ہرگز نہیں... ستارہ جیسی بھی ہے' میرے محسن کی بیٹی ہے۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ ان ماں بیٹی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ صرف ان کی مکاری کا جواب مکاری سے دوں گا۔"

آفرین اور نعیم صدیقی بمقابلہ ستارہ اور جواد اکبر... یہ دو ٹیمیں بن گئیں۔ دوسری ٹیم کی کوچ ستارہ کی ممی تھی۔ اس نے جو طریقہ کار بتایا کوچ کو سکھایا تھا، اس کے مطابق اس نے اپنے یار سے ہونے والے بچے کو ضائع ہونے سے بچا لیا تھا۔ بہ ظاہر یہ ٹیم جیت کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

دوسری ٹیم ابھی جان بوجھ کر ان جان بنی ہوئی تھی۔ نعیم صدیقی ایک معصوم، اطاعت گزار داماد اور فرماں بردار شوہر بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر آفرین خود کو ایک وفادار فیملی ڈاکٹر ثابت کر رہی تھی مگر بڑی رازداری سے علاج اور دواؤں کے ذریعے سرنگ کھودتی ہوئی ایک بے گناہ معصوم بچے تک پہنچ رہی تھی۔

نعیم صدیقی پہلی بار کاروباری منافع میں ہیرا پھیری کرنے لگا۔ اب وہ لندن اور سوئزرلینڈ میں اپنا بینک بیلنس بڑھا رہا تھا۔ اپنے اور آفرین کے نام سے چھوٹی بڑی جائیداد خرید تا جا رہا تھا۔ ادھر آفرین اپنی چالیں چل رہی تھی جن کے نتیجے میں ستارہ کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ زچگی سے قبل الٹراساؤنڈ کے ذریعے پتا چلا' بچے میں برائے نام جان ہے۔ اسے آپریشن کے ذریعے دنیا میں لانا ہوگا۔

برائی کرنے والوں کا انجام بُرا ہوتا ہے لیکن جو کسی کا بُرا نہیں چاہتے جو نہ کسی سے دوستی کرتے ہیں' نہ دشمنی کرتے ہیں۔ وہ جو دنیا میں آنے والے ہوتے ہیں' ان معصوم اور بے گناہوں کو بھی انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

اس بچے نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مگر اسے ماں کی کوکھ میں ہی اس قدر کمزور بنا دیا گیا کہ دنیا میں آتے ہی چند سانسیں لینے کے بعد وہ مر گیا۔ ستارہ کو اس کی موت کا صدمہ تھا۔ اس بچے کے لیے اس نے کتنی ہیرا پھیری کی تھی۔ اسے پیدا کرنے کے لیے اور ایک باپ کا نام دینے کے لیے نعیم صدیقی کو اوپری دل سے شوہر بنا لیا تھا۔ ساری تدبیریں، سارے ہتھکنڈے ناکام ہوئے تو وہ رونے لگی۔

ماں نے اسے تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! پریشان نہ ہو۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ تم پھر ماں بنو گی۔ اپنی صحت کا خیال رکھو گی تو بچہ بھی صحت مند پیدا ہوگا۔"

ڈاکٹر آفرین نے کہا۔ "میڈم...! ایک بُری خبر یہ ہے کہ آپ کی صاحبزادی اب کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔"

جواد اکبر بھی اس کمرے میں موجود تھا۔ ستارہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں بن سکوں گی...؟ میں ضرور بنوں گی۔ مجھے حوصلہ دو۔ میں پھر ایک بچے کو جنم دوں گی۔"

جواد اکبر نے ہچکچاتے ہوئے نعیم صدیقی کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "ستارہ کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ تمہیں اسے حوصلہ دینا چاہیے۔"

نعیم نے ستارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو کسی حوصلے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو چاہتی ہو' کر گزرتی ہو۔ مگر تقدیر سے نہیں لڑ سکو گی۔ جب ایک لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی ہے کہ ماں نہیں بن سکو گی تو اس کا مطلب یہی ہے' تمہارے اندر کوئی بہت بڑی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔"

اس کی ممی نے کہا۔ "کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ میں اپنی بیٹی کو لندن لے جاؤں گی۔ وہاں کسی مہنگے اسپتال میں اس کا علاج کراؤں گی۔ یہ ضرور ماں بنے گی۔"

نعیم نے جواد اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا معجزہ ہو جائے تو صرف ستارہ کو ماں بن کر ہی نہیں' مجھے بھی باپ بن کر خوشی ہوگی۔ آخر اتنی دولت و جائیداد کا کوئی تو وارث پیدا ہونا چاہیے۔"

ستارہ کو اسپتال سے گھر لایا گیا۔ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اس کی ماں نے نعیم صدیقی سے کہا۔ "میں اپنی بیٹی کو لندن لے جاؤں گی۔ وہاں مہینوں رہ کر اس کا علاج کراؤں گی۔"

نعیم نے کہا۔ ''اور میں وہاں مہینوں رہ کر یہاں اتنے بڑے بزنس سے غافل نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی کبھی آتا جاتا رہوں گا۔''

وہ ماں بیٹی لندن چلی گئیں۔ جواد اکبر بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ ڈاکٹر آفرین نے تنہائی میں نعیم صدیقی کے گلے لگ کر کہا۔ ''اُدھر وہ دونوں پھر اپنا گیم کھیلنے گئے ہیں، ادھر ہمیں ہنی مون منانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بے چاری میری ستارہ... اپنے یار کی اولاد سے اپنی گود بھرنا چاہتی ہے۔''

آفرین نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور میڈم اپنی بیٹی کی گود بھرنے گئی ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی اس کا علاج نہیں کر سکے گا۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔''

نعیم صدیقی کاروباری مصروفیات کا بہانہ کرتا رہتا تھا۔ ستارہ کے پاس نہیں جاتا تھا۔ اس کے برعکس جواد اکبر مہینے دو مہینے میں ایک ہفتے کے لیے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ لندن کے ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اس کے باوجود ستارہ وہیں رہی اور جواد کے ساتھ دن رات گزارتی رہی۔ دس ماہ کے بعد مایوس ہوگئی۔ یقین ہوگیا کہ تمام ڈاکٹر درست کہتے ہیں۔

وہ ماں بیٹی واپس آئیں تو نعیم نے کہا۔ ''ستارہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی اور مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں نے ڈاکٹر آفرین سے کورٹ میرج کرلی ہے۔''

میڈم نے غصے سے کہا۔ ''تم نے کس کی اجازت سے دوسری شادی کی ہے...؟''

''قانون اجازت دیتا ہے، ایک بیوی ماں بننے کے قابل نہ رہے تو مرد دوسری شادی کرسکتا ہے۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''تم نے اس لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی ہے جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتی رہی ہے۔ اب تم اس سے ہونے والی اولاد کو ہماری دولت و جائیداد کا وارث بنانا چاہو گے۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

نعیم نے کہا۔ ''پلیز! جھگڑا نہ بڑھائیں۔ مجھے بے ایمان نہ سمجھیں۔ میں اور میرا ہونے والا بچہ اس دولت و جائیداد کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ آپ اپنی تسلی کے لیے اپنا سب کچھ ستارہ کے نام لکھ دیں۔ میں آپ سے پھوٹی کوڑی نہیں مانگوں گا۔ اس کاروبار کو سنبھالنے کے لیے جو محنت کرتا ہوں، بس اس کی تنخواہ لیتا رہوں گا۔''

ساس صاحبہ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ بچپن سے اسے جانتی تھی۔ وہ وفادار بھی تھا اور دیانت دار بھی تھا۔ ستارہ نے کہا۔

''لیکن ممی...! مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ میں اپنی کا ایک بچہ گود لوں گی۔ اس کی پرورش کروں گی۔ اس سب کچھ نچھاور کرتی رہوں گی۔''

اس نے نعیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ بچہ... جو کا ہوگا۔ جب تم من مانی کر سکتے ہو میری اجازت دوسری شادی کر سکتے ہو تو میں بھی جواد کے بچے کو گود ہوں۔ اسے اپنا وارث بنا سکتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تم بڑے باپ کی بیٹی ہو جو چاہو کر سکتی ماں نے بیٹی سے کہا۔ ''جواد اکبر نے آج تک نہیں کی اور نہ آئندہ شادی کرنے کے موڈ میں ہے۔ پھ بچہ کہاں سے آئے گا؟''

ستارہ نے کہا۔ ''شادی نہیں کی ہے تو کرلے گ کرائے کی عورت لے آئے گا۔ اس سے نکاح پڑھوا پھر باپ بننے کے بعد بچہ اس عورت سے لے کر اس کی کردے گا۔''

نعیم نے کہا۔ ''ستارہ! تم میری بیوی ہو۔ اگر خلاف کوئی فیصلہ سناؤ گی تو میں بھی تمہارے خلاف سنانے کا حق رکھتا ہوں۔ آفرین سے میرا بچہ ہوگا تو قبول نہیں کروگی۔ اسے اپنی جائیداد کا وارث نہیں بنا اسی طرح تم جواد اکبر کے ہونے والے بچے کو گود لو اسے قبول نہیں کروں گا۔ ایک باپ کے طور پر اسے نہیں دوں گا۔''

ستارہ نے کہا۔ ''اگر تم میرے لے پالک بچے کو نہیں دو گے تو میں بھی تمہیں اپنا شوہر تسلیم نہیں کروں طلاق لے لوں گی۔''

نعیم نے اس کی ممی سے پوچھا۔ ''آپ کیا فرماتی ہمارے درمیان طلاق ہو جانی چاہیے؟ یہ رشتہ ٹوٹے گا کاروباری رشتہ بھی ختم ہو جائے گا؟''

اس کی ماں نے کہا۔ ''میں کچھ عرصے سے تمہار دیکھ رہی ہوں۔ تم بہت بدل گئے ہو۔ تمہیں یہ خوش فہمی تمہارے بغیر ہمارا بزنس جاری نہیں رہ سکے گا۔''

ستارہ نے کہا۔ ''تمہاری یہ خوش فہمی پلک جھپکتے ہی جائے گی۔ اگر تم جواد اکبر سے ہونے والے بچے کو باپ نہیں دو گے تو میں تمہیں اپنی زندگی سے اور اپنی ممی کاروبار سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی۔''

''تم کیا نکالو گی اور کیا پھینکو گی؟ میں خود ہی یہاں جارہا ہوں۔ کل تک تمہارے پاس طلاق نامہ پہنچ جائے اسے ایک جھوٹی، فریبی اور مغرور شریکِ حیات

نعیم نے کہا۔ ''اور میں وہاں مہینوں رہ کر یہاں اتنے بڑے بزنس سے غافل نہیں ہوسکتا۔ ویسے کبھی کبھی آتا جاتا رہوں گا۔''

وہ ماں بیٹی لندن چلی گئیں۔ جواد اکبر بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ ڈاکٹر آفرین نے تنہائی میں نعیم صدیقی کے گلے لگ کر کہا۔ ''اُدھر وہ دونوں پھر اپنا گیم کھیلنے گئے ہیں، ادھر ہمیں ہنی مون منانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بے چاری میری ستارہ... اپنے یار کی اولاد سے اپنی گود بھرنا چاہتی ہے۔''

آفرین نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور میڈم اپنی بیٹی کی گود بھرنے گئی ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی اس کا علاج نہیں کرسکے گا۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔''

نعیم صدیقی کاروباری مصروفیات کا بہانہ کرتا رہتا تھا۔ ستارہ کے پاس نہیں جاتا تھا۔ اس کے برعکس جواد اکبر مہینے دو مہینے میں ایک ہفتے کے لیے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ لندن کے ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اس کے باوجود ستارہ وہیں رہی اور جواد کے ساتھ دن رات گزارتی رہی۔ دس ماہ کے بعد مایوس ہوگئی۔ یقین ہوگیا کہ تمام ڈاکٹر درست کہتے ہیں۔

وہ ماں بیٹی واپس آئیں تو نعیم نے کہا۔ ''ستارہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی اور مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں نے ڈاکٹر آفرین سے کورٹ میرج کرلی ہے۔''

میڈم نے غصے سے کہا۔ ''تم نے کس کی اجازت سے دوسری شادی کی ہے...؟''

''قانون اجازت دیتا ہے' ایک بیوی ماں بننے کے قابل نہ رہے تو مرد دوسری شادی کرسکتا ہے۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''تم نے اس لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی ہے جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتی رہی ہے۔ اب تم اس سے ہونے والی اولاد کو ہماری دولت و جائیداد کا وارث بنانا چاہو گے۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

نعیم نے کہا۔ ''پلیز! جھگڑا نہ بڑھائیں۔ مجھے بے ایمان نہ سمجھیں۔ میں اور میرا ہونے والا بچہ اس دولت و جائیداد کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ آپ اپنی تسلی کے لیے اپنا سب کچھ ستارہ کے نام لکھ دیں۔ میں آپ سے پھوٹی کوڑی نہیں مانگوں گا۔ اس کاروبار کو سنبھالنے کے لیے جو محنت کرتا ہوں، بس اس کی تنخواہ لیتا رہوں گا۔''

ساس صاحبہ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ بچپن سے اسے جانتی تھی۔ وہ وفادار بھی تھا اور دیانت دار بھی تھا۔ ستارہ نے کہا۔

''لیکن ممی...! مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ میں اپنی کا ایک بچہ گود لوں گی۔ اس کی پرورش کروں گی۔ اس پر سب کچھ نچھاور کرتی رہوں گی۔''

اس نے نعیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ بچہ... جواد کا ہوگا۔ جب تم من مانی کرسکتے ہو' میری اجازت کے دوسری شادی کرسکتے ہو تو میں بھی جواد کے بچے کو گود لے ہوں۔ اسے اپنا وارث بنا سکتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تم بڑے باپ کی بیٹی ہو' جو چاہو کرسکتی ہو۔''

ماں نے بیٹی سے کہا۔ ''جواد اکبر نے آج تک شادی نہیں کی اور نہ آئندہ شادی کرنے کے موڈ میں ہے۔ پھر اس بچہ کہاں سے آئے گا؟''

ستارہ نے کہا۔ ''شادی نہیں کی ہے تو کرلے گا۔ کوئی کرائے کی عورت لے آئے گا۔ اس سے نکاح پڑھوائے گا پھر باپ بننے کے بعد بچہ اس عورت سے لے کر اس کی چھٹی کردے گا۔''

نعیم نے کہا۔ ''ستارہ! تم میری بیوی ہو۔ اگر میرے خلاف کوئی فیصلہ سناؤ گی تو میں بھی تمہارے خلاف فیصلہ سنانے کا حق رکھتا ہوں۔ آفرین سے میرا بچہ ہوگا تو تم اسے قبول نہیں کرو گی۔ اسے اپنی جائیداد کا وارث نہیں بناؤ گی۔ اسی طرح تم جواد اکبر کے ہونے والے بچے کو گود لوگی تو میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ ایک باپ کے طور پر اسے اپنا نام نہیں دوں گا۔''

ستارہ نے کہا۔ ''اگر تم میرے لے پالک بچے کو اپنا نام نہیں دو گے تو میں بھی تمہیں اپنا شوہر تسلیم نہیں کروں گی۔ طلاق لے لوں گی۔''

نعیم نے اس کی ممی سے پوچھا۔ ''آپ کیا فرماتی ہیں؟ ہمارے درمیان طلاق ہوجانی چاہیے؟ یہ رشتہ ٹوٹے گا تو کیا کاروباری رشتہ بھی ختم ہوجائے گا؟''

اس کی ماں نے کہا۔ ''میں کچھ عرصے سے تمہارے تیور دیکھ رہی ہوں۔ تم بہت بدل گئے ہو۔ تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تمہارے بغیر ہمارا بزنس جاری نہیں رہ سکے گا۔''

ستارہ نے کہا۔ ''تمہاری یہ خوش فہمی پلک جھپکتے ہی ختم ہوجائے گی۔ اگر تم جواد اکبر سے ہونے والے بچے کو باپ کا نام نہیں دو گے تو میں تمہیں اپنی زندگی سے اور اپنی ممی کے کاروبار سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی۔''

''تم کیا نکالو گی اور کیا پھینکو گی؟ میں خود ہی یہاں سے جارہا ہوں۔ کل تک تمہارے پاس طلاق نامہ پہنچ جائے گا۔''

اسے ایک جھوٹی، فریبی اور مغرور شریکِ حیات سے

بہت پہلے ہی پیچھا چھڑا لینا چاہیے تھا۔ دوسرے ہی دن طلاق ہوگئی۔ وہ اپنا ضروری سامان لے کر اس کوٹھی سے نکل آیا۔ کاروبار سے تعلق رکھنے والے تمام اہم کاغذات ان کے حوالے کردیے۔ ماں بیٹی کو یقین تھا کہ اس پھلتے پھولتے کاروبار کو اچھی طرح سنبھال لیں گی۔ جواد اکبر نے ایک بہت ہی تجربے کار اور قابلِ اعتماد شخص کو جنرل منیجر کی حیثیت سے ملازم رکھا۔ اس نے تمام اہم دستاویزات کی اسٹڈی کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ وہ کاروبار خسارے میں چل رہا ہے۔ نعیم صدیقی نے بینک سے کروڑوں روپے قرض لے کر اس کاروبار کو جاری رکھا تھا۔

نئے جنرل منیجر نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اس ڈوبتے ہوئے کاروبار کو سنبھال نہیں پائے گا۔ نعیم صدیقی نے ایسی چالاکی اور ہنرمندی سے فراڈ کیا تھا کہ اسے قانونی گرفت میں نہیں لیا جاسکتا تھا۔ وہ بڑی رازداری سے اپنا ایک نیا بزنس سیٹ اپ قائم کرچکا تھا۔

ستارہ اپنی ممی اور جواد اکبر کے ساتھ اس کے آفس میں آکر بولی۔ ”تم تو آستین کے سانپ نکلے۔ میرے ڈیڈی نے تمہیں ذلت کی پستیوں سے اٹھا کر اس بلند مقام تک پہنچایا مگر تم احسان فراموش ہو۔ تم نے ہمیں ہی ڈس لیا۔“

ستارہ کی ماں نے کہا۔ ”میں نے تمہیں دودھ نہیں پلایا لیکن ایک ماں کی طرح محبتیں دیتی رہی۔ بیٹا سمجھتی رہی پھر اپنا داماد بنالیا۔“

نعیم نے کہا۔ ”اگر تم مجھے اپنا دودھ پلاتیں اور مجھ سے فراڈ کرتیں، تب بھی وہ دودھ پانی ہو جاتا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ جب تک تم تینوں نے مل کر مجھے دھوکا نہیں دیا تھا، تب تک میں تمہارا وفادار اور دیانت دار ملازم تھا۔“

وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہوئے بولا۔ ”پہلے میں تمہاری عزت کرتا تھا مگر تم اس قابل نہیں ہو۔ یہ شرمناک حقیقت میں جانتا تھا کہ یہ دونوں تمہاری چھتر چھایا میں رہ کر بے حیائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔“

وہ کرسی پر اِدھر سے اُدھر ہوتے ہوئے بولا۔ ”جب آفرین نے مجھے بتایا کہ تم اپنی بیٹی کو بدنامی سے بچانے کے لیے اور جواد اکبر سے ہونے والے ناجائز بچے کو میرا نام دینے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو، فراڈ کر رہی ہو تو میں نے بھی وفاداری اور دیانت داری سے توبہ کرلی۔ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔ میں بھی تم جیسے مکاروں کو اپنی مکاری سے کاٹتا چلا گیا۔“

جواد اکبر ایک طرف خاموش بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر اپنی بھاری بھرکم گونجتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ تمہیں وارننگ دے رہا ہوں، ایک ہفتے کے اندر ہماری تمام لوٹی ہوئی دولت واپس کردو۔ ورنہ تمہاری زندگی سکڑ جائے گی۔ ہفتے کا ساتواں دن گزرتے ہی تم ایک کے بعد دوسری سانس لینے کے قابل نہیں رہو گے۔“

نعیم صدیقی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکال کر جواد کو نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہفتے کا ساتواں دن بہت دور ہے۔ ابھی ایک گولی چلے گی۔ پھر تم دھمکیاں دینے کے قابل نہیں رہو گے۔“

ستارہ اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی جواد اکبر کے سامنے آکر ڈھال بنتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا بدمعاشی ہے؟ ہم ملاقات کرنے آئے ہیں اور تم ہمیں قتل کرنا چاہتے ہو؟“

”تمہارے یار نے بدمعاشی شروع کی ہے۔ مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔“

پھر وہ جواد سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں، تمہارے پاس ریوالور ہے۔ کیا تم جانتے ہو، ابھی میں کیا کرنے والا ہوں؟“

جواد اکبر نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ وہ بولا۔ ”میں تمہیں گولی ماروں گا۔ پھر تمہارے مرتے ہی تمہارا اسلحہ نکال کر اپنی کرسی کی طرف فائر کروں گا۔ گولی میری کرسی کی پشت پر لگے گی۔ یہ ثابت ہوجائے گا کہ تم یہاں آکر مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے میں نے جواباً تم پر گولی چلائی تھی۔“

ستارہ کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”نعیم! ابھی تمہارے نشانے پر جواد نہیں ہے، میری بیٹی ہے۔ ریوالور نیچے کرو۔ گولی چل جائے گی۔“

”اپنی بیٹی کو وہاں سے ہٹاؤ۔ گولیاں اندھی ہوتی ہیں۔ کسی رشتے کو، کسی دوست اور دشمن کو نہیں پہچانتی ہیں۔“

ستارہ نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں... قسم کھا کر کہتی ہوں، جواد تم سے دشمنی نہیں کرے گا۔ تمہیں جانی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ کسی طرح کا بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ہمیں یہاں سے جانے دو۔“

نعیم نے انٹرکام کے ذریعے سیکورٹی افسر کو بلایا۔ پھر جواد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت بڑے سرکاری عہدے دار ہو۔ تمہارے پاس قانون کی طاقت ہے۔ میں ٹریڈ اینڈ کامرس کے ڈائریکٹرز میں سے ایک ہوں۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا آتا رہتا ہوں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا ہوں۔ بھانت بھانت کے مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں سے بہت کچھ سیکھتا رہتا ہوں۔ تمہارے قانونی شکنجوں سے نکلنے کا ہتھکنڈا بھی خوب جانتا ہوں۔ آئندہ تم



نے اِدھر کا رُخ کیا یا مجھے کسی طرح کی دھمکی دی تو اپنی اس داشتہ کے ساتھ جہنم میں پہنچ جاؤ گے۔“

سیکورٹی افسر نے آکر اسے سیلوٹ کیا۔ اس نے جواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کو اچھی طرح پہچان لو۔ ابھی اس کے پاس اسلحہ ہے۔ اسے باہر پہنچادو۔ آئندہ یہ کسی جبراً آنا چاہے تو گولی ماردو۔“

ان تینوں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ چپ چاپ جانے میں ہی خیریت تھی۔ وہ فوراً ہی سیکورٹی افسر کے پیچھے وہاں سے چلے گئے۔ جواد اکبر کبھی کسی کی دھونس میں نہیں آتا تھا۔ پہلی بار نعیم صدیقی اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر دھونس میں لے آیا تھا۔ وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ باہر آکر مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ستارہ نے کہا۔ ”خوامخواہ طیش میں نہ آؤ۔ اسے چیلنج نہ کرو۔ وہ بہت ہی مکار ہے۔ اس نے ہماری دولت لوٹی ہے۔ تمہیں جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ فی الحال اس سے دشمنی بھول جاؤ۔ پہلے میری ضرورت پوری کرو۔“

اسے ایک بچے کی ضرورت تھی۔ جو بھی بچا کھچا کاروبار رہ گیا تھا اور جتنی دولت و جائیداد رہ گئی تھی، اس کے لیے ایک وارث ضروری تھا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی مگر جواد اکبر باپ بن سکتا تھا۔

وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی محبوبہ کی خواہش پوری کرنا بھی ضروری تھی۔ کسی عورت کو عارضی طور پر ہی سہی، زندگی میں لانا تھا۔ انہی دنوں صبا رانی اس کی ہوس کی بیچ پر آگئی۔

اس نے ستارہ سے کہا۔ ”میں نے ایک قیدی لڑکی کو اپنی کوٹھی میں ملازمہ کی حیثیت سے رکھا ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اگر ماں بنے گی تو اپنی جیسی خوبصورت اولاد پیدا کرے گی۔ کیا ایک قیدی عورت کے بچے کو گود لینا چاہو گی؟“

وہ بولی۔ ”مجھے کسی کی سماجی حیثیت کا حساب نہیں کرنا ہے۔ میں تو صرف تم سے ہونے والی اولاد کو اپنے کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہوں۔“

ستارہ نے یہ بات اپنی ماں کو بتائی۔ اس نے کہا۔ ”اولاد قیدی عورت سے ہو یا کسی بازاری عورت سے... ولدیت میں ماں کا نہیں، باپ کا نام آتا ہے۔ وہ اولاد جواد کی ہوگی۔“

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ”ہمیں کسی قیدی عورت کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اہمیت اولاد کو دو۔ وہ جائز ہو، ناجائز نہ ہو۔ جواد سے کہو، چپ چاپ نکاح پڑھائے۔ جب اولاد ہوجائے تو اس عورت سے بچہ لے کر اسے طلاق دے دے۔“

ستارہ نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، وہ طلاق نہ لے۔ میں عورت ہوں اور عورتوں کی فطرت کو خوب سمجھتی ہوں۔ جب شادی ہوجائے گی تو وہ جواد کے گلے کا پھندا بن جائے گی۔ کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔“

ماں نے کہا۔ ”بلا سے پیچھا نہ چھوڑے۔ تمہیں اس سے کیا لینا ہے؟ جواد اگر اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے گا تو گزارتا رہے۔“

”ہرگز نہیں۔ میں کسی سوکن کو برداشت نہیں کروں گی۔“

ماں نے بیٹی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کس رشتے سے اسے سوکن سمجھو گی؟ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تم جواد کی دیوانی ہو مگر اس کی شریکِ حیات نہیں ہو۔“

”بے شک! میں اس کی دیوانی ہوں مگر نادانی نہیں کررہی ہوں۔ ذرا حساب لگائیں۔ اسی شہر میں اس کی چالیس کروڑ کی ایک کوٹھی ہے اور بھی زمینیں خریدتا رہتا ہے۔ کوئی دوسری عورت اس کی زندگی میں شریکِ حیات بن کر آئے گی تو میرا حق مارا جائے گا۔“

اس نے بیٹی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”کیا میری بات سمجھ رہی ہیں؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ستارہ نے کہا۔ ”میں اسے رنگ رلیاں منانے کی کھلی چھٹی دیتی ہوں لیکن شادی نہیں کرنے دیتی اور نہ ہی وہ کرے گا۔“

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم ان معاملات میں بہت چالاک ہو۔ پہلے یہ معلوم کرو کہ اس عورت کو عمر قید کی سزا ہو چکی ہے یا نہیں۔ ایک سزا یافتہ عورت سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ نہ وہ اپنی سلاخوں کے پیچھے سے کبھی باہر آسکے گی، نہ جواد کی دولت و جائیداد کی حق دار بن سکے گی۔“

ستارہ نے جواد اکبر کے پاس آکر کہا۔ ”میں تمہاری جائز اولاد چاہتی ہوں۔ تم اس قیدی عورت سے عارضی طور پر نکاح پڑھاؤ۔ جب وہ ماں بنے تو بچہ میرے پاس لے آؤ اور اس کی چھٹی کردو۔“

وہ اسے آغوش میں بھرتے ہوئے بولا۔ ”میری جان... میں یہی کروں گا۔“

”مگر اس سے نکاح پڑھاؤ گے تو وہ تمہارے گلے کا ہار بن جائے گی۔ کبھی تمہیں چھوڑنا نہیں چاہے گی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم شاید بھول رہی ہو، وہ ایک قیدی

عورت ہے۔ میں اسے جیل سے نکلنے ہی نہیں دوں گا۔ نہ وہ کبھی رہائی پائے گی' نہ بیوی بن کر اپنا کوئی حق جتا سکے گی۔''

صبارانی اس کی کوٹھی میں بہ ظاہر ایک ملازمہ تھی مگر داشتہ بن کر رہتی تھی۔ جب کبھی اطلاع ملتی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا فلاحی تنظیموں کے رہنما جیل کا معائنہ کرنے آرہے ہیں تو وہ اسے جیل میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ وہاں وہ ایک قیدی عورت کی حیثیت سے حاضر رہتی تھی۔ جب معائنہ کرنے والے چلے جاتے تو جیلر اسے جواد اکبر کی کوٹھی میں پہنچا دیا کرتا تھا۔

وہ حسبِ معمول اسی کوٹھی میں ایک ملازمہ کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ جواد نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر بولا۔ ''تجھے پتا ہے' میں تیرا کیسا دیوانہ ہوگیا ہوں؟''

وہ بولی۔ ''اگر آپ میرے دیوانے ہوتے تو مجھے اس جیل سے ہمیشہ کے لیے باہر لے آتے۔''

''تُو قانونی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھتی۔ شہباز درّانی نے تجھ پر چالیس ہزار کے زیورات کی چوری کا الزام لگایا ہے۔''

''وہ جھوٹ کہتا ہے۔ اس کا ایک بھی زیور چوری نہیں ہوا ہے۔''

''وہ جھوٹ بولیں گے مگر سچے کہلائیں گے۔ تُو سچ بولتی رہے گی اور جھوٹی کہلاتی رہے گی۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ انہیں جھوٹا اور فریبی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''تو کیا میں اسی طرح جیل میں ساری زندگی گزار دوں گی؟''

''تجھ پر الزام ہے کہ تُو کوٹھیوں میں کام کرتی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ مل کر چوریاں کرتی تھی۔ اگر تُو یہ بیان دے کہ واقعی تیرے باپ نے چوری کی تھی اور سارا مال چرانے کے بعد وہ کہیں چلا گیا تھا تو...''

وہ فوراً ہی اس کے بازوؤں سے اُترتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔ میرے ابّا مر چکے ہیں۔ میں ان پر چوری کا جھوٹا الزام نہیں لگاؤں گی۔''

''تو پھر ساری زندگی جیل میں سڑتی رہے گی۔''

''آپ بڑے آدمی ہیں۔ میری عزت سے کھیلتے رہتے ہیں، میں کوئی شکایت نہیں کرسکتی۔ آپ میری عزت لوٹ رہے ہیں۔ اس لوٹ مار میں مجھے تھوڑا سا تو فائدہ پہنچائیں۔''

''آج میں تجھے اتنا بڑا فائدہ پہنچانے والا ہوں کہ تُو سنے گی تو خوشی سے پاگل ہوجائے گی۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے مقدر کے موجودہ مالک کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تجھ سے شادی کرنے والا ہوں۔''

وہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''میں ابھی تجھ سے نکاح پڑھواؤں گا۔''

وہ مارے خوشی کے اس سے لپٹ کر بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ آپ پھر ایک بار بولیں۔''

''میں کیا بولوں؟ ابھی ایک گھنٹے کے اندر قاضی صاحب آنے والے ہیں۔ تُو جا اور نہا دھو کر اچھا سا لباس پہن لے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''آپ... آپ مجھے اپنی شریکِ حیات بنائیں گے۔ اپنے گھر کی عزت بنائیں گے۔ اب کبھی میری بے عزتی نہیں کریں گے۔ میں جارہی ہوں۔ وضو کر رہی ہوں۔ شکرانے کی نماز ادا کروں گی۔ یا اللہ...! بے شک، تُو ہی عزت دینے والا ہے۔ تُو ہی ذلت دینے والا ہے۔ اتنی ذلتیں اٹھانے کے بعد مجھے عزت دے رہا ہے۔ تیرا شکر ہے... لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

وہ بولتی ہوئی بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ یہ کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ تقدیر اس سے کتنا بڑا مذاق کرنے والی ہے؟ اسے سہاگ کا جوڑا پہنا کر دلدلی راستوں پر لے جانے والی ہے۔ وہ شہباز درانی کی کوٹھی سے جواد اکبر کی کوٹھی تک اسی طرح کے فریب کھاتی آرہی تھی۔

وہ دلہن بن گئی۔ قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ دینی احکامات کے مطابق وہ سچ مچ ایک بہت بڑے صاحب کی شریکِ حیات بن گئی تھی۔ اس خوش فہمی میں تھی کہ بیگم صاحبہ بن کر آئندہ قیدی عورت نہیں کہلائے گی۔ لیکن جواد اس کی اوقات کے مطابق کبھی کبھی اسے جیل کی چار دیواری میں بھیجنے لگا۔ تب عقل نے سمجھایا کہ اس کی حیثیت نہیں بدلے گی۔ وہ ان عورتوں میں سے ہے' جو مٹی میں رُلتے رہنے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔

چار ماہ بعد وہ بیمار رہنے لگی۔ اس نے جواد سے کہا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے' ماں بننے والی ہوں۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائیں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''اگر ماں بننے والی ہے تو میں بہت اچھی اور مہنگی لیڈی ڈاکٹر سے تیرا علاج کراؤں گا۔''

جواد اپنی ستارہ کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ بچہ اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس نے صبارانی کا علاج کرانے اور اس کی برابر نگرانی کرتے رہنے کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس بدنصیب کو پہلی بار ماں بننے کی خوشیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ یہ احساس بڑا ہی خوش کن تھا کہ وہ ایک بھرپور قابلِ قدر عورت بن چکی ہے اور وہ آنے والا بچہ اس کی



قدر و قیمت بڑھا رہا ہے۔

جواد نے ستارہ کے پاس آکر اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میری جان...! تقریباً آٹھ ماہ بعد تم ایک بچے کی ماں بننے والی ہو۔''

اس نے خوش ہو کر اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہائے، سچ کہہ رہے ہو نا؟ وہ تمہارا ہی بچہ ہوگا نا؟''

وہ اسے گود میں بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''خالص دودھ اور شہد کی طرح وہ بچہ بھی خالص میرا ہی ہے۔ صبارانی جب جیل میں آئی تو چودہ برس کی تھی۔ ابھی پندرہ برس پورے نہیں ہوئے ہیں۔ کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ وہ صرف میرے استعمال میں رہی ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں اس بچے کو سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ وہ میرا اور تمہارا ہوگا اور ہم دونوں کی جائیداد کا وارث ہوگا۔''

پھر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''اگر نعیم ہم سے دھوکا نہ کرتا تو آج ہمیں کروڑوں روپے کا منافع ہوتا رہتا۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''میں اس ذلیل دھوکے باز کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم اسے مار ڈالو گے تو میرا کیا فائدہ ہوگا؟''

''اس نے ہمیں ذلیل کر کے اپنے دفتر سے نکالا تھا۔ میں کم از کم اس ذلت کا بدلہ تو لے سکوں گا۔''

''اس کا بزنس ہمارے مقابلے میں زیادہ پھیل رہا ہے۔ وہ زیادہ منافع حاصل کر رہا ہے۔ اس کے مرجانے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ وہ زندہ رہے اور ہم اس کا سب کچھ چھین کر اسے کنگال بنا دیں۔''

''اس کی کوئی بڑی کمزوری ہاتھ نہیں آرہی ہے۔ جس دن ہتھے چڑھے گا' میں اسے کنگال بنا کر تمہارے قدموں میں جھکا دوں گا۔''

''وہ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا نمک حرام بہت ہی خوش نصیب ہے۔ میرے ڈیڈ کی دولت لوٹ کر عیاشی کر رہا ہے۔ اوپر سے باپ بننے والا ہے۔ آفرین کے پاؤں بھاری ہیں۔ وہ اس کے لیے ایک وارث پیدا کرنے والی ہے۔''

وہ خوش ہو کر اسے چومتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''تم خوش ہو رہے ہو؟''

''تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے۔ اس کی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آرہی ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں...؟''

''ابھی کچھ نہ سمجھو۔ بس دیکھتی رہو۔ میں آفرین اور اس کے ہونے والے بچے کے ذریعے اسے توڑ کر رکھ دوں گا۔ آج وہ بہت کامیاب بزنس مین کہلاتا ہے۔ کل اسے فٹ پاتھ پر لے آؤں گا۔''

نعیم صدیقی نادان نہیں تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سانپ ڈسنے سے باز نہیں آتا۔ جواد کبھی نہ کبھی اپنی ذلت کا بدلہ ضرور لے گا۔ مگر کیسے لے گا' یہ نہیں جانتا تھا۔

وہ آفرین کے ساتھ ایک اچھی ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ اتوار کے دن کاروباری معاملات سے چھٹی ملتی تھی۔ وہ سارا دن اسی کے ساتھ گزارتا تھا۔ کہیں نہ کہیں آؤٹنگ کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس روز وہ چھٹی منانے پاکس بے کے ایک کاٹیج میں آئے۔ وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ ساحل پر مرد' عورتیں اور بچے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں بڑی دیر تک وہاں ٹہلتے رہے۔ پھر آفرین نے کہا۔ ''میں تھک گئی ہوں۔ کاٹیج میں چلو۔''

وہ ادھر جانے لگے۔ ایسے ہی وقت ایک شناسا سے ملاقات ہوگئی۔ وہ کاروباری معاملات میں بہت اہم گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ نعیم نے کہا۔ ''آفرین! تم اندر جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ اپنے کاروباری شناسا کے ساتھ اُس کے کاٹیج کی طرف چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آگئی۔ اس کا خیال تھا' وہ اپنے محبوب شوہر سے عارضی طور پر جدا ہو رہی ہے۔ مگر تقدیر نے دائمی جدائی لکھ دی تھی۔ وہ جیسے ہی کاٹیج میں داخل ہوئی، اچانک ہی جواد اکبر اس کے پیچھے دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی گھبرا کر بولی۔ ''تم...؟''

اس نے ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ تم چپ رہو گی تو یہ بھی چپ رہے گا اور جب بولے گا' تب بھی آواز باہر تک نہیں جائے گی۔''

وہ سہم کر بولی۔ ''تم..... یہ ریوالور کیوں دکھا رہے ہو؟ تمہارے ارادے کیا ہیں؟''

''تم نادان نہیں ہو۔ سمجھ سکتی ہو' ارادہ نیک نہیں ہے۔ اگر میرے ساتھ چپ چاپ چلو گی تو زندہ رہو گی۔ ورنہ یہیں ماری جاؤ گی۔''

''مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''کوئی سوال نہ کرو۔ یہ ریوالور میرے کوٹ کی جیب میں رہے گا اور تم نشانے پر رہو گی۔ ابھی میرے ساتھ گاڑی میں چل کر بیٹھو گی۔ جہاں لے جاؤں گا، وہاں چلو گی۔ چپ چاپ میرے احکامات کی تعمیل کرتی رہو گی تو زندہ واپس آسکو گی۔''

وہ بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے‘ میں نادان نہیں ہوں۔ تمہارے ارادے کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ یہاں سے کہیں دور لے جا کر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔“

وہ پیچھے ہٹتی ہوئی بیڈ کے پاس آ گئی پھر بولی۔ ”جو کہنا ہے‘ یہیں کہو۔ کوئی سمجھوتا کرنا چاہتے ہو تو بولو... میں وعدہ کرتی ہوں‘ میرا نعیم تمہاری کسی بات سے‘ کسی سمجھوتے سے انکار نہیں کرے گا۔“

”مجھے باتوں میں نہ الجھاؤ۔ میں جانتا ہوں‘ وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔ آخری بار پوچھ رہا ہوں‘ میرے ساتھ چلو گی یا نہیں؟“

”میں سمجھ رہی ہوں‘ تم میرے ذریعے نعیم کو بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ اس سے اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں‘ تمہارے مطالبات یہیں پورے ہوں گے۔“

وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”میں پھر ایک بار پوچھ رہا ہوں‘ میرے ساتھ چلو گی یا نہیں؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں... تم جو چاہو گے‘ وہ تمہیں یہیں ملے گا۔ پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

بات ختم ہوتے ہی جواد نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کا نشانہ لیا پھر گولی چلا دی۔ فائر کی دھیمی سی آواز کاٹیج کے باہر تک نہیں گئی۔ آفرین کے حلق سے بھی چیخ نہ نکل سکی۔ بس ایک کراہ نکلی اور وہ بیڈ پر گر پڑی۔

ایک گولی سے ایک وقت میں کسی ایک ہی کو نشانہ بنایا جاتا ہے مگر اس نے ایک ہی گولی سے ماں اور بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ وہ مر چکی ہے، وہ فوراً ہی پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کاٹیج سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نعیم صدیقی واپس آیا تو آفرین کی لاش دیکھتے ہی چند لمحوں کے لیے سکتے میں رہ گیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اسے چھو کر‘ جھنجھوڑ کر آوازیں دینے لگا۔ مگر وہ موت کی نیند سو چکی تھی۔

ایک محبوبہ‘ ایک شریکِ حیات کی موت اسے صدمہ پہنچا رہی تھی۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا... یہاں کون آیا تھا؟ کس نے اسے قتل کیا ہے؟

وہ تلملاتا ہوا کاٹیج سے باہر آیا۔ دور دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ کتنے ہی محبوب اپنی محبوباؤں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی مشکوک شخص دور بھاگتا ہوا یا کار میں جاتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی پر شبہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے موبائل فون کے ذریعے اپنے ایک شناسا پولیس افسر کو اس واردات کی اطلاع دی۔ پھر اس کا انتظار کرنے لگا۔

کاٹیج میں آفرین کا بیگ اور دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ ان چیزوں کی تلاشی لینے لگا۔ نقدی اور زیورات کے علاوہ آفرین کا قیمتی موبائل فون بھی وہاں موجود تھا۔ کوئی چور یا ڈاکو آیا ہوتا تو پہلے ان چیزوں پر ہاتھ صاف کرتا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا... جو بھی آیا تھا‘ وہ صرف قتل کی نیت سے آیا تھا۔

اس نے جواد اکبر کے متعلق سوچا‘ کیا وہ اس حد تک جا سکتا ہے؟ کیا وہ خون خرابے پر اتر آیا ہے؟

نعیم کو یہ اندازہ تو تھا کہ وہ کبھی انتقامی کارروائی کرے گا لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ جان لیوا دشمنی پر اتر آئے گا۔

اس کا دوست پولیس افسر طفیل احمد چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایمبولینس بھی لایا تھا۔ آفرین کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ایک اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ نعیم صدیقی نے پولیس افسر سے کہا۔ ”طفیل! مجھے جواد اکبر پر شبہ ہے۔ تم اسے طلب کرو۔ کسی بھی طرح اس سے حقیقت اگلواؤ۔ یقیناً یہ اسی کا کام ہے۔“

طفیل احمد نے کہا۔ ”ہُوں... کوئی قاتل اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتا۔ لیکن بیان دیتے وقت کسی بھی مجرم سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے جس کے باعث وہ پکڑا جاتا ہے۔ میں اسے گرفت میں لینے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اس کا سیل نمبر بتاؤ۔“

نعیم صدیقی نے نمبر بتایا۔ اس نے اپنے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جواد اکبر کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو... کون؟“

طفیل احمد نے پوچھا۔ ”کیا تم جواد اکبر ہو؟“

”ہاں۔ میں بول رہا ہوں... مگر تم کون ہو؟“

”میں ایس پی طفیل احمد ہوں۔ ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ فوراً میرے آفس میں چلے آؤ۔“

”سوری آفیسر...! میں فوراً ہی نہیں آسکتا۔ حیدر آباد میں ہوں۔ بائی دا وے... آپ مجھے اپنے آفس میں کیوں طلب کر رہے ہیں؟“

”مجھ سے سوال نہ کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔ کیا تم ثابت کر سکتے ہو اس وقت حیدر آباد میں ہی ہو؟“

”آف کورس ثابت کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہونا چاہیے‘ معاملہ کیا ہے؟ کیا میرا فون نمبر دینے والے نے صرف میرا نام بتایا ہے؟ یہ نہیں بتایا کہ میں ضلع کے تمام جیل خانوں کا انسپکٹر جنرل ہوں؟“

طفیل احمد نے سوالیہ نظروں سے نعیم صدیقی کو دیکھا۔ پھر فون پر کہا۔ ”جی ہاں۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا تھا۔ میں نے آپ کو زحمت دی ہے۔ معذرت چاہتا ہوں۔“



”کوئی بات نہیں۔ میں شام تک واپس آؤں گا۔ تم رات آٹھ بجے تک میری کوٹھی میں آ کر مجھ سے مل سکتے ہو۔ کسی طرح کا شک و شبہ ہو تو اسے دور کر سکتے ہو۔“

جواد اکبر نے رابطہ ختم کر دیا۔ طفیل احمد نے نعیم صدیقی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمام جیل خانوں کا انسپکٹر جنرل ہے؟ خوامخواہ اسے قاتل کیوں سمجھ رہے ہو؟ کیا تمہاری اس سے کوئی دشمنی ہے؟“

نعیم صدیقی نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جواد اکبر بھی میرا رشتے دار تھا۔ میری سابقہ بیوی ستارہ کا کزن ہے۔“

وہ دشمنی کی وجوہات اور واقعات بتانے لگا۔ طفیل احمد نے ساری روداد سننے کے بعد کہا۔ ”یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم اسے اپنی بیوی کا قاتل ثابت کر سکو گے۔ وہ قانون سے کھیلنے والا شخص اپنے بچاؤ کے ہتھکنڈے خوب جانتا ہوگا۔“

واقعی اس نے ٹھوس پلاننگ کے مطابق واردات کی تھی۔ یہ ثابت کر دیا کہ آفرین کے قتل کے وقت وہ حیدر آباد میں تھا۔ چار ماہ بعد نعیم صدیقی کاروبار کے سلسلے میں لندن آیا۔ وہاں ایک ہوٹل میں لنچ کے لیے پہنچا تو جواد اکبر اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہائے نعیم! اکیلے ہو؟ کیا آفرین کو ساتھ نہیں لائے؟“

پھر خود ہی چونک کر بولا۔ ”اوہ... میں تو بھول ہی گیا۔ اس کا مرڈر ہو چکا ہے... سوسیڈ!“

نعیم نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اظہارِ افسوس کر چکے ہو تو یہاں سے جاؤ۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے اپنے دفتر سے نکال دیا تھا۔ یہ تمہارے باپ کا ہوٹل نہیں ہے۔ ویسے میں چلا جاؤں گا۔ میں نے اس روز بھی تم سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ آج بھی نہیں کروں گا۔“

نعیم اسے گھور کر دیکھ رہا تھا اور وہ بول رہا تھا۔ ”اس روز میں نے آفس میں مطالبہ کیا تھا کہ تم نے ستارہ کے مرحوم باپ کی جو دولت و جائیداد لوٹی ہے، ان کے کاروبار کو جو نقصان پہنچایا ہے، ان سب کی تلافی کرو اور لوٹا ہوا مال واپس کر دو۔“

”جاؤ... پہلے یہ ثابت کرو کہ میں نے لوٹ مار کی ہے۔“

”مجھے کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں عدالت کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ اپنے بُرے وقت کو سمجھو... ازدواجی اور گھریلو معاملات میں بہت بڑا نقصان اٹھا چکے ہو۔ ایک بیوی کے ساتھ ہونے والے بچے کو بھی کھو چکے ہو۔“

نعیم نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا قاتل کا سراغ مل رہا ہے؟ ہائی داوے... سراغ مل جائے گا‘ تب بھی تم قاتل کے خلاف کیا کر لو گے؟ تمہیں سنجیدگی اور ذہانت سے یہ سوچنا سمجھنا چاہیے کہ کسی سے دشمنی نہ بڑھائی جائے۔“

نعیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”بڑے کام کی باتیں سمجھا رہے ہو... آگے بولو؟“

”میں تو بول چکا۔ سمجھدار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔“

”میں سمجھ دار نہیں ہوں۔ مجھے سمجھاؤ۔ تم سے دشمنی کر کے اپنی بیوی اور بچے کو داؤ پر لگا چکا ہوں۔ اگر لوٹی ہوئی دولت واپس نہ کی تو آگے میرا کیا بنے گا؟“

جواد اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ تمہاری جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ جو تم نے کاروبار پھیلا رکھا ہے، اس کی تمام آمدنی پر ستارہ کا حق ہے۔ اگر تم اب بھی اس کے حقوق ادا کرنے سے انکار کرو گے تو بہت جلد ہاتھ میں کاسہ لے کر فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤ گے۔“

”اپنی پلاننگ بتاؤ کہ سمجھوتا کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”بہت آسان سی بات ہے۔ تم نے ستارہ کو طلاق دی ہے۔ یہ بات خاندان کے چند ہی افراد جانتے ہیں۔ باقی سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم دونوں کے درمیان عارضی علیحدگی ہوئی ہے۔ تم ستارہ سے رجوع کرو گے۔ پھر اس کے ساتھ ایک شوہر کی حیثیت سے زندگی گزارو گے تو تمام دشمنی ختم ہو جائے گی۔“

نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اوہ! سمجھ گیا... ستارہ پھر سے میری بیوی کہلائے گی۔ اس کے بعد میرا مرڈر ہو گا تو نعیم صدیقی کی بیوہ میری تمام دولت اور جائیداد کی مالک بن جائے گی۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”میں کہہ چکا ہوں‘ تمہاری جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنی زندگی سے بہت محبت ہے۔ یہ ایک ہی بار ملتی ہے۔ مر جاؤں گا تو پھر لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ لہٰذا ابھی جاؤ اور مجھے سوچنے دو۔ ہو سکتا ہے، پاکستان آ کر ستارہ کو اپنی شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول کر لوں۔“

وہ مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہی کرنا چاہیے۔ اسی میں تمہارے کاروبار کی بہتری اور تمہاری سلامتی ہے۔ میں اس یقین کے ساتھ جا رہا ہوں کہ تم ایسا ہی

دانش مندانہ فیصلہ کرو گے۔“

وہ وہاں سے چلا گیا۔ نعیم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہی اس کی آفرین اور ہونے والے بچے کا قاتل ہے۔ آج اس کی باتوں سے شبہ یقین میں بدل رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ بھوک اُڑ گئی تھی۔ وہ ہوٹل سے باہر آکر فون کے ذریعے کسی سے رابطہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو! میں لندن میں ہوں۔ تین روز بعد واپس آؤں گا۔ میرے آنے سے پہلے ایک بہت بڑا کام کرنا ہے۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”سر! آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ حکم کریں؟“

”میری سابقہ شریک حیات ستارہ کو جانتے ہو؟“

”یس سر! اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اسے اغوا کرنا ہے۔ پورے ایک لاکھ دوں گا۔“

”کام ہو جائے گا سر! میڈم کو کہاں پہنچانا ہے؟“

”میں نے شہر سے باہر ایک نیا فارم ہاؤس خریدا ہے۔ اس کے بارے میں صرف تم ہی جانتے ہو کہ وہ میری ملکیت ہے۔“

”او کے سر! میں سمجھ گیا۔ میڈم کو وہیں پہنچاؤں گا۔“

”ستارہ کو کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ وہ چیختا چلاتا چاہے، فرار ہونا چاہے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ پر ٹیپ لگا دینا۔ مگر کسی قسم کی زیادتی نہ کرنا۔“

”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں سر!“

”ہاں۔ ضرور پوچھو۔“

”آپ میڈم سے دشمنی بھی کر رہے ہیں اور ان کا اتنا خیال بھی رکھنا چاہتے ہیں۔“

”وہ میرے محسن کی بیٹی ہے۔ میں تمہارا محسن ہوں۔ کیا تم کبھی مجھے یا میرے کسی عزیز کو نقصان پہنچانا چاہو گے؟“

”ہرگز نہیں سر! میں میڈم کو بڑی عزت سے رکھوں گا۔“

”یہ کام میرے آنے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔“

نعیم نے جواب سن کر مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔ وہ تین دنوں کے بعد پاکستان جانے والا تھا۔ جواد اکبر اس سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ ستارہ نے فون پر کہا تھا کہ وہ اس سے ملنے ائرپورٹ آرہی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر قرار نہیں آتا تھا۔ آندھی طوفان بھی آجاتا‘ تب بھی وہ اپنے عاشق سے ملنے ائرپورٹ ضرور آتی۔

مگر وہ نہیں آئی... جواد اکبر نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ اس دیوانی کو آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ پھر بھی وہ نہیں آئی۔ اس نے فون کے ذریعے اس سے رابطہ کرنا چاہا مگر ٹیپ سے بار بار یہی آواز سنائی دیتی رہی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

اس نے پریشان ہو کر اس کی ماں سے رابطہ کیا۔ ”پھوپی جان...! میں یہاں آگیا ہوں۔ ستارہ کہاں ہے؟ اس نے ائرپورٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔“

اس نے کہا۔ ”وہ تو یہاں سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل چکی تھی۔ کیا تم نے اسے فون کیا ہے؟“

”کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ اپنی وے... آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ وہ یہیں بھیڑ میں کہیں ہو گی۔“

وہاں مسافروں کا اور ان کے رشتے داروں کا ہجوم تھا۔ وہ اسے دور دور تک تلاش کرتا رہا۔ بار بار فون کرتا رہا۔ مایوسی کہہ رہی تھی کہ اسے آسمان کھا گیا ہے یا پھر زمین نگل چکی ہے۔

اگرچہ وہ مختلف معاملات میں مکار اور خود غرض تھا مگر ستارہ سے دلی لگاؤ رکھتا تھا۔ پھر یہ کہ صبا رانی کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ ستارہ کی گود میں پرورش پا کر اس کی دولت اور جائیداد کا حق دار بننے والا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

ایسے وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے ننھی سی اسکرین پر ستارہ کا نام پڑھا پھر فوراً ہی فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟ میں ائرپورٹ پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

فون پر سسکیاں سنائی دیں۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”ستارہ۔ میری جان! کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ کہاں ہو تم؟ مجھے بتاؤ۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں کسی بات کا جواب نہیں دے سکوں گی۔ ابھی ایک ہی بات کہتی ہوں۔ میری گمشدگی کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ پولیس کی مدد لو گے تو یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“

اس نے پوچھا۔ ”وہ کون لوگ ہیں؟ ان سے میری بات کراؤ۔ ہیلو... ہیلو...“

اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ”یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ ستارہ کو کس نے اغوا کیا ہے؟“

جواد نے اس کی ماں کے پاس آکر کہا۔ ”اپنا دل مضبوط کریں اور بری خبر سنیں۔ ہماری ستارہ کو اغوا کیا گیا ہے۔“

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”ہائے میری بچی! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے؟“

”اس نے مجھے فون کیا تھا۔ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ



ہم اس کی گمشدگی کا اعلان نہ کریں۔ اگر پولیس سے مدد لیں گے تو وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔“

”آخر وہ کون لوگ ہیں؟ ہم سے کیوں دشمنی کر رہے ہیں؟“

”کوئی ہم سے خاص طور پر دشمنی نہیں کر رہا ہے۔ یہ ایک مجرمانہ واردات لگتی ہے۔ وہ یقیناً ہمیں فون کریں گے اور ستارہ کی واپسی کے لیے بھاری رقم کا مطالبہ کریں گے۔“

وہ دوسروں پر جبر کرنے والا بڑی بے بسی سے صبر کرنے لگا۔

نعیم صدیقی کو لندن میں اطلاع مل گئی تھی کہ اس کی پلاننگ کے مطابق ستارہ کو نئے فارم ہاؤس میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس نے فون کے ذریعے جواد اکبر کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو جواد! آرام اور سکون سے ہو؟“

وہ ستارہ کے لیے پریشان تھا۔ بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ فون پر بھی اپنی معشوقہ سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے وقت نعیم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کے طنزیہ لہجے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”سیدھی سی ایک بات کہہ رہا ہوں۔ آفرین کی ہلاکت کے بعد میرا آرام اور سکون غارت ہو گیا ہے۔ اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں‘ آرام سے تو ہو نا...؟“

اس نے ایک دم سے تڑپ کر پوچھا۔ ”ستارہ کہاں ہے؟“

”آرام سے ہے۔ مگر تمہارے بغیر اسے سکون نہیں مل رہا ہے۔“

وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔“

”مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ کیا بیماری ہو گے؟“

”تم بہت پچھتاؤ گے۔ میں تمہیں تباہ و برباد کر دوں گا۔“

”پہلے اپنی بربادی سے تو نمٹ لو۔“

”دیکھو! تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ کسی بھی لمحے ایک اندھی گولی تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گی۔“

”میں اس اندھی گولی کا انتظار کروں گا۔“

وہ غصے کے مارے کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ ایک جگہ سکون سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ستارہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ایک بار کر چکے ہو۔ دوسری بار بات کرنے کی بے چینی کو برقرار رہنے دو۔“

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ”تم چاہتے کیا ہو؟ کیا مطالبہ ہے تمہارا؟“

”پہلے تم نے مطالبہ کیا تھا کہ میں ستارہ کی دی ہوئی دولت واپس کر دوں۔“

”تم ستارہ کو چھوڑ دو... میں کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔“

”اتنی جلدی ہتھیار ڈال رہے ہو۔ تم تو مجھے کنگال بنا کر فٹ پاتھ پر پہنچانے والے تھے؟“

”فضول باتیں نہ کرو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مجھ سے سمجھوتا کر لو۔“

”سمجھوتا ایک ہی صورت میں ہو گا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا چھینا ہوا مال واپس کریں گے۔“

”میں نے تم سے کچھ نہیں چھینا ہے۔“

”تمہاری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ ابھی بحال ہو جائے گی۔ یہ بتاؤ‘ میں نے تم سے کیا چھینا ہے؟“

وہ پھر دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”میری ستارہ کو... کیوں بچکانا سوال کر رہے ہو؟“

”یعنی تمہاری محبوبہ کو چھینا ہے؟ اب بتاؤ میری بیوی... میرے ہونے والے بچے کی ماں کہاں ہے؟“

یہ ایسا سوال تھا کہ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ... وہ... تمہارا معاملہ ہے۔ تم جانتے ہو گے۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ اپنی آفرین اور ہونے والے بچے کی واپسی چاہتا ہوں۔ یہ مطالبہ پورا کر دو۔ پھر تمہارا مال تمہیں واپس مل جائے گا۔“

”یہ کیسا مطالبہ ہے؟ جانتے ہو کہ مرنے والے واپس نہیں آتے۔“

”ستارہ بھی مرے گی تو واپس نہیں آسکے گی۔“

وہ ایک دم سے تڑپ کر بولا۔ ”نہیں۔ تم اسے قتل نہیں کرو گے۔ جتنی رقم چاہو گے‘ تمہیں ملے گی۔“

”مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ میں تم سے زیادہ دولت مند ہوں۔ چپ چاپ بیٹھ کر سوچو کہ وہ زندہ کیسے رہے گی... کیسے واپس آئے گی۔ کیا اس سلسلے میں مجھ پر کسی طرح کا الزام عائد کر سکو گے؟“

پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم نے آفرین کے مرڈر کے وقت ثابت کیا تھا کہ حیدر آباد میں ہو۔ اب ستارہ کو اغوا کیا گیا ہے اور میں لندن میں ہوں۔ یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جائے واردات سے سات سمندر دور ہوں۔ تمہارا حربہ تم ہی پر آزما رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جواد اکبر چیخنے لگا۔ ”ہیلو، ہیلو... فون بند نہ کرو۔ میری بات سنو... ہیلو، ہیلو۔“

پھر اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ جب فون بند ہو چکا ہے

تو وہ بات کیسے سنے گا؟ یوں کسی سمجھوتے کے بغیر رابطہ ختم کرنے کا مطلب یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ ستارہ کو واپس نہیں کرے گا۔ انتقاماً اسے مار ڈالے گا۔

اس نے فوراً ہی نعیم کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''دیکھو! فون بند نہ کرنا۔ پہلے میری بات سن لو۔ ستارہ کو قتل کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوئی ایسا راستہ نکالو کہ تمہیں بہت کچھ حاصل ہو جائے اور وہ خوامخواہ ماری نہ جائے۔''

''ہاں۔ ایسا ایک راستہ نکل سکتا ہے۔ تم پکے کاغذ پر لکھو کہ میں کبھی قتل یا کسی حادثے میں مارا جاؤں یا میری موت خودکشی ثابت ہو تو وہ ہرگز خودکشی نہیں ہوگی۔ میری غیر طبعی موت میں تمہارا ہاتھ ہوگا۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''یہ تو تم مجھے پھنسانے کی بات کر رہے ہو؟ کبھی سچ مچ کسی حادثے میں مارے جاؤ گے تو مجھے سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔''

''میں بحث نہیں کروں گا۔ تمہارے سامنے ایک ہی راستہ ہے۔ میری مرضی کے مطابق کاغذ لکھ کر رکھو، پاکستان آؤں گا تو جیتی جاگتی ستارہ کو تمہاری جھولی میں ڈال دوں گا۔''

اس نے پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس بار جواد اکبر کو ذرا اطمینان ہوا کہ سمجھوتے کی اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں۔ وہ نعیم صدیقی کا انتظار کرنے لگا۔ نعیم دوسرے ہی دن پاکستان آ گیا مگر اس نے اپنی آمد کو راز میں رکھا۔ ائرپورٹ سے سیدھا فارم ہاؤس میں آیا۔ ستارہ کو ایک کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ''تم...؟ نعیم! تم مجھے یہاں سے لے جانے آئے ہو؟''

اسے رہائی پانے کی امید تھی۔ وہ قریب آ کر بولی۔ ''ہاں۔ میں تمہارے محسن کی بیٹی ہوں۔ تم احسان فراموش نہیں ہو۔ مجھے دشمنوں سے نجات دلانے آئے ہو۔''

''ہاں۔ پہلے میں احسان فراموش نہیں تھا مگر تم نے بنا دیا۔ اپنے یار کے بچے کو پیٹ میں رکھ کر مجھے دھوکا دینا چاہتی تھیں۔ اگر آفرین بھید نہ کھولتی تو میں تم ماں بیٹی کا فرماں بردار اور احسان مند رہ کر فریب کھاتا رہتا۔''

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''پلیز! جو ہو چکا ہے، اسے بھول جاؤ۔ تم بھی میرے ڈیڈی کی دولت لوٹ کر اپنا کاروبار جما کر مجھ سے انتقام لے چکے ہو۔ میں اب بھی تمہیں اپنا مجازی خدا مانتی ہوں۔''

نعیم نے اسے دھکا دیا۔ وہ پیچھے چلی گئی۔ اس نے حقارت سے کہا۔ ''میں باسی ہانڈی کو منہ نہیں لگاتا۔''

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ''تم بزنس مین ہو۔ ہینڈ مال خرید کر اسے چکاتے ہو اس سے منافع حاصل کر ہو۔ میں بھی سیکنڈ ہینڈ ہوں۔ تم مجھ سے اور میں تم سے حاصل کر سکتی ہوں۔''

نعیم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''وہ کیسے۔''

''کوئی نہیں جانتا' تم مجھے طلاق دے چکے ہو۔ ہمارے رشتے دار یہی سمجھتے ہیں کہ ہم نے عارضی طور پر علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے۔ ہم پھر میاں بیوی بن کر ایک دوسرے کے کاروبار میں شریک رہیں گے۔ ایک دوسرے کے منافع شیئر کریں گے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آئیڈیا اچھا ہے۔''

وہ پھر فریب ہو کر گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''اگر ہے تو پھر مجھے گلے لگاؤ۔''

وہ اسے دور ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''لگاؤں گا۔ پہلے معاملات طے ہو جائیں۔ تم میری بیوی بن کر رہو گی تو ایک بڑا نقصان ہوگا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیسا نقصان...؟''

''تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ پھر اتنی ساری دولت اور جائیداد کا وارث کہاں سے آئے گا؟''

''میری خاطر ایک سمجھوتا کرو گے تو وارث بھی مل جائے گا۔''

''کیا کسی لاوارث بچے کو گود لینے کی بات کرو گی؟''

''وہ لاوارث نہیں ہوگا۔ جواد ایک بچے کا باپ بننے والا ہے۔ تم اعتراض نہیں کرو گے تو وہ اپنا بچہ مجھے دے دے گا۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''یار کے نطفے کو کلیجے سے لگا کر رکھنے کا بڑا شوق ہے۔ بائی دا وے، اس نے شادی نہیں کی ہے... پھر تمہارے لیے بچہ کہاں سے لائے گا؟''

''اس نے میری خاطر ایک لڑکی سے عارضی طور پر نکاح پڑھوایا ہے۔''

نعیم نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے جھانسا دے کر بہت سی معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو ہمارے درمیان سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ مگر...''

''مگر کیا...؟''

''ہم پھر سے میاں بیوی بن کر جس بچے کی پرورش کریں گے اس کی ماں کے متعلق مجھے معلوم ہونا چاہیے۔''

''ماں کوئی بھی ہو... اس کے بارے میں معلوم کرنا کیا ضروری ہے؟''

''اگر ہم میاں بیوی ایک دوسرے کے راز دار بن کر



نہیں رہیں گے اور تم مجھ سے باتیں چھپاؤ گی تو میں تم سے سمجھوتا نہیں کروں گا۔''

''پلیز! ایسا نہ کہو۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ ہم جواد کے ساتھ بیٹھ کر سارے معاملات طے کریں گے۔''

''وہ تو میں طے کر چکا ہوں۔ ہم اس کے بچے کو گود لیں گے۔ جب اتنی بڑی بات مان رہا ہوں تو پھر مجھ سے اس عورت کی کوئی بات کیوں چھپا رہی ہو؟ کیا پھر مجھے دشمن بنانا چاہتی ہو؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں۔ میں اپنے ڈیڈی کی دولت تقسیم نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری بیوی بن کر رہوں گی۔''

''تو پھر بتاؤ' ہم کس عورت کے بچے کو گود لیں گے؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے نعیم کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''وہ... دراصل ایسی عورت ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ جواد کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ وہ قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔''

نعیم نے اسے پھسلانے کے لیے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ پیار مانگ رہی تھی۔ اس نے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں ہی جواد کے راز دار بن کر رہیں گے۔ اس طرح میری اور جواد کی دشمنی بھی ختم ہو جائے گی۔ ہم تینوں یک جان تین قالب بن کر رہیں گے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مگر ایک بار مجھے فون پر اس سے بات کرنے دو۔''

''یعنی تم مجھے نہیں، اسے اہمیت دے رہی ہو؟ جبکہ ہم تینوں کی برابر اہمیت ہونی چاہیے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات سمجھا رہا ہوں کہ پہلے میرا اعتماد حاصل کرو۔ پھر ہم جواد کو اپنے اعتماد میں لیں گے۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں ہے تو میں جا رہا ہوں۔''

وہ جانے کے لیے پلٹ رہا تھا۔ وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ''رک جاؤ۔ تم درست کہہ رہے ہو۔ پہلے تمہارا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ آؤ... یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔''

وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ ''تم میرے ڈیڈی کو اپنا محسن مانتے ہو۔ مجھے یقین ہے' دھوکا نہیں دو گے۔ ہم تینوں سمجھوتا کر کے پیار محبت سے رہیں گے۔''

''پلیز! مجھ پر بھروسا کرو اور اصل بات بتاؤ۔''

وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ پھر بولی۔ ''وہ سینٹرل جیل کی ایک قیدی عورت ہے۔ اس کا نام صبا رانی ہے۔''

نعیم نے کہا۔ ''ہوں... جواد اس ضلع کی تمام جیلوں کا انسپکٹر جنرل ہے۔ بڑی آسانی سے کسی قیدی عورت کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

''اس نے صبا رانی کو مجبور نہیں کیا ہے۔ وہ راضی خوشی اس کے نکاح میں آئی ہے۔''

''یہ نکاح یقیناً راز داری سے ہوا ہوگا؟''

''ظاہر ہے۔ جواد ایک اعلیٰ عہدے دار ہے۔ کسی سزا پانے والی عورت سے نہ کھل کر شادی کر سکتا ہے' نہ اس کا مستقل شوہر بن کر رہ سکتا ہے۔ بچہ ہونے کے بعد وہ اس عورت کو چھوڑ دے گا۔''

''کیا وہ صبا رانی اس بات پر راضی ہے؟''

''راضی کیسے نہیں ہوگی؟ اسے امید ہے' بڑے صاحب کا حکم مانتی رہے گی تو ایک دن رہائی مل جائے گی۔''

وہ ذرا سوچنے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ مگر ایک عورت اپنے خاوند کو چھوڑ سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک ماں اپنے بچے سے الگ نہیں ہوتی۔ وہ تو اس کی جان ہوتا ہے۔ اس کی ممتا...''

''ممتا کو مارو گولی... وہ بچہ کسی بھی طرح مل جائے گا۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ اس کے بعد درخت کٹ کر گر جائے، ہماری بلا سے...''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یو آر رائٹ... ہمیں تو ایک بچہ چاہیے۔ صبا رانی جائے جہنم میں مگر...''

ستارہ نے پوچھا۔ ''مگر کیا؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ لفظ 'مگر' بھی کیا ہے... بات بنتے بنتے اچانک 'مگر' آ جائے تو بنتی ہوئی بگڑ جاتی ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں نہیں جانتا کہ صبا رانی جیل کے جہنم میں رہے گی یا نہیں مگر... جواد جہنم میں پہنچ جائے گا۔''

وہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ ذرا دور ہو کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میری بات توجہ سے سنو۔ تم نے جواد کے بچے کو جنم دینے کے لیے مجھ سے شادی کی۔ مجھے دھوکا دیا۔ میں نے بھی انتقاماً کاروباری معاملات میں تمہیں دھوکا دیا۔''

''کیوں اس بات کو دہرا رہے ہو؟ حساب برابر ہو چکا ہے۔''

''جواد سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔ اس نے میری آفرین کو ہونے والے بچے سمیت قتل کیا ہے۔ اس کا انتقام تو مجھے لینا ہی ہوگا۔''

وہ فوراً ہی قریب آ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''پلیز نعیم! ایسا نہ کہو۔ ابھی ہم پیار و محبت سے مل جل کر رہنے

کی باتیں کررہے ہیں۔ جواد نے دشمن بن کر ایک غلطی کی۔ تم دوست بن کر معاف کردو۔ یہ انتقامی رویہ ہم سب کو تباہ کردے گا۔ تم بھی تباہی سے بچ نہیں پاؤ گے۔''

''تم میری نہیں' اپنے یار کی فکر کرو۔ خون کا بدلہ خون۔ آفرین کے بدلے تمہیں مرنا ہوگا یا پھر وہ مرے گا۔''

وہ جیسے جنون میں مبتلا ہوگئی۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ''میں مروں گی۔ مجھے مار ڈالو۔ میں اپنے جواد کو مرنے نہیں دوں گی۔ تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ انتقام کی آگ بجھاؤ۔ مجھے مار ڈالو...''

وہ اسے دھکا دے کر الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''واہ... کیا دیوانگی ہے اس کے لیے... اسے بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کررہی ہو۔ مگر افسوس! میں اپنے محسن کی بیٹی کو جانی یا جسمانی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''تو پھر اس کی جان کی قیمت بتاؤ۔ تم جو مانگو گے، وہ دوں گی۔''

''تم مجھ سے زیادہ دولت مند نہیں ہو۔ مجھے کیا دے سکو گی؟''

''میرے پاس جتنی بھی دولت ہے' وہ سب تمہارے نام کردوں گی۔''

''میں مال وزر نہیں چاہتا۔ اپنی سلامتی چاہتا ہوں۔ اگر جواد پکے کاغذ پر لکھ دے کہ کبھی میں قتل کیا جاؤں یا حادثے میں مارا جاؤں یا خودکشی کروں تو اس میں اس کا ہاتھ ہوگا۔''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اسے راضی کرلوں گی۔ وہ یہ کاغذ لکھ دے گا۔''

نعیم نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کبھی یہ نہیں کہو گی کہ تم نے مجھے صبارانی کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں اس سلسلے میں تمہارا رازدار بن گیا ہوں۔''

وہ نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے جواد کی سلامتی اہم ہے۔ تم جو کہہ رہے ہو، وہی کروں گی۔''

رابطہ ہوتے ہی اس نے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو... جواد! میں بول رہی ہوں۔''

اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔ ''میری جان! تم خیریت سے ہو نا...؟''

''میری فکر نہ کرو۔ ہم نعیم کی شرط مان لیں گے تو مجھے ابھی رہائی مل جائے گی۔''

وہ اس کی شرط بیان کرنے لگی۔ جواد نے کہا۔ ''اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔ میں نے پکے کاغذ پر لکھ دیا ہے کہ وہ غیر طبعی موت مرے گا تو میں اس کا قاتل کہلاؤں گا۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''واقعی تم مجھے دل وجان سے چاہتے ہو۔ مجھے رہائی دلانے کے لیے تم نے اتنی بڑی بات لکھ دی ہے۔ خدانخواستہ نعیم کسی حادثے میں مارا جائے گا تو قانون کا پھندا تمہارے ہی گلے میں پڑے گا۔''

''میری پروا نہ کرو۔ میں یہ کاغذ لکھنے کے بعد بھی اسے بچاؤ کی تدبیر کرلوں گا۔ تم اس سے رہائی کی بات کرو۔''

ستارہ نے نعیم سے کہا۔ ''میرے جواد نے تمہاری مرضی کے مطابق سب کچھ لکھ دیا۔ اب تو مجھے یہاں سے جانے دو۔''

وہ بولا۔ ''اس سے کہو' ایک گھنٹے بعد وہ کاغذ لے کر میری کوٹھی میں آجائے۔ میں اسے پڑھنے کے بعد تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔''

اس نے فون پر جواد سے یہ بات کہی۔ نعیم نے اس سے فون چھین کر اسے بند کردیا۔ پھر وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ ''انتظار کرو۔ اس نے میری مرضی کے مطابق لکھا ہوگا تو ایک گھنٹے کے اندر یہاں سے رہائی مل جائے گی۔''

وہ دروازے پر رک گیا۔ وہاں سے پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''صبارانی... جواد کی یہ کمزوری میرے ہاتھوں میں رہے گی۔ اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ یہ بات اسے معلوم نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہوگی اور وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے گا تو... تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا اور میری ہلاکت کے جرم میں جواد قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔ میں وہ کاغذ لینے جارہا ہوں۔''

اس نے باہر جاکر دروازے کو لاک کردیا۔ ستارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جواد وہ کاغذ لکھ کر بری طرح پھنسنے والا تھا۔ اب وہ اس سے رابطہ نہیں کرسکتی تھی۔ اسے ایسا بیان لکھنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ آئندہ جواد کی سلامتی اسی میں تھی کہ ستارہ اسے صبارانی کے سلسلے میں کچھ نہ بتائے۔ اپنے رازدار عاشق سے اس بات کو چھپانا لازمی ہوگیا تھا۔

دو گھنٹے بعد دو افراد دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ایک نے کہا۔ ''تمہیں رہائی مل رہی ہے... مگر ہم تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کرلے جائیں گے۔''

ستارہ نے اعتراض نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اسے اٹھا کر ایک گاڑی کی سیٹ پر ڈالا گیا۔ وہ بند آنکھوں کی تاریکی میں چپ چاپ پڑی رہی۔ گاڑی دیر تک چلتی رہی پھر ایک جگہ رک گئی۔

اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو شہر کے ایک پسماندہ علاقے میں دیکھا۔ ایک شخص نے اس کا موبائل

کی باتیں کررہے ہیں۔ جواد نے دشمن بن کر ایک غلطی کی۔ تم دوست بن کر معاف کردو۔ یہ انتقامی رویہ ہم سب کو تباہ کردے گا۔ تم بھی تباہی سے بچ نہیں پاؤ گے۔''

''تم میری نہیں' اپنے یار کی فکر کرو۔ خون کا بدلہ خون۔ آفرین کے بدلے تمہیں مرنا ہوگا یا پھر وہ مرے گا۔''

وہ جیسے جنون میں مبتلا ہوگئی۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ''میں مروں گی۔ مجھے مار ڈالو۔ میں اپنے جواد کو مرنے نہیں دوں گی۔ تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ انتقام کی آگ بجھاؤ۔ مجھے مار ڈالو...''

وہ اسے دھکا دے کر الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''واہ... کیا دیوانگی ہے اس کے لیے... اسے بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کررہی ہو۔ مگر افسوس! میں اپنے محسن کی بیٹی کو جانی یا جسمانی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''تو پھر اس کی جان کی قیمت بتاؤ۔ تم جو مانگو گے، وہ دوں گی۔''

''تم مجھ سے زیادہ دولت مند نہیں ہو۔ مجھے کیا دے سکو گی؟''

''میرے پاس جتنی بھی دولت ہے' وہ سب تمہارے نام کردوں گی۔''

''میں مال وزر نہیں چاہتا۔ اپنی سلامتی چاہتا ہوں۔ اگر جواد پکے کاغذ پر لکھ دے کہ کبھی میں قتل کیا جاؤں یا حادثے میں مارا جاؤں یا خودکشی کروں تو اس میں اس کا ہاتھ ہوگا۔''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اسے راضی کرلوں گی۔ وہ یہ کاغذ لکھ دے گا۔''

نعیم نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کبھی یہ نہیں کہو گی کہ تم نے مجھے صبارانی کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں اس سلسلے میں تمہارا رازدار بن گیا ہوں۔''

وہ نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے جواد کی سلامتی اہم ہے۔ تم جو کہہ رہے ہو، وہی کروں گی۔''

رابطہ ہوتے ہی اس نے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو... جواد! میں بول رہی ہوں۔''

اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔ ''میری جان! تم خیریت سے ہو نا...؟''

''میری فکر نہ کرو۔ ہم نعیم کی شرط مان لیں گے تو مجھے ابھی رہائی مل جائے گی۔''

وہ اس کی شرط بیان کرنے لگی۔ جواد نے کہا۔ ''اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔ میں نے پکے کاغذ پر لکھ دیا ہے کہ وہ غیر طبعی موت مرے گا تو میں اس کا قاتل کہلاؤں گا۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''واقعی تم مجھے دل وجان سے چاہتے ہو۔ مجھے رہائی دلانے کے لیے تم نے اتنی بڑی بات لکھ دی ہے۔ خدانخواستہ نعیم کسی حادثے میں مارا جائے گا تو قانون پھندا تمہارے ہی گلے میں پڑے گا۔''

''میری پروانہ کرو۔ میں یہ کاغذ لکھنے کے بعد بھی اسے بچاؤ کی تدبیر کرلوں گا۔ تم اس سے رہائی کی بات کرو۔''

ستارہ نے نعیم سے کہا۔ ''میرے جواد نے تمہاری مرضی کے مطابق سب کچھ لکھ دیا۔ اب تو مجھے یہاں سے جانے دو۔''

وہ بولا۔ ''اس سے کہو' ایک گھنٹے بعد وہ کاغذ لے کر میری کوٹھی میں آجائے۔ میں اسے پڑھنے کے بعد تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔''

اس نے فون پر جواد سے یہ بات کہی۔ نعیم نے اس سے فون چھین کر اسے بند کردیا۔ پھر وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ ''انتظار کرو۔ اس نے میری مرضی کے مطابق لکھا ہوگا تو وہ گھنٹے کے اندر یہاں سے رہائی مل جائے گی۔''

وہ دروازے پر رک گیا۔ وہاں سے پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''صبارانی... جواد کی یہ کمزوری میرے ہاتھوں میں رہے گی۔ اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ یہ بات اسے معلوم نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہوگی اور وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے گا تو... تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا اور میری ہلاکت کے جرم میں جواد قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔ میں وہ کاغذ لینے جارہا ہوں۔''

اس نے باہر جاکر دروازے کو لاک کردیا۔ ستارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جواد وہ کاغذ لکھ کر بری طرح پھنسنے والا تھا۔ اب وہ اس سے رابطہ نہیں کرسکتی تھی۔ اسے ایسا بیان لکھنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ آئندہ جواد کی سلامتی اسی میں تھی کہ ستارہ اسے صبارانی کے سلسلے میں کچھ نہ بتائے۔ اپنے رازدار عاشق سے اس بات کو چھپانا لازمی ہوگیا تھا۔

دو گھنٹے بعد دو افراد دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ایک نے کہا۔ ''تمہیں رہائی مل رہی ہے... مگر ہم تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائیں گے۔''

ستارہ نے اعتراض نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اسے اٹھا کر ایک گاڑی کی سیٹ پر ڈالا گیا۔ وہ بند آنکھوں کی تاریکی میں چپ چاپ پڑی رہی۔ گاڑی دیر تک چلتی رہی پھر ایک جگہ رک گئی۔

اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو شہر کے ایک پسماندہ علاقے میں دیکھا۔ ایک شخص نے اس کا موبائل

فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی سے اترو۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

وہ اتر گئی۔ اسے وہاں پہنچانے والے چلے گئے۔ اس نے فون کے ذریعے جواد سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

اس نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سرجانی ٹاؤن کے ڈی اے فلیٹ کے سامنے کھڑی ہوں۔ فوراً آؤ۔“

”بس ابھی آیا۔ پریشان نہ ہونا۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“

معشوقہ کو رہائی ملی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح چلا آیا۔ ستارہ اسے دیکھتے ہی رونے لگی۔ کار کے اندر آکر اس سے لپٹ گئی۔ کار کے شیشے کلرڈ تھے۔ کوئی انہیں باہر سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چومتے رہے اور نعیم کو گالیاں دیتے رہے۔ یہی دستور ہے۔ ہارنے کے بعد جیتنے والے کو گالیاں دی جاتی ہیں۔

ستارہ نے کہا۔ ”تم نے میری خاطر جو تحریری بیان دیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعیم سے تمہاری دشمنی ہے اور وہ دشمنی کے نتیجے میں مارا جاسکتا ہے۔“

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بے شک! اس نے مجھے پھنسایا ہے۔ لیکن فکر نہ کرو، میں جلد ہی اس پھندے سے نکل جاؤں گا۔“

ستارہ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اس نے نعیم کو صبارانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مگر وہ الجھی ہوئی تھی۔ نعیم نے سختی سے منع کیا تھا۔ اگر جواد کو معلوم ہو جاتا کہ اس کی ایک اور کمزوری دشمن کے ہاتھ آگئی ہے تو وہ ادھر سے بھی اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتا... اور جب نعیم کو یہ بات معلوم ہوتی تو وہ جواد کے تحریری بیان کو اس کے خلاف ہتھیار بنا لیتا۔

ستارہ کی عقل نے یہی سمجھایا کہ جواد پہلے اس تحریری بیان کے پھندے سے نکل آئے پھر وہ صبارانی کی بات اسے بتائے گی۔ وہ بولی۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ تمہیں ایسا کاغذ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ وہ دشمن کسی وقت بھی انتقامی کارروائی کرسکتا ہے۔“

”میری جان! میں نے کہا نا... فکر نہ کرو۔ میرے پاس بچاؤ کی تدبیر ہے۔“

”تم کیا کرسکو گے؟“

اس نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد پوچھا۔ ”نعیم کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟“

”جیسا غلاموں کا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔ میرے ڈیڈی کا احسان مند ہے۔ بڑی شرافت سے پیش آرہا تھا۔“

”جب وہ احسان مند ہے تو دشمنی بھلا کر دوستی کرسکتا ہے۔“

”میں نے اس سے یہی کہا تھا اور وہ ہم سے دوستی کے لیے راضی ہوگیا تھا۔ تم نے جو کاغذ لکھا ہے، اس کے بعد تو اسے دوست بن کر ہی رہنا چاہیے۔“

”تم اس سے دوستی کرو۔ اس کے لیے میٹھا زہر بن جاؤ۔ اگر آج رات اس کے ساتھ ڈنر کی فرمائش کرو گی تو کیا وہ راضی ہو جائے گا؟“

”تم چاہتے کیا ہو؟“

”پہلے میرے سوال کا جواب دو؟“

”راضی ہوسکتا ہے۔ صرف میں ہی نہیں ممی بھی اسے مدعو کریں گی۔ وہ ضرور آئے گا۔“

”میں چاہتا ہوں، وہ آج رات چند گھنٹوں تک اپنی کوٹھی میں نہ رہے۔ میں اپنا لکھا ہوا کاغذ وہاں سے چرالاؤں گا۔“

”پھر تو میں جی جان سے اسے گھر بلاؤں گی... بلکہ ممی کے ساتھ خود اس کے گھر جاؤں گی۔“

”اس کے پاس جاؤ گی تو وہ اپنے ہی گھر میں تمہارے ساتھ ڈنر کرے گا۔ اس سے دور رہ کر اسے اپنے پاس بلاؤ۔“

”آل رائٹ... میں یہی کروں گی۔“

دوسری طرف نعیم اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ ’جب تک میں صبارانی کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل نہ کرلوں اور اس قیدی عورت کو اپنے لیے مہرہ نہ بنالوں، تب تک جواد کو اس بات سے بے خبر رہنا چاہیے۔ مگر ستارہ ضرور اپنے عاشق کو بتادے گی کہ مجھے ان کا یہ راز معلوم ہوچکا ہے۔‘

اس سے پہلے کہ جواد اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرتا، نعیم اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا لینا چاہتا تھا۔ وہ اسی روز ایک بہت بڑی فلاحی تنظیم کے سربراہ ایڈووکیٹ امجد غوری کے پاس پہنچ گیا۔ ایڈووکیٹ سے دیرینہ شناسائی تھی۔ اس نے کہا۔ ”سینٹرل جیل میں ایک قیدی عورت سے ناانصافی ہورہی ہے۔ میں اسے انصاف دلانا چاہتا ہوں۔“

امجد غوری نے کہا۔ ”مجھے اس عورت کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ تم یقیناً اس کا مقدمہ لڑنے کے بھاری اخراجات برداشت کرسکو گے۔“

”اخراجات کی پروا نہ کرو۔ مقدمہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر کے خلاف لڑنا ہے۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”اچھا؟ کون ہے وہ سرکاری افسر؟“



”تم اسے جانتے ہو۔ اس کا نام جواد اکبر ہے۔“

”اوہ... وہ تو بہت بڑا مہرہ ہے۔ یعنی شطرنج کی بساط پر ایک شاہ کو مات دینی ہوگی۔ میں نے اور میری تنظیم کے کارکنوں نے سنا ہے، وہ کم بخت قیدی عورتوں سے منہ کالا کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔“

”مگر ایک ناجائز بچہ پیدا کرنے کے لیے صبارانی نام کی ایک قیدی عورت سے نکاح پڑھوایا ہے۔“

”کیا واقعی؟ کیا وہ نکاح نامہ ہمیں مل سکے گا؟“

نعیم نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”وہ بہت چالاک ہے۔ ہم نکاح نامہ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ لیکن صبارانی کو اپنے اعتماد میں لے کر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش کرسکیں گے۔“

”اگر وہ ماں بننے والی ہے تو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کتنے عرصے سے جیل میں ہے؟ وہاں آنے سے پہلے حاملہ تھی یا بعد میں ہوئی ہے؟ اسے عدالت سے سزا مل چکی ہے یا ابھی مقدمہ چل رہا ہے؟ میں یہ سب کچھ سپرنٹنڈنٹ جیل سے مل کر رجسٹر دیکھ کر معلوم کرسکوں گا۔“

”جیل کا عملہ جواد کا فرماں بردار اور اطاعت گزار ہوگا۔ تم سے اہم باتیں چھپائی جائیں گی۔ ایسی کارروائی کرو کہ جواد اکبر کو بچ نکلنے کا موقع نہ ملے۔“

”ہوں... جیل کا ڈاکٹر لالچی ہے۔ اگر ہم اسے قابو کریں گے تو بڑی رازداری سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”وہ اپنی بولی لگائے گا۔ جتنی بھی لگائے، اسے راضی کرو۔ میں نقد رقم ادا کروں گا۔ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ پلیز! ابھی اس ڈاکٹر سے رابطہ کرو۔“

ایڈووکیٹ امجد غوری نے اپنے ایک ماتحت کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ شام کو پانچ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جیل سے گھر آتا ہے۔ آج کل کچھ پریشان رہتا ہے۔ ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

نعیم ایک بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ کر امجد غوری کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ حیرانی سے بولا۔ ”ایڈووکیٹ صاحب! آپ میرے غریب خانے میں تشریف لائے ہیں۔ مجھے بلالیا ہوتا۔“

امجد نے کہا۔ ”پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے اسی لیے آیا ہوں۔ شاید تم بھی پیاسے اور پریشان ہو۔ معلوم ہوا ہے، جیل کی ملازمت چھوڑنے والے ہو؟ کیا کوئی خاص وجہ ہے؟“

وہ ایک کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”بس کیا بتاؤں؟ اس ملازمت میں پیسا ہے مگر عزت نہیں ہے جبکہ زندگی کے ہر شعبے میں ڈاکٹر کی عزت کی جاتی ہے۔ دراصل جیل ایسی جگہ ہے جہاں بددماغ مجرموں سے نمٹنے والے جیل اور اعلیٰ عہدے دار بھی بددماغ اور بدمزاج ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسے ماتحت ڈاکٹرز کے ساتھ بھی گالیوں سے بات کرنے لگتے ہیں۔“

”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہم یہاں ایک قیدی عورت کے متعلق معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔ اگر تم ت... انفارمیشن دو گے تو یہ نعیم صاحب ابھی تمہیں پچاس ہزار روپے پیش کریں گے۔“

ڈاکٹر کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ نعیم نے بریف کیس کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”کیش موجود ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

نعیم نے پوچھا۔ ”کیا وہاں صبارانی نام کی کوئی عورت ہے؟“

”ہاں ہے... ماں بننے والی ہے۔ آج رات یا کل ک... وقت ڈیلیوری متوقع ہے۔“

”وہ کتنے عرصے سے وہاں ہے؟“

”گیارہ ماہ پہلے آئی تھی۔ اس وقت چودہ برس کی بہت ہی خوبصورت سی بچی تھی۔ اس کتے جواد اکبر نے اسے ... عورت بنادیا ہے۔“

”تم ایک بڑے عہدے دار کو کتا کہہ رہے ہو۔“

”وہ بھی ہمیں کتا سمجھتا ہے۔ اس کے دماغ میں ہمیشہ چولہا جلتا رہتا ہے۔ کل اس نے مجھے ماں بہن کی گالیاں د... ہیں۔ اسی لیے ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔“

نعیم نے میز پر رکھے ہوئے بریف کیس کو اس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”تم ملازمت نہیں چھوڑو گے۔ اس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔ میں پچاس ہزار دینے آیا تھا لیکن اب یہ ساری رقم تمہاری ہے۔ تم جیل میں رہو گے۔ صبارانی کی زچگی خیر خیریت سے ہونی چاہیے۔ میں اس بچے کو جواد کے خلاف جیتا جاگتا ثبوت بنانا چاہتا ہوں۔“

وہ بریف کیس کھول کر ایک ایک گڈی اٹھا کر دیکھ ... تھا۔ خوش ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میں ماں اور بچے کا پو... خیال رکھوں گا۔ مگر جواد سے آپ دونوں کو نمٹنا ہوگا۔“

امجد غوری نے کہا۔ ”جواد نے رازداری سے نکا... پڑھوایا ہے۔ وہ نکاح نامہ ہمارے ہاتھ نہیں لگے گا۔ ... صبارانی سے ہمدردی کرتے رہو۔ اسے سمجھاؤ کہ جواد ک... اسے رہائی نہیں دلائے گا۔“

نعیم نے کہا۔ ”اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ وہ بچے کو اس ... چھین کر لے جائے گا۔ اگر ایک ماں کو یہ یقین ہو جائے ک... اس کی گود اجڑنے نہیں دو گے، اس کا مقدمہ لڑو گے اور ا...

فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی سے اترو۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

وہ اتر گئی۔ اسے وہاں پہنچانے والے چلے گئے۔ اس نے فون کے ذریعے جواد سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

اس نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سرجانی ٹاؤن کے ڈی اے فلیٹ کے سامنے کھڑی ہوں۔ فوراً آؤ۔“

”بس ابھی آیا۔ پریشان نہ ہونا۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“

معشوقہ کو رہائی ملی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح چلا آیا۔ ستارہ اسے دیکھتے ہی رونے لگی۔ کار کے اندر آ کر اس سے لپٹ گئی۔ کار کے شیشے کلرڈ تھے۔ کوئی انہیں باہر سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چومتے رہے اور نعیم کو گالیاں دیتے رہے۔ یہی دستور ہے۔ ہارنے کے بعد جیتنے والے کو گالیاں دی جاتی ہیں۔

ستارہ نے کہا۔ ”تم نے میری خاطر جو تحریری بیان دیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعیم سے تمہاری دشمنی ہے اور وہ دشمنی کے نتیجے میں مارا جا سکتا ہے۔“

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بے شک! اس نے مجھے پھنسایا ہے۔ لیکن فکر نہ کرو، میں جلد ہی اس پھندے سے نکل جاؤں گا۔“

ستارہ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اس نے نعیم کو صبارانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مگر وہ الجھی ہوئی تھی۔ نعیم نے سختی سے منع کیا تھا۔ اگر جواد کو معلوم ہو جاتا کہ اس کی ایک اور کمزوری دشمن کے ہاتھ آ گئی ہے تو وہ ادھر سے بھی اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتا... اور جب نعیم کو یہ بات معلوم ہوتی تو وہ جواد کے تحریری بیان کو اس کے خلاف ہتھیار بنا لیتا۔

ستارہ کی عقل نے یہی سمجھایا کہ جواد پہلے اس تحریری بیان کے پھندے سے نکل آئے پھر وہ صبارانی کی بات اسے بتائے گی۔ وہ بولی۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ تمہیں ایسا کاغذ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ وہ دشمن کسی وقت بھی انتقامی کارروائی کر سکتا ہے۔“

”میری جان! میں نے کہا نا... فکر نہ کرو۔ میرے پاس بچاؤ کی تدبیر ہے۔“

”تم کیا کر سکو گے؟“

اس نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد پوچھا۔ ”نعیم کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟“

”جیسا غلاموں کا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔ میرے ڈیڈی کا احسان مند ہے۔ بڑی شرافت سے پیش آ رہا تھا۔“

”جب وہ احسان مند ہے تو دشمنی بھلا کر دوستی کر سکتا ہے۔“

”میں نے اس سے یہی کہا تھا اور وہ ہم سے دوستی کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ تم نے جو کاغذ لکھا ہے، اس کے بعد تو اسے دوست بن کر ہی رہنا چاہیے۔“

”تم اس سے دوستی کرو۔ اس کے لیے میٹھا زہر بن جاؤ۔ اگر آج رات اس کے ساتھ ڈنر کی فرمائش کرو گی تو کیا وہ راضی ہو جائے گا؟“

”تم چاہتے کیا ہو؟“

”پہلے میرے سوال کا جواب دو؟“

”راضی ہو سکتا ہے۔ صرف میں ہی نہیں ممی بھی اسے مدعو کریں گی۔ وہ ضرور آئے گا۔“

”میں چاہتا ہوں، وہ آج رات چند گھنٹوں تک اپنی کوٹھی میں نہ رہے۔ میں اپنا لکھا ہوا کاغذ وہاں سے چرا لاؤں گا۔“

”پھر تو میں جی جان سے اسے گھر بلاؤں گی... بلکہ ممی کے ساتھ خود اس کے گھر جاؤں گی۔“

”اس کے پاس جاؤ گی تو وہ اپنے ہی گھر میں تمہارے ساتھ ڈنر کرے گا۔ اس سے دور رہ کر اسے اپنے پاس بلاؤ۔“

”آل رائٹ... میں یہی کروں گی۔“

دوسری طرف نعیم اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ ”جب تک میں صبارانی کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل نہ کر لوں اور اس قیدی عورت کو اپنے لیے مہرہ نہ بنا لوں، تب تک جواد کو اس بات سے بے خبر رہنا چاہیے۔ مگر ستارہ ضرور اپنے عاشق کو بتا دے گی کہ مجھے ان کا یہ راز معلوم ہو چکا ہے۔“

اس سے پہلے کہ جواد اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرتا، نعیم اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا لینا چاہتا تھا۔ وہ اسی روز ایک بہت بڑی فلاحی تنظیم کے سربراہ ایڈووکیٹ امجد غوری کے پاس پہنچ گیا۔ ایڈووکیٹ سے دیرینہ شناسائی تھی۔ اس نے کہا۔ ”سینٹرل جیل میں ایک قیدی عورت سے ناانصافی ہو رہی ہے۔ میں اسے انصاف دلانا چاہتا ہوں۔“

امجد غوری نے کہا۔ ”مجھے اس عورت کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ تم یقیناً اس کا مقدمہ لڑنے کے بھاری اخراجات برداشت کر سکو گے۔“

”اخراجات کی پروا نہ کرو۔ مقدمہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر کے خلاف لڑنا ہے۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”اچھا؟ کون ہے وہ سرکاری افسر؟“



”تم اسے جانتے ہو۔ اس کا نام جواد اکبر ہے۔“

”اوہ... وہ تو بہت بڑا مہرہ ہے۔ یعنی شطرنج کی بساط پر ایک شاہ کو مات دینی ہوگی۔ میں نے اور میری تنظیم کے کارکنوں نے سنا ہے، وہ کم بخت قیدی عورتوں سے منہ کالا کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔“

”مگر ایک ناجائز بچہ پیدا کرنے کے لیے صبارانی نام کی ایک قیدی عورت سے نکاح پڑھوایا ہے۔“

”کیا واقعی؟ کیا وہ نکاح نامہ ہمیں مل سکے گا؟“

نعیم نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”وہ بہت چالاک ہے۔ ہم نکاح نامہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ لیکن صبارانی کو اپنے اعتماد میں لے کر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش کر سکیں گے۔“

”اگر وہ ماں بننے والی ہے تو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کتنے عرصے سے جیل میں ہے؟ وہاں آنے سے پہلے حاملہ تھی یا بعد میں ہوئی ہے؟ اسے عدالت سے سزا مل چکی ہے یا ابھی مقدمہ چل رہا ہے؟ میں یہ سب کچھ سپرنٹنڈنٹ جیل سے مل کر رجسٹر دیکھ کر معلوم کر سکوں گا۔“

”جیل کا عملہ جواد کا فرماں بردار اور اطاعت گزار ہوگا۔ تم سے اہم باتیں چھپائی جائیں گی۔ ایسی کارروائی کرو کہ جواد اکبر کو بچ نکلنے کا موقع نہ ملے۔“

”ہوں... جیل کا ڈاکٹر لالچی ہے۔ اگر ہم اسے قابو کریں گے تو بڑی رازداری سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”وہ اپنی بولی لگائے گا۔ جتنی بھی لگائے، اسے راضی کرو۔ میں نقد رقم ادا کروں گا۔ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ پلیز! ابھی اس ڈاکٹر سے رابطہ کرو۔“

ایڈووکیٹ امجد غوری نے اپنے ایک ماتحت کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ شام کو پانچ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جیل سے گھر آتا ہے۔ آج کل کچھ پریشان رہتا ہے۔ ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

نعیم ایک بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ کر امجد غوری کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ حیرانی سے بولا۔ ”ایڈووکیٹ صاحب! آپ میرے غریب خانے میں تشریف لائے ہیں۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔“

امجد نے کہا۔ ”پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے اسی لیے آیا ہوں۔ شاید تم بھی پیاسے اور پریشان ہو۔ معلوم ہوا ہے، جیل کی ملازمت چھوڑنے والے ہو؟ کیا کوئی خاص وجہ ہے؟“

وہ ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”بس کیا بتاؤں؟ اس ملازمت میں پیسا ہے مگر عزت نہیں ہے جبکہ زندگی کے ہر شعبے میں ڈاکٹر کی عزت کی جاتی ہے۔ دراصل جیل ایسی جگہ ہے جہاں بد دماغ مجرموں سے نمٹنے والے جیلر اور اعلیٰ عہدے دار بھی بد دماغ اور بدمزاج ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسے ماتحت ڈاکٹرز کے ساتھ بھی گالیوں سے بات کرنے لگتے ہیں۔“

”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہم یہاں ایک قیدی عورت کے متعلق معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔ اگر تم صحیح انفارمیشن دو گے تو یہ نعیم صاحب ابھی تمہیں پچاس ہزار روپے پیش کریں گے۔“

ڈاکٹر کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ نعیم نے بریف کیس کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”کیش موجود ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

نعیم نے پوچھا۔ ”کیا وہاں صبارانی نام کی کوئی عورت ہے؟“

”ہاں ہے... ماں بننے والی ہے۔ آج رات یا کل کسی وقت ڈیلیوری متوقع ہے۔“

”وہ کتنے عرصے سے وہاں ہے؟“

”گیارہ ماہ پہلے آئی تھی۔ اس وقت چودہ برس کی بہت ہی خوبصورت سی بچی تھی۔ اس کتے جواد اکبر نے اسے پکی عورت بنا دیا ہے۔“

”تم ایک بڑے عہدے دار کو کتا کہہ رہے ہو۔“

”وہ کبھی ہمیں کتا سمجھتا ہے۔ اس کے دماغ میں ہمیشہ چولہا جلتا رہتا ہے۔ کل اس نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دی ہیں۔ اسی لیے ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔“

نعیم نے میز پر رکھے ہوئے بریف کیس کو اس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”تم ملازمت نہیں چھوڑو گے۔ اس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔ میں پچاس ہزار دینے آیا تھا لیکن اب یہ ساری رقم تمہاری ہے۔ تم جیل میں رہو گے۔ صبارانی کی زچگی خیر خیریت سے ہونی چاہیے۔ میں اس بچے کو جواد کے خلاف جیتا جاگتا ثبوت بنانا چاہتا ہوں۔“

وہ بریف کیس کھول کر ایک ایک گڈی اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ خوش ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میں ماں اور بچے کا پورا خیال رکھوں گا۔ مگر جواد سے آپ دونوں کو نمٹنا ہوگا۔“

امجد غوری نے کہا۔ ”جواد نے رازداری سے نکاح پڑھوایا ہے۔ وہ نکاح نامہ ہمارے ہاتھ نہیں لگے گا۔ تم صبارانی سے ہمدردی کرتے رہو۔ اسے سمجھاؤ کہ جواد کبھی اسے رہائی نہیں دلائے گا۔“

نعیم نے کہا۔ ”اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ وہ بچے کو اس سے چھین کر لے جائے گا۔ اگر ایک ماں کو یہ یقین ہو جائے کہ تم اس کی گود اجڑنے نہیں دو گے، اس کا مقدمہ لڑو گے اور اسے

بچے کے ساتھ رہائی دلاؤ گے تو وہ ہماری طرف سے جواد کے خلاف گواہ بن جائے گی۔"

وہ خوب سوچ سمجھ کر یہ ملے کر رہے تھے کہ آئندہ انہیں جواد کی مخالفت میں کیسی کارروائی کرنی ہوگی؟ تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد نعیم اپنی کوٹھی میں آگیا۔ ستارہ نے فون پر اسے مخاطب کرتے ہوئے۔ "تم کہاں تھے؟ شام پانچ بجے سے کال کر رہی ہوں۔ یہی معلوم ہوتا رہا کہ ابھی رابطہ نہیں ہو سکے گا۔"

اس نے کہا۔ "میں بہت زیادہ مصروفیات کے دوران اپنا سیل آف رکھتا ہوں۔"

"ایسی بھی کیا مصروفیت تھی کہ رات کے دس بج گئے؟ کیا کسی سے فلرٹ کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ آفرین کے بعد اب کسی پر دل نہیں آتا۔ تم بتاؤ' کس لیے فون کر رہی تھیں؟"

"ممی تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ ماضی کی تمام رنجشوں کو بھلا کر پہلے کی طرح ایک ہی چھت کے نیچے تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔ آج وہ تمہیں ڈنر پر بلانے والی تھیں۔ کیا ابھی آسکو گے؟"

"میں نے تو پیٹ بھر کر کھا لیا ہے۔ صرف چائے پی سکوں گا۔"

"تو پھر ہم سی سائیڈ چلیں گے۔ ساحل پر صبح تک رونق رہتی ہے۔ آدھی رات کے بعد واپس آئیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آرہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ ستارہ نے فون کے ذریعے جواد سے کہا۔ "میں نعیم کے ساتھ سی سائیڈ جا رہی ہوں۔ گیارہ بجے کے بعد تمہیں اس کی کوٹھی خالی ملے گی۔ کوشش کرنا' دو گھنٹے کے اندر تمہارا کام ہو جائے۔"

دوستی کے بھیس میں دشمنی ہو رہی تھی۔ نعیم اور جواد اپنے اپنے طور پر چالیں چل رہے تھے اور ایک دوسرے کی چالوں سے بے خبر تھے۔ وہ ان ماں بیٹی کے ساتھ ساحلِ سمندر پر آیا تو ستارہ نے پہلے شاپنگ میں ایک گھنٹا صرف کیا۔ پھر وہ تینوں ایک ریسٹورنٹ میں آکر آئس کریم کھاتے اور .... کولڈ ڈرنک پیتے رہے۔

ستارہ کی ماں نے نعیم سے وعدہ کیا کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے' اس کا الزام کوئی کسی کو نہیں دے گا۔ اب وہ پھر سے اس کی ساس بن کر رہے گی۔ وہ ماں بیٹی ہر معاملے میں اس پر اعتماد کرتی رہیں گی۔

ان کی باتیں' ان کی قسمیں سن کر نعیم کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ماں بیٹی ابھی حج کر کے آئی ہیں یا اب سانپوں نے ڈسنا چھوڑ دیا ہے۔ جب وہ ان سے رخصت ہو کر رات دو بجے اپنی کوٹھی میں آیا تو باہر نائٹ چوکیدار نہیں تھا۔ اندر ایک ملازم رہتا تھا۔ وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ نعیم نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اپنے بیڈ روم میں آیا تو دروازہ کھولتے ہی ٹھٹک گیا۔

الماری کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اندر کا تمام سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ الماری کا سیف ٹوٹا ہوا تھا۔ وہاں سے اہم کاغذات نکال کر اِدھر اُدھر پھینکے گئے تھے۔ اس نے انہیں سمیٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ ان میں جواد کا لکھا ہوا کاغذ نہیں تھا۔

بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ ملازم کو ہوش آرہا تھا۔ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اسے ٹھنڈا جوس پلایا' تب وہ بتانے لگا کہ دو گن مین منہ پر ڈھاٹا باندھے آئے تھے۔ انہوں نے اس کے چہرے کے پاس کوئی دوا اسپرے کی تھی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گن مین وہاں سے کیا چرا کر لے گئے ہیں۔

نعیم نے موبائل فون پر ستارہ کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف فون بند پڑا تھا۔ وہ جواد کے ساتھ کامیابی کا جشن منا رہی ہوگی۔ اس نے ماں کو فون کیا۔ وہ نیند سے اٹھ کر جھنجھلاتے ہوئے بولی۔ "کیا بات ہے؟ کیوں ہماری نیند خراب کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "جاگتے رہنے میں بہتری ہے۔ میرے آدمی کسی بھی وقت ستارہ کو گولی مارنے پہنچ جائیں گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ نعیم کا ایسی کوئی واردات کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ محض ان کی نیندیں اڑانے کی خاطر ایسا کہہ دیا تھا۔ وہ آرام سے سو گیا اور وہ ماں بیٹی خوف کے مارے صبح تک جاگتی رہیں۔ جواد ان کی سیکیورٹی کے لیے آیا تھا۔ پھر بھی وہ سو نہ سکیں۔

صبح سویرے جواد کو اطلاع ملی کہ سول کورٹ کا مجسٹریٹ ڈپٹی کمشنر اور فلاحی تنظیم کا ایڈووکیٹ امجد غوری اپنی ٹیم کے ساتھ معائنے کے لیے جیل میں آرہا ہے۔

وہ فوراً ہی بھاگم بھاگ سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس آیا۔ اچانک معائنے کے لیے ٹیم آرہی تھی۔ جیل میں سب ہی اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "سر! آپ فکر نہ کریں۔ صبا رانی کی جگہ دوسری عورت کو پیش کیا جائے گا۔ کوئی گڑبڑ نہیں



ہوگی۔"

دو ماہ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ معائنے کے لیے جو ٹیم آئی تھی' اسے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہاں ایک حاملہ قیدی عورت کو کہیں چھپایا گیا ہے۔ انہوں نے رجسٹر میں قیدی عورتوں کے نام پڑھے تھے۔ چند عورتوں سے سوالات کیے تھے۔ پھر مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

اس بار ایڈووکیٹ امجد نے رجسٹر میں نام پڑھتے ہوئے پوچھا۔ "ان قیدیوں میں صبا رانی کون ہے؟"

اسسٹنٹ جیلر نے ان عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صبا رانی! آگے آؤ۔"

ایک جوان عورت دو قدم آگے آگئی۔

امجد نے مجسٹریٹ سے کہا۔ "یہاں اندراج کے مطابق چالیس قیدی عورتیں ہیں۔ آپ ان کی گنتی کرائیں۔"

مجسٹریٹ کے حکم کے مطابق ایک ایک عورت کے نام کے ساتھ گنتی ہونے لگی۔ آخر میں پتا چلا کہ انتالیس عورتیں ہیں۔ حمیدہ نام کی ایک عورت کم ہے۔

جواد اکبر اور سپرنٹنڈنٹ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ قیدی عورتوں کے نام کے ساتھ گنتی ہوگی۔ ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔ "قیدی حمیدہ کہاں ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "سر! وہ بیمار ہے۔"

امجد نے کہا۔ "ہم اس بیمار کی عیادت کے لیے جائیں گے۔"

جواد نے پریشان ہو کر سپرنٹنڈنٹ کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ تو اچھی بات ہے سر! آپ اس بے چاری کی مزاج پرسی کریں گے۔ ہمارے ساتھ آئیں۔"

معائنہ کرنے والی ٹیم جواد اور سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ جیل کے دور افتادہ حصے میں آگئی۔ وہاں ایک کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا۔ اندر صبا رانی لحاف اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ اس کے سرہانے ایک زنانہ کانسٹیبل اور ایک بوڑھی عورت کھڑی ہوئی تھیں۔

مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "تم بیمار ہو؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ لوگ بڑے برے وقت میں معائنے کے لیے آئے تھے۔ پچھلی رات سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ اب تب میں زچگی ہونے والی ہے۔ بار بار دردِ زہ اٹھ رہا تھا۔ صبا رانی برداشت کر رہی تھی۔ جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ امجد نے کہا۔ "چلو، نام نہ بتاؤ۔ یہ لحاف اپنے اوپر سے ہٹاؤ۔"

سپرنٹنڈنٹ نے جلدی سے کہا۔ "ڈاکٹر نے تاکید کی ہے' اسے لحاف میں ہی رکھا جائے۔ ٹھنڈ لگنے کا خدشہ ہے۔"

امجد غوری نے کہا۔ "میں ڈاکٹروں کا ڈاکٹر ہوں۔ ابھی اس کی ساری بیماری دور کر دوں گا۔"

اس نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا۔ "اس کا لحاف ہٹاؤ۔"

ماتحت نے آگے بڑھ کر حکم کی تعمیل کی۔ لحاف کے ہٹتے ہی سب نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو حیرانی سے دیکھا۔ مجسٹریٹ نے سپرنٹنڈنٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ تو حاملہ ہے؟"

وہاں کھڑی ہوئی بوڑھی عورت نے کہا۔ "آپ لوگوں کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ باہر چلے جائیں۔ اس کا ٹائم قریب ہے۔"

وہ سب باہر آگئے۔ مجسٹریٹ نے کہا۔ "اس کا ریکارڈ پیش کرو۔ یہ جیل میں کب آئی؟ کیا آنے سے پہلے حاملہ تھی؟"

جواد اور سپرنٹنڈنٹ... جیل کے دفتری کمرے میں پہنچنے تک حیلے بہانے کرتے رہے۔ یہ بھی کہا کہ اس قیدی عورت کی زچگی ہونے کے بعد اس معاملے کی انکوائری کی جائے گی۔ لیکن امجد نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ انہیں صبا رانی کا ریکارڈ پیش کرنا پڑا۔ یہ بھید کھلا کہ وہ گیارہ ماہ سے جیل میں ہے اور وہاں آنے کے بعد حاملہ ہوئی ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔ "اس کا ذمے دار کون ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "سر! اس عورت نے ایک قیدی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ ہمیں چار ماہ بعد معلوم ہوا تو دیر ہو چکی تھی۔ نہ ہم اسے سزا دے سکتے تھے' نہ اس کا حمل ضائع کر سکتے تھے۔"

امجد نے کہا۔ "یعنی آج سے پانچ ماہ پہلے آپ کو معلوم ہوا۔ کیا آپ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو تحریری اطلاع دی تھی؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "نہیں۔ اس معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔"

امجد غوری نے جواد اکبر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں' اس عورت سے ہونے والے بچے کا باپ کون ہے۔ کیوں جواد صاحب! میں جانتا ہوں نا...؟"

وہ مٹھیاں بھینچ کر تلملاتے ہوئے بولا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے کچھ کہنا نہیں پڑے گا۔ ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد بھید کھل جائے گا اور بھی کئی طرح سے انکوائری ہوگی۔ میں مجسٹریٹ صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ انکوائری مکمل ہونے تک سپرنٹنڈنٹ کو معطل کیا جائے اور جواد اکبر صاحب تحریری بیان دیں کہ صبا رانی کو یہاں کیوں چھپایا گیا تھا اور قیدی حمیدہ کو صبا رانی کا نام دے کر ہمارے سامنے کیوں پیش کیا گیا تھا؟ میں یہ ثابت کر دوں گا

کہ صبارانی سے ہونے والے بچے کے باپ یہ حضرت جواد اکبر صاحب ہی ہیں۔"

جواد نے گرج کر کہا۔ "آپ بکواس کر رہے ہیں۔"

"آپ یہ لکھ کر دیں کہ میں بکواس کر رہا ہوں اور آپ اس ہونے والے بچے کے باپ نہیں ہیں۔"

وہ اچانک ہی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بچاؤ کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں تحریری بیان ضرور دے گا۔ مجسٹریٹ نے کہا۔ "جواد اکبر صاحب کو صبارانی کے معاملے میں ملزم ٹھہرایا گیا ہے۔ لہٰذا انکوائری اور قانونی کارروائی جاری رہنے تک جواد اکبر اس جیل کے احاطے میں قدم نہیں رکھیں گے اور نہ ہی صبارانی سے کوئی رابطہ کریں گے۔"

یہ ایسا حکم تھا کہ جواد بالکل ہی بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔ اسسٹنٹ جیلر کو وہاں کا قائم مقام سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ جیل کے اندر ایسے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو تعینات کیا گیا جو جواد اکبر کے زیر اثر نہیں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے اس کی حکمرانی ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

انسان کو انسان مارتا ہے۔ بدنصیبی کبھی نہیں مارتی...

صبارانی کو انسان مار رہے تھے۔ جب وہ مر جائے گی تو الزام مقدر کو دیا جائے گا۔ ہائے! بے چاری کو بدنصیبی نے ضائع کر دیا۔

نصیب کیا ہوتا ہے؟ بڑے لوگوں کے اچھے یا بُرے عمل اور ردعمل سے چھوٹے لوگوں پر جو اثرات پڑتے ہیں' اسے نصیب کا لکھا کہا جاتا ہے۔

بہزاد درانی بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ صبارانی چھوٹے باپ کی بیٹی تھی۔ وہ چودہ برس کی لڑکی کسی کے لیے دینے میں نہیں تھی۔ عزت آبرو سے تین وقت کی روٹی کمانے کوٹھی میں گئی تھی۔ رئیس زادے نے اس کی کچی جوانی کو لہولہو کر دیا تھا۔

کاتب تقدیر کو یہ الزام کیوں دیا جائے کہ اس نے ایک رئیس زادے کو غریب لڑکی کی جوانی لوٹنے کا موقع فراہم کیا؟

کیوں الزام دیا جائے کہ ایک بیمار باپ کو حوالات میں مار مار کر موت کی نیند سلا دیا گیا اور بیٹی کو کسی جرم کے بغیر جیل کی چار دیواری میں پہنچا کر جواد اکبر کی رکھیل بنا دیا گیا؟

سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے' گناہ ہم کرتے ہیں اور بڑی ہنرمندی سے الزام کاتب تقدیر کو دیتے ہیں کہ اس نے ایسی ہی تقدیر لکھی ہے۔ ازل سے انسانی کمینگی کا یہ کھیل جاری ہے۔ ازل سے بدترین اعمال کا الزام اپنی تقدیر کو دیا جا رہا ہے۔

صبارانی کو بدنصیب بنائے رکھنے والا عمل رکنے والا نہیں تھا۔ ابھی جواد کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی اس سے ایک بچہ حاصل کرنا تھا۔ ایسے وقت وہ قانون کے شکنجے میں آ رہا تھا۔ اگر صبارانی اس کی حمایتی بن کر یہ بیان دیتی کہ جواد نے اس کے ساتھ منہ کالا نہیں کیا ہے' اس سے ہونے والا بچہ کسی دوسرے قیدی بدمعاش کا ہے تو وہ بہ آسانی قانونی شکنجے سے نکل سکتا تھا۔

اس نے جسے داشتہ بنا کر رکھا تھا' جسے ایک بچہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا، وہ صبارانی اچانک ہی بہت اہم ہو گئی تھی۔ وہی اس اعلیٰ عہدے دار کو معزز اور شریف انسان ثابت کر سکتی تھی۔ مگر جیل کے احاطے میں اس کا داخلہ بند ہو گیا تھا۔ صبارانی سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اسے دور سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

ان حالات میں صبارانی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس بچے کا نصیب بھی اس کے عیاش باپ نے لکھا تھا۔ اس نومولود نے پیدائش سے پہلے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پیدائش کے بعد بھی نہیں جانتا تھا کہ گناہ اور جرائم کیا ہوتے ہیں؟ وہ زندگی کی پہلی سانس لینے کے لیے جیل کی کوٹھری میں پہنچ گیا تھا۔ اس بے چارے کا انجام کیا ہوگا؟ یہ تو اسے وہاں پہنچانے والے ہی جانتے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ کو معطل کیا گیا تھا۔ اس کی جگہ اسسٹنٹ جیلر کو عارضی طور پر سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا تھا۔ جواد نے فون پر اس سے کہا۔ "تم ہمیشہ میرے وفادار رہے ہو۔ آج بھی میرے کام آؤ۔"

اس نے جواب دیا۔ "سوری جواد صاحب! صبارانی کو بڑی سخت نگرانی میں رکھا گیا ہے۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکوں گا۔"

"تم موجودہ سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے جب چاہو' اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔ اسے میرے خلاف بیان دینے سے روک سکتے ہو۔"

"میں جب بھی اس کے پاس جاتا ہوں، انٹیلی جنس کا کوئی نہ کوئی بندہ وہاں موجود رہتا ہے۔ میں آپ کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کر سکوں گا۔"

"وہ کبھی تو تنہا رہتی ہوگی؟"

"ہاں۔ جب ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے آتا ہے تو کمرے میں اور کوئی نہیں جاتا۔ آپ ڈاکٹر سے معاملات طے



کر لیں۔"

جواد نے ڈاکٹر کو فون پر مخاطب کیا۔ بڑی اپنائیت سے کہا۔ "ہیلو ڈاکٹر فاروق! میں جواد اکبر بول رہا ہوں۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "ہاں۔ میں سن رہا ہوں۔"

"تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے تمہاری تنخواہ بڑھانے کی منظوری حاصل کر لی ہے۔"

"اچھا۔ میں بہت خوش ہو رہا ہوں پھر...؟"

"تم ابھی میری کوٹھی میں آؤ۔ تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"وہ ضروری باتیں فون پر کہہ دیں۔ میں نہیں آ سکوں گا۔"

"تم میرا حکم سنتے ہی دوڑے چلے آتے ہو۔ آج کیوں نہیں آؤ گے؟"

"اس لیے کہ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ سالے! دو کوڑی کے لاٹ صاحب! تُو نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دی تھیں۔ کیا سمجھتا ہے' میں تیرے آگے دُم ہلاؤں گا؟ ارے کتے! میں تو تجھے اور تیرے حامیوں کو صبارانی کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دوں گا۔ تجھے تو تیرا باپ بھی نہیں بچا سکے گا کیونکہ نعیم صدیقی صاحب تیرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ جواد نے چونک کر... زیرلب کہا۔ "اوہ گاڈ! مجھ پر یہ حملہ نعیم نے کیا ہے؟"

وہ فوراً ہی ستارہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "بہت پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

وہ جھنجھلا کر بولا۔ "نعیم کو صبارانی کے متعلق کیسے معلوم ہو گیا؟ یہ جو مصیبتیں مجھ پر آ رہی ہیں' ان کے پیچھے اسی دشمن کا ہاتھ ہے۔"

ستارہ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اس نے رہائی پانے کے لیے نعیم کو گھر کا بھیدی بنایا تھا اور یہ بات اب تک اپنے یار سے چھپاتی آئی تھی۔ اب بھی اس سلسلے میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ بہت پریشان اور جھنجھلایا ہوا تھا۔ حقیقت معلوم ہوتی تو یقیناً اس سے ناراض ہو جاتا۔ قطع تعلق کر لیتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولی۔ "ریلیکس ہو جاؤ۔ ہیریشانیوں کو اندر سے نکالو۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ تم نے بھی کسی سے مات نہیں کھائی ہے۔ نعیم کو بھی مات دے سکو گے۔ آرام سے بیٹھو۔ میں بوتل اور گلاس لاتی ہوں۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر پینے کا سامان لے آئی۔ ایک پیگ بنا کر اسے پیش کرتے ہوئے بولی۔ "لو پیو۔ میں ممی کے پاس جا کر کہتی ہوں، وہ یہاں نہیں آئیں گی۔"

وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے موبائل فون کے ذریعے نعیم سے رابطہ کرنے لگی۔ دوسری طرف سے اس کی آواز سنائی دی۔ "ہائے ستارہ! معلوم ہوتا ہے' عاشق کو تیر لگا ہے اور تم گھائل ہو کر مجھے مسیحا سمجھ رہی ہو۔"

"بے شک! تم مسیحا ہی ہو۔ دیکھو! میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق جواد کو یہ نہیں بتایا کہ تمہیں صبارانی کے بارے میں مجھ سے بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ پلیز! تم بھی اسے یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں تمہاری معلومات کا ذریعہ ہوں۔"

"بتانا ہوتا تو بہت پہلے تمہارے خلاف بہت کچھ کہہ دیتا۔ میں تمہیں کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ کیا اس احسان کے بدلے یہ بتاؤ گی کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کیا کر رہا ہے؟"

"وہ بہت پریشان ہے۔ اسے بچاؤ کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"ابھی کہاں ہے؟"

"میرے بیڈروم میں پی رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں' وہ غم غلط کرے۔ اس کی پریشانی کچھ کم ہو جائے۔"

نعیم نے فون بند کر دیا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ پھر دروازہ کھول کر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگی۔ یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ زبان کا دھنی ہے۔ اس کے خلاف جواد سے کچھ نہیں بولے گا۔

وہ بیڈروم میں آئی تو جواد فون کو کان سے لگائے دہاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ ایک بار مجھے اس پھندے سے نکلنے دو پھر میں تمہیں ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لینے دوں گا۔"

"کتے کی طرح بھونکتے رہو گے تو پتے وقت ٹھنڈکا لگے گا۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "تم کیسے جانتے ہو' میں شراب پی رہا ہوں؟"

"اپنی داشتہ کے کمرے میں کوئی لسی نہیں پیتا۔"

وہ خالی گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے بولا۔ "یعنی تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس وقت ستارہ کے پاس ہوں؟ یقیناً تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہو۔"

"اور تمہارا پیچھا کرتے ہوئے تمہیں جہنم کے دروازے تک پہنچاؤں گا۔"

ستارہ کمرے میں آ کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ فون چھین کر اسے بند کرتے ہوئے بولی۔ "اس سے جتنا بولو گے' اُتنا ہی تمہارا دماغ گرم ہوگا۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے بھول

جاؤ۔ ساری دنیا کو بھول جاؤ۔ میں تمہاری مشکل کو آسان کروں گی۔ اب اسے پیتے رہو۔“

وہ دوسرا گلاس بھرنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ ”یہ آسان ہونے والی مشکل نہیں ہے۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔ ایڈووکیٹ امجد غوری بہت ہی تیز طرار ہے۔ وہ صبارانی سے میرے خلاف تحریری بیان لے چکا ہوگا۔ عدالت میں یہ ثابت ہوجائے گا کہ میں ایک قیدی عورت کی عزت سے کھیلتا رہا ہوں۔ جیل کا ڈاکٹر اور وہاں کا عملہ بھی میرے خلاف بیان دے گا۔“

”کسی چالاک اور تجربہ کار وکیل سے مشورہ کرو۔ وہ ہمیں بچاؤ کے قانونی ہتھکنڈے بتائے گا۔“

وہ ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ”ایڈووکیٹ حمزہ گیلانی بہت چالباز ہے۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سیاہ کو سفید بنا دیتا ہے۔ میں کل ہی اس کی خدمات حاصل کروں گا۔“

”بس تو پھر آرام سے پیو اور یہیں میری بانہوں میں سوجاؤ۔ پریشان ہونے کی کوئی بات مت سوچو۔“

”صبارانی میری گرفت سے نکل چکی ہے۔ میں تمہارے لیے اس سے پیچھا نہیں لے سکوں گا۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”بچہ جائے جہنم میں... تم سلامت رہو گے تو بچے کہیں سے بھی آجائیں گے۔“

اس رات اس نے خوب پی۔ بیڈ پر آکر ستارہ کی آغوش میں سوگیا۔ دوسرے روز حمزہ گیلانی سے ملاقات کی۔ اسے اپنی روداد سنائی۔ اس نے توجہ سے سننے کے بعد کہا۔ ”آپ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے باعث گرفت میں آرہے ہیں۔ ایک قیدی عورت کے ساتھ گناہ ثابت ہوگا تو کوڑے کھانے پڑیں گے۔ نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔ سرکاری ملازمت بھی جائے گی۔ ان سب سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔“

جواد نے اسے پُرامید نظروں سے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ کے پاس صبارانی سے پڑھایا ہوا نکاح نامہ ہے؟“

”ہاں۔ میرے پاس ہے۔“

”تو اپنے خلاف ہونے والی قانونی کارروائی سے پہلے ہی نکاح نامہ عدالت میں پیش کر دیں۔ یہ بیان دیں کہ صبارانی ایک مظلوم قیدی ہے۔ اس کے خلاف چوری کا جھوٹا الزام ہے۔ آپ نے اس شریف لڑکی پر ترس کھا کر اسے اپنی شریکِ حیات بنایا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرتے، نعیم صدیقی کی سازش کے تحت زوجہ صبارانی سے آپ کو دور کر دیا گیا۔“

”یہ تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہے۔ بے شک! مجھ پر سے سارا الزام ڈھل جائے گا مگر دو کوڑی کی لڑکی میری گردن سے ڈھول کی طرح لٹک جائے گی۔ ہمارا ایک اعلیٰ خاندان ہے۔ ہم لوگ...“

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ اپنے خاندان کا قصیدہ نہ پڑھیں۔ پہلے سزا سے بچیں۔ اپنی ملازمت کو بچائیں۔ جب کیس ختم ہوجائے آپ کے دامن سے گناہ کا دھبا ڈھل جائے تو صبارانی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔“

جواد اپنا سر سہلاتے ہوئے قائل ہو کر بولا۔ ”زبردست آئیڈیا ہے۔ میں اس داشتہ کو شریکِ حیات تسلیم کر کے سارے الزامات سے بری ہوسکتا ہوں۔ بعد میں اس کا بچہ لے کر اسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ نعیم صدیقی ناکام ہو کر سوچتا اور دیکھتا ہی رہ جائے گا کہ سوچا کیا تھا اور کیا ہوگیا؟“

جواد نے دیر نہیں کی۔ اس نے اسی روز اپنے اوپر والوں کو ایک تحریری بیان دیا۔ ان کے سامنے اپنا اور صبارانی کا نکاح نامہ پیش کیا۔ اس سے پوچھا گیا۔ ”تم نے اب تک اس نکاح کو راز میں کیوں رکھا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میری شریکِ حیات پر چوری کا جھوٹا الزام تھا۔ میں اسے جھوٹ ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور گواہوں کی تلاش میں تھا۔ جب اسے باعزت طور پر بری کیا جاتا، تب اعلان کرتا کہ صبارانی میری شریکِ حیات ہے اور وہ چور نہیں، ایک معزز خاتون ہے۔“

اس سے طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ وہ ہر سوال کا سوچا سمجھا، نپا تلا جواب دیتا رہا۔ اس ضمن میں بنیادی بات یہ تھی کہ وہ ایک ایسی بے یارومددگار قیدی عورت کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتا تھا جس کا مقدمہ اب تک عدالت میں پہنچایا نہیں گیا تھا اور نہ ہی قانوناً سزا سنائی گئی تھی۔

ایک اور بات جواد کے حق میں تھی کہ اس نے اپنی نیک نیتی اور دیانت داری ثابت کرنے کے لیے اس بے سہارا عورت کو اپنی منکوحہ بنایا تھا۔ دینی اور دنیاوی قانون کے مطابق نہ اسے گرفتار کیا جاسکتا تھا، نہ سرکاری ملازمت سے معطل کیا جاسکتا تھا اور نہ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی جا سکتی تھی۔

یوں دیکھا جائے تو اس نے خود کو محاسبے سے اور مطعون ہونے سے بچا لیا تھا مگر نعیم صدیقی پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کی طرف سے ایڈووکیٹ امجد غوری ہر دوسرے



تیسرے دن جیل میں جا کر صبارانی سے ملتا تھا۔ اسے سمجھاتا تھا کہ جواد اکبر شاطر ہے۔ وہ قانونی گرفت سے بچنے کے لیے اسے اپنی شریکِ حیات تسلیم کر رہا ہے۔

صبارانی نے کہا۔ ”دیر سے سہی، تسلیم تو کر رہا ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ وہ مجھے عزت آبرو سے اپنے گھر میں رکھے گا۔ میرے بچے کو باپ کا نام دے گا۔“

”تم اس کی چالبازیوں کو نہیں سمجھ رہی ہو۔ وہ کبھی یہ ثابت نہیں ہونے دے گا کہ تم بے گناہ ہو۔ تم پر چالیس ہزار روپے کے زیورات کی چوری کا الزام رہے گا۔ تمہیں دو چار برس قید بامشقت کی سزا سنائی جائے گی۔ تب وہ تمہارے خلاف بیان دینے پر حق بجانب ہوگا کہ وہ مجرمانہ واردات کرنے والی عورت کو طلاق دے رہا ہے۔ یوں وہ مکار تم سے پیچھا چھڑا لے گا۔ عدالت بچے کو ایک مجرم ماں کے پاس رہنے نہیں دے گی۔ جواد اس بچے کو لے جائے گا۔ اس کی ایک جھلک بھی تم دیکھ نہیں پاؤ گی۔“

”آپ نعیم صدیقی کی طرف سے میرا کیس لڑنا چاہتے ہیں۔ پتا نہیں وہ صاحب کون ہیں؟ میں کسی کو نہیں جانتی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک ماں تھی... وہ بھی نہ جانے کہاں ہوگی؟ پچھلے سات ماہ سے کبھی ملنے نہیں آئی۔ میں اس جیل کے اندر اور باہر صرف جواد صاحب کو جانتی ہوں۔ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر چکی ہوں۔ ان کے بچے کی ماں بھی بن چکی ہوں۔ اپنے بچے کے باپ کے خلاف بھی کوئی بیان نہیں دوں گی۔“

”تم بہت بھولی ہو۔ جس نے نکاح پڑھانے کے بعد بھی تمہیں داشتہ بنا کر رکھا، کبھی تمہارے کیس کو عدالت میں جانے نہیں دیا، اس پر بھروسا کر رہی ہو کہ وہ آئندہ تمہیں عزت و آبرو سے اپنے گھر میں رکھے گا؟“

”نہیں رکھے گا تو لات مار کر گھر سے نکال دے گا۔ پھر کبھی بلائے گا تو اس کی چھاؤں میں چلی جاؤں گی۔ میرے جیسی کتنی ہی عورتیں اپنے مردوں کی لات جوتے کھاتی ہیں۔ میں بھی کھاتی رہوں گی۔ اسے چھوڑ کر کبھی کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی۔“

امجد غوری نے نعیم کے پاس آکر کہا۔ ”میں اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ وہ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں ہے کہ جواد اسے ٹھکرا کر بچے کو چھین کر لے جائے گا۔ جو عورت ایک ظلم کرنے والے کو اپنی اچھی بُری تقدیر کا مالک سمجھ لے اور اس کے آگے دنیا کے کسی دوسرے مرد کو ترجیح نہ دے، اس کے ارادوں کو بدلا نہیں جاسکتا۔ وہ کبھی جواد اکبر کے خلاف کوئی بیان نہیں دے گی۔“

نعیم نے کہا۔ ”نچلے طبقے کی جاہل عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک ہی مرد کے قدموں سے لپٹی رہ جاتی ہیں۔ جواد کے نصیب اچھے ہیں۔ صبارانی کی عاقبت نااندیشی اسے بچا لے گی۔“

امجد نے کہا۔ ”ہم نے اتنی بھاگ دوڑ کی... یہ ساری محنت رائیگاں جائے گی۔“

”رائیگاں تو نہیں جائے گی۔ میں جواد کی تاک میں رہوں گا۔ صبارانی کے بچے کو ستارہ کی گود میں جانے نہیں دوں گا۔ جب اس پر چوری کا الزام ثابت ہوجائے گا، اسے سزا ہوگی تو جواد طلاق دینے میں حق بجانب ہوگا۔ لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اسے سارے الزامات سے باعزت طور پر بری کرائیں گے۔“

انتقام لینے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ جواد نہ اسے چور ثابت کرے اور نہ طلاق دے سکے۔ اسے شریکِ حیات بنا کر ساتھ رکھنے پر مجبور ہوجائے۔ پھر وہ بچے کو بھی ماں سے چھڑا کر ستارہ کے پاس نہیں پہنچا سکے گا۔

اس سلسلے میں پہلے یہ معلوم کیا گیا کہ صبارانی کو چوری کے الزام میں گرفتار کر کے کس تھانے میں لایا گیا تھا؟ نعیم نے اس تھانے دار کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیا۔

اس نے شہباز درانی کو سمجھایا۔ ”آپ نے بیٹے کو بدنامی سے بچانے کے لیے صبارانی پر چوری کا الزام لگایا۔ میں نے آپ کی خدمت کی۔ اسے حوالات میں پہنچایا پھر جیل میں پہنچا دیا۔ اب ایک برس گزر چکا ہے۔ بے چاری نے بدترین مجرم سے بھی زیادہ سزا پالی ہے۔ اس کی عزت کی دھجیاں ایسے اڑائی گئی ہیں کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بن گئی ہے۔ اب آپ اس پر رحم کریں۔“

شہباز درانی نے کہا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ چوری کا الزام واپس لے لیں۔ یہ بیان دیں کہ چرایا ہوا مال کسی دوسری جگہ سے برآمد ہوچکا ہے۔“

”مگر مال کہاں سے برآمد ہوگا؟“

”جب آپ کے گھر میں چوری ہوئی ہی نہیں تھی تو کہاں سے برآمد ہوگا؟ آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس یہ بیان لکھ دیں کہ چرایا ہوا مال واپس مل گیا ہے۔ صبارانی پر غلط شبہ کیا گیا تھا۔“

شہباز درانی نے اس کی مرضی کے مطابق بیان لکھ کر دستخط کردیے۔ انہی دنوں ایک ڈاکو گرفت میں آیا تھا۔ اس کے خفیہ اڈے سے لاکھوں روپے نقد اور زیورات برآمد ہوئے تھے۔

شہباز درانی کے تعاون سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ صبارانی نے نہیں اس ڈاکو نے زیورات چرائے تھے۔

قانون سے کھیلنے والوں نے خوب کھیل دکھایا تھا۔ پہلے سفید کو سیاہ بنایا' پھر سیاہ کو سفید بنا دیا۔ صبارانی کے ساتھ خوب زیادتی کی گئی تھی پھر مہربانی بھی کی گئی۔ ایک برس دو ماہ بعد اسے عدالت میں پہنچا کر تمام الزامات سے بری کرا لیا گیا۔

جواد اکبر نے اپنے طور پر بہت کوششیں کی تھیں کہ اس پر سے چوری کا الزام ختم نہ ہونے پائے مگر اس معاملے میں وہ ناکام رہا۔ جب وہ باعزت طور پر بری ہو کر عدالت سے باہر آئی تو جواد کو ایک شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنا پڑا۔ وہاں پریس اور ٹی وی کے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کا ہجوم تھا۔ مختلف چینلز کے لیے نیوز تیار کی جا رہی تھیں۔ ان دونوں سے طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے۔ صبارانی خوش تھی۔ چہک چہک کر جواب دے رہی تھی۔ جواد کیمروں کے سامنے جبراً مسکرا رہا تھا۔ بہت مجبور ہو کر یہ بیان دے رہا تھا کہ صبارانی ایک اچھی اور خدمت گزار بیوی ہے۔ وہ اسے جیل سے اپنے گھر لے جانے پر فخر کر رہا ہے۔

میڈیا کے ذریعے دنیا والوں کے سامنے اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ آئندہ کبھی طلاق دینے کے لیے اپنی شریکِ حیات کی کوئی کمزوری اور خامی نہیں نکال سکتا تھا۔ ستارہ بھی نیوز چینلز پر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ صبارانی ایسی سوکن بن گئی تھی جسے وہ جواد کی زندگی سے کبھی نکال نہیں سکتی تھی۔

اس نے فون پر جواد سے کہا۔ ''اس میں شبہ نہیں ہے کہ تم نے اپنی ملازمت بھی بچائی ہے اور ایک قیدی عورت کے ساتھ گناہ گار بھی نہیں کہلائے۔ تمہیں نیک نامی مل رہی ہے مگر یہ صبارانی زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارے ساتھ کینسر کی طرح لگی رہے گی۔''

''ہاں۔ یہ ایسی مصیبت بن گئی ہے جس سے پیچھا چھڑانے میں ایک عرصہ لگے گا۔ میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ کسی دوست یا دشمن کو اپنے مزاج کے خلاف برداشت نہیں کرتا۔ یہ بیوی بن کر نہیں' چیلنج کر میری کوٹھی میں آئی ہے۔ مجھے سوچنے دو کہ میں کس طرح اسے ٹھکانے لگا سکتا ہوں۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تم میرا یہ بچہ گود نہیں لے سکو گی۔ میں اسے اغوا کراؤں گا... اس کی ماں سے چھپا کر لاؤں گا تو نعیم بھید کھول دے گا۔''

''بچے کو رہنے دو۔ پہلے اس بلا کو اپنی زندگی سے نکالو۔ وہ کم بخت مرے گی تو وہ بچہ ہمارا ہی ہوگا۔''

وہ صبارانی کی ہلاکت کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا۔ دشمن نعیم اس کی غیر طبعی موت کو جواد کے گلے کا پھندا بنا سکتا تھا۔ ستارہ نے کہا۔ ''وہ کم بخت گلے میں ہڈی بن گئی ہے۔ نہ نگل سکو گے' نہ اگل سکو گے۔ اسے آفرین کی طرح ختم کرنے کی غلطی نہ کرنا۔''

''ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ مگر کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ نعیم نے پھانسی کا پھندا نہ سہی لیکن مجھے پھولوں کے پھندے میں کس دیا ہے۔ اس دو ٹکے کی قیدی عورت کو دیکھ کر میرا دم الجھتا رہے گا۔''

وہ غم غلط کرنے کے لیے پی رہا تھا اور فون پر بول رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر تھا کہ صبارانی بڑے پیار سے آئی تھی اور اس کی باتیں سن کر ٹھٹک گئی تھی۔ ستارہ کہہ رہی تھی۔ ''ادھر تمہارا دم الجھ رہا ہے' ادھر میرا سکون غارت ہو رہا ہے۔ اللہ کرے نعیم مر جائے۔ پھر ساری رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی۔''

وہ چونک کر بولا۔ ''واہ میری جان! کیا آئیڈیا دیا ہے؟ واقعی نعیم کو ٹھکانے لگانے کے بعد تمہاری اس سوکن کو بھی ٹھکانے لگا سکوں گا۔''

''پلیز جواد! اس معاملے میں جلد بازی نہ کرنا۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ نعیم بہت چالاک ہے۔ تمہارا وار خالی جائے گا تو اس کے جوابی وار سے بچ نہیں پاؤ گے۔''

''تم اطمینان رکھو۔ میں اس سلسلے میں جلد بازی نہیں کروں گا۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہوشیار رہنے والوں پر کب اور کس طرح جھپٹنا چاہیے؟''

اس نے فون بند کر دیا۔ صبارانی وہاں سے دبے قدموں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ تو جانتی تھی کہ جواد اسے دل سے نہیں چاہتا ہے۔ پہلے کی طرح داشتہ سمجھ کر اپنی ٹھوکروں میں رکھتا ہے مگر یہ حقیقت اب معلوم ہوئی تھی کہ وہ اسے گلے کا پھندا سمجھتا ہے' اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ صرف یہی نہیں' اس کے بچے کو بھی کسی سوکن کی گود میں پہنچانا چاہتا ہے۔

ایک ماں کو اپنی جان سے زیادہ اپنے بچے کی سلامتی کی فکر رہتی ہے۔ عقل نے سمجھا دیا کہ بچہ اس کوٹھی میں محفوظ نہیں رہے گا۔ ایسے وقت امجد غوری یاد آیا۔ اس نے کہا تھا' نعیم نے اس کا کیس لڑ کر اسے رہائی دلائی ہے۔ ورنہ جواد کبھی اسے جیل سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ وہ جواد پر بھروسا کرتی تھی۔ اس وقت اس سچائی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اب سوچ رہی تھی کہ امجد غوری اور نعیم صدیقی سے کس طرح رابطہ کرے؟ کس طرح اپنے بچے کے لیے حفاظتی انتظامات کرے؟

جواد اسے کوٹھی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ



کسی کا فون نمبر بھی نہیں جانتی تھی۔ بڑی رازداری سے کوٹھی کے باہر جا کر اپنے مددگاروں کا پتا ٹھکانا اور فون نمبرز معلوم کرنا چاہتی تو بھٹکتی رہ جاتی۔ پھر جواد اکبر کے ہتھے چڑھ جاتی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رونے لگی۔ اس پر جب بھی کوئی مصیبت آتی تو وہ رو دھو کر صبر کر لیا کرتی تھی۔ مصائب سے لڑنے کے لیے نہ اس کے پاس کبھی عقل رہی نہ کہیں سے سہارا ملا۔ لیکن اس بار وہ صبر نہیں کر رہی تھی۔ بچے کو دودھ پلاتی تھی۔ اسے چومتی تھی اور سوچتی تھی کہ جگر کے ٹکڑے کو کہاں لے جا کر چھپائے؟ اتنی بڑی دنیا میں ایک ننھے سے بچے کو سوکن سے دور زندہ سلامت رکھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ جواد اس سے جانوروں کی طرح سلوک کرنے لگا تھا۔ اسے صوفوں پر بیٹھنے اور بیڈ پر لیٹنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ نیچے فرش پر سوتی اور بیٹھتی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ وہ دو پیروں سے نہ چلے۔ اس کے سامنے چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک کر جانوروں کی طرح چلتی پھرتی اور گھر کا تمام کام کرتی رہے۔

اور بھی کچھ ایسی شرمناک حرکتیں کرتا تھا کہ اسے گھن آتی تھی۔ وہ جان چھڑا کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر بچہ وہاں آرام سے تھا۔ چونکہ وہ جواد کا بیٹا تھا' اس لیے رئیس زادوں کی طرح پرورش پا رہا تھا۔ وہ اسے لے کر فرار ہونا چاہتی تو اپنے ساتھ اس ننھے کو بھی فاقوں سے مارتی۔ جہاں بھی اسے لوٹنے والے ملتے' وہاں اس بچے کی بھی شامت آ جاتی۔

وہ بار بار کہتا۔ ''اگر آرام اور سکون سے انسانوں جیسی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو بچے کو میرے حوالے کر کے طلاق لے لے۔ یہ بیان لکھ دے کہ تو بچے کو بوجھ سمجھتی ہے اور میرے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔ راضی خوشی طلاق لے کر جا رہی ہے۔ میری بات مانے گی تو پچاس ہزار دے کر یہاں سے رخصت کروں گا۔''

وہ کہتی تھی۔ ''میں تمہاری تمام باتیں مان لوں گی۔ پچاس ہزار بھی نہیں لوں گی مگر اپنے بچے کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ جیوں گی تو اس کے ساتھ ورنہ... یہیں اس کے ساتھ رہ کر مر جاؤں گی۔''

وہ ضدی تھی۔ بری طرح مار کھاتی تھی۔ لہولہان ہو جاتی تھی مگر بچے کو چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوتی تھی۔ جواد نے ستارہ کے پاس آ کر کہا۔ ''وہ سور کی بچی بہت ڈھیٹ ہے' میں مارتے مارتے تھک گیا ہوں مگر وہ مار کھاتے نہیں تھکتی۔ جیل کی چار دیواری میں رہ کر سخت جان ہو گئی ہے۔''

ستارہ نے کہا۔ ''کیوں اس کے پیچھے ہلکان ہو رہے ہو؟ اس کم بخت کی وجہ سے گناہ گار کہلانے والے تھے۔ کوڑوں کی سزا مل سکتی تھی۔ تمہاری برسوں کی ملازمت جانے والی تھی۔ اگر نکاح نامہ پیش نہ کرتے تو ذلت کی پستی میں گر جاتے۔ وہ عورت تمہارے لیے منحوس ہے۔ اس سے پیچھا چھڑا لو۔ بچہ دے کر نجات حاصل کر لو۔ تم آج بھی تگڑے جوانوں جیسے ہو۔ تم سے ایک نہیں دس بچے حاصل ہو جائیں گے۔''

وہ اس رات ستارہ کے پاس رہ کر پیتا رہا اور صبارانی کو گالیاں دیتا رہا۔ ادھر وہ کوٹھی میں تھی۔ یہ بات عقل میں آئی کہ جواد کی ٹیلی فون ڈائری پڑھے۔ اس میں دوستوں کے ہی نہیں نعیم جیسے دشمنوں کے نمبرز بھی درج ہوں گے۔

اس نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر لیا تاکہ جواد اچانک نہ چلا آئے۔ پھر ڈائری کھول کر نام اور نمبرز پڑھنے لگی۔ این کے خانے میں پہلے ہی صفحے پر نعیم صدیقی کا نمبر مل گیا۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر وہ نمبر پنچ کیے۔

دوسری بیل جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی نعیم صدیقی کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو جواد! یہ دشمن کیسے یاد آ گیا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''مم... میں صبا رانی بول رہی ہوں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''صبارانی؟''

''ہاں۔ وہ گھر میں نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے آپ کا نمبر ملا ہے۔ میں اس سے چھپ کر فون کر رہی ہوں۔''

''تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ بات کیا ہے؟''

''میرے بچے پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ ایک وکیل صاحب نے کہا تھا' آپ میرا کیس لڑ رہے ہیں۔ مجھے چوری کے الزام سے بری کرا رہے ہیں۔''

''ہاں۔ میں نے ہی تمہیں جیل سے رہائی دلائی ہے۔''

''کیا آپ میرے جگر کے ٹکڑے کو کہیں چھپا کر رکھ سکتے ہیں؟ میں یہاں اپنی جان دے سکتی ہوں۔ مگر اس کی سلامتی اور بہتری کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔''

''میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ گیا ہوں۔ ابھی تم نے بتایا' جواد گھر میں نہیں ہے۔ کیا آدھے گھنٹے بعد بچے کے ساتھ کوٹھی سے باہر آ سکتی ہو؟''

''آ جاؤں گی۔ آپ کہاں ہیں؟''

''گھر سے نکل رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔''

''میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟''

''میں سفید ٹویوٹا کار میں آؤں گا۔ تمہیں بچے کے ساتھ پہچان لوں گا۔ بس تیار رہو۔ میں آ رہا ہوں۔''

شہباز درانی کے تعاون سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ صبارانی نے نہیں اس ڈاکو نے زیورات چرائے تھے۔

قانون سے کھیلنے والوں نے خوب کھیل دکھایا تھا۔ پہلے سفید کو سیاہ بنایا' پھر سیاہ کو سفید بنا دیا۔ صبارانی کے ساتھ خوب زیادتی کی گئی تھی پھر مہربانی بھی کی گئی۔ ایک برس دو ماہ بعد اسے عدالت میں پہنچا کر تمام الزامات سے بری کرا لیا گیا۔

جواد اکبر نے اپنے طور پر بہت کوششیں کی تھیں کہ اس پر سے چوری کا الزام ختم نہ ہونے پائے مگر اس معاملے میں وہ ناکام رہا۔ جب وہ باعزت طور پر بری ہو کر عدالت سے باہر آئی تو جواد کو ایک شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنا پڑا۔ وہاں پریس اور ٹی وی کے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کا ہجوم تھا۔ مختلف چینلز کے لیے نیوز تیار کی جا رہی تھیں۔ ان دونوں سے طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے۔ صبارانی خوش تھی۔ چہک چہک کر جواب دے رہی تھی۔ جواد کیمروں کے سامنے جبراً مسکرا رہا تھا۔ بہت مجبور ہو کر یہ بیان دے رہا تھا کہ صبارانی ایک اچھی اور خدمت گزار بیوی ہے۔ وہ اسے جیل سے اپنے گھر لے جانے پر فخر کر رہا ہے۔

میڈیا کے ذریعے دنیا والوں کے سامنے اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ آئندہ کبھی طلاق دینے کے لیے اپنی شریکِ حیات کی کوئی کمزوری اور خامی نہیں نکال سکتا تھا۔ ستارہ بھی نیوز چینلز پر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ صبارانی ایسی سوکن بن گئی تھی جسے وہ جواد کی زندگی سے کبھی نکال نہیں سکتی تھی۔

اس نے فون پر جواد سے کہا۔ ''اس میں شبہ نہیں ہے کہ تم نے اپنی ملازمت بھی بچائی ہے اور ایک قیدی عورت کے ساتھ گناہ گار بھی نہیں کہلائے۔ تمہیں نیک نامی مل رہی ہے مگر یہ صبارانی زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارے ساتھ کینسر کی طرح لگی رہے گی۔''

''ہاں۔ یہ ایسی مصیبت بن گئی ہے جس سے پیچھا چھڑانے میں ایک عرصہ لگے گا۔ میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ کسی دوست یا دشمن کو اپنے مزاج کے خلاف برداشت نہیں کرتا۔ یہ بیوی بن کر نہیں' چیلنج کر میری کوٹھی میں آئی ہے۔ مجھے سوچنے دو کہ میں کس طرح اسے ٹھکانے لگا سکتا ہوں۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تم میرا یہ بچہ گود نہیں لے سکو گی۔ میں اسے اغوا کراؤں گا... اس کی ماں سے چھپا کر لاؤں گا تو نعیم بھید کھول دے گا۔''

''بچے کو رہنے دو۔ پہلے اس بلا کو اپنی زندگی سے نکالو۔ وہ کم بخت مرے گی تو وہ بچہ ہمارا ہی ہو گا۔''

وہ صبارانی کی ہلاکت کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا۔ دشمن نعیم اس کی غیر طبعی موت کو جواد کے گلے کا پھندا بنا سکتا تھا۔ ستارہ نے کہا۔ ''وہ کم بخت گلے میں ہڈی بن گئی ہے۔ نہ نگل سکو گے' نہ اگل سکو گے۔ اسے آفرین کی طرح ختم کرنے کی غلطی نہ کرنا۔''

''ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ مگر کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ نعیم نے پھانسی کا پھندا نہ سہی لیکن مجھے پھولوں کے پھندے میں کس دیا ہے۔ اس دو ٹکے کی قیدی عورت کو دیکھ کر میرا دم الجھتا رہے گا۔''

وہ تم غلط کرنے کے لیے پی رہا تھا اور فون پر بول رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر تھا کہ صبارانی بڑے پیار سے آئی تھی اور اس کی باتیں سن کر ٹھٹک گئی تھی۔ ستارہ کہہ رہی تھی۔ ''ادھر تمہارا دم الجھ رہا ہے، ادھر میرا سکون غارت ہو رہا ہے۔ اللہ کرے نعیم مر جائے۔ پھر ساری رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی۔''

وہ چونک کر بولا۔ ''واہ میری جان! کیا آئیڈیا دیا ہے؟ واقعی نعیم کو ٹھکانے لگانے کے بعد تمہاری اس سوکن کو بھی ٹھکانے لگا سکوں گا۔''

''پلیز جواد! اس معاملے میں جلد بازی نہ کرنا۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ نعیم بہت چالاک ہے۔ تمہارا وار خالی جائے گا تو اس کے جوابی وار سے بچ نہیں پاؤ گے۔''

''تم اطمینان رکھو۔ میں اس سلسلے میں جلد بازی نہیں کروں گا۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہوشیار رہنے والوں پر کب اور کس طرح جھپٹنا چاہیے؟''

اس نے فون بند کر دیا۔ صبارانی وہاں سے دبے قدموں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ تو جانتی تھی کہ جواد اسے دل سے نہیں چاہتا ہے۔ پہلے کی طرح داشتہ سمجھ کر اپنی ٹھوکروں میں رکھتا ہے مگر یہ حقیقت اب معلوم ہوئی تھی کہ وہ اسے گلے کا پھندا سمجھتا ہے' اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ صرف یہی نہیں' اس کے بچے کو بھی کسی سوکن کی گود میں پہنچانا چاہتا ہے۔

ایک ماں کو اپنی جان سے زیادہ اپنے بچے کی سلامتی کی فکر رہتی ہے۔ عقل نے سمجھا دیا کہ بچہ اس کوٹھی میں محفوظ نہیں رہے گا۔ ایسے وقت امجد غوری یاد آیا۔ اس نے کہا تھا' نعیم نے اس کا کیس لڑ کر اسے رہائی دلائی ہے۔ ورنہ جواد کبھی اسے جیل سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ وہ جواد پر بھروسا کرتی تھی۔ اس وقت اس سچائی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اب سوچ رہی تھی کہ امجد غوری اور نعیم صدیقی سے کس طرح رابطہ کرے؟ کس طرح اپنے بچے کے لیے حفاظتی انتظامات کرے؟

جواد اسے کوٹھی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ



کسی کا فون نمبر بھی نہیں جانتی تھی۔ بڑی رازداری سے کوٹھی کے باہر جا کر اپنے مددگاروں کا پتا ٹھکانا اور فون نمبرز معلوم کرنا چاہتی تو بھٹکتی رہ جاتی۔ پھر جواد اکبر کے ہتھے چڑھ جاتی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رونے لگی۔ اس پر جب بھی کوئی مصیبت آتی تو وہ رو دھو کر صبر کر لیا کرتی تھی۔ مصائب سے لڑنے کے لیے نہ اس کے پاس کبھی عقل رہی نہ کہیں سے سہارا ملا۔ لیکن اس بار وہ صبر نہیں کر رہی تھی۔ بچے کو دودھ پلاتی تھی۔ اسے چومتی تھی اور سوچتی تھی کہ جگر کے ٹکڑے کو کہاں لے جا کر چھپائے؟ اتنی بڑی دنیا میں ایک ننھے سے بچے کو سوکن سے دور زندہ سلامت رکھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ جواد اس سے جانوروں کی طرح سلوک کرنے لگا تھا۔ اسے صوفوں پر بیٹھنے اور بیڈ پر لیٹنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ ننگے فرش پر سوتی اور بیٹھتی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ وہ دو پیروں سے نہ چلے۔ اس کے سامنے چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک کر جانوروں کی طرح چلتی پھرتی اور گھر کا تمام کام کرتی رہے۔

اور بھی کچھ ایسی شرمناک حرکتیں کرتا تھا کہ اسے گھن آتی تھی۔ وہ جان چھڑا کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر بچہ وہاں آرام سے تھا۔ چونکہ وہ جواد کا بیٹا تھا، اس لیے رئیس زادوں کی طرح پرورش پا رہا تھا۔ وہ اسے لے کر فرار ہونا چاہتی تو اپنے ساتھ اس ننھے کو بھی فاقوں سے مارتی۔ جہاں بھی اسے لوٹنے والے ملتے' وہاں اس بچے کی بھی شامت آ جاتی۔

وہ بار بار کہتا۔ ''اگر آرام اور سکون سے انسانوں جیسی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو بچے کو میرے حوالے کر کے طلاق لے لے۔ یہ بیان لکھ دے کہ تو بچے کو بوجھ سمجھتی ہے اور میرے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔ راضی خوشی طلاق لے کر جا رہی ہے۔ میری بات مانے گی تو پچاس ہزار دے کر یہاں سے رخصت کروں گا۔''

وہ کہتی تھی۔ ''میں تمہاری تمام باتیں مان لوں گی۔ پچاس ہزار بھی نہیں لوں گی مگر اپنے بچے کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ جیوں گی تو اس کے ساتھ ورنہ... یہیں اس کے ساتھ مر کر مر جاؤں گی۔''

وہ ضدی تھی۔ بری طرح مار کھاتی تھی۔ لہولہان ہو جاتی تھی مگر بچے کو چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوتی تھی۔ جواد نے ستارہ کے پاس آ کر کہا۔ ''وہ سور کی بچی بہت ڈھیٹ ہے۔ میں مارتے مارتے تھک گیا ہوں مگر وہ مار کھاتے نہیں تھکتی۔ جیل کی چار دیواری میں رہ کر سخت جان ہو گئی ہے۔''

ستارہ نے کہا۔ ''کیوں اس کے پیچھے ہلکان ہو رہے ہو؟ اس کم بخت کی وجہ سے گناہ گار کہلانے والے تھے۔ کوڑوں کی سزا مل سکتی تھی۔ تمہاری برسوں کی ملازمت جانے والی تھی۔ اگر نکاح نامہ پیش نہ کرتے تو ذلت کی پستی میں گر جاتے۔ وہ عورت تمہارے لیے منحوس ہے۔ اس سے پیچھا چھڑا لو۔ بچہ دے کر نجات حاصل کر لو۔ تم آج بھی بگڑے جوانوں جیسے ہو۔ تم سے ایک نہیں دس بچے حاصل ہو جائیں گے۔''

وہ اس رات ستارہ کے پاس رہ کر پیتا رہا اور صبارانی کو گالیاں دیتا رہا۔ ادھر وہ کوٹھی میں تھی۔ یہ بات عقل میں آئی کہ جواد کی ٹیلی فون ڈائری پڑھے۔ اس میں دوستوں کے ہی نہیں نعیم جیسے دشمنوں کے نمبرز بھی درج ہوں گے۔

اس نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر لیا تاکہ جواد اچانک نہ چلا آئے۔ پھر ڈائری کھول کر نام اور نمبرز پڑھنے لگی۔ این کے خانے میں پہلے ہی صفحے پر نعیم صدیقی کا نمبر مل گیا۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر وہ نمبر پنچ کیے۔

دوسری بیل جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی نعیم صدیقی کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو جواد! یہ دشمن کیسے یاد آ گیا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''مم... میں صبا رانی بول رہی ہوں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''صبارانی؟''

''ہاں۔ وہ گھر میں نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے آپ کا نمبر ملا ہے۔ میں اس سے چھپ کر فون کر رہی ہوں۔''

''تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ بات کیا ہے؟''

''میرے بچے پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ ایک وکیل صاحب نے کہا تھا، آپ میرا کیس لڑ رہے ہیں۔ مجھے چوری کے الزام سے بری کرا رہے ہیں۔''

''ہاں۔ میں نے ہی تمہیں جیل سے رہائی دلائی ہے۔''

''کیا آپ میرے جگر کے ٹکڑے کو کہیں چھپا کر رکھ سکتے ہیں؟ میں یہاں اپنی جان دے سکتی ہوں مگر اس کی سلامتی اور بہتری کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔''

''میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ گیا ہوں۔ ابھی تم نے بتایا' جواد گھر میں نہیں ہے۔ کیا آدھے گھنٹے بعد بچے کے ساتھ کوٹھی سے باہر آ سکتی ہو؟''

''آ جاؤں گی۔ آپ کہاں ہیں؟''

''گھر سے نکل رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔''

''میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟''

''میں سفید ٹویوٹا کار میں آؤں گا۔ تمہیں بچے کے ساتھ پہچان لوں گا۔ بس تیار رہو۔ میں آ رہا ہوں۔''

وہ ریسیور رکھ کر واش روم میں آئی۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر حلیہ درست کیا۔ اپنا اور بچے کا لباس تبدیل کیا۔ پھر اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا کر باہر آگئی۔ بڑے اہتمام سے گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے پوچھا۔ ”کہاں جارہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”کہیں بھی جارہی ہوں۔ تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟“

”میں اپنے مالک کا وفادار ہوں۔ ان کا حکم ہے، تمہیں کوٹھی سے باہر نہ جانے دیا جائے۔“

”سامنے سے ہٹو۔ میں جاؤں گی۔“

دونوں میں ’تُو تُو مَیں مَیں‘ ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت سفید ٹویوٹا وہاں آکر رکی۔ نعیم نے کار سے باہر آکر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

صبارانی نے کہا۔ ”یہ مجھے باہر جانے سے روک رہا ہے۔ جواد نے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔“

نعیم نے ایک الٹا ہاتھ چوکیدار کو رسید کیا۔ پھر ریوالور نکال کر نشانہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”تیرے بیوی بچے ہیں؟“

اس نے سہم کر ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ”تو پھر گولی چلنے سے پہلے بھاگتا ہوا ان کے پاس چلا جا۔ وہ تجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہیں گے۔“

وہ فوراً ہی ایک طرف بھاگنے لگا۔ نعیم نے ماں اور بچے کو کار میں لا کر بٹھایا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ وہ بولی۔ ”میں جلدی میں آئی ہوں۔ بچے کی دوائیں اور دوسری چیزیں وہیں چھوڑ آئی ہوں۔“

”فکر نہ کرو۔ تمہارے اور بچے کی تمام ضروری چیزیں مل جائیں گی۔ ابھی جلد سے جلد محفوظ پناہ گاہ میں پہنچنا چاہیے۔“

”آپ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟“

”یہاں سے پچیس میل دور میرا ایک فارم ہاؤس ہے۔ وہاں تم بچے کے ساتھ آرام سے رہو گی۔“

”جواد بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر لے جاسکتا ہے۔“

”اس کا باپ بھی تمہارے سائے تک نہیں پہنچ پائے گا۔ تمہاری طرف سے عدالت میں ایک عرضی پیش کی جائے گی۔ تم جواد کے بارے میں تحریری بیان دو گی کہ اس نے الزامات سے بچنے اور اپنی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے تمہیں شریکِ حیات مان لیا تھا۔ مگر گھر لے جا کر ظلم کرتا رہا۔ اپنی پھوپی زاد سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے۔ تمہارے سامنے شرمناک حرکتیں کرتا ہے۔“

”آپ جو کہیں گے، وہی بیان دوں گی۔ وہ میرے بچے کو تو چھین نہیں سکے گا نا...؟“

”قانون کے مطابق بچہ کم از کم پانچ برس تک ماں کے پاس رہتا ہے۔ پھر باپ اس کی پرورش کا حق دار ہوتا ہے۔“

وہ بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”کیا وہ پانچ برس بعد اسے لے جائے گا؟“

”میں لے جانے نہیں دوں گا۔ وہ میری بیوی اور بچے کا قاتل ہے۔ اس کے خلاف ثبوت اور گواہ تلاش کر رہا ہوں۔ اسے عمر قید ہوگی یا سزائے موت... پھر یہ بچہ صرف تمہارا ہی رہے گا۔“

وہ جواد کو اپنی بیوی آفرین کا قاتل ثابت نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی اسے سزا دلا سکتا تھا۔ مگر یہ طے کر چکا تھا کہ اس بچے کو جواد اور ستارہ تک کبھی پہنچنے نہیں دے گا۔

جواد اپنی عادت کے مطابق خوب پی رہا تھا۔ پھر ٹُن ہو کر ستارہ کی آغوش میں سو گیا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ لنچ کے بعد کوٹھی میں آیا تو چوکیدار نے بتایا کہ صبارانی بچے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ اسے روک نہ سکا کیونکہ اسے لے جانے والے کے پاس ریوالور تھا۔

اس نے سفید ٹویوٹا کار کا نمبر بتایا۔ جواد نے فوراً ہی نعیم کے خلاف رپورٹ درج کرائی اور اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرا دیا۔ امجد غوری صبح دس بجے ہی صبارانی کا تحریری بیان اور طلاق کا مطالبہ عدالت میں پیش کر کے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر چکا تھا۔

صبارانی کی جانب سے یہ عرضی بھی پیش کی گئی تھی کہ وہ جواد سے خوف زدہ ہے۔ اسے قتل کیا جاسکتا ہے یا ٹارچر کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا طلاق کا عدالتی فیصلہ ہونے تک وہ نعیم صدیقی کی پناہ میں رہنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ عرضی بھی منظور کر لی گئی تھی۔

جواد غصے سے تلملا رہا تھا۔ اس نے فون پر نعیم کو مخاطب کرنا چاہا مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ پھر گھر کے نمبر پر کوشش کی۔ رابطہ ہوتے ہی وہ اسے گالیاں دینے لگا۔

نعیم نے کہا۔ ”فون پر بھونکتے ہی رہو گے۔ میری شرافت دیکھو کہ جواباً گالیاں نہیں دے رہا ہوں۔ مجھے اطمینان ہے، صبارانی عدالت میں تمہارا کچا چٹھا بیان کرے گی۔ تمہارے اور ستارہ کے ناجائز تعلقات کی چشم دید گواہ بنے گی۔ تب تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔“

وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس اپنی سانسیں گنتے رہو۔“

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ ہمت والوں کے کام



ہیں۔ کیا تمہارے باپ نے بھی کبھی کسی کو قتل کیا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو۔ تمہاری چہیتی آفرین کو میں نے ہی اس بے کے کالیج میں موت کی نیند سلایا تھا۔ تم بھی میرے ہاتھوں حرام موت مرو گے۔“

وہ بولا۔ ”پلیز! اپنی باتیں پھر سے دہراؤ۔ میرے اس فون سے ریکارڈر منسلک ہے۔ یہ بات اچھی طرح ریکارڈ ہوں رہے گی کہ تم نے میری بیوی آفرین کو قتل کیا ہے اور اب مجھے ہلاک کرنے والے ہو۔“

اس نے فوراً ہی گھبرا کر فون بند کر دیا۔ ستارہ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”وہ بہت مکار ہے۔ میری تمام باتیں ریکارڈ کر رہا تھا۔“

وہ بڑے پیار سے ڈانٹنے کے انداز میں بولی۔ ”جواد! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ غصے میں اتنے پاگل کیوں ہو جاتے ہو؟ دشمن سے بات کرتے وقت محتاط کیوں نہیں رہتے؟ اب بولو... کیا ہوگا؟“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ ”میں نہیں جانتا، کیا ہوگا؟ مگر اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بھلے مجھے پھانسی ہو جائے۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ تمہارے بغیر میں کیسے جی سکوں گی؟ یہ دشمنی ختم کرو۔ کسی بھی طرح اس سے سمجھوتا کرو۔“

”وہ دشمنی کبھی نہیں بھولے گا۔ مجھ سے آفرین کا انتقام لیتا رہے گا اور میں اس کے سامنے جھکنے والا نہیں ہوں۔“

وہ غصے میں نعیم کو چیلنج کر رہا تھا مگر یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی پوزیشن کمزور ہے۔ اگر وہ راضی خوشی صبارانی کو طلاق نہیں دے گا تو وہ عدالت میں اس کے خلاف بہت کچھ بولے گی۔

اس نے ایک مظلوم قیدی عورت کو بیوی بنا کر جو نیک نامی حاصل کی تھی، اس سے زیادہ بدنامیاں مل سکتی تھیں۔ پھر یہ کہ نعیم کے پاس اس کی آڈیو ریکارڈنگ موجود تھی۔ اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ اسے اور صبارانی کو قتل کرنے والا ہے۔

اس نے کئی حیل و حجت کے بغیر اسے طلاق دے دی۔ وہ فارم ہاؤس سے نکل کر نعیم کی کوٹھی میں آکر رہنے لگی۔ ستارہ نے فون پر نعیم سے کہا۔ ”جواد نے طلاق دے دی ہے۔ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بچہ ماں کے پاس رہے گا۔ وہ کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتائے گا۔ اب تو ہمیں صلح صفائی اور امن و امان سے رہنا چاہیے۔“

اس نے کہا۔ ”بے شک! میری آفرین مجھے واپس مل جائے گی تو میں امن و امان سے رہوں گا۔“

”تم پھر دشمنی کی باتیں کر رہے ہو؟“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں تو صرف اپنی مقتولہ شریکِ حیات کو یاد کر رہا ہوں اور اسے واپس بلا رہا ہوں۔“

”کیا تم جواد کو قتل کرنا چاہتے ہو؟“

”توبہ کرو۔ میں نے آج تک ایک چیونٹی نہیں ماری اور تم ایک بندے کو قتل کرنے کی بات پوچھ رہی ہو؟ پھر ایک بار توبہ کرو۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ نعیم نے ستارہ کے موبائل نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر وہ جھنجلا کر بولی۔ ”اب کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”کیا میری بات ریکارڈ کرنے کا فائدہ حاصل نہیں ہوا؟ اب تمہارے اس موبائل فون پر کہہ رہا ہوں۔ جواد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ انگارے چباتی رہو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ستارہ نے ٹیلی فون سیٹ کو ایک لات ماری۔ اس سے منسلک رہنے والا ریکارڈر دور فرش پر گر پڑا۔ جواد نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا، وہ محتاط رہے گا۔ کبھی فون پر غصہ نہیں دکھائے گا۔ گرفت میں آنے والی کوئی بات نہیں کرے گا۔“

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی اِدھر سے اُدھر جارہی تھی۔ اس کے پاس آکر بولی۔ ”وہ کتا دشمنی سے باز نہیں آئے گا۔ مرہی جائے تو اچھا ہے۔“

”وہ مرے گا۔ تم اسے کتا کہہ رہی ہو۔ کتے کی موت ہی مرے گا۔ اپنا موڈ ٹھیک کرو میری جان! میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔“

وہ اسے پیار سے تھپکنے لگا۔ دو ہفتے بعد نعیم صدیقی بزنس کے سلسلے میں لندن چلا گیا۔ جواد ایسے ہی موقعے کی تاک میں تھا۔ اس نے کرائے کے دو قاتلوں کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ دو لاکھ روپے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ پیشگی رقم ہے۔ اسے موت کی نیند سلا کر آؤ گے تو چار لاکھ اور دوں گا۔“

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ ”ہم ایک ہفتے کے اندر واپس آئیں گے۔ خوش خبری سنائیں گے، آپ رقم تیار رکھیں۔“

وہ انہیں رخصت کر کے ستارہ کے پاس آگیا۔ اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کرائے کے قاتلوں کو اس کے پیچھے بھیجا ہے۔ دو چار دن میں خبر ملے گی۔ وہ کم بخت مرے گا تو صبارانی بے سہارا ہو جائے گی۔ پھر اس

وہ ریسیور رکھ کر واش روم میں آئی۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر حلیہ درست کیا۔ اپنا اور بچے کا لباس تبدیل کیا۔ پھر اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا کر باہر آگئی۔ بڑے آہنی گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کہیں بھی جارہی ہوں۔ تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟''

''میں اپنے مالک کا وفادار ہوں۔ ان کا حکم ہے' تمہیں کوٹھی سے باہر نہ جانے دیا جائے۔''

''سامنے سے ہٹو۔ میں جاؤں گی۔''

دونوں میں 'تُو تُو میں میں' ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت سفید ٹویوٹا وہاں آکر رکی۔ نعیم نے کار سے باہر آکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

صبارانی نے کہا۔ ''یہ مجھے باہر جانے سے روک رہا ہے۔ جواد نے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔''

نعیم نے ایک الٹا ہاتھ چوکیدار کو رسید کیا۔ پھر ریوالور نکال کر نشانہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تیرے بیوی بچے ہیں؟''

اس نے سہم کر ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''تو پھر گولی چلنے سے پہلے بھاگتا ہوا ان کے پاس چلا جا۔ وہ تجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہیں گے۔''

وہ فوراً ہی ایک طرف بھاگنے لگا۔ نعیم نے ماں اور بچے کو کار میں لا کر بٹھایا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ وہ بولی۔ ''میں جلدی میں آئی ہوں۔ بچے کی دوائیں اور دوسری چیزیں وہیں چھوڑ آئی ہوں۔''

''فکر نہ کرو۔ تمہارے اور بچے کی تمام ضروری چیزیں مل جائیں گی۔ ابھی جلد سے جلد محفوظ پناہ گاہ میں پہنچنا چاہیے۔''

''آپ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟''

''یہاں سے پچیس میل دور میرا ایک فارم ہاؤس ہے۔ وہاں تم بچے کے ساتھ آرام سے رہو گی۔''

''جواد بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر لے جاسکتا ہے۔''

''اس کا باپ بھی تمہارے سائے تک نہیں پہنچ پائے گا۔ تمہاری طرف سے عدالت میں ایک عرضی پیش کی جائے گی۔ تم جواد کے بارے میں تحریری بیان دو گی کہ اس نے الزامات سے بچنے اور اپنی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے تمہیں شریکِ حیات مان لیا تھا۔ مگر گھر لے جا کر ظلم کرتا رہا۔ اپنی پھوپی زاد سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے۔ تمہارے سامنے شرمناک حرکتیں کرتا ہے۔''

''آپ جو کہیں گے' وہی بیان دوں گی۔ وہ میرے بچے کو تو چھین نہیں سکے گا نا...؟''

''قانون کے مطابق بچہ کم از کم پانچ برس تک ماں کے پاس رہتا ہے۔ پھر باپ اس کی پرورش کا حق دار ہوتا ہے۔''

وہ بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''کیا وہ پانچ برس بعد اسے لے جائے گا؟''

''میں لے جانے نہیں دوں گا۔ وہ میری بیوی اور بچے کا قاتل ہے۔ اس کے خلاف ثبوت اور گواہ تلاش کر رہا ہوں۔ اسے عمر قید ہوگی یا سزائے موت... پھر یہ بچہ صرف تمہارا ہی رہے گا۔''

وہ جواد کو اپنی بیوی آفرین کا قاتل ثابت نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی اسے سزا دلا سکتا تھا۔ مگر یہ طے کر چکا تھا کہ اس بچے کو جواد اور ستارہ تک کبھی پہنچنے نہیں دے گا۔

جواد اپنی عادت کے مطابق خوب پی رہا تھا۔ پھر ٹُن ہو کر ستارہ کی آغوش میں سو گیا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ لنچ کے بعد کوٹھی میں آیا تو چوکیدار نے بتایا کہ صبارانی بچے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ اسے روک نہ سکا کیونکہ اسے لے جانے والے کے پاس ریوالور تھا۔

اس نے سفید ٹویوٹا کار کا نمبر بتایا۔ جواد نے فوراً ہی نعیم کے خلاف رپورٹ درج کرائی اور اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرا دیا۔ امجد غوری صبح دس بجے ہی صبارانی کا تحریری بیان اور طلاق کا مطالبہ عدالت میں پیش کر کے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر چکا تھا۔

صبارانی کی جانب سے یہ عرضی بھی پیش کی گئی تھی کہ وہ جواد سے خوف زدہ ہے۔ اسے قتل کیا جاسکتا ہے یا ٹارچر کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا طلاق کا عدالتی فیصلہ ہونے تک وہ نعیم صدیقی کی پناہ میں رہنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ عرضی بھی منظور کر لی گئی تھی۔

جواد غصے سے تلملا رہا تھا۔ اس نے فون پر نعیم کو مخاطب کرنا چاہا مگر رابطہ نہ ہوسکا۔ پھر گھر کے نمبر پر کوشش کی۔ رابطہ ہوتے ہی وہ اسے گالیاں دینے لگا۔

نعیم نے کہا۔ ''فون پر بھونکتے ہی رہو گے۔ میری شرافت دیکھو کہ جواباً گالیاں نہیں دے رہا ہوں۔ مجھے اطمینان ہے' صبارانی عدالت میں تمہارا کچا چٹھا بیان کرے گی۔ تمہارے اور ستارہ کے ناجائز تعلقات کی چشم دید گواہ بنے گی۔ تب تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس اپنی سانسیں گنتے رہو۔''

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ہمت والوں کے کام ہیں۔ کیا تمہارے باپ نے بھی کبھی کسی کو قتل کیا ہے؟''

''تم بھول رہے ہو۔ تمہاری چہیتی آفرین کو میں نے ہی باکس بے کے کاٹیج میں موت کی نیند سلایا تھا۔ تم بھی میرے ہاتھوں حرام موت مرو گے۔''

وہ بولا۔ ''پلیز! اپنی باتیں پھر سے دہراؤ۔ میرے اس فون سے ریکارڈر منسلک ہے۔ یہ بات اچھی طرح ریکارڈ ہوتی رہے گی کہ تم نے میری بیوی آفرین کو قتل کیا ہے اور اب مجھے ہلاک کرنے والے ہو۔''

اس نے فوراً ہی گھبرا کر فون بند کر دیا۔ ستارہ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''وہ بہت مکار ہے۔ میری تمام باتیں ریکارڈ کر رہا تھا۔''

وہ بڑے پیار سے ڈانٹنے کے انداز میں بولی۔ ''جواد! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ غصے میں اتنے پاگل کیوں ہو جاتے ہو؟ دشمن سے بات کرتے وقت محتاط کیوں نہیں رہتے؟ اب بولو... کیا ہوگا؟''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ ''میں نہیں جانتا' کیا ہوگا؟ مگر اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بھلے مجھے پھانسی ہو جائے۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ تمہارے بغیر میں کیسے جی سکوں گی؟ یہ دشمنی ختم کرو۔ کسی بھی طرح اس سے سمجھوتا کرو۔''

''وہ دشمنی کبھی نہیں بھولے گا۔ مجھ سے آفرین کا انتقام لیتا رہے گا اور میں اس کے سامنے جھکنے والا نہیں ہوں۔''

وہ غصے میں نعیم کو چیلنج کر رہا تھا مگر یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی پوزیشن کمزور ہے۔ اگر وہ راضی خوشی صبارانی کو طلاق نہیں دے گا تو وہ عدالت میں اس کے خلاف بہت کچھ بولے گی۔

اس نے ایک مظلوم قیدی عورت کو بیوی بنا کر جو نیک نامی حاصل کی تھی، اس سے زیادہ بدنامیاں مل سکتی تھیں۔ پھر یہ کہ نعیم کے پاس اس کی آڈیو ریکارڈنگ موجود تھی۔ اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ اسے اور صبارانی کو قتل کرنے والا ہے۔

اس نے کسی حیل وحجت کے بغیر اسے طلاق دے دی۔ وہ فارم ہاؤس سے نکل کر نعیم کی کوٹھی میں آکر رہنے لگی۔ ستارہ نے فون پر نعیم سے کہا۔ ''جواد نے طلاق دے دی ہے۔ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بچہ ماں کے پاس رہے گا۔ وہ کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتائے گا۔ اب تو ہمیں صلح صفائی اور امن وامان سے رہنا چاہیے۔''

اس نے کہا۔ ''بے شک! میری آفرین مجھے واپس مل جائے گی تو میں امن وامان سے رہوں گا۔''

''تم پھر دشمنی کی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں تو صرف اپنی منقولہ شریکِ حیات کو یاد کر رہا ہوں اور اسے واپس بلا رہا ہوں۔''

''کیا تم جواد کو قتل کرنا چاہتے ہو؟''

''توبہ کرو۔ میں نے آج تک ایک چیونٹی نہیں ماری اور تم ایک بندے کو قتل کرنے کی بات پوچھ رہی ہو؟ پھر ایک بار توبہ کرو۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ نعیم نے ستارہ کے موبائل نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر وہ جھنجھلا کر بولی۔ ''اب کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیا میری بات ریکارڈ کرنے کا فائدہ حاصل نہیں ہوا؟ اب تمہارے اس موبائل فون پر کہہ رہا ہوں۔ جواد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ انگارے چباتی رہو۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ ستارہ نے ٹیلی فون سیٹ کو ایک لات ماری۔ اس سے منسلک رہنے والا ریکارڈر دور فرش پر گر پڑا۔ جواد نے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا' وہ محتاط رہے گا۔ کبھی فون پر غصہ نہیں دکھائے گا۔ گرفت میں آنے والی کوئی بات نہیں کرے گا۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی اِدھر سے اُدھر جارہی تھی۔ اس کے پاس آکر بولی۔ ''وہ کتا دشمنی سے باز نہیں آئے گا۔ مرہی جائے تو اچھا ہے۔''

''وہ مرے گا۔ تم اسے کتا کہہ رہی ہو۔ کتے کی موت ہی مرے گا۔ اپنا موڈ ٹھیک کرو میری جان! میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔''

وہ اسے پیار سے تھپکنے لگا۔ دو ہفتے بعد نعیم صدیقی بزنس کے سلسلے میں لندن چلا گیا۔ جواد ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے کرائے کے دو قاتلوں کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ دو لاکھ روپے دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیشگی رقم ہے۔ اسے موت کی نیند سلا کر آؤ گے تو چار لاکھ اور دوں گا۔''

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہم ایک ہفتے کے اندر واپس آئیں گے۔ خوش خبری سنائیں گے، آپ رقم تیار رکھیں۔''

وہ انہیں رخصت کر کے ستارہ کے پاس آگیا۔ اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کرائے کے قاتلوں کو اس کے پیچھے بھیجا ہے۔ دو چار دن میں خبر ملے گی۔ وہ کم بخت مرے گا تو صبارانی بے سہارا ہو جائے گی۔ پھر اس

سے نمٹ لیا جائے گا۔ میرا بچہ جلد ہی تمہاری گود میں آنے والا ہے۔''

نعیم دشمن کی چال سے بے خبر تھا۔ بے خبری میں یقیناً مارا جانے والا تھا۔ لندن میں کاروباری مصروفیت ایسی تھی کہ کسی دشمن کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں ڈنر کے بعد اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ لباس تبدیل کر کے سونا چاہتا تھا' ایسے وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

باہر سے آواز سنائی دی۔ ''میں ہوں رستم بابا...''

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم پاکستان سے یہاں آئے ہو؟ کیا کسی کی سپاری ملی ہے؟''

وہ دونوں اندر آ گئے۔ انہوں نے اپنا اپنا ریوالور نکالا۔ رستم بابا نے کہا۔ ''جواد اکبر نے آپ کے نام کی سپاری دی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''وہ الّو کا پٹھا نہیں جانتا کہ ہم آپ کے لیے کام کرتے ہیں۔''

نعیم نے کہا۔ ''تم لوگوں نے ستارہ کو اغوا کیا تھا، وہ تو تمہیں پہچانتی ہے۔''

''وہ موجود ہوتی تو پہچان لیتی۔ پھر وہ ہمیں دو لاکھ نہ دیتا۔ آپ کو قتل کرنے کے بعد چار لاکھ دے گا۔''

نعیم نے کہا۔ ''یعنی کہ چھ لاکھ... اس میں اور چھ لاکھ میری طرف سے جوڑ دو اور جا کر خوش خبری سناؤ کہ میرا کام تمام ہو چکا ہے۔ اسے مطمئن کرنے کے بعد میرا انتظار کرو۔ میں وہاں آ کر بتاؤں گا کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟''

وہ دونوں اسے سلام کر کے واپس چلے گئے۔ جس کی موت نہ آئی ہو، تقدیر اسے ایسی ہی ہیرا پھیری سے بچاتی ہے۔ جواد کی شامت آئی تھی۔ اسی لیے اس نے رستم بابا کو واردات کے لیے وہاں بھیجا تھا۔ انہوں نے واپس آ کر نعیم کا شناختی کارڈ اور موبائل فون پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اسے قتل کر کے دریائے ڈیمز میں پھینک دیا ہے۔''

یہ ثبوت کافی تھے۔ اسے یقین ہو گیا۔ اس نے بقیہ چار لاکھ روپے ادا کر دیے۔ کرائے کے قاتل خوش ہو کر چلے گئے۔ دوسرے ہی دن لندن آفس سے اطلاع ملی کہ نعیم صدیقی پچھلے دو دن سے لاپتا ہے۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ پاکستان بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟

ستارہ اور جواد مطمئن تھے۔ یہی سمجھ رہے تھے' اس کی لاش کبھی کسی کو نہیں ملے گی۔ وہ دریائے ڈیمز میں بہتی ہوئی نہ جانے کہاں چلی گئی ہو گی؟

صبارانی بہت پریشان تھی۔ اچانک بے سہارا ہو گئی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں جواد کے خلاف بیان دیا جسے بے سروپا سمجھا گیا کیونکہ جواد اس عرصے میں لندن نہیں گیا تھا۔ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

نعیم نے ایک وصیت لکھی تھی کہ اسے کچھ ہو جائے تو صبارانی کو اس کی کوٹھی سے بے دخل نہ کیا جائے۔ اسے ماہانہ پچاس ہزار روپے دیے جائیں اور جواد کی دشمنی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے دو مسلح گارڈز کو بھی تنخواہیں دی جاتی رہیں۔

ستارہ نے ایک روز اس سے فون پر پوچھا۔ ''کیا تم نے نعیم کو اپنا یار بنا لیا تھا؟ وہ مرنے سے پہلے تمہارے لیے ایسے زبردست انتظامات کر گیا ہے۔''

صبارانی نے پوچھا۔ ''تمہیں مرچیں کیوں لگ رہی ہیں؟''

''میں تو بہت خوش ہوں۔ میرے کاروبار کو برباد کرنے والا اور بے ایمانی سے میری دولت اور جائیداد لوٹنے والا حرام موت مر گیا ہے۔''

صبارانی نے کہا۔ ''مجھے تیری شرمناک زندگی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر... تُو اپنے کزن کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہتی ہے۔ نعیم صاحب میرے محسن ہیں۔ انہیں اپنے ناجائز بچے کا باپ بنانا چاہتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آفرین نے یہ بھید کھولا تو تیرے یار جواد نے اس بے چاری کو باکس بے کے کامپلیکس میں قتل کر دیا۔''

ستارہ نے کہا۔ ''وہ تو مر گئی۔ تُو اپنی خیر منا۔ آگے تیرا کیا بنے گا؟''

''تیرے اس سوال کا جواب آنے والا کل دے گا۔''

ستارہ کچھ کہنا چاہتی تھی' ادھر سے فون بند ہو گیا۔ جواد اسے آغوش میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے فون سے کان لگا کر صبارانی کی باتیں سن رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''اچھا... تُو سوال کا جواب آنے والا کل دے گا۔ کل کیا وہ قیامت ڈھائے گی؟ کمال ہے... ایک بلی شیر کو للکار رہی ہے۔''

وہ پھر قہقہہ لگانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اصل مہرے کو مار چکا ہے۔ اب سے پہلے ذلت بھری زندگی گزارنے والی صبارانی تنہا رہ گئی ہے۔ وہ بس میاؤں میاؤں ہی کرتی رہے گی۔

صبارانی نے کہا تھا۔ ''آنے والا کل جواب دے گا...'' اور وہ نکل آیا... جواد دس بجے ناشتا کر کے کوٹھی سے باہر گیا



تھا۔ ستارہ نے دو گھنٹے بعد فون ریسیو کیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی سی' بھرائی ہوئی سی آواز سنی۔ ''ستارہ...! میں بول رہا ہوں اور شاید آخری بار بول رہا ہوں۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہو تم...؟''

''جہاں ہوں' وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہاں چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کون لوگ ہیں؟ جلدی بتاؤ...''

''بتانے سے پہلے ہی یہ گولی مار دیں گے۔''

''کچھ تو اشارہ دو۔''

''اشارہ تو دیا ہے۔ سمجھتیں کیوں نہیں؟''

''ہاں ہاں، سمجھ گئی۔ تم کسی قبرستان میں ہو مگر اس شہر میں کتنے ہی قبرستان ہیں۔ میں کہاں آؤں؟''

جواب میں ایک بھاری بھرکم سی آواز سنائی دی۔ ''آؤ گی تو تمہیں بھی یہیں سُلا دیا جائے گا۔ یہاں اپنے یار کے ساتھ سوتی رہو گی تو کیڑے کھاتے رہیں گے۔''

''کون ہو تم...؟ کیوں ہم سے دشمنی کر رہے ہو؟''

''یہ کتا جو ہمارے گن پوائنٹ پر ہے، ایک غریب بے سہارا لڑکی سے دشمنی کرتا رہا۔ اسے ساری عمر جیل کی چار دیواری میں رکھنے کی کوششیں کرتا رہا۔ جب قانون کی گرفت میں آنے لگا تو اسی لڑکی کے ذریعے نیک نامی کماتا رہا۔ جب نیک نامی ملی تو اسے گھر لے جا کر اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتا رہا۔ ایک دودھ پیتے بچے کو اس سے چھین لینا چاہا۔''

وہ ایک ذرا توقف سے غرّانے کے انداز میں بولا۔ ''کیا قصور تھا صبا رانی کا اور آفرین کا...؟ مُردہ بہ دست زندہ... آدمی مرنے کے بعد زندہ لوگوں کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔ اسے مٹی میں ملا دیں' چتا میں جلا دیں یا دریا برد کر دیں۔ مگر تیرے یار جیسے لوگ تو مرنے سے پہلے ہی زندہ رہنے والوں کو ہر لمحہ مارتے رہتے ہیں۔ مگر نہیں... تیرا یہ یار مرنے کے بعد زندہ لوگوں کے ہاتھوں خوار ہوتا رہے گا۔ آج کے بعد تُو یہ تماشا دیکھے گی... یہ لے، آواز سن... یہ مرنے کے بعد بہ دست زندہ رہنے والا ہے۔''

جواد کی چیخ سنائی دی۔ ''ستارہ! مجھے بچاؤ...''

اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر بالکل خاموشی چھا گئی۔ ستارہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اس نے چیختے ہوئے آوازیں دیں۔ ''جواد...! جواد...! بولو... تم بولتے کیوں نہیں؟''

وہی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''یہ کبھی نہیں بولے گا۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو قانون کے محافظوں سے بولنے کی غلطی نہ کرنا۔ تمہیں اس کی لاش مل جائے گی۔ مگر ذرا صبر سے انتظار کرنا ہو گا۔ فون کے پاس ہی رہنا۔ میں کسی وقت بھی کال کروں گا۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے دھمکی دی گئی تھی کہ اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرے گی تو جان سے جائے گی اور وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ جبکہ مرنے والے کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا چکی تھی۔ زندگی میں سب ہی قسمیں کھاتے ہیں مگر کوئی کسی کے ساتھ قبر میں نہیں جاتا۔

ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ وہی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''اس دنیا میں تیرے یار جیسے کتنے ہی کمینے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے لاش کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ واپس آ کر دیکھا تو یہ ننگا ہو گیا تھا۔ یقیناً چڑی موالی آئے ہوں گے۔ اس کا لباس اتار کر لنڈا... بازار لے گئے ہوں گے۔ انہیں پڑیا خریدنے کے پیسے مل گئے ہوں گے۔''

وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''تمہیں رونا نہیں چاہیے۔ یہ اپنی زندگی میں قیدی عورتوں کو ننگا کرتا رہا۔ اب مرنے کے بعد یہ ننگا ہوا ہے تو روتی کیوں ہو؟''

وہ روتے ہوئے' سسکتے ہوئے بولی۔ ''اب تو اُسے میرے حوالے کر دو۔''

''یہ تمہیں ضرور ملے گا۔ اگلی کال کا انتظار کرو۔''

رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ وہ روتی رہی' آنسو پوچھتی رہی' آہیں بھرتی رہی اور اپنے یار کو تصور میں برہنہ دیکھتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد پھر وہی آواز سنائی دی۔ ''آہ... مُردہ بہ دست زندہ... یہ ہماری دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ جرائم پیشہ افراد انسانی اعضا کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے گئے تھے۔ پھر واپس آ کر دیکھا تو تیرے یار کے دونوں گردے نہیں تھے۔ اگر یہ زندہ ہوتا تو بھی کسی کو زندگی دینے کے لیے اپنے گردے پیش نہ کرتا۔ چلو، مرنے کے بعد نیکی کما رہا ہے۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ میرے جواد کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟''

''وہی جو یہ زندگی میں زندہ لوگوں کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ اب آنسو پونچھو اور جاؤ۔ وہ نیو کراچی چھ نمبر والے

قبرستان میں پڑا ہے۔ اب تم اس کے قتل کی رپورٹ درج کرا سکتی ہو۔"

ان ماں بیٹی نے بھاگم بھاگ رپورٹ درج کرائی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا۔ اپنے تحریری بیانات دیے۔ فون پر کال کرنے والے نے تاکید کی تھی کہ صبارانی پر شبہ ظاہر نہ کیا جائے۔ ستارہ کو اپنی سلامتی عزیز تھی۔ لہٰذا اس سارے معاملے میں صبارانی کا ذکر نہیں آیا۔

ستارہ نے رودھو کر اس کی آخری رسومات ادا کر دیں۔ رات کو آ کر سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو فون کی گھنٹی نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ وہی سفاک آواز سنائی دی۔ "تم شاید آرام سے سو رہی ہو مگر وہ آرام سے نہیں ہے۔ دو بندے اس کی قبر کھود رہے ہیں۔"

وہ ایک دم سے روتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، تم کون ہو؟ دل و دماغ میں یہی بات آرہی ہے کہ تم نعیم ہو۔ اگر ہو تو خدا کے واسطے... میرے جواد کو معاف کردو۔ اب اس سے انتقام نہ لو۔"

"ایسے ظالموں سے قیامت تک انتقام لیا جاتا رہے، تب بھی ہماری دنیا میں کسی کو عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ سیدھی سی بات ہے، ظلم کبھی ختم نہیں ہوگا اور انتقام کا سلسلہ جاری رہے گا۔ رات کا ایک بجا ہے۔ اپنے یار سے محبت ہے تو جاؤ اور اس کی قبر کی حفاظت کرو۔"

وہ اتنی رات کو تنہا نہیں جا سکتی تھی۔ پولیس والوں کے ساتھ جانا چاہتی تو سوال کیا جاتا کہ اسے کیسے خبر ہوئی، وہاں قبر کھودی گئی ہے؟ وہ فون پر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "ارے... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟"

"وہ ہو رہا ہے جس کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سمجھ رہے تھے، قبر کھودنے والے کفن چور ہیں۔ کفن اتار کر لے جائیں گے اور مُردے کو وہیں چھوڑ دیں گے۔ مگر..."

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "مگر کیا...؟"

"کیا کہا جائے؟ ہماری دنیا میں مجرمانہ تجارت کی انتہا ہو چکی ہے۔ تم نے بڑے بڑے اسپتالوں کے ڈی سیکشن ہال میں مکمل انسانی ڈھانچے دیکھے ہوں گے۔ ایسے ڈھانچے اچھی قیمت پر خریدے جاتے ہیں۔ وہ قبر کھودنے والے تمہارے یار پر تیزاب ڈال کر گوشت گلا رہے ہیں۔"

وہ ایک دم سے چیخ پڑی۔ "نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تم جھوٹ سمجھ رہی ہو، ہم سے بحث کر رہی ہو اور ادھر سارا گوشت گل چکا ہے، صرف ڈھانچا رہ گیا ہے۔ پتا نہیں وہ لوگ اسے کہاں لے جائیں گے؟ میں معلوم کروں گا۔ پھر تمہیں اطلاع دوں گا۔ فون کے پاس رہو۔"

اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ شاید کسی نے کسی دشمن سے ایسا انتقام نہیں لیا ہوگا۔

ایک ہفتے بعد اسے فون پر صبارانی کی آواز سنائی دی۔ "میں بہت بیمار ہوں۔ نجی عبداللہ اسپتال میں پڑی ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ مرنے سے پہلے اس شخص کا نام بتانا چاہتی ہوں جو موت کے بعد بھی جواد سے انتقام لیتا رہا ہے۔ کیا ابھی آسکتی ہو؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی آرہی ہوں۔"

وہ جس حلیے میں تھی، اسی حلیے میں کوٹھی سے باہر آئی۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتی ہوئی اسپتال کے مطلوبہ وارڈ میں پہنچ گئی۔ وہاں صبارانی دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹک کر بولی۔ "تم تو اچھی بھلی نظر آرہی ہو؟"

"ہاں۔ تمہارا جواد اچھا بھلا نہیں ہے۔ کیا اس سے ملنا چاہو گی؟"

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ...؟ مگر وہ تو مر چکا ہے..."

"شیطان کبھی نہیں مرتا۔ یقین نہ ہو تو آکر دیکھ لو۔"

وہ ایک طرف جانے لگی۔ ستارہ بھی متجسس سی ہو کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس ہال میں آئی جہاں سرجری کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ ایک جانب ایک مکمل انسانی ڈھانچا اسٹینڈ پر لٹک رہا تھا۔ ستارہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ فون پر اس سے کہا گیا تھا، انسانی ڈھانچوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

اسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔ "غور سے دیکھو... یہی تمہارا یار ہے۔"

اس نے چونک کر سر گھماتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پیچھے نعیم صدیقی مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "تم اسے اچھے داموں خرید کر لے جا سکتی ہو۔ اس کے ساتھ اپنی زندگی کی تمام راتیں گزار سکتی ہو۔"

وہ صبارانی کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے بولا۔ "مجھے میری آفرین بچے سمیت مل گئی ہے۔"

ستارہ چکرا کر گر پڑی۔ اس کے سر کے قریب ہی جواد بتیسی نکالے لٹک رہا تھا۔



# جل پری

مرزا ظفر بیگ

زندگی واقعات کا مجموعہ ہے۔ کسی شخص کی زندگی میں واقعات اتنی تیزی سے رونما ہوتے ہیں کہ اسے سوچنے کی مہلت تک نہیں ملتی۔ چندایسے کرداروں کے گرد گھومتی کہانی جو لمحہ بہ لمحہ مشکلات کے بھنور میں پھنستے جا رہے تھے۔

**اس جرم کا ماجرا جس کی منصوبہ بندی نہایت مہارت سے کی گئی تھی**

فارلے شہر جنوبی کیرولائنا کے زیریں علاقے میں واقع ہے۔ اس شہر کی واحد دلچسپی اور قابلِ توجہ چیز اس کی ٹیکسٹائل مل تھی جس نے اس شہر کی اقتصادی حالت بدل دی تھی ورنہ یہ خشک اور بنجر علاقہ تھا۔ یہاں پہاڑیاں تھیں۔ گرد تھی اور ناقابلِ برداشت موسم تھا جس کی وجہ سے شاید کوئی بھی یہاں رہنا پسند نہ کرتا مگر صرف اس ٹیکسٹائل مل کی وجہ سے یہاں لوگ آباد تھے۔ اس شہر کے بیشتر لوگ اس مل میں کام کرتے تھے اور شام کو مقامی ہوٹلوں اور ریستورانوں میں چلے جاتے تھے جہاں وہ سیاست، کھیلوں، مقامی اسکینڈلز یا پھر کاٹن کی قیمتوں پر بات کرتے تھے۔

رابرٹس نے اپنی کار ایک ٹرک کے پیچھے روکی اور جب وہ اترا تو سامنے ہی ڈاکٹر سموئیل نظر آیا۔ ڈاکٹر سموئیل ویسے تو ڈاکٹر تھا مگر وہ گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ تھا۔ جب سڑک پر چلتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے شامیانہ چلا آرہا ہے۔ رابرٹس کو دیکھتے ہی اس نے خوش دلی سے ہاتھ ہلایا اور دونوں ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ڈاکٹر سموئیل نے کہا۔ "میں نے کل نارس کو دیکھا تھا۔"

"مگر وہ تو شمالی کیرولائنا میں تھا۔" رابرٹس نے کہا۔

"غالباً ایش وِل گیا ہوا تھا۔"

"ہاں... وہ واپس آچکا ہے اور تمہیں تلاش کر رہا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

جواب میں رابرٹس نے کچھ نہیں کہا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟" رابرٹس نے بےزاری سے کہا۔

"کیا مجھ سے بھی چھپاؤ گے؟" ڈاکٹر نے کہا تو رابرٹس ہنس دیا۔ پھر اس نے کہا۔

"ارے ہاں ڈاکٹر... آج میں نے ٹومائلز کے پہاڑی چشمے میں ایک لڑکی کو نہاتے دیکھا۔ وہ لڑکی تھی یا جل پری... اس دنیا کی مخلوق تو لگ ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے سنہرے بدن پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔" بولتے بولتے رابرٹس کا لہجہ خواب ناک ہو گیا۔

"تم ٹومائلز کی پہاڑی پر کیوں گئے تھے؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"کپاس کے کھیت دیکھنے گیا تھا۔" رابرٹس نے جواب دیا۔ "سخت گرمی تھی۔ میں نے سوچا کہ چشمے میں نہالوں۔ اچانک وہ حسینہ نظر آگئی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل اکیلی وہاں ایسی بےفکری سے نہا رہی تھی جیسے وہ اس کا گھر ہو۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یکایک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں وہاں سے ہٹ گیا لیکن جب دوبارہ گیا تو وہ غائب تھی... پتا نہیں وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور کہاں چلی گئی۔"

ڈاکٹر سموئیل اس ستائیس سالہ نوجوان کو دیکھ رہا تھا جو خاصا محنتی اور فرض شناس تھا۔ یکایک رابرٹس اٹھا اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

ڈاکٹر سموئیل کو رابرٹس ذاتی طور پر پسند تھا۔ اس نے کم عمری میں ہی خاصی ترقی کی تھی۔ رابرٹس نے ٹریڈ اسٹریٹ کی ایک پرانی عمارت میں دوسری منزل پر اپنا دفتر قائم کر رکھا تھا جہاں سے وہ کاٹن کے سودے کرتا تھا، اس کی بروکری کرتا تھا۔ اس نے بہت کم عرصے میں خاصا منافع کما لیا تھا۔ اس کے دوسرے کاروبار بھی تھے مگر بنیادی کام کاٹن کی فروخت تھا۔ اس کے باپ دادا بھی یہی کاروبار کرتے رہے تھے۔

جب رابرٹس اپنے دفتر میں داخل ہوا تو مسز وھارٹن جا چکی تھی۔ وہ اس کی سیکریٹری تھی۔ ابھی وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ نارس آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہیلو کہا۔ نارس پچاس سال سے زائد عمر کا تھا مگر اپنے دبلے پتلے جسم کی وجہ سے چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔

"تم تو ایش وِل گئے تھے..." رابرٹس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہاں... کل ہی واپس آیا ہوں۔" نارس نے جواب دیا پھر اس نے گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں دعوت دینے آیا ہوں۔ آج رات ڈنر تم ہمارے ساتھ کرو گے۔"

یہ دعوت سن کر رابرٹس حیران رہ گیا۔ نارس اور اس کی بیوی ڈولی سے اس کی کبھی دوستی نہیں رہی تھی بلکہ وہ دونوں ہی رابرٹس کو ناپسند کرتے تھے۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔" نارس نے کہا۔ "تمہیں ضرور آنا ہے۔" نارس نے محبت آمیز لہجے میں اصرار کیا تو رابرٹس کو ہامی بھرنی پڑی۔

☆☆☆

ڈولی اور نارس کا مکان کیا تھا، پورا محل تھا۔ اس جیسا کوئی اور گھر پورے فارلے سٹی میں نہیں تھا۔ ایک ملازمہ نے رابرٹس کی راہنمائی کی۔ نارس ایک مستطیل کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس نے رابرٹس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور کہا۔ "تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں کیسے دعوت دے دی۔ اس دعوت کے پیچھے ایک وجہ ہے۔"

"وہ تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم میرے آفس آئے تھے۔" رابرٹس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں یہاں آنے پر افسوس نہیں ہو گا۔" نارس نے رابرٹس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندر والے کمرے میں گیا اور جب واپس لوٹا تو ایک جوان لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

"یہ میری بھانجی ہے اور اس کا نام جین ہارکنس ہے۔" پھر وہ اپنی بھانجی کی طرف مڑا اور اس سے کہا۔ "اور یہ رابرٹس ہے۔"

رابرٹس آنکھیں پھاڑے اس لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا جس کا تعارف نارس نے اپنی بھانجی کی حیثیت سے کرایا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی حسینہ تھی جسے رابرٹس نے پہاڑی چشمے پر نہاتے دیکھا تھا۔ نارس بڑی دلچسپی سے رابرٹس کو دیکھ رہا تھا جو اس کی بھانجی کو یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اس لڑکی کے حسن کا اسیر ہو گیا ہے۔ وہ لڑکی جس کا نام جین بتایا گیا تھا، واقعی غضب ڈھا رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور خیریت معلوم کی۔

اسی دوران میں نارس نے کہا۔ "کھانا تیار ہے۔" اس اعلان نے ان دونوں کی محویت کو توڑ دیا۔

اسی لمحے کمرے میں ڈولی کا بھاری بھرکم وجود نمودار ہوا۔



اسے دیکھ کر کسی ہاتھی کا خیال آ رہا تھا۔ جب کھانا شروع ہوا تو ڈولی اس پر ٹوٹ پڑی۔ اسے کھاتے دیکھ کر رابرٹس کو اندازہ ہوا کہ وہ گوشت کا پہاڑ کیسے بنی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس جیسی سے کوئی معقول آدمی کبھی شادی نہیں کر سکتا۔ یقیناً یہ ڈولی کے باپ کی دولت ہی تھی جس نے نارس جیسے لالچی انسان کو اس کی طرف راغب کیا تھا۔ ڈولی کے ماں باپ کا سمندر میں لانچ کے ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا تھا لہٰذا ان کی چھوڑی ہوئی تمام دولت جائیداد اور اس ٹیکسٹائل مل کی وہ بلاشرکت غیرے مالک تھی جس میں کبھی نارس ملازم تھا مگر ڈولی سے شادی کے بعد گویا ڈولی کی ہر چیز کا وہ بھی مالک بن چکا تھا۔ اسی لیے وہ گوشت کے اس پہاڑ کو برداشت کر رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کرتا تھا کہ ڈولی کھا کھا کر مر جائے تاکہ وہ اس کی دولت کا صحیح معنوں میں مالک بن جائے۔ ڈولی نارس کو شوہر سے زیادہ پالتو کتا سمجھتی تھی اور اکثر و بیشتر اس کی بےعزتی کرتی رہتی تھی مگر لالچی نارس اس کی ہر بات کو اس امید پر برداشت کرتا تھا کہ کسی نہ کسی دن تو وہ اس کی دولت کا مالک بنے گا۔

رابرٹس نے محسوس کر لیا تھا کہ ڈولی کی نظروں میں نارس کی بھانجی جین کے لیے پسندیدگی کے جذبات نہیں ہیں۔ وہ اسے مسلسل کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ نارس نے اسے اپنے گھر کیوں بلایا ہے... اور اپنی بھانجی سے کیوں ملوایا ہے۔ نارس ایک خودغرض انسان تھا۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی غرض شامل ہوتی تھی۔ رابرٹس اس غرض کو تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔

گھر پہنچ کر بھی رابرٹس کی بےچینی کم نہیں ہوئی۔ اس نے ایک رسالے کی ورق گردانی شروع کی مگر اس میں بھی دل نہیں لگا۔ وہ بستر پر بےچینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ مسلسل نارس، ڈولی اور جین کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

نارس پندرہ سال پہلے فارلے سٹی آیا تھا۔ وہ ایک مکار انسان تھا اس لیے جلدی ترقی کرتا چلا گیا۔ اسی دوران اس کا ڈولی کے ماں باپ کے گھر بھی آنا جانا ہوا اور اس لالچی انسان نے ڈولی کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا۔ اس طرح ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس شادی پر کسی کو بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ہر شخص جانتا تھا کہ نارس لالچی ہے۔

ادھر ڈولی نے بھی زندگی بھر دولت کو سب کچھ سمجھا تھا۔ اس نے اپنی دولت سے ہر من پسند چیز، ہر آسائش، ہر خوشی خریدی تھی۔ نارس کو بھی اس نے ایک کھلونا سمجھ کر ہی خریدا تھا اور اب اس سے کھیل رہی تھی۔

تین سال پہلے اچانک نارس کے گھر پولیس پہنچی اور اسے اپنے ساتھ ایش وِل لے گئی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا بات ہے مگر ایش وِل کے ایک اخبار میں کسی نے پوری کہانی پڑھ لی جو فارلے سٹی آ کر سبھی کو بتا دی۔

رابرٹس کو یاد آ رہا تھا کہ اس کہانی کے مطابق نارس کی ایک بہن ونفریڈ تھی جس نے ڈیولن ہارکنس نامی شخص سے شادی کی تھی۔ ڈیولن نے اپنی بیوی ونفریڈ کو ایک چھرے سے ذبح کر دیا تھا۔ پھر اس نے اسی چھرے سے خود کو بھی ہلاک کر لیا۔ فارلے سٹی کے کسی بھی فرد نے نہ ونفریڈ کو دیکھا تھا اور نہ ڈیولن کو۔ وہ دونوں کبھی فارلے سٹی نہیں آئے تھے کیونکہ ڈولی سے شادی کے بعد نارس نے اپنے تمام رشتے داروں کو چھوڑ دیا تھا مگر بعد میں اسے ایش وِل جانا پڑا۔ اس نے اپنی بہن بہنوئی کی تدفین کرائی۔ فارلے سٹی آ کر اس نے اس حوالے سے کسی کو کچھ نہیں بتایا... مگر اب... پورے تین سال بعد اچانک وہ ڈیولن اور ونفریڈ کی بیٹی اور اپنی بھانجی جین کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس نے رابرٹس کی اس انداز سے دعوت کی تھی کہ جہاں کوئی اور مہمان موجود نہیں تھا۔ یہی بات رابرٹس کو الجھا رہی تھی۔

☆☆☆


بطور خاص خواتین کیلئے

اب آپ کو بار بار تھریڈنگ یا ویکسنگ کی ضرورت نہیں

SHINE ON STRIPS

چہرے کلائیوں پنڈلیوں کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کا ایک بہترین ٹریٹمینٹ ہے اسکا استعمال




چہرے کے کیل مہاسوں داغ دھبوں کو بھی دور کرتا ہے۔ چہرے کیلئے قیمت 450 روپے دیگر حصوں کے بالوں کیلئے قیمت 1350 روپے محصول ڈاک خرچ 50 روپے علاوہ گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر وی پی پارسل طلب فرمائیں یا E-MAIL کریں۔

fairy.perfumers@hotmail.com

بے اولاد خواتین کیلئے خوشخبری

ایسی خواتین جو برسا برس سے اولاد سے محروم ہوں یا کسی پیچیدہ و پوشیدہ بیماری میں مبتلا ہوں حفظان صحت کی تدبیروں اور احتیاطوں پر معلوماتی بروشر مفت طلب کر سکتی ہیں۔

فیئری پرفیومرس پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی۔ 74600

یکا یک فون کی گھنٹی بجی تو رابرٹس اپنے خیالوں سے باہر نکل آیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر اپنے کان سے لگا لیا۔

”رابرٹس!“ دوسری طرف ڈولی تھی۔ ”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”اتنی رات کو!“ رابرٹس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں... یہ ضروری ہے۔“ ڈولی نے کہا۔ ”میں دیکھ رہی تھی کہ تم اس لڑکی جین پر کچھ زیادہ توجہ دے رہے تھے۔“

”ڈولی...“ رابرٹس نے کچھ کہنا چاہا تو ڈولی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میری بات دھیان سے سنو... کسی بھی وقت نارس کمرے میں آسکتا ہے۔ وہ لڑکی، لڑکی نہیں چڑیل ہے۔ وہ تمہیں برباد کردے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس سے دور رہو۔ میری بات کا یقین کرو۔“

”تم نہ جانے کیسی باتیں کررہی ہو۔“ رابرٹس نے کہا تو ایک بار پھر ڈولی نے اس کی بات کاٹ دی اور غراتے ہوئے کہا۔

”تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ تم اس کے ماں باپ کے قتل کی بات کررہی ہو۔“ رابرٹس نے کہا۔

”میں ان دونوں کی بات نہیں کررہی۔“ ڈولی نے ناراضی سے کہا۔ ”بلکہ اس لڑکی جین کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ اس بچی نے اپنے باپ کو اپنی ماں کو قتل کرتے دیکھا تھا پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اسے خود کو ہلاک کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد یہ لڑکی ذہنی مریضہ بن گئی تھی۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے۔ اسے اپنا کوئی ہوش نہیں رہتا تھا۔ تین سال تک یہ ایک پرائیویٹ نفسیاتی اسپتال میں داخل رہی ہے۔ نارس اسی سے ملنے جاتا تھا۔“

”چلو مان لیا... پھر تو یہ ٹھیک ہوگئی ہوگی جبھی ڈاکٹرز نے تین سال بعد اسے چھٹی دے دی۔“ رابرٹس نے کہا۔

”تم بے وقوف ہو... اور وہ ڈاکٹر بھی پاگل ہیں جنہوں نے اسے اسپتال سے چھٹی دی ہے۔“ ڈولی نے تلخی سے کہا۔ ”مگر میں اس بیمار لڑکی کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکوں گی۔“

”ظاہر ہے یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم جین کو اپنے گھر میں رہنے دیتی ہو یا نہیں... بہرحال، میں اس مسئلے پر سوچوں گا۔“ رابرٹس نے سنجیدگی سے کہا اور ”شب بخیر“ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ مگر وہ ریسیور کان سے لگائے رہا۔ پہلے ایک کلک کی آواز آئی پھر دوسری... اس کا مطلب یہ تھا کہ ایکسٹینشن پر نارس بھی ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

وہ رات رابرٹس نے بڑی بے آرامی سے گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہ کافی بنانے کچن میں پہنچا تو کال بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے نارس کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے نارس کو بھی کافی دی۔ نارس نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”ڈولی نے گزشتہ رات تم سے فون پر جو باتیں کی تھیں وہ میں نے بھی سنی تھیں۔“ یہ کہہ کر نارس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ ”رابرٹس! میں تمہیں سب کچھ بتانے والا تھا مگر اس کا وقت ہی نہیں ملا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جین کے بارے میں سب جان لو۔ ڈولی کی باتوں میں مت آنا۔ جین تمہیں پسند ہے اس کا اندازہ میں گزشتہ رات کرچکا ہوں۔“

”یعنی تم چاہتے ہو کہ میں اس کے ساتھ...“

”ہاں... جین کے لیے میری نظر میں تم سے بہتر شخص ہو ہی نہیں سکتا۔“ نارس نے کہا۔ ”اس وقت اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ تم اس سے ملو، اسے دیکھو، سمجھو، اس کے ساتھ وقت گزارو اور جب مطمئن ہوجاؤ تو اس سے شادی کرسکتے ہو۔“

”کیا وہ بالکل ٹھیک ہوچکی ہے؟“ رابرٹس نے سوال کیا۔

”وہ اب بالکل ٹھیک ہے ورنہ ڈاکٹر اسے ڈسچارج کیوں کرتے؟“

”تو ٹھیک ہے۔ میں جین کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔“ رابرٹس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ یہ سنتے ہی نارس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے رابرٹس کو..... گلے لگالیا۔

☆☆☆

رابرٹس اور جین کی دوستی کو ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے تھے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں۔ بعض اوقات اَن جانے خدشات اس کے ذہن میں سر اٹھاتے تھے مگر وہ انہیں جھٹک دیتا تھا۔

رابرٹس نے جین کے بارے میں ڈاکٹر سموئیل سے بھی بات کی تو اس نے کہا تھا کہ بہ ظاہر جین ٹھیک ٹھاک لگتی ہے لیکن اندرونی طور پر کوئی مسئلہ ہے تو اس کے لیے اس کا مکمل معائنہ کرنا ہوگا... مگر رابرٹس اس معائنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

اس رات جین، رابرٹس کے ساتھ اس کے گھر میں تھی۔ ان دونوں نے کھانا گھر میں ہی کھایا تھا۔ جین بہت خوش تھی۔ یکا یک اس نے رابرٹس سے کہا۔ ”مجھے بعض اوقات آنٹی ڈولی سے خوف آتا ہے۔ نہ جانے اسے میں اس قدر بری کیوں لگتی ہوں؟ یہ بات میری آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ مجھ سے جان چھڑانے کی سازش میں مصروف ہے۔“



جین کی بات سنتے ہی رابرٹس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ویسے بھی وہ اس قدر سنجیدہ ہوگئی تھی کہ رابرٹس کو شک ہوا کہ کہیں اسے پہلے کی طرح دورہ نہ پڑ جائے۔ جین بڑے غور سے رابرٹس کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”شاید تم مجھے ذہنی مریضہ سمجھ رہے ہو... تم سوچ رہے ہو کہ مجھے ماضی کی طرح دورہ نہ پڑ جائے... مگر ایسا نہیں ہے۔ میں بالکل صحیح ہوں۔ اگر انکل نارس نہ ہوتے تو اب تک ڈولی مجھے اپنے گھر سے نکال چکی ہوتی۔“

”تو تم ڈولی کا گھر چھوڑ دو... اپنے لیے الگ گھر لے لو۔“ رابرٹس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مسئلہ یہ ہے کہ میں الگ نہیں رہ سکتی۔“ جین نے کہا۔ ”جب میں ٹھیک ہوگئی تھی اور ڈاکٹرز نے مجھے اسپتال سے باہر جانے کی اجازت دی تھی تو... میں باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مین گیٹ تک جاتی تھی اور خوف زدہ ہوکر واپس آجاتی تھی۔“

”لیکن اب تم بالکل ٹھیک ہو۔“ رابرٹس نے کہا۔ ”دوست، دشمن کو پہچانتی ہو۔ اگر ڈولی تمہیں پسند نہیں کرتی تو اس کا گھر چھوڑ دو۔“

”تم میری مدد کرو گے رابرٹس؟“ جین نے عاجزی سے کہا۔

”بالکل کروں گا۔“ رابرٹس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں جانتیں کہ میری زندگی میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔“

اسی لمحے کال بیل بجی۔ اس بے وقت کی دخل اندازی پر رابرٹس کو بہت غصہ آیا مگر اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے نارس کو کھڑے پایا۔ وہ خاموشی سے اندر آگیا۔ اس کے چہرے پر برہمی تھی۔ شاید وہ ڈولی سے لڑ کر آیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ڈولی کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ جین اور رابرٹس ہمدردی سے نارس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی حالت کو سمجھ رہے تھے۔

”تم دونوں میرے ساتھ چلو... پیٹر کے کلب۔“ نارس نے کہا۔ ”اس طرح جین کا بھی دل بہل جائے گا اور میری ٹینشن بھی کم ہوجائے گی۔ سیر و تفریح کے لیے اچھی جگہ ہے۔“

رابرٹس پہلے تو ہچکچایا مگر پھر تیار ہوگیا۔ وہ سب رابرٹس کی کار میں پیٹر کے کلب پہنچے۔

پیٹر جو اس کلب کا مالک تھا شہر کے اتنے دولت مند لوگوں کو اپنے کلب میں دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور خود ان کی میزبانی میں مصروف ہوگیا۔ وہ تینوں ایک میز کے اردگرد بیٹھ گئے اور پیٹر ان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لینے خود کچن میں جا پہنچا۔ رابرٹس دیکھ رہا تھا کہ وہ کلب ٹیکسٹائل مل میں کام کرنے والے مزدوروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک معمولی سا کلب تھا۔ تھوڑی دیر بعد پیٹر نے ان تینوں کے سامنے مشروب لاکر رکھ دیا اور وہ پینے لگے۔

مشروب پیتے ہوئے نارس اس وقت کو برا بھلا کہہ رہا تھا جب اس نے ڈولی سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ رابرٹس کو وہ جگہ پسند نہیں آئی تھی جہاں وہ اس وقت بیٹھے تھے۔ اس لیے وہ نارس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہاں سے اٹھ بھاگے۔ نارس اور جین خوب باتیں کررہے تھے۔ انہیں نہ اس کلب کے ماحول کی پروا تھی اور نہ رابرٹس کے احساسات کی... جین بڑی پُرشوق نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اپنے انکل نارس کی باتیں سن رہی تھی۔

☆☆☆

اچانک وہاں ایک دھماکا ہوا۔ سبھی لوگ اس طرف گھوم کر دیکھنے لگے۔ رابرٹس نے بھی اس طرف دیکھا۔ وہ جیک تھا۔ اس کے سامنے ایک میز پر ایک عورت، مرد بیٹھے تھے۔ جیک نے عورت کے ساتھ بیٹھے مرد کو گالی دی تھی اور ساتھ ہی اس کی میز بھی پلٹ دی تھی۔ عورت کا ساتھی یہ دیکھ کر سراسیمہ ہوگیا۔ جیک اسے مسلسل گالیاں دیتا رہا۔ عورت گھبرا کر اپنی میز سے ہٹ گئی اور پیچھے جانے لگی۔

جیک نے گھوم کر عورت کو دیکھا اور کسی وحشی سانڈ کی طرح اس کی طرف دوڑا۔ اس نے چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ رابرٹس نے اپنی سیٹ چھوڑ دی کیونکہ جیک جس طرح دوڑا تھا اس سے لگتا تھا کہ وہ عورت کو لے کر ان کی میز سے آٹکرائے گا مگر رابرٹس نے درمیان میں ہی جیک کو روک لیا اور دو تین فولادی مکے اس کے منہ پر جڑ دیے۔ جیک کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ ایک دم فرش پر بیٹھ گیا۔ رابرٹس پھر اس کی طرف بڑھا مگر اس دوران پیٹر اور نارس نے اسے دائیں بائیں سے پکڑ لیا۔ اُدھر رابرٹس جین کی وجہ سے پریشان تھا۔ وہ جیک کے ہاتھ میں کھلا چاقو بھی دیکھ چکی تھی اور اس کی ناک سے بہتا ہوا خون بھی۔ رابرٹس کو فکر تھی کہ کہیں اسے پہلے کی طرح دورہ نہ پڑ جائے۔

نارس اور پیٹر نے رابرٹس کو پکڑ لیا اور سمجھا بجھا کر بٹھا دیا لیکن اب رابرٹس کا موڈ خراب ہوچکا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کلب سے باہر کی طرف چل دیا۔ جین اس کے ساتھ تھی۔ نارس بھی دوڑا دوڑا چلا آرہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم کائی کی

طرح پھٹ گیا تھا جس میں سے گزر کر وہ تینوں باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد رابرٹس کی کار نارس اور ڈولی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ رابرٹس نے اپنے برابر بیٹھی ہوئی جین کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور وہ نروس انداز میں بار بار اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

جب رابرٹس نے اپنی کار کو بریک لگائے تو کار کی آواز سن کر ڈولی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ رابرٹس نے سہارا دے کر جین کو نیچے اتارا اور اس سے کہا۔ ”تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں... میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ... شب بخیر۔“ جین نے جواب دیا۔

رابرٹس کے دیکھتے دیکھتے جین اندر دوڑتی چلی گئی۔ رابرٹس نے مڑ کر نارس کی طرف غصے سے دیکھا تو اس نے کہا۔ ”پیٹر کا کلب اتنی بری جگہ نہیں ہے... بس اتفاق تھا کہ وہاں وہ کم بخت جیک آ گیا اور... پھر مجھے بھی کیا معلوم تھا کہ وہاں یہ ناخوش گوار واقعہ پیش آ سکتا ہے۔“

رابرٹس نے کوئی جواب نہیں دیا تو نارس نے اس سے کہا۔ ”تم ایسا کرو، آج رات میرے گھر رک جاؤ۔ صبح چلے جانا۔“

رابرٹس نے سوچا کہ یہ ٹھیک ہے۔ وہ خود بھی جین کو دیکھنا چاہتا تھا تاکہ صبح ڈاکٹر سموئیل سے اس کے بارے میں بات کر سکے۔

☆☆☆

وہ بے چینی کے عالم میں سو رہا تھا۔ وہ سو ضرور رہا تھا مگر عجیب عجیب سے خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر ایسا لگا کسی نے اس کے ماتھے پر زور زور سے گھونسے مارنے شروع کر دیے ہیں۔ اس کی آنکھ کھلی... تو پتا چلا کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو نارس کو سامنے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ... وہ... جین... ڈولی... وہ... رابرٹس...“

جب اس کے منہ سے پورے الفاظ نہیں نکل سکے تو وہ رابرٹس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ وہ دونوں جین کے کمرے میں پہنچے مگر یہ دیکھ کر رابرٹس حیران رہ گیا کہ اس کا بستر خالی تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ وہاں سے نارس رابرٹس کو ڈولی کے کمرے میں لے گیا... وہاں کا منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ ایک لمحے کے لیے رابرٹس کو چکر آ گئے۔ ڈولی اپنے بستر پر اس حالت میں پڑی تھی کہ پورا بستر اس کے خون سے رنگین ہو رہا تھا اس کا گلا کسی تیز دھار والے چاقو سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ابھی تک خون نکل رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر رابرٹس مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔

”جین کہاں ہے؟“ رابرٹس نے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

”پتا نہیں کہاں ہے۔“ نارس نے جواب دیا۔ ”میں... نے... شور کی آواز... سنی... تو... ڈولی... خون... چاقو... گردن...“ کہتے کہتے نارس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا تو رابرٹس نے اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

”تم نے جین کو تلاش کیا؟“ رابرٹس نے پوچھا۔

”نن... نہیں... مم... میں... سیدھا... تمہارے پاس... آیا... تھا... اسے تلاش... کرو۔“ نارس نے بہ مشکل یہ الفاظ ادا کیے۔

”ہاں... ہم اسے تلاش کریں گے... فوراً۔“ رابرٹس نے کہا۔ ”آؤ... آؤ... میرے ساتھ...“ یہ کہہ کر رابرٹس نے نارس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”مم... میں... تمہارے ساتھ... نہیں... جاؤں... گا... میری حالت...“

رابرٹس نے غور سے قالین کی طرف دیکھا۔ کسی کے قدموں کے سرخ نشان دروازے کی طرف جا رہے تھے، وہاں سے وہ باہر نکل گئے تھے۔ اس گھر میں موت کا سناٹا چھا چکا تھا۔ آخر نارس کو وہیں چھوڑ کر رابرٹس گھر سے باہر نکلا۔ وہ زمین پر غور سے دیکھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ آخر وہ کھاڑی کے پشتے پر جا پہنچا۔ یہاں وہ محتاط انداز سے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ پھسلنے سے محفوظ رہے۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں اسے سفید لبادہ نظر آیا۔ وہ جین تھی۔ رابرٹس اس کی طرف دوڑا۔ رابرٹس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر جین نے زوردار چیخ ماری۔ اس وقت رابرٹس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ چاقو لہراتی ہوئی رابرٹس پر جھپٹی۔

☆☆☆

فارلے سٹی کے لیے ڈولی کے قتل کی خبر بہت بڑی تھی۔ ایسا قتل اس شہر کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ ڈولی کی موت کے بعد اب نارس ہی شہر کی سب سے بااثر قبل شخصیت تھا۔ قانونی کارروائی ضرور ہوئی مگر خاموشی سے... نارس نے جیوری کے بجائے ایک جج کی عدالت میں ٹرائل کی درخواست کی تھی جو منظور ہوئی۔ جج نے مقدمے کی سرسری سماعت کی۔ اس کی کیا مجال تھی کہ اوپر والوں کے خلاف جاتا۔ اسے جو حکم ملا وہ کرتا رہا۔

رابرٹس نے بھی بیان حلفی دیا اور اس رات کے تمام واقعات بیان کیے جس رات ڈولی قتل ہوئی تھی۔ شیرف نے یہ بیان دیا کہ اسے فون پر ڈولی کے قتل کی اطلاع ملی تھی... اور جب وہ اس کے گھر پہنچا تو نارس اور رابرٹس نے جین کو پکڑ رکھا



تھا۔ ان دونوں نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر اور اس کی بیماری کے بارے میں سن کر شیرف نے اسے جیل بھیجنے کے بجائے نفسیاتی اسپتال بھجوا دیا تھا جہاں وہ داخل تھی۔ اس کا علاج ہو رہا تھا اور شیرف کا ایک اپنی وہاں تعینات تھا۔

نارس نے اس نفسیاتی اسپتال کا ریکارڈ بھی عدالت میں پیش کر دیا تھا جہاں اپنے ماں باپ کی موت کے بعد جین داخل ہوئی تھی۔ اس ریکارڈ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جین کو پہلے بھی اس قسم کے دورے پڑتے تھے۔ ڈاکٹر سموئیل نے بھی ایسا ہی بیان دیا تھا۔ تمام حقائق پر نظر ڈالنے کے بعد جج نے جین کو ملزمہ کے بجائے مریضہ قرار دے دیا اور اسے اس وقت تک اسپتال میں رکھنے کا حکم دیا جب تک وہ بالکل ٹھیک نہ ہو جاتی۔ اس طرح فارلے سٹی میں گشت کرنے والی افواہوں کا خاتمہ ہوا اور ڈولی کے قتل کا باب بھی بند ہو گیا۔

رابرٹس عدالت سے سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ وہ ایک ہفتے تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس دوران اس کا شیو بھی بڑھ گیا اور بے خوابی کے باعث اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی پڑ گئے۔ وہ زیادہ شراب بھی پینے لگا تھا، ایسا کیوں تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک ہفتے بعد ایک روز صبح صبح ڈاکٹر سموئیل، رابرٹس کے گھر پہنچا۔ اس نے رابرٹس کو خوب ڈانٹا کہ اس نے اپنی یہ کیا حالت بنا لی ہے اور اپنے آفس کیوں نہیں جا رہا۔ اس کے سمجھانے بجھانے سے رابرٹس اٹھا۔ اس نے شیو بنایا اور نہا دھو کر تازہ دم ہو گیا۔ مگر جب وہ واپس اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو ڈاکٹر جا چکا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر سموئیل اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے رابرٹس کو اس کی خود ساختہ گوشہ نشینی ختم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب رابرٹس اپنے آفس پہنچا تو موسم بہت خوب صورت تھا۔ مگر رابرٹس اس موسم سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کا ذہن یکسو نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے چند ایک ضروری فائلیں دیکھیں اور رکھ دیں۔ اس کے ذہن میں وہ نفسیاتی اسپتال تھا جہاں جین کو رکھا گیا تھا۔ لگ بھگ گیارہ بجے وہ اپنے دفتر سے اٹھا اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسپتال کے گیٹ کے اندر وسیع لان میں بہت سے مریض بیٹھے یا لیٹے تھے اور کچھ نرسوں یا اپنے ساتھ آنے والوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک عورت نے رابرٹس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ پھر ایک بڑی عمر کی عورت آئی اور رابرٹس کو اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئی۔ راستے میں اس نے کہا۔ ”جین کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے بہت کم بات کرنی ہے... وہ بھی محتاط انداز سے۔“

جین کا کمرا خاصا آرام دہ تھا۔ نارس نے اس کی ہر سہولت کا خیال رکھا تھا، ایک نرس کمرے میں رکھے گلدان میں تازہ پھول سجا رہی تھی۔ رابرٹس کو دیکھتے ہی جین جلدی سے آگے بڑھی اور اس کے بازوؤں میں سما گئی۔ رابرٹس نے اس کی آنکھوں میں تازہ نمی صاف محسوس کی تھی۔

”اب تم کیسی ہو جین؟“ رابرٹس نے سوال کیا۔

”پہلے سے بہتر ہوں۔“ جین نے جواب دیا۔ ”وہ رات قیامت کی رات تھی... اس رات کا منظر... پتا نہیں کیا ہوا تھا۔“

یہ سنتے ہی کمرے میں موجود نرس نے رابرٹس کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ گفتگو کا موضوع بدل دے۔ رابرٹس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں کچھ دیر تمہارے ساتھ رہوں اور تمہارے ساتھ ہی لنچ بھی کروں؟“ یہ کہتے ہوئے رابرٹس نرس کی طرف گھوم گیا تھا۔ جواب میں نرس نے مسکراتے ہوئے اجازت دے دی۔

”یہاں کا کھانا بڑا مزے دار ہوتا ہے۔“ جین نے معصومیت سے کہا۔ ”وقتِ مقررہ پر ہمارا کھانا اس کھڑکی کے ذریعے ہمیں دے دیا جاتا ہے... تم بھی میرے ساتھ کھانا رابرٹس!“

”ضرور، ضرور!“ رابرٹس نے کہا۔

☆☆☆

رابرٹس برابر جین سے ملنے جاتا رہا۔ ایک ہفتے بعد ڈاکٹرز نے اسے رابرٹس کے ساتھ چہل قدمی کرنے کی اجازت دے دی۔ جلد ہی سب کچھ نارمل ہو گیا۔ رابرٹس بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر جین کو اسپتال سے کب ڈسچارج کریں گے؟

اس روز رابرٹس، جین کے پاس اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب جوتے کے انتخاب کا وقت آیا تو اس نے اپنے شیلف میں نظر ڈالی۔ حالانکہ وہاں چھ جوڑی جوتے رکھے تھے مگر رابرٹس کو کسی اور جوڑی کی تلاش تھی جو اسے شیلف میں نظر نہیں آ رہی تھی... وہ حیران تھا کہ اس کے سیاہ جوتے کہاں گئے... وہ جوتے اس نے ڈولی کے قتل والی رات پہنے تھے۔

اس نے جھک کر سیاہ جوتے تلاش کرنے شروع کیے اور تھوڑی دیر بعد وہ مل گئے۔ وہ فرش پر پڑے تھے۔ اس رات کی اگلی صبح جب وہ گھر واپس آیا تھا تو اس نے پریشانی کے عالم میں وہ جوتے فرش پر اتار کر ایسے ہی چھوڑ دیے تھے۔ اس دن سے نہ تو اسے ان کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ وہ اسے یاد آئے۔ وہ جوتے اٹھا کر سیدھا ہوا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ انہیں پالش کی ضرورت ہے۔ ان پر ابھی تک کھاڑی کے پشتے کی وہ سرخ مٹی لگی ہوئی تھی جہاں سے اس نے جین کو پکڑا تھا۔

جوتوں کو ہاتھ میں لے کر وہ بستر پر آن بیٹھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ جوتے دیکھتے ہی وہ دردناک منظر اسے پھر یاد آگیا تھا۔ اسے وہ نشان بھی یاد آگئے جو اس نے ڈولی کے گھر میں قالین پر دیکھے تھے پھر اسے یاد آیا کہ اس نے نارس سے پوچھا تھا کہ اس نے جین کو تلاش کیا؟ اس پر نارس نے جواب دیا تھا۔ ”نہیں... میں سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں۔“

وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اٹھا اور سیدھا شیرف لیتھم کے دفتر میں پہنچا۔ اس کو دیکھ کر لیتھم حیران رہ گیا مگر اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے ذہن میں کوئی الجھن ہے جسے سلجھانے وہ اس کے پاس آیا ہے۔

”شیرف! میں چاہتا ہوں کہ تم نارس سے بھی پوچھ گچھ کرو۔“ رابرٹس نے کہا۔ ”تم نے اسے ڈولی کا شوہر ہونے کے باعث بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اسے شاملِ تفتیش کرنا ضروری ہے۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“ شیرف لیتھم نے پوچھا۔

”فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“ رابرٹس نے کہا۔

”دیکھو رابرٹس! یہ کیس عدالت میں جا کر ختم ہو چکا ہے۔“ شیرف نے کہا۔ ”بیانات ہو گئے، سوال جواب ہو گئے۔ یہ ایک سیدھا سادہ سا کیس تھا جس کا فیصلہ عدالت بھی دے چکی ہے۔“

”دراصل اس سے پہلے کسی کے ذہن میں بھی کوئی شک یا شبہ نہیں تھا۔“ رابرٹس نے کہا۔ ”مگر اب ہے... ڈولی کے قتل کی رات نارس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ سیدھا میرے پاس آیا ہے۔ جبکہ وہ کچھ دیر پہلے چوری چھپے میرے کمرے میں آیا تھا۔ اس کے جوتوں کے نشان قالین پر بالکل واضح تھے۔ سوال یہ ہے کہ نارس کو یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تم اپنے اس شک سے کیا نتیجہ نکال رہے ہو؟“ شیرف نے پوچھا۔

”یہی کہ ممکن ہے، ڈولی کو جینی نے قتل نہ کیا ہو۔“ رابرٹس نے کہا۔

”گویا تم نارس پر الزام لگا رہے ہو کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ ہے نا؟“ شیرف لیتھم نے سوال کیا۔

”میں نے فی الحال یہ بات نہیں کی ہے۔“ رابرٹس نے کہا۔ ”ساری دنیا جانتی ہے کہ نارس ایک لالچی آدمی ہے۔ اس نے ڈولی کی دولت کی خاطر اس سے شادی کی تھی۔ وہ ایک ظالم اور بے رحم آدمی ہے۔ دولت کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایسا آدمی اپنی بیوی کو بھی قتل کر دے تو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔“

رابرٹس کی بات سن کر لیتھم گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ رابرٹس کی بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

☆☆☆

شیرف لیتھم اپنے ساتھ رابرٹس کو لے کر نارس کے گھر گیا اور اس مسئلے پر اس سے بات کی تو وہ حیرت سے رابرٹس کی طرف دیکھنے لگا۔ شیرف اور رابرٹس دونوں نے ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رابرٹس کا خون پی جائے۔

”میرا خیال ہے کہ رابرٹس کے ذہن میں خلل واقع ہو گیا ہے۔“ آخر نارس نے زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا دل و دماغ یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ جین ڈولی کو قتل کر سکتی ہے۔ یہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے اور فرضی نتیجے نکالتا رہتا ہے۔ دراصل یہ جین کی محبت میں دیوانہ ہو چکا ہے اور اسے قاتلہ کے روپ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ محبت چیز ہی ایسی ہے۔ اسے اس روز کلب میں بھی غصہ آگیا تھا جب اس نے جیک کی پٹائی کی تھی۔ میں نے اسی لیے اسے اپنے گھر میں روک لیا تھا کہ کہیں یہ اپنے گھر جا کر غصے میں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔“

یہ بات سن کر شیرف نے رابرٹس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، ہے کوئی جواب تمہارے پاس اس بات کا؟ رابرٹس خود بغلیں جھانکنے لگا تھا۔ وہ دونوں واپس چلے آئے۔ راستے میں شیرف نے رابرٹس سے کہا۔ ”جب تک نارس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرو گے، ہم اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔ وہ اس شہر کا ایک معزز آدمی ہے۔ ٹیکسٹائل مل کا مالک ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی روٹی چل رہی ہے۔ میں اس پر اندھا دھند ہاتھ نہیں ڈالوں گا، میرے لیے مشکل کھڑی ہو جائے گی۔“ رابرٹس محسوس کر رہا تھا کہ شیرف کی آواز اور اس کی آنکھوں میں ناگواری تھی۔

اسپتال کی طرف گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے رابرٹس سوچ رہا تھا کہ اب جین کا جلدی ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے تاکہ وہ ڈولی کی موت کے بارے میں اصل حقائق بتا سکے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ڈولی کو جین نے قتل نہیں کیا ہے۔

اچانک اس نے اپنی کار روک لی۔ اس سے آگے نارس کی کار تھی۔ وہ بھی جین سے ملنے اسپتال جا رہا تھا لہٰذا رابرٹس نے اپنی گاڑی بیک کی اور شہر کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔ وہ اس وقت نارس سے الجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ اپنی بھانجی کو اس کے خلاف بہکا بھی سکتا تھا اور اگر جین ہی اس کے خلاف ہو جاتی تو پھر کیا رہ جاتا؟ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر واقعی ڈولی کو نارس نے قتل کیا تھا اور اس کا الزام جین کے سر ڈال دیا تھا تو وہ بعد میں اس لڑکی کو بھی مروا سکتا تھا۔ اس کے پاس سیکڑوں راستے تھے۔ جین خودکشی کر سکتی تھی۔ اسپتال کا اسٹاف نارس کے کہنے پر اس کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ نارس اسے اسپتال سے غائب کرا سکتا تھا۔ اسے ایکسیڈنٹ میں ہلاک کروا سکتا تھا۔ جین سخت خطرے میں تھی۔ اسے نارس سے بچانا ضروری تھا۔

شہر آتے ہی نہ جانے رابرٹس کو کیا سوجھی کہ وہ جیک کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ وہی بدمعاش تھا جس سے رابرٹس کا پیٹر کے کلب میں جھگڑا ہوا تھا۔

جیک کا گھر لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا ایک کیبن تھا۔ اس کے احاطے میں مرغی کے بچے کھیل رہے تھے اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کیبن کے سامنے ایک نئی چمچماتی کار کھڑی تھی جو کسی بھی طرح اس جگہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کیبن کا راستہ دوسری طرف سے تھا۔ رابرٹس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا اور دروازے پر دستک دی تو جیک کی بھاری بھرکم بیوی نے دروازہ کھول دیا۔ رابرٹس پر نظر پڑتے ہی اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ ”آہا... تم اور ہم غریبوں کے گھر... آج تو ہماری خوش قسمتی کا دن ہے۔ خیریت تو ہے؟ کیسے آنا ہوا؟“

”مجھے جیک سے ملنا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔“ رابرٹس نے کہا۔

”تم نے تو اس کی اس قدر پٹائی کی تھی۔“ جیک کی بیوی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اب اس سے ملنے آئے ہو، کیوں؟“

”میں کوئی بات دل میں رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔“ رابرٹس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”رات گئی بات گئی۔“

”میرا جیک بھی اسی مزاج کا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کا تم سے جھگڑا ہوا۔ پھر اس نے اپنا دل صاف کر لیا مگر میرے خیال میں کوئی تیسرا فرد ہے جو اسے تمہارے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے۔“

”اسی لیے تو میں اس سے ملنے آیا ہوں۔“ رابرٹس نے کہا۔

☆☆☆

اسی دوران رابرٹس نے کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی، اس نے تھوڑا سا گھوم کر دیکھا تو اس نئی کار کو حرکت کرتے پایا جو اس نے اس کیبن کے سامنے کھڑی دیکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا، وہ کار تیزی سے روانہ ہو گئی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ جیک اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ رابرٹس چاہتا تو جیک کا پیچھا کر سکتا تھا، اسے روک بھی سکتا تھا مگر جب وہ اس سے ملنے کے موڈ میں ہی نہیں تھا تو سب فضول تھا۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے مسز جیک کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا۔ ”جب میں تم سے بات کر رہی تھی تو جیک سو رہا تھا اسی دوران اس کی آنکھ کھل گئی ہو گی... وہ تم سے ملنا نہیں چاہتا ہو گا اسی لیے دوسرے دروازے سے نکل کر چلا گیا۔“

”اس کے پاس یہ نئی کار کہاں سے آئی؟“ رابرٹس نے سوال کیا۔

”کہہ رہا تھا کہ کسی دوست نے مستعار دی ہے۔“

”اس دوست کا نام نارس تو نہیں ہے؟“ رابرٹس نے پوچھا۔

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ مسز جیک نے کہا۔ ”دراصل میں جیک کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتی۔“

ایک گھنٹے بعد رابرٹس شیرف لیتھم کے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس نے پوری کہانی شیرف کو سنا دی تھی مگر شیرف اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”مسٹر رابرٹس! تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ نارس نے جیک کو وہ نئی کار اس لیے دی تھی تاکہ وہ کلب میں جھگڑا کرے اور جین کے خوابیدہ جذبات کو ابھارے تاکہ جب نارس ڈولی کو قتل کر دے تو سب یہی سمجھیں کہ وہ جذباتی طور پر پہلے ہی مشتعل ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے ڈولی کو قتل کر دیا۔ تم یہی کہنا چاہ رہے ہو نا؟“

”بالکل... میرا یہی مطلب ہے۔“ رابرٹ نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کوئی بے سروپا بات نہیں کی ہے۔

ایسا ممکن ہے... بلکہ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"تم فضول باتیں کررہے ہو۔" شیرف نے کہا۔

"دیکھو شیرف، ذرا غور کرو۔" رابرٹس نے کہا۔ "نارس ایک ایسی لڑکی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لاتا ہے جو ابھی ابھی نفسیاتی اسپتال سے ڈسچارج ہوئی ہے۔ پھر وہ میری دعوت کرتا ہے۔ مجھے اس سے ملواتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ میں اس سے دوستی کرلوں۔ وہ ہم دونوں کو ملنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور ہمیں زبردستی پیٹر کے کلب لے جاتا ہے جہاں جیک بھی موجود ہے اور اس کے پاس چاقو بھی ہے... وہاں خوامخواہ کی لڑائی شروع ہوجاتی ہے اور جیک مشتعل ہو کر ایک شخص پر چاقو نکال لیتا ہے۔ وہ اس کی طرف بھاگتا ہے تو راستے میں لڑکھڑاتا ہے اور اس کا رخ جین کی طرف ہوجاتا ہے..."

"چلو مان لیا... تو پھر نارس نے تمہیں اپنے گھر رات بسر کرنے پر کیوں مجبور کیا؟" شیرف لیتھم نے کہا۔ "تاکہ تم اسے ڈولی کو قتل کرتے ہوئے پکڑلو؟ اگر نارس ڈولی کو قتل کرنا چاہتا تھا تو اسے تمہیں اپنے گھر نہیں روکنا چاہیے تھا۔"

"پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تم نارس کو چیک کرو۔" رابرٹس نے کہا۔ "اپنی بیوی ڈولی کو اسی نے قتل کیا ہے۔"

"اگر اس روز جین نے پیٹر کے کلب میں وہ چاقو نہ دیکھا ہوتا تو کیا ہوتا؟" شیرف لیتھم نے سوال کیا۔

"تو نارس کسی مناسب وقت کا انتظار کرتا... جب وہ اپنے منصوبے پر عمل کرسکے۔" رابرٹس نے جواب دیا۔ پھر اس نے کہا۔ "ویسے میں جیک کے پاس بھی جاؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ اس کے پاس نئی گاڑی کیسے آئی؟"

"بہرحال... جو بھی کرو احتیاط سے کرنا۔" شیرف نے کہا۔

اگلے دو ہفتے خاصے ہنگامہ خیز رہے۔ نارس محتاط ہوچکا تھا اور رابرٹس کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔ دوسری طرف جیک بھی روپوش تھا۔ اس کی گمشدگی کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی کیونکہ وہ اکثر اسی طرح غائب ہوا کرتا تھا۔ دوسری جانب جین بڑی تیزی سے صحت یاب ہورہی تھی۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔

ایک روز رابرٹس نے ڈاکٹر سموئیل سے جین کے بارے میں بات کی اور سوال کیا۔ "اسے ساری بات یاد تو ہوگی نا... خصوصاً ڈولی کے قتل والی رات..."

"فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" ڈاکٹر سموئیل نے جواب دیا۔ "بہرحال عدالت نے میری ذمے داری لگائی ہے کہ میں جین کا علاج کروں اور اسپتال جاکر بھی اس کی نگہداشت کروں۔ میرے پیش نظر اس کی صحت اور سو... ہے۔ میں اس سے ایسا کوئی سوال نہیں کروں گا جس کے باع... اسے پھر کوئی دورہ پڑجائے۔"

رابرٹس سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہیں نارس اس... کو مروا نہ دے کیونکہ اب وہ اس کے لیے خطرہ بن چکی تھی۔

☆☆☆

فارلے سٹی میں سردی کی پہلی لہر کی آمد نے ہی لوگوں کو ان کے گھروں میں بند کردیا اور وہ ڈولی کے قتل کی کہانی بھی بھول گئے۔ رابرٹس کو خبر ملی تھی کہ جیک اپنے گھر واپس آچکا ہے۔ کچھ سوچ کر وہ پیٹر کے کلب پہنچا کہ شاید وہاں جیک مل جائے مگر سردی نے اس کلب کو بھی ویران کردیا تھا۔ کلب بند تھا اور پیٹر اپنے گھر پر تھا۔ رابرٹس اس کے گھر پہنچا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ پیٹر کلب بند ہونے کی وجہ سے پریشان تھا۔ رابرٹس نے اس سے کہا کہ اگر وہ اس کے لیے کام کرے تو وہ اسے معاوضہ دے سکتا ہے۔ اس سے وقتی طور پر سہارا مل جائے گا۔

جب پیٹر نے کام کی نوعیت معلوم کی تو رابرٹس نے کہا۔ "تمہیں نارس پر نظر رکھنی ہے۔"

"نہیں، میں یہ کام نہیں کرسکتا۔" پیٹر نے جلدی سے کہا۔

"میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا کہ کسی کام میں دخل دو یا کسی کو چھیڑو۔" رابرٹس نے کہا۔ "صرف یہ دیکھو کہ جیک اس سے ملنے آتا ہے یا نہیں۔ بس اتنا سا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پیٹر نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "مگر معاوضہ کتنا ملے گا؟"

"پورے سو ڈالرز!" رابرٹس نے کہا۔ "اور اگر تم نے نارس اور جیک کی ملاقات کی اطلاع مجھے فوراً دے دی تو سو ڈالرز مزید ملیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" پیٹر نے کہا اور رابرٹس چلا آیا۔

دو تین روز تک پیٹر اپنے کام میں لگا رہا مگر کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں ملی۔ موسم خراب ہوتا جارہا تھا۔ سرد ہواؤں نے پورے شہر کو گویا منجمد کردیا تھا۔ پھر طوفانی بارش شروع ہوگئی۔ اسی روز اس کے پاس پیٹر کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ غالباً نارس نے اسے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس کی نگرانی کررہا ہے چنانچہ اس نے اپنے غنڈوں سے پیٹر کی خوب پٹائی کرائی اور اب وہ اس کا کام نہیں کرسکے گا۔

"تم ٹھیک تو ہونا؟ میرا مطلب ہے زخمی تو نہیں ہو؟" رابرٹس نے پوری ہمدردی کے ساتھ پیٹر سے یہ سوال کیا تھا۔

"کچھ نہ پوچھو... میری حالت ٹھیک نہیں ہے اس لیے تو



تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔ ظالموں نے بہت مارا ہے مجھے۔" پیٹر کی آواز میں دکھ تھا۔

"خیر... میں نے جو سو ڈالرز دیے تھے وہ تمہارے ہوئے۔" رابرٹس نے کہا تو دوسری طرف سے پیٹر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

رابرٹس نے سوچا کہ وہ شیرف سے اس سلسلے میں بات کرے... مگر پھر اپنے اس خیال کو مسترد کردیا کیونکہ شیرف اس لڑائی کو آپس کی دشمنی کا شاخسانہ بھی قرار دے سکتا تھا۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی نے رابرٹس کو جگا دیا۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ رابرٹس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"رابرٹس؟" دوسری طرف نارس تھا۔ "میں نے سوچا کہ تم سے خود ہی بات کرلوں۔ دراصل تم اپنے اس خیال پر قائم ہو کہ جین نے ڈولی کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ یہ کام میرا ہے... ہے نا؟"

"ہاں۔" رابرٹس نے مختصر جواب دیا۔

"جین سے تمہاری ہمدردی کی میں داد دیتا ہوں۔" نارس نے کہا۔ "وہ میری بھانجی ہے مگر تم اسے بچا رہے ہو۔ مجھے تمہارے خلوص پر کوئی شک نہیں مگر ہمارے درمیان جو خوامخواہ کی بدمزگی پیدا ہوگئی ہے اسے دور ہونا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہیں اپنی بے گناہی کا ثبوت دکھانا چاہتا ہوں۔"

"اگر ایسی بات تھی تو تم نے اتنا انتظار کیوں کیا؟" رابرٹس نے فون پر نارس سے سوال کیا۔

"بس غلطی ہوگئی۔ تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہارا ہر شک دور کردوں گا۔ آرہے ہونا؟" رابرٹس نے نارس کی آواز سنی۔ اس کی آواز میں التجا تھی۔

"اچھا۔" رابرٹس نے متذبذب لہجے میں کہا۔ پھر اس نے لباس بدلا، رین کوٹ پہنا اور احتیاطاً اپنا پستول بھی ساتھ رکھ لیا۔ پھر وہ کمرے سے باہر آگیا۔

رات کیا تھی تاریکی کا سمندر تھا جس میں سرد ہواؤں کے تھپیڑے زندگی کا احساس دلا رہے تھے۔ طوفانی بارش کی وجہ سے آگے کا راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ سڑکیں تالاب بن چکی تھیں۔ رابرٹس محتاط انداز سے کار چلا رہا تھا۔ اس کا ذہن نارس کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔

پھر وہ اس چھوٹی پہاڑی کے قریب پہنچ گیا جس کے دائیں طرف موڑ کاٹنے کے بعد نارس کا گھر آجاتا تھا۔ ہوا اور بارش نے اس کی کار کا آگے بڑھنا مشکل کردیا تھا۔ یکایک رابرٹس کو اپنے سامنے ایک بہت بڑا اور دیوہیکل سایہ نظر آیا۔ اوپر پہاڑی سے اترتے ہوئے وہ ٹریکٹر ٹرالر غالباً حادثے کا شکار ہوگیا تھا کیونکہ اس کے دونوں اگلے پہیے ایک گڑھے میں پھنسے ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے آگے بڑھنے کا راستہ مکمل طور پر بند ہوگیا تھا۔ ابھی رابرٹس اس خوفناک منظر کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس نے ایک اور سایہ دیکھا۔ وہ غالباً کوئی پرانی جیپ تھی جو پہاڑی سے لڑھکتی ہوئی اسی کی طرف آرہی تھی۔ رابرٹس نے اپنی کار کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی مگر اس کی کار کے ہٹتے ہٹتے بھی جیپ اس کی کار سے ہلکے سے آٹکرائی جس نے اس کی کار کو پھرکی کی طرح گھما دیا۔ اس کی کار کے ریڈی ایٹر سے پانی اور بھاپ نکلنے لگی۔

رابرٹس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی کار کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگادی۔ تب اس کی نظر نارس پر پڑی جو درختوں کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فولادی سلاخ تھی۔

"اوہ! تو تم نے مجھے دھوکے سے بلایا تھا تاکہ یہاں میرا شکار کرسکو۔" رابرٹس نے کہا۔

"ہاں... مگر تمہاری قسمت اچھی ہے۔" نارس نے کہا۔ "نہ تو تم ٹرک سے ٹکرائے اور نہ جیپ تمہارے بالکل اوپر گرسکی۔" یہ کہہ کر نارس نے فولادی سلاخ والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میرے وار سے نہیں بچ سکو گے۔ یہ فولادی سلاخ تمہاری کھوپڑی کے ٹکڑے کردے گی۔ پھر میں تمہاری کار میں تمہاری لاش کو بٹھا کر اسے گہری کھائی میں گرادوں گا اس طرح تمہارا قصہ پاک ہوجائے گا۔ کیوں کیسا رہا میرا پلان؟" نارس نے زہرآلود لہجے میں پوچھا۔

رابرٹس نے نیچے گرتے گرتے اپنا پستول نکالا اور قلابازی کھاتے ہوئے نارس پر لگاتار دو فائر کیے۔ نارس زور سے لڑکھڑایا اور زمین پر گرنے لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ رابرٹس اپنے ساتھ پستول لے کر آئے گا۔ اس کا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان میں رابرٹس کو ایک غلیظ گالی دی پھر وہ زور سے ہلا اور زمین پر گرگیا۔ یکایک اس نے قہقہے لگانے شروع کردیے۔ ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا۔ "میڈیلین... میڈیلین... وہ..."

پھر اس کا جسم زور سے تڑپا اور ساکت ہوگیا۔

☆☆☆

اس وقت رابرٹس نفسیاتی اسپتال میں تھا۔ وہ جین سے ملنے اور اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔ رات بھر کی بارش کے بعد آسمان صاف ہوچکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ

پھیلی تھی۔ آنے سے پہلے وہ شیرف کے آفس گیا تھا جہاں ڈاکٹر سموئیل بھی آیا تھا۔ شیرف نے رابرٹس سے معذرت کی تھی کہ اس نے رابرٹس کے شک کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی ورنہ ڈولی کا قاتل بہت پہلے گرفتار ہو جاتا۔ شیرف نے ہی رابرٹس کو اسپتال بھیجا تھا کہ وہ جین کو اس کے دفتر لے آئے۔ جین اس کے ساتھ شیرف کے دفتر پہنچی۔ وہ خاصی خوش اور مطمئن لگ رہی تھی۔

''کیسی ہو میڈیلین؟'' شیرف نے جب جین سے سوال کیا تو وہ پلکیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا نام تو جین ہارکنس ہے۔'' اس لڑکی نے کہا جسے شیرف نے میڈیلین کہہ کر پکارا تھا جبکہ وہ خود کو جین کہہ رہی تھی۔

''جھوٹ مت بولو۔'' شیرف نے کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو ہم تمہیں ایش وِل بھی لے جائیں گے تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ تم جین نہیں بلکہ میڈیلین ہو۔ تم نے اور نارس نے مل کر جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام ہو چکا ہے اور تمہارا جھوٹ کھل چکا ہے۔''

لڑکی نے رابرٹس کی طرف دیکھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اس پر عاشق تھا اور ابھی تک اس نے اس کی خاطر کافی تکلیفیں برداشت کی تھیں لیکن نہ جانے کیوں ایک دم اجنبی ہو گیا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ شاید اس آدمی کی پرانی محبت بیدار ہو جائے مگر نہیں... وہ بالکل بے حس اور پتھر بنا ہوا تھا۔ آخر وہ سمجھ گئی کہ اس کا راز کھل چکا ہے اور مزید ڈراما کرنا بے کار ہے۔

''میں نارس سے ملنا چاہتی ہوں۔ کہاں ہے وہ؟'' میڈیلین نے سوال کیا۔

''تم اس سے فی الحال نہیں مل سکتیں۔ وہ اسپتال میں ہے۔'' شیرف نے جواب دیا۔ ''بہرحال تمہارا راز فاش ہو چکا ہے۔ اس لیے سیدھی طرح ہمارے ساتھ تعاون کرو۔''

''مجھے پانی پلا دو۔'' میڈیلین نے کہا تو ڈاکٹر سموئیل نے اس کے لیے جگ میں سے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے پیو۔''

''کیا نارس نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ یہ سارا منصوبہ میرا تھا؟'' میڈیلین نے پوچھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ منصوبہ کس نے بنایا تھا؟'' شیرف نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بہرحال یہ منصوبہ ناکام گیا۔''

''رابرٹس!'' میڈیلین نے کہا۔ ''میری بات کا یقین کرو... جب میں تم سے ملی تھی اور میں نے تمہیں سمجھا تھا اس کے بعد سے میں اس ڈرامے کا حصہ نہیں رہی تھی۔ میں تمہارے ساتھ مخلص تھی اور تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے درمیان میں نارس سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس منصوبے کو ترک کر دے مگر اس نے میری بات نہیں سنی۔ مجھے پیچھے ہٹنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔''

''اصل بات بتاؤ... اپنا تعارف کراؤ۔'' شیرف نے کہا۔

''ہاں... میرا نام میڈیلین ہی ہے۔ میں نے نفسیاتی امراض کے بارے میں تربیت حاصل کی تھی اور ایش وِل میں ذہنی امراض کے اس اسپتال میں کام کرتی تھی جہاں جین داخل تھی۔ اسی دوران میری نارس سے ملاقات ہوئی۔ وہ جب اپنی بھانجی سے ملنے ایش وِل آتا تو مجھ سے ضرور ملتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ صرف مجھ سے ملنے وہاں آیا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکی پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جین ایک سال پہلے مر گئی تھی۔ میں نے اس کی موت کی خبر نارس کو دی تو وہ فوراً ایش وِل پہنچا۔ اس نے نہایت تیزی اور خاموشی سے جین کی تدفین کرا دی اور اس کی خبر اپنے کسی جاننے والے دوست یا رشتے دار تک کو نہیں دی۔ میں اور نارس ساتھ تو رہے تھے مگر میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف دوست کی حیثیت سے۔ ڈولی کے پاس دولت تھی۔ اگر وہ راستے سے ہٹ جاتی تو وہ ساری دولت ہمیں مل جاتی اور ہم اس پر جی بھر کر عیش کرتے لہٰذا نارس نے ہی ڈولی کو ہٹانے کا منصوبہ تیار کیا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ جین کی حیثیت سے میں چونکہ ماضی میں بھی ذہنی مریضہ رہ چکی ہوں اس لیے سارا الزام مجھ پر ڈال دیا جائے گا۔ وہ جین کے کاغذات ساتھ لایا تھا جو اس نے عدالت میں پیش کر دیے اور اس طرح مجھے جیل کے بجائے اسپتال پہنچا دیا گیا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

''مگر اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔'' ڈاکٹر سموئیل نے کہا۔ ''میں عدالت میں یہ بیان دوں گا کہ تم بالکل صحیح الدماغ ہو اور قتل کے اس منصوبے میں نارس کی ساتھی رہی ہو۔''

میڈیلین نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ رابرٹس دل شکستہ وہاں سے اٹھا اور اسی پہاڑی چشمے پر پہنچا جہاں اس نے کبھی ایک حسینہ کو دیکھا تھا جس نے اس کے دل کا چین لوٹ لیا تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ محض خواب تھا اور خوابوں کی تعبیر کبھی کبھار ہی ملتی ہے۔ پھر وہ سر ہلاتا ہوا وہاں سے واپس چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کبھی تو اسے کوئی اصلی اور حقیقی حسینہ ملے گی جس سے وہ محبت کرے گا... شادی کرے گا... پھر ان کے بچے ہوں گے... اور زندگی نہایت حسین ہو جائے گی۔



کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کو تحفے دینے سے محبت بڑھتی ہے ...یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے ...تحفے تحائف کا تبادلہ آپس میں ملنے کے رجحان کو بڑھاتا ہے ...یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی کبھی تحفے مادی لحاظ سے قیمتی اور انمول نہیں ہوتے ...مگر دینے والا اہم اور معتبر ہوتا ہے...اسی تاثر کو اجاگر کرتی ایک دل کش تحریر۔

**کچھ یادگار و انمول لمحات کی عکاس سات سمندر پار سے تازہ سوغات**

# انمول

ظفر سعید یوسفی

لندن بیسویں صدی کے آغاز میں ایک غنودہ سا شہر تھا۔ سوائے کچھ حصوں کے باقی لندن میں سرِ شام ہی سناٹا چھا جاتا تھا اور سردیوں میں تو سرِ شام کی شرط بھی نہیں ہوتی تھی۔ سردی کی شدت سے ہمہ وقت سناٹا ہی چھایا رہتا تھا۔ شمالی لندن کی ایک چھوٹی سی بستی نورفوک میں ملی جلی آبادی تھی۔ یہاں کچھ دولت مند رہتے تھے تو کچھ نچلے طبقے کے لوگ بھی تھے مگر اکثر آبادی متوسط طبقے کی تھی۔ دولت مندوں میں سب سے مشہور مسٹر ایمرسن تھے۔ ان کا پورا نام چارلس ایمرسن تھا اور وہ جدی پشتی دولت مند تھے، اسی وجہ سے ان کا رویہ ان دولت مندوں سے قطعی مختلف تھا جو تیسری دنیا میں لوٹ کھسوٹ کر کے دولت مند بنے تھے۔ مسٹر ایمرسن نرم خو انسان تھے اور انسانیت پر یقین رکھتے تھے۔ کوئی انسان ان کے نزدیک اس وجہ سے حقیر نہیں ہو جاتا تھا کہ اس کے پاس دولت نہیں تھی۔ وہ مخیر بھی تھے اور اپنی دولت فلاحی کاموں

میں خرچ کرتے تھے۔ ان کی عالی شان حویلی نورفوک کے آغاز میں ہی تھی اور یہ بستی کا سب سے خوب صورت حصہ تھا۔ یہاں ان کی حویلی کے ساتھ ایک بڑا سا پارک بھی تھا۔ یہ پارک بھی مسٹر ایمرسن کی کوششوں سے بنا تھا کیونکہ یہاں پہلے ایک گندی سی جھیل تھی جس کی صفائی اور اسے پاٹنے میں آنے والے خرچ کی وجہ سے مقامی حکومت نے اس کو پارک بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

مسٹر ایمرسن نے مقامی لوگوں کو اس بارے میں متحرک کیا اور ان کی مدد سے اس جھیل کو پاٹ کر اس پر ایک خوب صورت باغ بنوایا۔ اس پر آنے والا سارا خرچ مسٹر ایمرسن نے برداشت کیا تھا۔ اس باغ کی وجہ سے علاقے کا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ جہاں سے پہلے ہر وقت سڑی ہوئی دلدل کے بھبکے اٹھتے تھے، اب وہاں سے گلابوں کی خوشبو آتی تھی۔ باغ کی ہریالی نے علاقے کو خوب صورت کر دیا تھا۔ بچوں کو کھیلنے اور لوگوں کو سیر کرنے کے لیے ایک اچھی جگہ مل گئی تھی۔ مقامی آبادی نے اظہارِ تشکر کے طور پر پارک کو مسٹر ایمرسن کے نام سے منسوب کر دیا تھا اور اب یہ ایمرسن پارک کہلاتا تھا۔ اس کے وسط میں پتھر کی بنی لاٹ پر یہ نام جلی حروف میں لکھا تھا۔ اس لاٹ کے گرد ایک دائرے میں بنچیں بنی تھیں جن پر سیر کے لیے آنے والے معمر حضرات آرام کر لیا کرتے تھے۔

مسٹر ایمرسن روز ہی صبح کا وقت پارک میں گزارتے تھے۔ ان کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ وہ لاولد تھے اور بیوی بھی چند سال پہلے وفات پا چکی تھی۔ اس لیے وقت گزاری کے لیے پارک آجاتے تھے۔ کچھ دیر ٹہل کر وہ اپنی پسندیدہ بنچ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے اور پھر سگار پیتے یا اونگھتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی جان پہچان والا آجاتا تو اس سے علیک سلیک کر لیا کرتے تھے، ورنہ سو بھی جاتے تھے۔ اگر وہ سو جاتے تھے تو کوئی ان کو نہیں چھیڑتا تھا اور نہ ہی ان کے آس پاس شور کرتا تھا۔

سردیوں کے خاتمے پر مسٹر ایمرسن کے گھر میں کچھ ہلچل ہوئی تھی۔ ان کا اکلوتا بھتیجا رائے ایمرسن ہندوستان سے آرہا تھا جہاں وہ والسرائے ہندوستان کے ذاتی عملے میں شامل تھا۔ اس نے مسٹر ایمرسن کو خط لکھا تھا کہ وہ اپریل کے مہینے میں ایک سرکاری کام سے لندن آرہا تھا اور وہ ان کے ہاں قیام کرے گا۔ بہت عرصے بعد مسٹر ایمرسن کا کوئی رشتے دار ان کے ہاں آرہا تھا اور پھر اب ان کا کوئی نزدیکی خون کا رشتہ باقی نہیں رہا تھا، سوائے رائے کے... اس لیے وہ بہت خوش تھے۔

رائے ایک پُرجوش اور متحرک نوجوان تھا۔ وہ آتے ہی جیسے ان کی حویلی کی زندگی پر چھا گیا تھا۔ برسوں سے خاموش حویلی شور اور ہنگامے سے گونج اٹھی تھی۔ رائے مستقل بولنے والا شخص تھا اور اس کے پاس باتوں کی کمی نہیں تھی۔ خاص طور سے ہندوستان کے بارے میں اس کے پاس نہ ختم ہونے والے قصے تھے جن میں زیادہ تر کا محور وہ خود تھا۔ اس نے تاج برطانیہ کے لیے کیا حیرت انگیز کارنامے انجام دیے تھے، اس کو سن کر ایسا لگتا تھا کہ رائے کو پیدا ہونے میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی ورنہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان پر قبضہ کرنے میں اتنے جتن نہ کرنے پڑتے... اور رائے اسے بہ آسانی تاج برطانیہ کی جھولی میں ڈال دیتا۔

مسٹر ایمرسن ذاتی طور پر خاموش طبع تھے اور کسی سے بھی زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر رائے کی بات اور تھی۔ خون کے رشتوں میں ان کے پاس بس وہی بچا تھا اور ممکنہ طور پر ان کا وارث بھی وہی تھا مگر اس کی نظر میں مسٹر ایمرسن کی حویلی اور دولت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں اسے جو مکان ملا ہوا تھا، وہ نورفوک سے بھی بڑا تھا اور اس میں اتنے ملازم تھے جتنے کہ نورفوک میں لوگ رہتے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہندوستان میں کسی پُرفضا مقام پر مستقل رہائش اختیار کر لے گا۔ ابھی وہ صرف پینتیس برس کا تھا اور اس کی ریٹائرمنٹ میں بہت وقت تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت تک وہ کسی اونچے عہدے تک پہنچ جاتا۔ وہ والسرائے بھی بن سکتا تھا۔

''انکل چارلس! ہوسکتا ہے ایک وقت آئے کہ آپ کا بھتیجا والسرائے بن کر آپ سے ملنے آئے۔ ذرا سوچیں، اس وقت آپ کی عزت میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔'' رائے نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

اس کی یہ بات مسٹر ایمرسن کو چبھ گئی تھی مگر انہوں نے مروت میں اپنے بھتیجے سے کچھ نہیں کہا۔ وہ مقامی سیاست سے واقف تھے۔ تاج برطانیہ کے نمائندے ہمیشہ لندن سے جاتے تھے اور کمپنی کا ملازم ہمیشہ ملازم ہی رہتا تھا چاہے وہ کتنے بڑے عہدے تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ رائے ان کے پاس پورا مہینا رکا۔ اس دوران میں اس نے وہ سرکاری کام تو ایک دن میں نمٹا لیا تھا جس کے لیے وہ لندن آیا تھا۔ اور یہ اہم کام ایک خط محکمۂ خارجہ تک پہنچانا تھا۔ مسٹر ایمرسن نے دیکھا تھا کہ یہ کوئی خاص خط نہیں تھا کیونکہ اس پر خفیہ کی مہر نہیں لگی تھی۔ اس کے علاوہ سارا وقت رائے نے تفریحات میں گزارا تھا۔ مسٹر ایمرسن کا سہارا لے کر وہ لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں گھومتا رہا تھا۔ اس سے جو وقت بچ جاتا تھا وہ مسٹر ایمرسن کو قصے سناتا تھا.... مسٹر ایمرسن کے محلے والے اور



جاننے والے رائے کے بارے میں سن کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ اس زمانے میں جو بھی ہندوستان سے ہو کر آتا تھا اس کے بارے میں فرض کر لیا جاتا تھا کہ اس نے بے تحاشہ دولت کمائی ہوگی اور وہ لارڈ بن جائے گا۔ یہ تاثر کچھ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ رائے ابھی نوجوان تھا اور اس کے پاس خاص عہدہ بھی نہیں تھا، ورنہ وہ مسٹر ایمرسن کو اس بارے میں ضرور بتاتا مگر اس نے کبھی اپنے عہدے کے بارے میں بات نہیں کی۔ وہ بس اتنا بتاتا تھا کہ وہ والسرائے کے ذاتی اسٹاف میں ہے اور یہ بھی بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ مسٹر ایمرسن نے دیکھا تھا کہ رائے کا ذاتی سامان نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کے پاس درجن سے بھی اوپر قیمتی سوٹ تھے اور سونے کے مُٹھ والی چھڑی بھی تھی۔ اس کے پاس مگرمچھ کی کھال کے دو جوڑی جوتے تھے۔ اس مگرمچھ کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ اس نے اسے وسطی ہندوستان کے ایک دریا میں خود شکار کیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مسٹر ایمرسن نے کبھی رائے کی ان باتوں پر شک نہیں کیا جن کے مطابق وہ ہندوستان میں دولت میں کھیلتا تھا۔ وہ اس کی ہر بات، چاہے وہ کتنی مہمل اور عقل سے ماورا کیوں نہ ہو، پورے ذوق وشوق سے سنتے تھے۔ رائے کا کہنا تھا کہ اس سے بڑا شکاری ہندوستان میں اور کوئی نہیں تھا۔ شیر اور چیتے اس نے درجنوں کے حساب سے مارے تھے اور اس کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا ورنہ وہ ان کا سیکڑوں کے حساب سے شکار کرتا۔ اس نے مہاراجا نیپال کے ساتھ ہمالیہ کی ترائی میں گینڈوں کا شکار بھی کیا تھا اور اس کے گھر کی نشست گاہ میں ان کے سینگ سجے ہوئے تھے۔ غرضیکہ رائے کے پاس قصوں کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ کچھ زیادتی ہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینا گزر گیا۔ پھر رائے کی واپسی کا وقت آگیا۔ اتفاق سے مسٹر ایمرسن کی حویلی پر اس کا ایک خط آگیا اور وہ غلطی سے انہوں نے کھول بھی لیا۔ اس میں ... وزارتِ خارجہ کی جانب سے ایک وارننگ تھی کہ اسے صرف دو ہفتے کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ دیر کرنے کی صورت میں اسے والسرائے کے کلریکل اسٹاف سے نکال دیا جائے گا۔ مسٹر ایمرسن نے خاموشی سے لفافہ ویسے ہی بند کر کے اسے رائے کے حوالے کر دیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ والسرائے کے ذاتی اسٹاف میں تھا۔ مسٹر ایمرسن کے خیال میں ہندوستان سے آنے والے کو اتنی گپ مارنے کا حق تو حاصل تھا ہی اور کلریکل اسٹاف میں ہونا بھی کون سی کم اعزاز کی بات تھی۔ نہ جانے کیوں رائے نے اس بارے میں ان سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ کم سے کم ان کو تو سچ بتا دیتا۔

جس دن رائے نے واپس جانا تھا، اس روز اس نے پہلی بار مسٹر ایمرسن کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔ اس نے شرمندگی سے کہا کہ وہ آتے ہوئے ان کے لیے کوئی مناسب تحفہ لے کر نہیں آسکا مگر اس کے پاس ایک نادر و نایاب شے تھی جو اسے ایک ہندوستانی نواب نے تحفے میں دی تھی۔ یہ بندر کے مجسمے جیسا لائٹر تھا۔ لائٹر اس زمانے میں نئی نئی چیز تھی اور بہت امیر لوگ ہی اسے رکھ سکتے تھے کیونکہ اس کے لیے گیس عام دستیاب نہیں تھی۔

''انکل! یہ خالص سونے کا بنا ہے اور اسے ہندوستان کے ایک بہت بڑے جوہری نے تیار کیا ہے۔ وہ راجا مہاراجاؤں کے لیے چیزیں بناتا ہے۔'' رائے نے بندر نما لائٹر دیتے ہوئے بتایا۔ ''اس کی آنکھوں کی جگہ ہیرے لگے ہیں۔''

یہ بندر کالبیٹھی ہوئی پوزیشن میں مجسمہ تھا جس کے سر کا ایک حصہ دبانے سے وہ اوپر اٹھ جاتا تھا اور لائٹر جل جاتا تھا۔ سنہری رنگ کا یہ لائٹر بہت نفاست اور صفائی سے بنایا گیا تھا۔ بندر کا ایک ایک نقش واضح تھا۔ مسٹر ایمرسن نے اس تحفے پر رائے کا بہت شکریہ ادا کیا اور وہ خوش خوش لندن سے واپس ہندوستان روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد مسٹر ایمرسن نے ایک محفل میں اتفاق سے سگار سلگانے کے لیے لائٹر نکالا تو وہاں موجود ایک صحافی نے اسے دیکھا اور اس کی بہت

تعریف کی۔ مسٹر ایمرسن نے اسے بتایا کہ یہ اس کے بھتیجے نے اسے تحفے میں دیا ہے اور اسے ہندوستان کے ایک بڑے جوہری نے بنایا۔

اگلے دن صحافی نے اس کے بارے میں اخبار میں پورا فیچر شائع کر دیا۔ اگرچہ اس زمانے میں اخبارات میں تصویر شائع نہیں ہوتی تھی مگر صحافی نے الفاظ سے لائٹر کا پورا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے زیادہ قیمتی لائٹر دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ اسے ہندوستان کے ایک ماہر جوہری نے بنایا تھا۔ صحافی نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی قیمت پانچ ہزار برطانوی پاؤنڈز سے زیادہ ہی تھی۔ مضمون اتنا دلچسپ تھا کہ جو اخبار نہیں پڑھتے تھے انہوں نے بھی اس کی خاطر اخبار پڑھا اور مسٹر ایمرسن کا لائٹر شام تک پورے لندن میں مشہور ہو گیا۔ جبکہ مسٹر ایمرسن اس شہرت سے بے خبر تھے۔

☆☆☆

پیری جوزف لندن کا مشہور چور تھا اور وہ خاص طور سے قیمتی اشیا چراتا تھا... کیونکہ ایک تو ان کی قیمت بہت اچھی مل جاتی تھی دوسرے یہ کہ وہ اپنے وزن کے مقابلے میں سونے سے بھی زیادہ قیمت رکھتی تھیں۔ اس وجہ سے اس کی توجہ کا مرکز ہمیشہ نادر اور قیمتی چیزیں ہوتی تھیں۔ اس نے بھی اخبار میں شائع ہونے والا یہ مضمون پڑھا تھا اور اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پانچ ہزار پاؤنڈز اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ اس سے دو سال بڑے ٹھاٹ سے گزارہ کر سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ اسے ہر صورت میں یہ لائٹر حاصل کرنا ہے۔ وہ لندن کی بندرگاہ کے قریب نچلے طبقے کے علاقے میں ایک کھولی میں رہتا تھا مگر یہ اس کی مستقل رہائش نہیں تھی بلکہ یہاں وہ صرف خود کو چھپانے کے لیے رہتا تھا۔ اس کی اصل رہائش لندن کے ایک پوش علاقے میں تھی جہاں اس کا عالی شان فلیٹ تھا اور وہ اکثر کاروباری سلسلے میں لندن سے باہر رہتا تھا۔ کم سے کم اس نے اپنے پڑوسیوں کو یہی بتا رکھا تھا۔ جب وہ کوئی واردات کر گزرتا تھا تو یہاں آ جاتا تھا۔ جس وقت پولیس اسے لندن میں تلاش کرتی پھر رہی ہوتی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک پوش علاقے میں بیٹھا ہوگا۔

پیری کا اصل نام کارلیس کورٹ لینڈ تھا مگر اس نے پیری جوزف کا نام اختیار کر رکھا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ کہیں واردات کرتا تھا تو اپنا ایک کارڈ چھوڑ آتا تھا جس پر پیری لکھا ہوتا تھا۔ اس کی اس حرکت کی وجہ سے وہ چند سال میں لندن کا مشہور ترین چور بن گیا تھا اور کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کہیں بیٹھا ہوتا تھا اور اس کے برابر میں بیٹھے لوگ اس کے بارے میں تبصرہ کر رہے ہوتے تھے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ جس کے بارے میں بات کر رہے ہیں وہ ان کے برابر میں ہی بیٹھا ہے۔ یہ سب سن کر اور دیکھ کر پیری کے لیے اپنی کامیابیوں کا نشہ دوبالا ہو جاتا تھا۔

نچلے طبقے کے علاقے میں رہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ واردات کی ساری منصوبہ بندی یہیں کرتا تھا، یہاں اس کی جان پہچان تھی۔ کوئی اس کے بارے میں یہ تو نہیں جانتا تھا کہ وہ پیری جوزف ہے۔ یہاں وہ جونی دی مین کے نام سے جانا جاتا تھا مگر اس کے بارے یہ تاثر عام تھا کہ وہ جرائم پیشہ ہے۔ خود پیری اس تاثر کو ہوا دیتا تھا، ورنہ اس کا یہاں رہنا مشکل ہو جاتا۔ یہ جرائم پیشہ لوگوں کی بستی تھی اور یہاں کوئی صاف ستھرا آدمی رہ نہیں سکتا تھا۔ یہاں اسے اپنے کام کے سلسلے میں مدد بھی ملتی تھی اور وسائل بھی میسر تھے۔ پھر وہ کتنا ہی مشکوک کام کر جاتا، کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ واردات کر لیتا تو چرائی جانے والی چیز فروخت کر کے اپنے فلیٹ کی راہ لیتا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے وہ ایک حمام میں اپنا حلیہ بدلتا، شیو بنواتا اور دوسرے کپڑے پہن کر جاتا تھا۔ اس کا ایک سوٹ کیس ہمہ وقت اس حمام میں موجود رہتا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے اپنے فلیٹ پر جاتا تھا۔ اس وقت سچ مچ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کامیاب بیرونی دورے سے آ رہا ہو۔

خبر پڑھتے ہی اس نے رختِ سفر باندھا اور چند پڑوسیوں سے مل کر اور ان کو اپنے کاروباری دورے کی اطلاع کرنے کے بعد وہ اس حمام میں پہنچ گیا جہاں وہ حلیہ بدلتا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ بندرگاہ والی بستی میں آ جاتا تھا جہاں اس کی رہائش ایک کھولی میں تھی۔ ایک دن یہاں رہ کر اس نے مسٹر ایمرسن کے بارے میں معلومات جمع کرنا شروع کیں۔ اس معاملے میں اس کا اصول تھا کہ وہ معلومات ہمیشہ خود حاصل کرتا تھا کیونکہ کسی اور کے ملوث ہونے سے خطرہ ہوتا تھا کہ بات پولیس تک پہنچ جائے گی۔ وہ روز صبح نکلتا تھا اور مسٹر ایمرسن کی حویلی پہنچ جاتا تھا اور پھر سارا دن وہاں منڈلاتا رہتا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے وہ روز نیا حلیہ بناتا تھا تاکہ کوئی اسے دیکھ کر چونکے نہیں۔

جلد وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ مسٹر ایمرسن روز ہی کئی گھنٹے اپنے نام سے منسوب پارک میں گزارتے



ہیں اور جس دن دھوپ نکلی ہو تو وہ وہاں بنچ پر سو بھی جاتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ بنچ ایک پھول دار جھاڑی کے پاس ہی تھی اور پیری وہاں گھات لگا کر بیٹھ سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مسٹر ایمرسن اس سونے کے بندر نما لائٹر کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے اور وہ اس کی حفاظت کی طرف سے خاص فکرمند بھی نہیں تھے کیونکہ لائٹر اکثر ان کے کوٹ کی سامنے والی جیب میں ہوتا تھا۔ جب وہ سو جاتے تو کوئی بھی ان کی جیب سے بہ آسانی لائٹر نکال سکتا تھا۔ پیری اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا تھا جو اسے اتنا آسان موقع مل رہا تھا اور ذرا سی محنت سے پانچ ہزار پاؤنڈز اس کی جیب میں آ سکتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس لائٹر کو امریکا لے جا کر فروخت کرے گا کیونکہ امریکا ایک دولت مند ملک تھا اور اس کے امرا نادر اشیا کے... لندن کے امرا سے کہیں زیادہ دیوانے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس بندر کو نیویارک جا کر نیلام کرے گا تو اسے منہ مانگی قیمت بھی مل سکتی تھی۔ مگر فی الحال تو اسے لائٹر مسٹر ایمرسن سے حاصل کرنا تھا جو بہ ظاہر بہت آسان لگ رہا تھا۔ مگر پیری کا ایک اصول تھا کہ کام کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو، اسے پوری احتیاط اور مہارت سے کرنا چاہیے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ کام اس دن کرے گا جس دن دھوپ نکلی ہوگی۔

☆☆☆

نورفوک کسی قدر بلندی پر تھا اسی لیے شمال سے آنے والی سرد ہوائیں اسے باقی لندن کی نسبت سرد رکھا کرتی تھیں اور یہاں کے باشندے دھوپ کے زیادہ ہی متمنی رہا کرتے تھے۔ اس روز پیر تھا اور دو دن تک بادل چھائے رہنے کے بعد خوش قسمتی سے دھوپ نکل آئی تھی۔ مسٹر ایمرسن بہت خوش تھے کیونکہ عام انگریزوں کی طرح ان کو بھی دھوپ اچھی لگتی تھی۔ وہ ناشتا کر کے باہر آئے، دھوپ بہت نکھری ہوئی تھی اور آسمان مکمل نیلا ہو رہا تھا۔ وہ پارک میں آئے تو یہاں کئی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب سے علیک سلیک کرتے ہوئے انہوں نے پارک کا ایک چکر لگایا اور پھر اپنی پسندیدہ بنچ پر آ بیٹھے۔ انہوں نے جیب سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ یہ خاص سگار ان کے لیے کیوبا سے آئے تھے اور ان کا ذائقہ اور مہک منفرد تھی۔ پھر انہوں نے جیب سے بندر نما لائٹر نکالا، سگار سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور سر بنچ کی پشت سے ٹکا دیا۔ لائٹر انہوں نے بے پروائی سے کوٹ کے سامنے والی جیب میں اس طرح رکھ لیا تھا کہ اس کا سر اجھلک رہا تھا۔ چند کش لینے کے بعد وہ غنودگی میں چلے گئے۔ سگار بجھ گیا اور مسٹر ایمرسن خراٹے لینے لگے۔ اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ کچھ دور دو بچے کھیل رہے تھے اور ایک طرف ایک نوجوان بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا مگر اخبار اس کے منہ کے سامنے تھا۔

جھاڑی میں چھپا پیری یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ یہ موقع ہے کہ وہ اپنا کام کر جائے۔ اس نے فرار کا راستہ طے کر لیا تھا۔ اپنا کام کر کے وہ پارک کی عقبی طرف سے نکلتا اور گلیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا نورفوک سے دور چلا جاتا۔ اس طرف نچلے طبقے کی آبادی تھی اور پیری اس میں خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ پیری جھاڑی سے نکلا اور اس نے نہایت مہارت سے مسٹر ایمرسن کے کوٹ کے سامنے والی جیب سے وہ بندر نما لائٹر نکال لیا۔ ان کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوا تھا اور وہ مزے سے ہلکے ہلکے خراٹے لیتے رہے۔ بندر نما لائٹر ہاتھ میں آتے ہی پیری کے جسم میں جیسے بجلی بھر گئی اور وہ تیزی سے پارک کے عقبی حصے سے نکلا۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے پیروں میں پہیے لگ جائیں یا اس کے پر نکل آئیں اور وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جائے۔ اس سے پہلے بھی پیری نے بے شمار وارداتیں کی تھیں اور بہت ساری قیمتی چیزیں چرائی تھیں مگر اس کی کبھی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ اتنے خطرناک مرحلوں سے گزر رہا تھا کہ آج بھی سوچتا تھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر اتنی آسان سی واردات کے بعد اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے نہ جانے کتنے خطرے اس کے پیچھے ہوں۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنے کوٹ کی وہ جیب پکڑ رکھی تھی جس میں لائٹر تھا۔ پارک سے نکل کر وہ گلیوں میں آیا۔ اچانک سامنے سے ایک پولیس مین آتا دکھائی دیا تو اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ اسے لگا کہ ابھی پولیس والا اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی تلاشی لے گا اور اس کے پاس سے بندر نما لائٹر برآمد کر کے اسے گرفتار کر لے گا۔ مگر پولیس والا اس کی طرف توجہ دیے بغیر اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ اس نے سکون کا طویل سانس لیا اور اپنے قدم مزید تیز کر دیے۔

تیسری گلی سے نکل کر وہ ایک کشادہ سڑک پر آیا۔ یہاں نورفوک کا تجارتی علاقہ تھا۔ دکانیں کھلی تھیں اور لوگ آ جا رہے تھے۔ یہاں آ کر اس نے خود کو کسی قدر محفوظ محسوس کیا۔ اس نے رفتار کم کر لی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مصروف جگہ کوئی اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے متوجہ ہو۔ اچانک عقب سے شور اٹھا اور اس کا دل جو نارمل رفتار پر آ گیا تھا، اچانک پوری رفتار سے دھڑکنے لگا اور وہ بے ساختہ

بھاگنے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ شور کس وجہ سے ہوا تھا اور اس کے پیچھے کوئی آ رہا تھا یا نہیں۔ بات اتنی تھی کہ ایک آوارہ کتا اچانک ہی گوشت کی دکان میں گھس گیا تھا اور اسے نکالنے کے لیے شور اور ہنگامہ ہو رہا تھا۔

آگے جا کر سڑک دائیں طرف سے بند تھی اور صرف بائیں طرف کچی گلی میں مڑا جا سکتا تھا۔ پیری ایک گلی میں مڑ گیا۔ یہاں گودام تھے جن میں مزدور سامان نکال اور رکھ رہے تھے، گھوڑا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اسے بچ بچا کر نکلنا پڑ رہا تھا۔ اس نے پہلی بار پلٹ کر دیکھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں آ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ سامنے سے آتے ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ اس نے جلدی سے معذرت کی، اس پر وہ شخص اسے گھورتا ہوا چلا گیا۔ وہ دبلا پتلا اور چوہے جیسے منہ والا شخص تھا۔ عام حالات میں پیری اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا مگر اس وقت اس نے معذرت کر لی تھی تاکہ کوئی تنازعہ کھڑا نہ ہو جس کی وجہ سے اسے روک لیا جائے۔ خدا خدا کر کے وہ اس علاقے سے نکل گیا۔ وہ ایک کوچ کے عقبی حصے پر سوار ہو کر بندرگاہ تک آیا۔ اپنی کھولی میں گھس کر اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور سب سے پہلے بندر نما لائٹر نکال کر دیکھنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ ساکت رہ گیا۔ لائٹر اس کی جیب میں نہیں تھا۔ یہ بھی سی جیب تھی، اس نے اطمینان کے لیے اندر تک ہاتھ ڈال کر دیکھا اور پھر بوکھلا کر پورا کوٹ اور پتلون تک چیک کر لی مگر لائٹر کہیں نہیں تھا۔ وہ اس سے کہیں گر نہیں سکتا تھا پھر کہاں گیا تھا؟ اچانک اسے چوہے نما چہرے والے شخص کا خیال آیا جو اس سے ٹکرایا تھا۔ پیری نے سر تھام لیا۔ اس نے جو لائٹر اتنی محنت کے بعد حاصل کیا تھا وہ اس جیب کترے نے ایک منٹ میں اس کی جیب سے نکال لیا تھا اور وہ اپنے فن میں اتنا ماہر تھا کہ اس نے پیری جیسے ہوشیار آدمی کو بھی پتا چلنے نہیں دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔ لائٹر اس کی قسمت میں ہی نہیں تھا۔ اس کی ساری محنت رائیگاں گئی تھی، کم سے کم اس کے لیے رائیگاں گئی تھی۔ البتہ کسی اور کو اس کا فائدہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نیلسن اسٹیورڈ اپنے نام سے کوئی لارڈ یا کوئی مشہور فوجی افسر لگتا تھا مگر وہ ایک جیب کترا تھا اور اس کی صورت بھی جیب کتروں جیسی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مشکل سے ہی کامیاب ہوتا تھا۔ اسے پاس پا کر سب اپنی جیبوں کی طرف سے ہوشیار ہو جاتے تھے۔ اور اگر علاقے میں جیب تراشی کی کوئی واردات ہو جاتی تھی تو پولیس سب سے پہلے اس سے پوچھ گچھ کرتی تھی اور اسے مدعی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ وہ تین بار جیل جا چکا تھا اور آخری بار دو سال پہلے ہی آزاد ہو کر آیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ بہت محتاط ہو گیا تھا اور کوئی بھی کام اس طرح کرتا تھا کہ اس پر شک نہ ہو۔ اگر وہ محسوس کرتا کہ اسامی محتاط ہو گئی ہے تو وہ اس کے پاس جانے سے گریز کرتا تھا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ محتاط شخص کی جیب کسی اور نے کاٹ لی اور وہ بلاوجہ رگڑے میں آ گیا۔

نیلسن عام طور سے نورفوک کے علاقے میں کام کرتا تھا۔ یہ اس کا آبائی علاقہ بھی تھا اور اس نے یہیں پرورش پائی تھی۔ اس کا باپ بھی جیب کترا تھا اور اس نے نیلسن کی تربیت کی تھی۔ نوعمری میں وہ ماہر جیب تراش بن چکا تھا مگر بدقسمتی سے اس کی صورت ایسی تھی کہ ان جان شخص بھی اس کی طرف سے ہوشیار ہو جاتا تھا۔ وہ شکل سے نہایت چالاک اور عیار نظر آتا تھا۔ اسے قدرت سے اپنی شکل کے بارے میں سخت گلہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ درحقیقت اتنا چالاک نہیں تھا جتنا کہ قدرت نے اس کی صورت بنا کر پیدا کیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں باپ کے مرنے کے بعد وہ خود گزر بسر کر رہا تھا اور نورفوک کی تجارتی منڈی اس کی شکارگاہ تھی کیونکہ یہاں باہر سے بھی بہت سارے لوگ آتے تھے اور ان میں سے اکثر اس سے ناواقف ہوتے تھے... اس لیے اسے کام دکھانے کا موقع مل جاتا تھا۔

نیلسن کو عام طور سے نیل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ اس وقت کسی شکار کی تلاش میں تھا۔ منڈی میں صبح کے وقت بہت ہجوم ہوتا تھا اس لیے وہ صبح سویرے کام پر نکلتا تھا۔ اچانک ہی اس نے ایک بدحواس شخص کو دیکھا جو ہراساں اور بوکھلایا ہوا کمرشل اسٹریٹ میں داخل ہوا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے اپنے کوٹ کی دائیں جیب کو یوں تھام رکھا تھا جیسے اس میں کوئی قیمتی چیز ہو اور وہ نیلسن کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یعنی وہ اس علاقے کا نہیں تھا۔ نیلسن نے محسوس کیا کہ یہ اس کے لیے سنہری موقع ہے۔ اس نے کئی دن سے کسی کی جیب پر ہاتھ صاف نہیں کیا تھا اور خود اس کی جیب تقریباً خالی ہو رہی تھی۔ اسے کسی شکار کی اشد ضرورت تھی اور یہ شخص یوں سامنے آیا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ آؤ اور مجھے شکار کر لو۔ نیلسن اس کے پیچھے لگ گیا مگر اس انداز سے کہ اسے احساس نہ ہو۔ وہ سڑک کے بائیں طرف تھا جبکہ وہ شخص دائیں طرف چل رہا تھا۔

نیلسن جانچ رہا تھا کہ اس شخص کو کسی سے خطرہ ہے۔ عین ممکن تھا وہ اس کی جیب صاف کرنے کی کوشش کرتا اور خود



کسی مصیبت میں پھنس جاتا... جبکہ وہ مصیبتوں سے دور رہنے کا قائل تھا اس لیے پوری احتیاط سے اس شخص پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ نیلسن کو پتا تھا کہ آگے جا کر وہ اس کی طرف آئے گا کیونکہ یہ سڑک آگے جا کر دائیں طرف سے بند ہو جاتی تھی اور وہ دائیں طرف ہی تھا۔ اس وقت وہ اس کی جیب پر ہاتھ صاف کر سکتا تھا۔

اچانک ہی عقب سے شور ہوا اور وہ شخص بھڑک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا جیسے اسے شبہ ہو کہ کوئی اس کے تعاقب میں آ رہا ہو اور اس کے پکڑے جانے کا امکان ہو۔ نیلسن کو اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ کوئی واردات کر کے یا کسی سے کوئی چیز چھین کر بھاگا تھا۔ اس کے بھاگنے سے نیلسن کو بھی رفتار بڑھانی پڑی مگر وہ اتنا تیز نہیں تھا۔ اب سڑک کا آخری سرا آ گیا تھا اور اس شخص کو بائیں طرف کسی گلی میں مڑنا تھا۔ نیلسن کو اندازہ لگانا تھا کہ وہ کس گلی میں مڑے گا۔ اگر اس کا اندازہ غلط ہو جاتا تو وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ آخر نیلسن نے فیصلہ کیا اور گوداموں والی گلی کی طرف مڑ گیا۔ اسے خاصی حد تک یقین تھا کہ وہ شخص اسی گلی میں آئے گا کیونکہ یہاں رش ہوتا تھا اور وہ رش میں آسانی سے غائب ہو سکتا تھا۔ نیلسن ایک گلی پہلے مڑ گیا تھا اور اس کے بعد بھاگتا ہوا گھوم کر دوسری طرف سے گوداموں والی گلی میں نمودار ہوا۔ ذرا آگے آ کر اس نے اس شخص کو سامنے سے آتے دیکھا تو اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا مگر ایک تشویش ناک بات تھی کہ اس شخص نے ابھی تک اپنی جیب پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس حالت میں وہ اس کی جیب کس طرح کاٹتا؟

مگر لگ رہا تھا کہ قدرت اس پر مہربان ہے کیونکہ نزدیک آنے پر اس شخص نے اچانک پلٹ کر دیکھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں آ رہا ہے اور اس دوران میں اس کا ہاتھ اپنی جیب پر سے ہٹ گیا۔ نیلسن کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے لپک کر ہاتھ مارا اور اتنی صفائی سے وہ شے نکالی کہ اس شخص کو بھی خبر نہیں ہوئی اور اس کے بعد وہ جان بوجھ کر اس سے ٹکرایا تاکہ اسے اپنی جیب ہلکی ہونے کا احساس نہ ہو۔ اس شخص نے جلدی سے اس سے معذرت کی اور آگے بڑھ گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا ہو اور کسی قسم کے تنازعے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا ہو۔ خود نیلسن بھی یہی چاہتا تھا۔ ذرا آگے آ کر اس نے وہ شے اپنی جیب میں ڈال لی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا چیز ہے مگر وہ اسے ابھی نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی دھاتی شے ہے اور شاید سونے کی ہے۔ اس کے اندر سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ خاصی وزنی شے تھی اور اگر یہ سونے کی تھی تو اسے اچھی خاصی رقم مل سکتی تھی۔

وہ تیزی سے گلیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اس جگہ سے دور نکل آیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس شخص کو اپنی جیب کٹنے کا احساس ہو بھی گیا ہو، تب بھی وہ اس کا سراغ نہیں لگا سکتا تو اس نے رک کر اپنا سانس درست کیا اور مفلر سے چہرے پر آنے والا پسینا صاف کیا۔ یہ ویران سی گلی تھی اور کوئی دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ چیز نکالی۔ اس کے انداز میں بے تابی تھی... اور جب اس نے اس بندر نما لائٹر کو دیکھا تو وہ سحر زدہ رہ گیا۔ اس نے کبھی اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بہت قیمتی تھی... اس کے اندازے سے بھی زیادہ قیمتی تھی کیونکہ اس کی بناوٹ، اس کا سونے جیسا رنگ اور اس کی آنکھوں کی جگہ جڑے جھلملاتے ہیرے بتا رہے تھے کہ یہ کوئی بہت قیمتی چیز ہے۔ یہ تو کوئی نوادر لگ رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اسے بیچنے جاتا تو اسے اس کے ہزار پاؤنڈز تو مل جاتے اور یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس کے تصور سے ہی نیلسن کے گھٹنے کانپنے لگے۔ اس نے گھبرا کر اس بندر نما لائٹر کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لائٹر تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ یہ بہت قیمتی شے ہے۔

اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور وہ خوابوں خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا جہاں وہ اس چیز کی فروخت سے ملنے والی رقم سے مزے کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا کہ اس کے سامنے ہارڈی کھڑا ہے۔ ہارڈی اس علاقے کا داداتھا۔ وہ سب کے ساتھ بدمعاشی سے پیش آتا تھا اور یہی اس کا ذریعۂ روزگار تھا۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد سے بھتا لیتا تھا۔ نیلسن بھی اس کے بھتا دہندگان میں شامل تھا۔ اس کا خون اس بات پر بہت جلتا تھا کہ وہ محنت کر کے اور خطرہ مول لے کر جو کماتا تھا اس کا ایک حصہ ہارڈی بلاوجہ لے جاتا تھا۔ ہارڈی معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''کہاں ہاتھ مارا ہے؟''

تب نیلسن کو احساس ہوا کہ وہ بندر نما چیز ابھی تک اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ اس نے جلدی سے اسے جیب میں رکھنا چاہا مگر ہارڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''یہ کیا ہے پیارے... مجھے بھی دکھاؤ۔''

"کچھ نہیں ہے۔" نیلسن نے جدوجہد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

مگر ہارڈی اس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اس نے آسانی سے نیلسن سے بندر نما لائٹر چھین لیا۔ وہ دلچسپی سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ نیلسن اب منت سماجت پر اتر آیا تھا۔ "دیکھو... یہ میں نے حاصل کیا ہے... اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اچھا۔" ہارڈی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تم نے پچھلے دو مہینے سے میرا حصہ نہیں دیا ہے۔"

"کوئی کام دھندا ہی نہیں ہوا تھا۔" نیلسن نے کمزور لہجے میں کہا۔

"کام نہیں تھا تو یہ کیا ہے؟" اس نے بندر اس کے سامنے لہرایا۔

"خدا کے لیے یہ مجھے دے دو۔ میں تمہارا دو مہینے کا حصہ ادا کر دوں گا۔" اس نے التجا کی۔ "اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ہارڈی نے بے پروائی سے کہا اور بندر نما لائٹر جیب میں ڈال لیا۔ "سمجھ لو تم نے مجھے دو مہینے کا حصہ دے دیا ہے۔"

"نہیں۔" نیلسن نے تڑپ کر کہا۔ "یہ بہت قیمتی ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں دوں گا۔" وہ ہارڈی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

ہارڈی کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اسے بدمعاشی کرنے میں مزہ آتا تھا اور اس وقت اسے اس کا بھرپور موقع مل رہا تھا۔ "اگر میں نہیں دوں گا تو تم کیا کر لو گے؟"

"دیکھو ہارڈی... یہ زیادتی ہے۔ تم سب سے نقد لیتے ہو اور مجھ سے بھی ہمیشہ نقد لیتے ہو۔ اس لیے یہ مجھے دے دو۔ میں اسے فروخت کر کے تمہارا حصہ تمہیں دے دوں گا۔"

"اس بار میں نے چیز لینے کا فیصلہ کیا ہے۔" ہارڈی گویا لطف لیتے ہوئے بولا۔ "اب یہ میری قسمت کہ یہ چیز اتنے میں بک جائے جس سے میرا حصہ نکل آئے۔"

"یہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔" نیلسن کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا۔

"یہ بھی میری قسمت!" ہارڈی نے جواب دیا اور وہاں سے جانے لگا تھا کہ نیلسن اس سے لپٹ گیا۔ مگر ان دونوں کا آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ ہارڈی نے اسے بہ آسانی گردن سے پکڑا اور زمین پر پٹخ کر اس کی بھرپور طریقے سے مرمت کرنے لگا۔ یہاں کوئی دیکھنے والا اور اسے بچانے والا بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مزاحمت کرتے ہوئے خاموشی سے پٹتا رہا۔ مزاحمت بھی کیا تھی، وہ بس خود کو ہارڈی کے مکوں اور لاتوں سے بچانے کی فضول سی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ صرف پٹنے لگا۔ کبھی کبھی وہ دبے لفظوں میں اس کی منت کرتا تھا کہ وہ اسے یہ چیز واپس کر دے۔ لیکن ہارڈی کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو وہ اس کی مرمت ہی کیوں کرتا۔ جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے نیلسن کو ایک آخری لات رسید کی اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں اچھی طرح علم ہو گیا ہو گا کہ میرے منہ لگنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر ہارڈی بے پروائی سے وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نیلسن کراہتا ہوا اٹھا۔ اس نے ہارڈی کو چند غلیظ گالیوں سے نوازا اور اپنا جسم سہلاتا ہوا گلی سے باہر آ گیا۔ اس کا جسم چوٹوں سے زیادہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا مگر وہ ہارڈی کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ گلی سے نکل کر وہ جا رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سے آتے پولیس کانسٹیبل مسٹر ولیم پر پڑی۔ ولیم اس علاقے کا نگران تھا۔ وہ صبح سے شام تک گشت کرتا تھا اور کوئی مجرم اس کے سامنے آنے کے بعد بچ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجرم اس کے سائے سے بھی بچتے تھے۔ خود نیلسن اسے دیکھ کر راستہ بدل لیا کرتا تھا مگر اس وقت ولیم کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا تھا۔ اگر چہ یہ بات مجرموں کی برادری کے اصولوں کے خلاف تھی مگر ہارڈی نے اس کے ساتھ جو کیا تھا، اس کے بعد وہ اس کے خلاف کچھ بھی کرنے میں خود کو سو فیصد حق بہ جانب سمجھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ولیم کو روکا۔ اس کی ابتر حالت نے ولیم کی توجہ خود اس کی جانب مبذول کرا دی تھی۔

"نیل! تمہارے ساتھ کس نے یہ سلوک کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہارڈی نے جناب!" نیلسن نے کراہ کر کہا۔ "مجھے ایک سونے کا بندر سڑک پر پڑا ملا تھا، وہ میں پولیس اسٹیشن جمع کرانے جا رہا تھا کہ ہارڈی نے اسے مجھ سے چھین لیا اور میں نے مزاحمت کی تو اس نے مار مار کر میرا یہ حال کر دیا۔"

اگر چہ ولیم جانتا تھا کہ نیلسن ایک جیب کترا ہے اور ممکن ہے اس نے بندر کسی کی جیب سے نکالا ہو مگر فی الحال اس کا مسئلہ ہارڈی تھا۔ وہ خاصے دن سے اس کی فکر میں تھا کہ اسے کسی طرح گرفتار کر کے جیل کی سیر کرائے۔ اور آج یہ موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے نیلسن سے پوچھا۔

"ہارڈی کس طرف گیا ہے؟"



"وہ نورفوک کے پارک کی طرف گیا ہے۔" نیلسن نے کہا۔

"تم اسی جگہ رکو، میں ابھی آیا۔ یہاں سے جانا مت ورنہ میں تمہیں بعد میں گرفتار کر لوں گا۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب... میں اسی جگہ موجود رہوں گا۔" نیلسن نے ولیم کو یقین دلایا تو وہ فوری طور پر اس طرف روانہ ہو گیا جس سمت میں ہارڈی گیا تھا۔

☆☆☆

ہارڈی ایک تن آسان شخص تھا۔ اس نے کمانے کا یہ طریقہ نکال لیا تھا کہ خود کچھ نہیں کرتا تھا، سوائے اس کے کہ اپنی دہشت بنا کر رکھے اور دوسروں کے بارے میں جانتا رہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ ان سے ان کی غیر قانونی کمائی سے بھتا وصول کرتا تھا اور خود مزے کرتا تھا۔ اسے کوئی ایسا کام نہیں کرنا پڑتا تھا کہ وہ پولیس کی گرفت میں آ سکے۔ ہارڈی ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ مقامی کونسل میں کلرک تھا اور اس کی بہت عزت تھی مگر ہارڈی بچپن سے مجرمانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ اس نے نوعمری سے مار پیٹ اور چھین جھپٹ کی وارداتیں شروع کر دی تھیں اور آئے دن اس کی شکایتیں مسٹر روجر تک آتی تھیں اور وہ اس کی مرمت کرتے تھے۔ اس مرمت کا ہارڈی پر خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ جوان ہو گیا تو مسٹر روجر کے کمزور ہاتھ اس پر بے اثر ہو گئے۔ اب وہ بالکل ہی بے لگام ہو گیا تھا اور اس کی حرکتوں پر کڑھ کڑھ کر مسٹر روجر کو ٹی بی ہو گئی تھی۔ ایک دن وہ خون تھوکتے تھوکتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ہارڈی کو روکنے والا کوئی نہ رہا تھا۔

وہ واحد جرائم پیشہ فرد تھا جو علاقے کے پولیس کانسٹیبل مسٹر ولیم سے آنکھیں ملا کر بات کر سکتا تھا کیونکہ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی فرد جرم نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ولیم اس کی تاک میں رہتا تھا اور جس دن وہ اس کی گرفت میں آ گیا، وہ اسے جیل کی ہوا ضرور کھلائے گا مگر وہ ایسا ہونے کی نوبت ہی کیوں آنے دیتا، اس لیے وہ آزادی سے دندناتا پھرتا تھا۔ وہ سب سے نقد لیتا تھا کیونکہ نوٹوں سے کسی کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ وہ چیز لینے سے گریز کرتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی سے کوئی چیز لی تھی، وہ بھی اس لیے کہ اسے یہ بندر کا مجسمہ بہت اچھا لگا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے اس چیز کا معائنہ کیا تو اسے لگا جیسے یہ خالص سونے کا ہے اور اس کی آنکھوں کی جگہ ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس نے حیرت سے سوچا کہ کیا واقعی یہ اتنا ہی قیمتی تھا؟ پھر اسے نیلسن کا رویہ یاد آیا۔ عام حالات میں اس کے سامنے مسکین بنے رہنے والے نیلسن نے اس چیز کے لیے اس سے لڑنے اور پٹنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ چیز بہت قیمتی تھی۔ اس کے اندر جوش کی لہر اٹھی۔ اگر یہ واقعی قیمتی شے تھی تو وہ اس کا تخمینہ کسی جوہری سے لگواتا اور اس کی پوری قیمت وصول کرتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے ایسے ہی اونے پونے فروخت نہیں کرے گا۔

وہ ایک جگہ رک کر اس چیز کا معائنہ کر رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا سر والا حصہ کھل گیا اور اس سے شعلہ نکلا تھا۔ ایک لمحے کو وہ بدحواس ہو گیا پھر اسے ہنسی آ گئی۔ یہ اصل میں لائٹر تھا۔ اس نے سر بند کیا تو شعلہ خود بہ خود بجھ گیا۔ اس نے لائٹر جیب میں رکھا۔ وہ وہاں سے جانے والا تھا کہ اس کی نظر ولیم پر پڑی جو اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آ رہا تھا اور اس کا رخ ہارڈی کی طرف تھا۔ ابھی تک اس کی نظر ہارڈی پر نہیں پڑی تھی کیونکہ ہارڈی ایک آڑ میں تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ ولیم اسی کی تلاش میں آ رہا ہے اور اس کے پاس ایک مشکوک چیز تھی۔ مگر وہ اس کی تلاش میں کیوں تھا؟ اس سوال کا جواب اچانک ہی اس کے دماغ پر نازل ہوا تھا۔ مسٹر ولیم کو نیلسن نے شکایت کی تھی اور اب وہ اس کی تلاش میں تھا۔ آڑ میں وہ محفوظ تھا مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں کیونکہ ولیم ذرا آگے آنے کے بعد اسے دیکھ ہی لیتا۔ اس نے ولیم کے نزدیک آنے سے پہلے وہاں سے بھاگ لینا مناسب سمجھا۔ جیسے ہی وہ آڑ سے نکلا اور ولیم نے اسے دیکھا تو اس نے سیٹی بجائی۔ یہ رکنے کا اشارہ تھا مگر ہارڈی رک نہیں سکتا تھا۔ وہ بھاگتا چلا گیا اور ولیم نے بھی اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔

ہارڈی نے گلیوں والا راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ سیدھی سڑک پر ولیم اسے پکڑ ہی لیتا اور وہ اس چیز سے نہ تو دست بردار ہو سکتا تھا اور نہ اس کے ساتھ پکڑے جانا پسند کرتا۔ اس لیے وہ جان توڑ کر بھاگنے لگا۔ یوں تو ہارڈی میں بہت جان تھی مگر اس میں ایک خامی بھی تھی کہ وہ شرابی تھا اور اس کا سانس ذرا سی دیر میں اکھڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سانس اکھڑنا شروع ہو گیا تھا جبکہ ولیم نہ صرف جوان تھا بلکہ اس کو ایسی کوئی علت بھی نہیں تھی اس لیے اس کا سانس برقرار تھا اور وہ بڑی مستقل مزاجی سے ایک ہی رفتار سے ہارڈی کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہارڈی کا سانس جلد اکھڑ جائے گا اور وہ اسے جا لے گا۔

ہارڈی جلدی جلدی گلیاں تبدیل کر رہا تھا مگر ولیم کسی سائے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح پیچھا چھڑائے۔ بھاگتے بھاگتے

"کچھ نہیں ہے۔" نیلسن نے جدوجہد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

مگر ہارڈی اس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اس نے آسانی سے نیلسن سے بندر نما لائٹر چھین لیا۔ وہ دلچسپی سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ نیلسن اب منت سماجت پر اتر آیا تھا۔ "دیکھو... یہ میں نے حاصل کیا ہے... اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اچھا۔" ہارڈی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تم نے پچھلے دو مہینے سے میرا حصہ نہیں دیا ہے۔"

"کوئی کام دھندا ہی نہیں ہوا تھا۔" نیلسن نے کمزور لہجے میں کہا۔

"کام نہیں تھا تو یہ کیا ہے؟" اس نے بندر اس کے سامنے لہرایا۔

"خدا کے لیے یہ مجھے دے دو۔ میں تمہارا دو مہینے کا حصہ ادا کر دوں گا۔" اس نے التجا کی۔ "اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ہارڈی نے بے پروائی سے کہا اور بندر نما لائٹر جیب میں ڈال لیا۔ "سمجھ لو تم نے مجھے دو مہینے کا حصہ دے دیا ہے۔"

"نہیں۔" نیلسن نے تڑپ کر کہا۔ "یہ بہت قیمتی ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں دوں گا۔" وہ ہارڈی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

ہارڈی کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اسے بدمعاشی کرنے میں مزہ آتا تھا اور اس وقت اسے اس کا بھرپور موقع مل رہا تھا۔ "اگر میں نہیں دوں گا تو تم کیا کر لو گے؟"

"دیکھو ہارڈی... یہ زیادتی ہے۔ تم سب سے نقد لیتے ہو اور مجھ سے بھی ہمیشہ نقد لیتے ہو۔ اس لیے یہ مجھے دے دو۔ میں اسے فروخت کر کے تمہارا حصہ تمہیں دے دوں گا۔"

"اس بار میں نے چیز لینے کا فیصلہ کیا ہے۔" ہارڈی گویا لطف لیتے ہوئے بولا۔ "اب یہ میری قسمت کہ یہ چیز اتنے میں بک جائے جس سے میرا حصہ نکل آئے۔"

"یہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔" نیلسن کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا۔

"یہ بھی میری قسمت!" ہارڈی نے جواب دیا اور وہاں سے جانے لگا تھا کہ نیلسن اس سے لپٹ گیا۔ مگر ان دونوں کا آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ ہارڈی نے اسے بہ آسانی گردن سے پکڑا اور زمین پر پٹخ کر اس کی بھرپور طریقے سے مرمت کرنے لگا۔ یہاں کوئی دیکھنے والا اور اسے بچانے والا بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مزاحمت کرتے ہوئے خاموشی سے پٹتا رہا۔ مزاحمت بھی کیا تھی، وہ بس خود کو ہارڈی کے مکوں اور لاتوں سے بچانے کی فضول سی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ صرف پٹنے لگا۔ کبھی کبھی وہ دبے لفظوں میں اس کی منت کرتا تھا کہ وہ اسے یہ چیز واپس کر دے۔ لیکن ہارڈی کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو وہ اس کی مرمت ہی کیوں کرتا۔ جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے نیلسن کو ایک آخری لات رسید کی اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں اچھی طرح علم ہو گیا ہو گا کہ میرے منہ لگنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر ہارڈی بے پروائی سے وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نیلسن کراہتا ہوا اٹھا۔ اس نے ہارڈی کو چند غلیظ گالیوں سے نوازا اور اپنا جسم سہلاتا ہوا گلی سے باہر آ گیا۔ اس کا جسم چوٹوں سے زیادہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا مگر وہ ہارڈی کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ گلی سے نکل کر وہ جا رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سے آتے پولیس کانسٹیبل مسٹر ولیم پر پڑی۔ ولیم اس علاقے کا نگران تھا۔ وہ صبح سے شام تک گشت کرتا تھا اور کوئی مجرم اس کے سامنے آنے کے بعد بچ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجرم اس کے سائے سے بھی بچتے تھے۔ خود نیلسن اسے دیکھ کر راستہ بدل لیا کرتا تھا مگر اس وقت ولیم کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا تھا۔ اگر چہ یہ بات مجرموں کی برادری کے اصولوں کے خلاف تھی مگر ہارڈی نے اس کے ساتھ جو کیا تھا، اس کے بعد وہ اس کے خلاف کچھ بھی کرنے میں خود کو سو فیصد حق بہ جانب سمجھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ولیم کو روکا۔ اس کی ابتر حالت نے ولیم کی توجہ خود اس کی جانب مبذول کرا دی تھی۔

"نیل! تمہارے ساتھ کس نے یہ سلوک کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہارڈی نے جناب!" نیلسن نے کراہ کر کہا۔ "مجھے ایک سونے کا بندر سڑک پر پڑا ملا تھا، وہ میں پولیس اسٹیشن جمع کرانے جا رہا تھا کہ ہارڈی نے اسے مجھ سے چھین لیا اور میں نے مزاحمت کی تو اس نے مار مار کر میرا یہ حال کر دیا۔"

اگر چہ ولیم جانتا تھا کہ نیلسن ایک جیب کترا ہے اور ممکن ہے اس نے بندر کسی کی جیب سے نکالا ہو مگر فی الحال اس کا مسئلہ ہارڈی تھا۔ وہ خاصے دن سے اس کی فکر میں تھا کہ اسے کسی طرح گرفتار کر کے جیل کی سیر کرائے۔ اور آج یہ موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے نیلسن سے پوچھا۔

"ہارڈی کس طرف گیا ہے؟"



"وہ نورفوک کے پارک کی طرف گیا ہے۔" نیلسن نے کہا۔

"تم اسی جگہ رکو، میں ابھی آیا۔ یہاں سے جانا مت ورنہ میں تمہیں بعد میں گرفتار کر لوں گا۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب... میں اسی جگہ موجود رہوں گا۔" نیلسن نے ولیم کو یقین دلایا تو وہ فوری طور پر اس طرف روانہ ہو گیا جس سمت میں ہارڈی گیا تھا۔

☆☆☆

ہارڈی ایک تن آسان شخص تھا۔ اس نے کمانے کا یہ طریقہ نکال لیا تھا کہ خود کچھ نہیں کرتا تھا، سوائے اس کے کہ اپنی دہشت بنا کر رکھے اور دوسروں کے بارے میں جانتا رہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ ان سے ان کی غیر قانونی کمائی سے بھتا وصول کرتا تھا اور خود مزے کرتا تھا۔ اسے کوئی ایسا کام نہیں کرنا پڑتا تھا کہ وہ پولیس کی گرفت میں آ سکے۔ ہارڈی ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ مقامی کونسل میں کلرک تھا اور اس کی بہت عزت تھی مگر ہارڈی بچپن سے مجرمانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ اس نے نوعمری سے مار پیٹ اور چھین جھپٹ کی وارداتیں شروع کر دی تھیں اور آئے دن اس کی شکایتیں مسٹر روجر تک آتی تھیں اور وہ اس کی مرمت کرتے تھے۔ اس مرمت کا ہارڈی پر خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ جوان ہو گیا تو مسٹر روجر کے کمزور ہاتھ اس پر بے اثر ہو گئے۔ اب وہ بالکل ہی بے لگام ہو گیا تھا اور اس کی حرکتوں پر کڑھ کڑھ کر مسٹر روجر کوئی بی ہو گئی تھی۔ ایک دن وہ خون تھوکتے تھوکتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ہارڈی کو روکنے والا کوئی نہ رہا تھا۔

وہ واحد جرائم پیشہ فرد تھا جو علاقے کے پولیس کانسٹیبل مسٹر ولیم سے آنکھیں ملا کر بات کر سکتا تھا کیونکہ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی فردِ جرم نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ولیم اس کی تاک میں رہتا تھا اور جس دن وہ اس کی گرفت میں آ گیا، وہ اسے جیل کی ہوا ضرور کھلائے گا مگر وہ ایسا ہونے کی نوبت ہی کیوں آنے دیتا، اس لیے وہ آزادی سے دندناتا پھرتا تھا۔ وہ سب سے نقد لیتا تھا کیونکہ نوٹوں سے کسی کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ وہ چیز لینے سے گریز کرتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی سے کوئی چیز لی تھی، وہ بھی اس لیے کہ اسے یہ بندر کا مجسمہ بہت اچھا لگا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے اس چیز کا معائنہ کیا تو اسے لگا جیسے یہ خالص سونے کا ہے اور اس کی آنکھوں کی جگہ ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس نے حیرت سے سوچا کہ کیا واقعی یہ اتنا ہی قیمتی تھا؟ پھر اسے نیلسن کا رویہ یاد آیا۔ عام حالات میں اس کے سامنے مسکین بنے رہنے والے نیلسن نے اس چیز کے لیے اس سے لڑنے اور پٹنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ چیز بہت قیمتی تھی۔ اس کے اندر جوش کی لہر سی اٹھی۔ اگر یہ واقعی قیمتی شے تھی تو وہ اس کا تخمینہ کسی جوہری سے لگواتا اور اس کی پوری قیمت وصول کرتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے ایسے ہی اونے پونے فروخت نہیں کرے گا۔

وہ ایک جگہ رک کر اس چیز کا معائنہ کر رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا سر والا حصہ کھل گیا اور اس سے شعلہ نکلا تھا۔ ایک لمحے کو وہ بدحواس ہو گیا پھر اسے ہنسی آ گئی۔ یہ اصل میں لائٹر تھا۔ اس نے سر بند کیا تو شعلہ خود بہ خود بجھ گیا۔ اس نے لائٹر جیب میں رکھا۔ وہ وہاں سے جانے والا تھا کہ اس کی نظر ولیم پر پڑی جو اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آ رہا تھا اور اس کا رخ ہارڈی کی طرف تھا۔ ابھی تک اس کی نظر ہارڈی پر نہیں پڑی تھی کیونکہ ہارڈی ایک آڑ میں تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ ولیم اسی کی تلاش میں آ رہا ہے اور اس کے پاس ایک مشکوک چیز تھی۔ مگر وہ اس کی تلاش میں کیوں تھا؟ اس سوال کا جواب اچانک ہی اس کے دماغ پر نازل ہوا تھا۔ مسٹر ولیم کو نیلسن نے شکایت کی تھی اور اب وہ اس کی تلاش میں تھا۔ آڑ میں وہ محفوظ تھا مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں کیونکہ ولیم ذرا آگے آنے کے بعد اسے دیکھ ہی لیتا۔ اس نے ولیم کے نزدیک آنے سے پہلے وہاں سے بھاگ لینا مناسب سمجھا۔ جیسے ہی وہ آڑ سے نکلا اور ولیم نے اسے دیکھا تو اس نے سیٹی بجائی۔ یہ رکنے کا اشارہ تھا مگر ہارڈی رک نہیں سکتا تھا۔ وہ بھاگتا چلا گیا اور ولیم نے بھی اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔

ہارڈی نے گلیوں والا راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ سیدھی سڑک پر ولیم اسے پکڑ ہی لیتا اور وہ اس چیز سے نہ تو دست بردار ہو سکتا تھا اور نہ اس کے ساتھ پکڑے جانا پسند کرتا۔ اس لیے وہ جان توڑ کر بھاگنے لگا۔ یوں تو ہارڈی میں بہت جان تھی مگر اس میں ایک خامی بھی تھی کہ وہ شرابی تھا اور اس کا سانس ذرا سی دیر میں اکھڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سانس اکھڑنا شروع ہو گیا تھا جبکہ ولیم نہ صرف جوان تھا بلکہ اس کو ایسی کوئی علت بھی نہیں تھی اس لیے اس کا سانس برقرار تھا اور وہ بڑی مستقل مزاجی سے ایک ہی رفتار سے ہارڈی کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہارڈی کا سانس جلد اکھڑ جائے گا اور وہ اسے جا لے گا۔

ہارڈی جلدی جلدی گلیاں تبدیل کر رہا تھا مگر ولیم کسی سائے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح پیچھا چھڑائے۔ بھاگتے بھاگتے

وہ نورفوک کے رہائشی علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں مکانات تھے اور گلیاں تھیں جن میں چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اچانک ہی اس کے سامنے پارک آیا اور وہ بلا سوچے سمجھے اس کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ ولیم نے اسے پارک میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک شمال میں اور دوسرا مشرق میں۔ وہ مشرق والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس طرح ہارڈی مستقل اس کی نظروں میں تھا۔

ہارڈی بھاگتے ہوئے وسط میں بنی پتھر کی لاٹ تک آیا۔ یہاں مسٹر ایمرسن بدستور خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اس کا سانس اس بری طرح پھول گیا تھا کہ اب اس میں بھاگنے کی ذرا سی بھی سکت نہیں رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ ولیم اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اس چیز سے چھٹکارا حاصل کر لے ورنہ وہ اس کے ساتھ گرفتار ہو جاتا تو اسے لمبی مدت کے لیے جیل بھیج دیا جاتا۔ ان دنوں انگلینڈ میں معمولی چوری پر عمر قید کی سزا عام تھی۔

اس نے چاروں طرف دیکھا کہ اسے کوئی جگہ نظر آ جائے جہاں وہ اس بندر نما لائٹر کو چھپا سکے مگر اسے ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ وہ اسے جہاں بھی چھپاتا ولیم اسے تلاش کر لیتا یا کوئی اور پا کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ اگر کوئی اور لے جاتا تو اسے اتنی پروا نہیں تھی مگر وہ ولیم کے ہاتھ لگتا تو وہ اسے اس کے گلے کا پھندا بنا دیتا۔ اس نے مسٹر ایمرسن کو غور سے دیکھا، وہ اس علاقے کے سب سے معزز آدمی تھے۔ اگر ان کے پاس سے یہ برآمد ہو بھی جاتا تو ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے بندر نما لائٹر ان کے کوٹ کی اوپر والی جیب میں ڈال دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے ولیم پارک میں داخل ہوا اور اس نے سیٹی بجا کر ہارڈی کو للکارا۔ وہ فوراً رک گیا تھا۔ ولیم اس کے پاس آیا اور اس سے ہاتھ اوپر کرنے کو کہا۔ اس نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ ولیم نے اس کی مکمل تلاشی لی مگر اس کے پاس سے وہ چیز نہیں نکلی جس کی اسے توقع تھی۔ ہارڈی مسکرانے لگا پھر اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''کیا میں عزت مآب سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ میری اس طرح تلاشی کیوں لی جا رہی ہے؟''

''جب میں نے تمہیں رکنے کو کہا تھا تو تم بھاگ کیوں کھڑے ہوئے تھے؟'' ولیم نے پوچھا۔

''میں نے سنا نہیں تھا۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ تم نے سنا تھا اور پھر بھاگے تھے... کیوں؟''

''میرا بھاگنے کو دل چاہ رہا تھا۔''

''تم نے وہ بندر نما چیز کہاں پھینکی ہے؟''

''بندر نما چیز!'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''نہیں جناب! میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہے۔ پھینکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ولیم نے پارک میں چاروں طرف دیکھا مگر اسے وہ چیز کہیں نظر نہیں آئی جس کا ذکر نیلسن نے کیا تھا۔ اس نے ہارڈی سے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔''

''کس جرم میں جناب؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''یہ میں تمہیں وہاں چل کر بتاؤں گا۔'' ولیم نے کہا۔

''تم نے بے شک اس چیز سے چھٹکارا پا لیا ہے مگر تم پر ابھی مار پیٹ کا کیس ہے۔''

یہ سن کر ہارڈی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے مزاحمت کی مگر ولیم نے چند مکوں میں اس کا دماغ درست کر دیا پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اب وہ نیلسن کو بلا کر اس کا سامنا کراتا اور دونوں کو مار پیٹ کے الزام میں اندر کر دیتا۔ اس طرح علاقے کے لوگ چند مہینے تو سکون سے رہتے۔

☆☆☆

مسٹر ایمرسن بیدار ہوئے تو دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے ان کی نیند اچاٹ ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا بجھا سگار دیکھا اور جیب سے بندر نما لائٹر نکال کر اسے پھر سے سلگا لیا۔ وہ لائٹر جیب میں رکھنے لگے تھے کہ وہ نیچے گر گیا۔ اسی وقت پاس سے ان کا ایک پڑوسی مسٹر جارج گزر رہا تھا۔ اس نے لائٹر اٹھا کر مسٹر ایمرسن کو دیا اور بولا۔

''مسٹر ایمرسن! اتنی قیمتی چیز اتنی بے پروائی سے نہ پھینکیں۔''

''شکریہ مسٹر جارج! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

انہوں نے مسکرا کر کہا اور مسٹر جارج کے جانے کے بعد ہنسے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ جس لائٹر کا شہرہ پورے لندن میں بلکہ اس سے باہر بھی ہو چکا تھا، وہ نقلی تھا۔ یہ نہ تو سونے کا بنا تھا اور نہ اس کی آنکھوں کی جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ان کے بھتیجے نے ان سے غلط بیانی کر کے یہ تحفہ دیا تھا اور انہوں نے بھتیجے کا دل رکھنے کے لیے اسے لے لیا تھا۔ ورنہ وہ جدی پشتی رئیس تھے۔ سونے اور ہیروں کی پہچان ان سے زیادہ اور کس کو ہو سکتی تھی۔ مگر تحفہ، تحفہ ہوتا ہے، چاہے وہ نقلی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اسے سنبھال کر رکھیں گے۔ انہوں نے کافی سے زیادہ آرام کر لیا تھا اس لیے پانچ سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

❄



ساحلی علاقے کی گشتی پولیس فورس کا کمانڈر ٹام اپنی گاڑی میں میامی سے آ رہا تھا۔ وہ گزشتہ نصف شب کو وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہو سکا اور اس کی گاڑی میں گیس اچانک ختم ہو گئی۔ اس نے فیول کی سوئی کی طرف دیکھا تو وہ ''خالی'' کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

''اوہ میرے خدا! یہ کیا ہوا؟'' ٹام نے خود کلامی کی اور گیس اسٹیشن کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ تھوڑے فاصلے پر اسے گیس اسٹیشن نظر آ گیا اور وہ اپنی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح وہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ گیس اسٹیشن چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے اور ایسے وقت بھی وہاں کئی کاریں

# لٹیرے

رضوانہ منظر

**سراغ رسی کی باریکیوں کو اجاگر کرتی ایک مختصر کتھائے جرم**

ہر شخص اپنی دانست میں خود کو عقلِ کل سمجھتا ہے کہ وہ جو کر رہا ہے بالکل درست ہے ایسے ہی شخص کی روداد جو اپنی منصوبہ بندی سے پوری طرح مطمئن تھا

کھڑی تھیں۔ ٹام نے اپنی گاڑی پمپ کے بالکل سامنے پہنچائی ہی تھی کہ اس کا انجن غرّا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں اپنی کار سے باہر دیکھا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ گیس اسٹیشن میں کھڑی ہوئی سب کاریں شیرف کے محکمے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تھوڑی دیر تک ٹام اپنی کار میں ہی بیٹھا باہر ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔ وہ لوگ گاڑیوں میں گیس ڈلوانے کے بجائے کسی موضوع پر زور و شور سے بحث کر رہے تھے۔

ٹام اپنی کار سے اترا اور ان لوگوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈپٹی شیرف ایوارٹس نے اسے پہچان لیا اور وہیں سے بولا۔ ''ارے کمانڈر! تم نے تو کمال کر دیا۔ وقت ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ گئے۔''

''وقت ضائع کیے بغیر؟'' ٹام نے سردمہری سے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں سمجھا نہیں۔''

''بھئی تم ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے ہو۔''

ایوارٹس نے دوبارہ گرم جوشی سے کہا تو ٹام بھنّا گیا۔

''میں تو پچھلی رات میامی سے روانہ ہوا تھا اور اس جگہ سے گزر رہا تھا کہ گیس ختم ہو گئی۔ وہ تو میری نظر اس گیس اسٹیشن پر پڑ گئی ورنہ رات کے دو بجے میں کہاں جاتا؟'' ٹام نے کہا تو ڈپٹی شیرف حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا؟ مگر میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔'' ایوارٹس نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ تمہیں اس حادثے کی اطلاع دی گئی ہے اور تم کی ویسٹ سے آئے ہو۔''

''خیر... تم یہ بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟'' ٹام نے سوال کیا۔

''دراصل یہاں دو ملاح آئے تھے۔'' ایوارٹس بولا۔ ''اس حوالے سے اس کیس کی ذمے داری تمہارے محکمے ''شور پٹرول'' کی ہی بنتی ہے۔''

''ملاح... کیسے ملاح؟'' کمانڈر ٹام نے سوال کیا۔ ''مجھے تو یہاں کوئی ملاح نظر نہیں آرہا ہے... صرف تم لوگ ہو یا پھر اس گیس اسٹیشن کے ملازم...''

''ہاں... یہ میک ہے۔'' ایوارٹس نے کہا۔ ''اس گیس اسٹیشن کا رات کی شفٹ کا انچارج!'' اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جس کی پیشانی اور چہرے پر گریس لگی ہوئی تھی۔

''میک کا کہنا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے اس گیس اسٹیشن پر دو ملاح آئے تھے۔ اس وقت یہ کسی گاڑی میں گیس ڈال رہا تھا کہ ان دونوں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور کوئی وزنی چیز اس کے سر پر دے ماری۔ جب اسے ہوش آیا تو دونوں ملاح غائب تھے اور سارا کیش بھی غائب تھا۔ ڈاکو ملاحوں نے ایک پینی بھی نہیں چھوڑی تھی۔'' ایوارٹس نے کمانڈر ٹام کو بتایا تو ٹام نے گیس اسٹیشن کے انچارج میک کو غور سے دیکھا۔ وہ دراز قد اور دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی اور لرزتی ہوئی آواز میں اٹک اٹک کر ایوارٹس کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کر دی۔

''ان... لوگوں نے... کچھ بھی نہیں چھوڑا... ایک سکہ... بھی نہیں...'' میک نے کہا اور اپنی پتلون کی دونوں جیبیں الٹ کر کمانڈر کو دکھائیں۔ دورانِ گفتگو وہ ہاتھ بھی چلا رہا تھا۔ اس نے گریس میں لتھڑا ہوا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیا۔ گھبرا کر اس نے دوسرے ہاتھ سے گریس صاف کرنے کی کوشش کی تو وہ اور بھی پھیل گئی۔ اس نے ایک میلا کچیلا سا کپڑا اٹھا کر اپنے سیدھے کان کو صاف کرنا چاہا تو وہ کپڑا خون آلود ہو گیا۔ ٹام کی نظریں اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔

''تم تو زخمی بھی ہو میک!'' ٹام نے کہا۔

''ہاں۔'' میک نے جواب دیا۔ ''پہلے مجھے اس چوٹ کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں پندرہ بیس منٹ بے ہوش رہا تھا۔ بہرحال، جب ہوش آیا تو سب سے پہلے میں نے شیرف کو فون کیا تھا۔ اُف میرا سر...!'' یہ کہہ کر میک کراہا۔

ایوارٹس کے اشارے پر اس کا ایک آدمی گاڑی سے فرسٹ ایڈ باکس لے آیا۔ اس نے باکس کھولا اور میک کے زخم کی صفائی شروع کر دی۔

''اوہ! یہ تو خاصا گہرا زخم ہے۔'' ایوارٹس کے آدمی نے کہا۔ ''ان ملاحوں نے تمہارے سر پر کیا چیز ماری تھی؟''

''پتا نہیں۔'' میک نے جواب دیا۔ ''مجھے ہوش ہی کہاں تھا جو کچھ دیکھتا... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں گیس پمپ کر رہا تھا تو وہ دونوں ٹھنڈے کولر سے پانی پی رہے تھے اور گیس اسٹیشن میں گھوم پھر رہے تھے کہ میرے سر پر کوئی چیز لگی اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں فرش پر زخمی پڑا ہوا تھا اور دونوں ملاح جا چکے تھے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ملاح ہی تھے؟'' شور پٹرول کے سربراہ ٹام نے میک سے سوال کیا۔ وہ بے حد فکرمند اور پریشان تھا کیونکہ ساحل اور ساحل پر آنے جانے والے تمام بحری جہازوں اور ان پر کام کرنے والے ملاحوں کی حفاظت اور نگرانی ''شور پٹرول'' کی ذمے داری تھی۔

''ہاں... وہ ملاحوں والے لباس میں تھے۔'' میک نے فوراً جواب دیا تو ٹام کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''ان کی کار کون سی تھی؟'' ٹام نے سوال کیا۔



''نیلی کنورٹیبل!'' میک نے جواب میں کہا۔ ''اس کار کی ونڈ شیلڈ پر ایک بڑا سا اسٹیکر بھی لگا ہوا تھا جس پر ان کی بیس کا نام لکھا تھا۔''

''اچھا... تمہارے چہرے اور لباس پر یہ گریس کیسے لگ گئی؟'' ٹام کا اگلا سوال سن کر میک جھینپ گیا۔ اس نے سامنے لگے ہوئے ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں دو کسٹمرز کی کاروں کے علاوہ اپنی کار پر بھی کام کر رہا تھا۔''

ٹام نے اس کی کار کی طرف دیکھا جو اس وقت بھی ہائیڈرولک لفٹ پر تھی اور زمین سے لگ بھگ پانچ فٹ بلند تھی۔ اس کے نیچے گریس بھی پڑی تھی اور چکنائی اور تیل کے دھبے بھی نظر آرہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میک اچھا خاصا گندا اور بدسلیقہ انسان تھا۔

''ایوارٹس!'' ٹام نے مڑ کر سارجنٹ کو مخاطب کیا۔ ''تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟''

''کمانڈر! میک کا خیال ہے کہ جس وقت وہ دونوں ملاح یہاں آئے تھے، اس وقت وہ کی ویسٹ جا رہے تھے مگر بعد میں کدھر گئے... اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جب وہ واپس گئے تو میک بے ہوش تھا۔'' ایوارٹس نے جواب دیا۔ ''ویسے میں نے کی لارگو اور اسٹاک آئی لینڈ کو بہ ذریعہ ریڈیو مطلع کر دیا ہے اور تمام پٹرول کاروں کو بھی مستعد کر دیا ہے۔ ہر علاقے کی پولیس ایسے مشکوک ملاحوں کو تلاش کر رہی ہے۔''

''اچھا... انہیں بیس اسٹیکر کے بارے میں بھی بتا دیا ہوتا۔ اس سے وہ آسانی سے پہچان لیے جائیں گے۔'' ٹام نے کہا تو ایوارٹس بولا کہ وہ یہ کام کر چکا ہے۔

''ہم بہت جلد مجرموں کے گرد گھیرا تنگ کر دیں گے۔ وہ زیادہ دیر ہم سے نہیں بچ سکیں گے۔'' ٹام نے کہا۔

''کمانڈر! تم اپنے کام کا آغاز کب کرو گے؟'' ایوارٹس نے کچھ سوچتے ہوئے کمانڈر ٹام سے سوال کیا۔

''میں ابھی فون کر کے احکام دیتا ہوں۔'' ٹام نے کہا۔ ''ہماری پٹرول گاڑیاں فوری کام شروع کر دیں گی۔'' پھر اس نے سوال کیا۔ ''فون کہاں ہے؟''

''وہ... آفس کے باہر...'' ایوارٹس نے کہا۔ ''مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس گیس اسٹیشن پر عام ٹیلی فون نہیں ہے بلکہ سکے ڈالنے والا فون ہے۔''

''اچھا!'' یہ کہہ کر ٹام فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا اور ٹیلی فون میں ڈالنے کے بعد


خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہِ اگست 2009ء کے جھلملاتے شمارے کی رنگینیاں

**ایسا بھی ہوتا ہے**

ہجرتوں اور..... ہجر و وصال کا بے مثال احوال آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کی روانی

**راجپوت محبوبہ**

ہمایوں بلگرامی کے قلم سے فیروز شاہ تغلق کے پوتے ہمایوں خاں اور اس کی روپ بدلتی راجپوت محبوبہ کی پرکیف داستان عشق

**حضرت لوطؑ**

قومِ لوطؑ کی بداعمالیوں کے عبرت آموز اور فکر انگیز واقعات

**بیساکھی**

ملک صفدر حیات کا سنسنی خیز کارنامہ

قاتل اس کی پہنچ سے دور نہیں تھا

اس کے علاوہ

دیوتا، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید

طاہر جاوید مغل، مریم کے خان
کاشف زبیر اور ثمر عباس کی دلچسپ تحریریں

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!

تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

کھڑی تھیں۔ ٹام نے اپنی گاڑی پمپ کے بالکل سامنے پہنچائی ہی تھی کہ اس کا انجن غرّا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں اپنی کار سے باہر دیکھا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ گیس اسٹیشن میں کھڑی ہوئی سب کاریں شیرف کے محکمے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تھوڑی دیر تک ٹام اپنی کار میں ہی بیٹھا باہر ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔ وہ لوگ گاڑیوں میں گیس ڈلوانے کے بجائے کسی موضوع پر زور و شور سے بحث کر رہے تھے۔

ٹام اپنی کار سے اترا اور ان لوگوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈپٹی شیرف ایوارٹس نے اسے پہچان لیا اور وہیں سے بولا۔ ”ارے کمانڈر! تم نے تو کمال کر دیا۔ وقت ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ گئے۔“

”وقت ضائع کیے بغیر؟“ ٹام نے سرد مہری سے کہا۔ ”کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں سمجھا نہیں۔“

”بھئی تم ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے ہو۔“ ایوارٹس نے دوبارہ گرم جوشی سے کہا تو ٹام بھنّا گیا۔

”میں تو پچھلی رات میامی سے روانہ ہوا تھا اور اس جگہ سے گزر رہا تھا کہ گیس ختم ہو گئی۔ وہ تو میری نظر اس گیس اسٹیشن پر پڑ گئی ورنہ رات کے دو بجے میں کہاں جاتا؟“ ٹام نے کہا تو ڈپٹی شیرف حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اچھا؟ مگر میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔“ ایوارٹس نے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تمہیں اس حادثے کی اطلاع دی گئی ہے اور تم کی ویسٹ سے آئے ہو۔“

”خیر... تم یہ بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ ٹام نے سوال کیا۔

”دراصل یہاں دو ملاح آئے تھے۔“ ایوارٹس بولا۔ ”اس حوالے سے اس کیس کی ذمے داری تمہارے محکمے ”شور پٹرول“ کی ہی بنتی ہے۔“

”ملاح... کیسے ملاح؟“ کمانڈر ٹام نے سوال کیا۔ ”مجھے تو یہاں کوئی ملاح نظر نہیں آ رہا ہے... صرف تم لوگ ہو یا پھر اس گیس اسٹیشن کے ملازم...“

”ہاں... یہ میک ہے۔“ ایوارٹس نے کہا۔ ”اس گیس اسٹیشن کا رات کی شفٹ کا انچارج!“ اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جس کی پیشانی اور چہرے پر گریس لگی ہوئی تھی۔

”میک کا کہنا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے اس گیس اسٹیشن پر دو ملاح آئے تھے۔ اس وقت یہ کسی گاڑی میں گیس ڈال رہا تھا کہ ان دونوں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور کوئی وزنی چیز اس کے سر پر دے ماری۔ جب اسے ہوش آیا تو دونوں ملاح غائب تھے اور سارا کیش بھی غائب تھا۔ ڈاکو ملاحوں نے ایک پینی بھی نہیں چھوڑی تھی۔“ ایوارٹس نے کمانڈر ٹام کو بتایا تو ٹام نے گیس اسٹیشن کے انچارج میک کو غور سے دیکھا۔

وہ دراز قد اور دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی اور لرزتی ہوئی آواز میں اٹک اٹک کر ایوارٹس کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کر دی۔

”ان... لوگوں نے... کچھ بھی نہیں چھوڑا... ایک سکہ... بھی نہیں...“ میک نے کہا اور اپنی پتلون کی دونوں جیبیں الٹ کر کمانڈر کو دکھائیں۔ دورانِ گفتگو وہ ہاتھ بھی چلا رہا تھا۔ اس نے گریس میں لتھڑا ہوا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیا۔ گھبرا کر اس نے دوسرے ہاتھ سے گریس صاف کرنے کی کوشش کی تو وہ اور بھی پھیل گئی۔ اس نے ایک میلا کچیلا سا کپڑا اٹھا کر اپنے سیدھے کان کو صاف کرنا چاہا تو وہ کپڑا خون آلود ہو گیا۔ ٹام کی نظریں اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔

”تم تو زخمی بھی ہو میک!“ ٹام نے کہا۔

”ہاں۔“ میک نے جواب دیا۔ ”پہلے مجھے اس چوٹ کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں پندرہ بیس منٹ بے ہوش رہا تھا۔ بہرحال، جب ہوش آیا تو سب سے پہلے میں نے شیرف کو فون کیا تھا۔ اُف میرا سر...!“ یہ کہہ کر میک کراہا۔

ایوارٹس کے اشارے پر اس کا ایک آدمی گاڑی سے فرسٹ ایڈ باکس لے آیا۔ اس نے باکس کھولا اور میک کے زخم کی صفائی شروع کر دی۔

”اوہ! یہ تو خاصا گہرا زخم ہے۔“ ایوارٹس کے آدمی نے کہا۔ ”ان ملاحوں نے تمہارے سر پر کیا چیز ماری تھی؟“

”پتا نہیں۔“ میک نے جواب دیا۔ ”مجھے ہوش ہی کہاں تھا جو کچھ دیکھتا... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں گیس پمپ کر رہا تھا تو وہ دونوں ٹھنڈے کولر سے پانی پی رہے تھے اور گیس اسٹیشن میں گھوم پھر رہے تھے کہ میرے سر پر کوئی چیز لگی اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں فرش پر زخمی پڑا ہوا تھا اور دونوں ملاح جا چکے تھے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ملاح ہی تھے؟“ شور پٹرول کے سربراہ ٹام نے میک سے سوال کیا۔ وہ بے حد فکر مند اور پریشان تھا کیونکہ ساحل اور ساحل پر آنے جانے والے تمام بحری جہازوں اور ان پر کام کرنے والے ملاحوں کی حفاظت اور نگرانی ”شور پٹرول“ کی ذمے داری تھی۔

”ہاں... وہ ملاحوں والے لباس میں تھے۔“ میک نے فوراً جواب دیا تو ٹام کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

”ان کی کار کون سی تھی؟“ ٹام نے سوال کیا۔



”نیلی کنورٹیبل!“ میک نے جواب میں کہا۔ ”اس کار کی ونڈ شیلڈ پر ایک بڑا سا اسٹیکر بھی لگا ہوا تھا جس پر ان کی بیس کا نام لکھا تھا۔“

”اچھا... تمہارے چہرے اور لباس پر یہ گریس کیسے لگ گئی؟“ ٹام کا اگلا سوال سن کر میک جھینپ گیا۔ اس نے سامنے لگے ہوئے ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں دو کسٹمرز کی کاروں کے علاوہ اپنی کار پر بھی کام کر رہا تھا۔“

ٹام نے اس کی کار کی طرف دیکھا جو اس وقت بھی ہائیڈرولک لفٹ پر تھی اور زمین سے لگ بھگ پانچ فٹ بلند تھی۔ اس کے نیچے گریس بھی پڑی تھی اور چکنائی اور تیل کے دھبے بھی نظر آ رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میک اچھا خاصا گندا اور بدسلیقہ انسان تھا۔

”ایوارٹس!“ ٹام نے مڑ کر سارجنٹ کو مخاطب کیا۔ ”تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟“

”کمانڈر! میک کا خیال ہے کہ جس وقت وہ دونوں ملاح یہاں آئے تھے، اس وقت وہ کی ویسٹ جا رہے تھے مگر بعد میں کدھر گئے... اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جب وہ واپس گئے تو میک بے ہوش تھا۔“ ایوارٹس نے جواب دیا۔ ”ویسے میں نے کی لارگو اور اسٹاک آئی لینڈ کو بہ ذریعہ ریڈیو مطلع کر دیا ہے اور تمام پٹرول کاروں کو بھی مستعد کر دیا ہے۔ ہر علاقے کی پولیس ایسے مشکوک ملاحوں کو تلاش کر رہی ہے۔“

”اچھا... انہیں بیس اسٹیکر کے بارے میں بھی بتا دیا ہوتا۔ اس سے وہ آسانی سے پہچان لیے جائیں گے۔“ ٹام نے کہا تو ایوارٹس بولا کہ وہ یہ کام کر چکا ہے۔

”ہم بہت جلد مجرموں کے گرد گھیرا تنگ کر دیں گے۔ وہ زیادہ دیر ہم سے نہیں بچ سکیں گے۔“ ٹام نے کہا۔

”کمانڈر! تم اپنے کام کا آغاز کب کرو گے؟“ ایوارٹس نے کچھ سوچتے ہوئے کمانڈر ٹام سے سوال کیا۔

”میں ابھی فون کر کے احکام دیتا ہوں۔“ ٹام نے کہا۔ ”ہماری پٹرول گاڑیاں فوری کام شروع کر دیں گی۔“ پھر اس نے سوال کیا۔ ”فون کہاں ہے؟“

”وہ... آفس کے باہر...“ ایوارٹس نے کہا۔ ”مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس گیس اسٹیشن پر عام ٹیلی فون نہیں ہے بلکہ سکے ڈالنے والا فون ہے۔“

”اچھا!“ یہ کہہ کر ٹام فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا اور ٹیلی فون میں ڈالنے کے بعد

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہِ اگست 2009ء کے جھلملاتے شمارے کی رنگینیاں!

**ایسا بھی ہوتا ہے**
ہجرتوں اور... ہجر و وصال کا بے مثال احوال آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کی روانی

**راجپوت محبوبہ**
ہمایوں بلگرامی کے قلم سے فیروز شاہ تغلق کے پوتے ہمایوں خاں اور اس کی روپ بدلتی راجپوت محبوبہ کی پرکیف داستان عشق

**حضرت لوطؑ**
قومِ لوطؑ کی بداعمالیوں کے عبرت آموز اور فکر انگیز واقعات

**بیساکھی**
ملک صفدر حیات کا سنسنی خیز کارنامہ
قاتل اس کی پہنچ سے دور نہیں تھا

اس کے علاوہ
دیوتا، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید
طاہر جاوید مغل مریم کے خان
کاشف زبیر اور ثمر عباس کی دلچسپ تحریریں

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

نیول بیس کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف رات کی ڈیوٹی پر مامور بریگیڈ نے جواب دیا۔ ٹام کی آواز پہچانتے ہوئے وہ بولا۔ ''ارے کمانڈر! آپ نے اتنی رات کو فون کیسے کیا؟ خیریت تو ہے نا؟''

جواب میں ٹام نے اسے مختصراً اس گیس اسٹیشن پر ملاحوں کی لوٹ مار سے آگاہ کیا اور کچھ ہدایات بھی دیں۔

اس دوران ایوارٹس برابر میک سے باتیں کرتا رہا۔ ٹام فون کر کے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ایوارٹس کے آدمی اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک آدمی کولر پر پاؤڈر چھڑک کر انگلیوں کے نشانات لے رہا تھا۔ دوسرا کار کے ٹائروں کے نشانات محفوظ کر رہا تھا جبکہ تیسرا آدمی گیس اسٹیشن کے باہر جھاڑیوں میں ٹارچ کی روشنی میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ ٹام نے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے ایوارٹس سے سوال کیا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے؟''

''یہ وہ چیز تلاش کر رہا ہے جس سے میک کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔'' ایوارٹس نے کہا۔ ''میرے خیال میں وہ چیز زیادہ بھاری نہیں ہے مگر اس میں دھار ہے۔ میک کے زخم سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

وہ لوگ جس زدہ رات میں گیس اسٹیشن میں کھڑے سمندر کی جانب سے آنے والی ناگوار بساند کو اپنے پھیپھڑوں میں اتار رہے تھے۔ مجبوری تھی، وہ بو پورے علاقے میں میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹام کافی دیر تک سوچتا رہا۔ کبھی وہ گیس اسٹیشن کو دیکھتا اور کبھی اس کے باہر پھیلی ہوئی سڑک کو...! اس کی پیشانی پر فکر کی شکنیں نظر آ رہی تھیں۔ یکا یک اس کے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور اس نے ایوارٹس سے کہا۔ ''جس وقت تم اس طرف آ رہے تھے تو تم نے اپنی سائیڈ پر کوئی گاڑی جاتے دیکھی یا مخالف سمت سے کوئی گاڑی آتی دیکھی تھی؟''

''نہیں... کمانڈر ٹام!'' ایوارٹس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''رات کے دو بجے آنے اور جانے والی دونوں سڑکوں پر سناٹا تھا۔ میری پٹرول کار کے علاوہ کوئی دوسری کار سڑک پر تھی ہی نہیں۔''

''کم و بیش یہی صورتِ حال میرے ساتھ بھی ہے۔'' ٹام نے کہا۔ ''میں نے میامی سے آتے ہوئے راستے میں خاص طور سے نیلی کنورٹیبل کوئی نہیں دیکھی۔''

''راستے میں اتنے تعمیراتی اور ترقیاتی پروجیکٹس پر کام ہو رہا ہے۔'' ایوارٹس نے کہا۔ ''ممکن ہے وہ دونوں ملاح ایسی کسی جگہ چھپ گئے ہوں۔''

''ہاں... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نیول ایئر اسٹیشن چلے گئے ہوں۔'' ٹام بولا۔ ''بہرحال، ہم دونوں ہی مل کر وہاں چیک کر لیں گے۔''

''ضرور، ضرور... مجھے تمہارے ساتھ کام کرتے ہوئے بہت خوشی ہوگی۔'' ایوارٹس نے کہا۔

اس کی بات سن کر ٹام مسکراتا ہوا ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ وہ ایک اور کال کرنا چاہ رہا تھا کہ ایک خیال اس کے ذہن میں آیا جس نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ کئی سیکنڈ تک وہ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ ایوارٹس اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کوئی نئی بات ذہن میں آ گئی ہے کمانڈر ٹام؟'' ایوارٹس نے ٹام سے سوال کیا تو ٹام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹیلی فون کی طرف جانے کے بجائے اس طرف گیا جہاں گریس، آئل اور دوسرے ڈبے ریک پر رکھے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک وہ اس ریک کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہائیڈرولک لفٹ کو دیکھا جس پر میک کی کار موجود تھی۔ اچھی طرح اس کا جائزہ لینے کے بعد ٹام واپس آ گیا۔ ایوارٹس بڑے غور سے ٹام کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ایوارٹس! میں نے فی الحال اگلی تمام کارروائی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔'' ٹام نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ ایک نظر میک کی کار کو بھی دیکھ لیں۔''

''کیا... مگر کیوں؟'' ایوارٹس کی آواز میں شدید حیرت تھی۔

''دیکھو... لوٹی ہوئی رقم گیس اسٹیشن میں نہیں ہے۔'' ٹام نے کہا۔ ''تم چیک کر چکے ہو۔ تمہارے آدمی نے باہر جھاڑیوں میں بھی تلاش کر لیا۔ وہاں بھی کچھ نہیں ملا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ میک کی کار ہی وہ واحد جگہ ہے جہاں رقم آسانی سے چھپائی جا سکتی ہے اور تم نے ابھی تک اس کی تلاشی نہیں لی ہے... ہے نا؟'' ٹام نے سوالیہ نظروں سے ایوارٹس کو دیکھا۔

ٹام کی بات سن کر ایوارٹس کے چہرے پر پہلے تو برہمی نظر آئی پھر اس کا منہ لٹک گیا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور ٹام سے سوال کیا۔ ''مگر کمانڈر! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ سب میک نے ہی کیا ہے؟''

''ہاں... مجھے یہ میک کا ڈراما ہی لگ رہا ہے۔'' ٹام نے کہا۔ ''تم اس کی کار کی تلاشی تو لو... تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میرا خیال صحیح ہے یا غلط۔'' یہ کہہ کر ٹام آگے بڑھا تو ایوارٹس بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ ہائیڈرولک لفٹ کے پاس میک کھڑا تھا۔ ٹام نے لفٹ کا لیور دبایا تو میک کی کار نیچے آنے لگی۔ یہ دیکھ کر پہلے تو میک کا منہ حیرت سے کھلا پھر



اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

''یہ... تم... لوگ... کیا... کر رہے... ہو؟'' میک نے اٹک اٹک کر ٹام اور ایوارٹس سے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں کر رہے۔'' ایوارٹس نے کہا۔ ''صرف تمہاری کار کو چیک کر رہے ہیں۔ کہیں ان ڈاکو ملاحوں نے لوٹی ہوئی... رقم تمہاری کار میں تو نہیں چھپا دی؟''

''مگر یہ میری کار ہے... اس میں وہ لوگ رقم کیوں چھپائیں گے؟'' میک نے اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''جب تم بے ہوش تھے تو انہوں نے یہ چالاکی کر دی ہو گی۔'' ایوارٹس نے نرمی سے کہا۔ ''تاکہ بعد میں موقع دیکھ کر رقم نکال لیں۔ ہم تمہارے فائدے کی خاطر اس کار کو چیک کر رہے ہیں۔''

ٹام دیکھ رہا تھا کہ ایوارٹس کی بات سن کر میک کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل سکی۔

کار نیچے آ چکی تھی۔ ٹام نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر کی تلاشی لی۔ اس نے ڈیش بورڈ کے نیچے دیکھا مگر کچھ بھی نہیں ملا۔ میک کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ دم بہ خود ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ایوارٹس!'' ٹام نے کہا۔ ''ڈکی کھولو... ضرور لوٹی ہوئی رقم وہیں ہوگی۔''

یہ سن کر میک کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ ایوارٹس نے ڈکی کھولنا چاہی تو وہ نہیں کھل سکی۔

''میک! اس کا لاک کھولو۔'' ٹام نے سخت لہجے میں میک سے کہا۔ میک نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اپنی جیب سے چابی نکالی اور اپنی کار کی ڈکی کا لاک کھول دیا۔ پھر وہ مایوسی کے عالم میں پیچھے ہٹ گیا۔ ٹام اور ایوارٹس دونوں آگے بڑھے اور ڈکی کے اندر جھانکنے لگے۔

''میک! تم نے ایوارٹس کو کیا بتایا تھا؟'' ٹام نے اس سے سوال کیا۔ ''ڈاکو ملاح تم سے کتنی رقم لے گئے تھے؟ مجھے بتاؤ۔''

میک نے ٹام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا مگر ایوارٹس کے آدمیوں نے اسے زیادہ دور نہیں جانے دیا اور اسے جکڑ لیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور اسے ایک طرف بٹھا دیا۔

ایوارٹس حیرت اور فخر کے عالم میں ٹام کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی بھی تھی۔

''مسٹر ٹام! تم ایک زبردست کمانڈر ہو۔'' ایوارٹس نے کہا۔ ''واقعی تم نے ثابت کر دیا کہ تمہاری آنکھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ مگر مجھے یہ بتاؤ، تمہیں یہ اندازہ کیسے ہوا کہ رقم میک کی کار میں ہے اور یہ سارا ڈراما میک کا تیار کردہ ہے؟''

''میک نے سوچ رکھا تھا کہ جب پولیس چلی جائے گی اور یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو جائے گا اور رقم بھی لے جائے گا۔'' کمانڈر ٹام نے ایوارٹس کو بتایا تو اس نے ہاتھ اٹھایا۔

''وہ سب تو میں سمجھ گیا مگر تمہیں یہ معلوم کیسے ہوا؟ آخر وہ کون سی بات تھی جو تمہیں میک پر شک ہوا؟'' ایوارٹس نے سوال کیا۔

''دراصل وہ ریک جس پر گریس کے ڈبے رکھے تھے، زیادہ اونچا نہیں تھا۔'' ٹام نے کہا۔ ''دوسرے یہ کہ اس ریک کے نچلے حصے میں دھاری نکلی ہوئی ہے، جس وقت میک ریک کے نیچے بیٹھا کام کر رہا تھا تو وہ بے خیالی کے عالم میں اٹھا اور اس کا سر ریک سے ٹکرا گیا جس کی وجہ سے اس کے سر اور کان پر چوٹ لگی۔ اس کے خون بھی نکلا اور گریس کا ڈبا بھی نیچے گر گیا۔ وہ فرش پر گر پڑا جہاں پہلے ہی تیل، چکنائی اور گریس نے گندگی کر رکھی تھی۔ چنانچہ میک کا لباس بھی خراب ہوا اور چہرہ بھی۔ اپنا حلیہ دیکھ کر میک کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لہٰذا اس نے ملاحوں کی لوٹ مار اور مار پیٹ کی فرضی کہانی تیار کی اور ساری رقم اپنی کار کی ڈکی میں چھپا دی۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس کو اس پر شک نہیں ہوگا لہٰذا اس کی کار کی تلاشی بھی نہیں لی جائے گی اور بعد میں وہ رقم سمیت نکل جائے گا۔ اس کی ملازمت بھی محفوظ رہے گی۔ رقم بھی ہاتھ لگ جائے گی اور اس گیس اسٹیشن کا مالک اسے علاج معالجے کے لیے رقم الگ دے گا۔''

''خوب... بہت خوب!'' ایوارٹس نے ستائشی نظروں سے کمانڈر ٹام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہیں میک پر شک کیوں ہوا؟ اس کی کیا وجہ تھی؟''

''میک نے تمہیں اور مجھے یہ بتایا تھا کہ ڈاکو ملاح سب کچھ لے گئے ہیں۔ انہوں نے ایک سکہ تک نہیں چھوڑا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیبیں الٹ کر ہمیں دکھائی تھیں۔'' ٹام نے ایوارٹس سے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ اس کے پاس ٹیلی فون میں ڈالنے کے لیے سکہ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا کہنا تھا کہ اس نے گیس اسٹیشن کے فون سے ہی پولیس کو اس واردات کے بارے میں بتایا تھا۔''

''ہاں۔'' ایوارٹس نے کہا اور میک کو گھورنے لگا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

# پرواز

طاہر جاوید مغل

ساتویں قسط

فرقت کی چبھن، ملن کے گداز اور محبت کے راز افشا کرتے قلم کا شاہکار

ایک سیدھے سادے لیکن پر فن مولا کی داستان۔ اس کے بازو توانا تھے اور قدم مستحکم۔ منطقی ذہن اس کا رہنما تھا اور نقارے بجاتا دل محبت کی تال پر دھڑکتا تھا۔ رگوں میں خون کی جگہ جوش دوڑتا اور لبوں پر نغمے مچلتے رہتے ...پھر اس کی سماعت میں گھلنے والے رس نے اس کے لبوں کو ایک نئی تشنگی سے آشنا کیا اور وہ طلب کے منہ زور دھارے کے آگے بے دست و پا ہو گیا۔ بے کراں طلب اور تند جذبوں کے اس بہاؤ میں وہ تنہا نہ تھا۔ وہ ہستی بھی اس کے ہم دوش تھی جس کی فقط ایک نگاہ نے اس کے دل کا فیصلہ کر دیا تھا۔ بہاؤ کی سمت غلط تھی یا درست، اس سے بے خبر، اس سیلِ بلا خیز میں وہ بہے چلے جا رہے تھے!

**ایک دلربا کی جستجو میں سحر... اور اسی کے خیال میں شام کرنے والے پجاری کا احوال**

میں نے سائیں نما شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمینہ سے پوچھا۔ ”کون ہے یہ؟“

”یہ میری چاچی کا چھوٹا بھائی ہے۔“ ثمینہ ہکلائی۔ ”خورشید...نام ہے...اس کا۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”و...وہ...اصل میں، میں ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ بارش کی وجہ سے اس کی ساری چھت چونے (ٹپکنے) لگی ہے۔ میرے کپڑے بھی بھیگ گئے ہیں۔ اب میں نے چاچے اور چاچی کے کمرے میں جا کر لیٹنا تھا۔ میں یہاں... کپڑے... بدلنے کے لیے آئی ہوں۔ خورشید کو نظر نہیں آتا نا۔“

خورشید ہکا بکا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ ”یہ... یہ کون ہے، چھیمو؟“ اس نے بے ڈھنگی سی آواز میں ثمینہ سے پوچھا۔

”یہ چودھری صاحب ہیں۔ شاہ خاور۔ ہم...مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تم آرام سے لیٹو۔“

سائیں نما خورشید نے اپنی رال پونچھی اور ثمینہ سے مخاطب ہو کر ہونق انداز میں بولا۔ ”یہ باداموں والی برفی بھی لے کر آئے ہیں؟“

”نہیں، یہ برفی نہیں لائے۔ تم آرام سے سو جاؤ۔“

خورشید وہیں پر کھسک کر لیٹ گیا۔ اس کی بے نور آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں اور چھت پر تواتر سے بارش کا پانی گر رہا تھا۔

گھر کے باقی کمروں میں خاموشی تھی۔ اس کا مطلب تھا مکین سو رہے ہیں۔ ثمینہ سخت سہمی ہوئی سی ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تو تم نے مجھے شہوار کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“

اس کا سر بہ دستور جھکا رہا۔ بھیگے بالوں کی لٹیں اس کی شفاف گردن سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں پھنکارا۔ ”میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ تم نے مجھے اس حالت میں دیکھا تھا کہ میں شہوار پر چڑھا ہوا اسے چھریاں مار رہا تھا اور وہ لہولہان میرے نیچے تڑپ رہی تھی؟“

ثمینہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ لیا۔

”میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا تم نے؟ کس کے کہنے پر کیا؟ میں نے کیا برائی کی تھی تمہارے ساتھ... کیا نقصان پہنچایا تھا تمہیں؟“ وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ بس جھکی پلکوں کے ساتھ آنسو گراتی رہی۔ اس کا بھیگا بھیگا جسم خشک پتے کی

طرح لرز رہا تھا۔ خورشید بالکل لاتعلق سا لیٹا تھا اور اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ شاید ان پر کوئی میٹھی چیز لگی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ثمینہ کو جھنجوڑا۔ ''تم بولتی کیوں نہیں ہو؟'' وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی۔ ''میں کیا کرتی؟ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بتانے پر مجبور ہوگئی۔''

میرے اعصاب چٹخ گئے۔ میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''کیا بک رہی ہو؟ کیا دیکھا تھا تم نے؟'' اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اس کے سر کے بالوں کو اپنے ہاتھ کے گرد بل دیا اور ایک بار پھر زور سے جھنجوڑا۔ ''کیا دیکھا تھا تم نے؟ یہی کہ میں شہوار کو چھریاں مار مار کر لہولہان کر رہا ہوں؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے۔ میں نے تو بس وہی کہا تھا...'' وہ منمنائی۔

''کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ... آپ کے ہاتھ میں چاقو تھا... آپ... نے... ووہٹی جی کو...''

''ہاں، کیا کیا تھا ووہٹی جی کو؟''

''آپ... بہت غصے میں تھے۔ آپ نے... ووہٹی جی کو... پلنگ کے پیچھے گرا دیا تھا...''

ایک دم میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ ایک ہی لحظ میں، میں سمجھ گیا کہ ثمینہ یہ کیا بات کہہ رہی ہے۔ اس کے بالوں پر سے میری گرفت کمزور ہوگئی۔ جب رات گئے میرے اور شہوار کے درمیان دوسری جھڑپ ہوئی تھی اور شہوار نے دیوار پر سے خنجر اتار لیا تھا... اس نے خود کو زخمی کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میں نے اس کوشش کو ناکام بنایا تھا۔ اسی کھینچا تانی میں ہم دونوں گر گئے اور شہوار کا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرایا تھا... ثمینہ اسی واقعے کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ ایک ادھورا منظر تھا جسے شاید وہ پورا سمجھ بیٹھی تھی اور پولیس کے روبرو ایک نہایت سنگین بیان دے دیا تھا۔

میں نے اس کے سامنے ایک نواڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے تو کہا ہے کہ تم نے مجھے شہوار پر چھریاں چلاتے اور اسے خون میں لت پت ہوتے دیکھا؟''

''نہیں جی... میں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی۔ تھانے دار صیب نے بڑھا چڑھا کر لکھ دیا ہوگا۔''

اللہ لوک خورشید نے بستر پر لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔ ''اب جب آنا تو کلاس والے کی کھٹی برفی ضرور لے کر آنا۔'' وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

''ہاں ہاں، لے کر آئیں گے۔'' ثمینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تم اب سو جاؤ۔''

خورشید نے کروٹ بدل کر سچ مچ آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ثمینہ سے پوچھا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں شہوار کو چھریاں مار کر قتل کر سکتا ہوں؟''

اس نے پہلی مرتبہ آب دیدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ پلکیں جھکا لیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کوئی جواب دینے سے قاصر ہے۔

میں نے کہا۔ ''جب تم نے میرے ہاتھ میں خنجر دیکھا اور پھر مجھے اور شہوار کو پلنگ کے پیچھے گرتے دیکھا تو اس کے بعد تم نے کیا کیا؟''

وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی۔ ''میں ڈر گئی تھی... بہت ہی زیادہ ڈر گئی تھی۔ مم... مجھے لگ رہا تھا کہ میں... بے ہوش ہو جاؤں گی... میں کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے کنڈی چڑھا لی اور لحاف میں گھس کر اور کانوں میں انگلیاں دے کر لیٹ گئی۔ مجھے نہیں پتا میں کب تک اس طرح پڑی رہی۔ پھر دروازہ دھڑ دھڑ بجا اور ماسی اللہ رکھی نے بتایا کہ... ووہٹی جی کا خون ہو گیا ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میرا سر چکرا رہا تھا۔ بار بار الٹی آ رہی تھی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ اگر میں وہاں رہی تو بے ہوش ہو جاؤں گی یا میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ میں نے بس اللہ رکھی کو بتایا اور چپ کر کے یہاں آ گئی۔''

ثمینہ کی بات اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ بڑا عجیب، غریب معاملہ ہو گیا تھا۔ ثمینہ نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ پولیس کو بتا دیا تھا۔ لیکن اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ سچ نہیں تھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ثمینہ! بندے کی نظر اکثر اسے دھوکا دیتی ہے۔ کئی دفعہ ہم دیکھ کچھ رہے ہوتے ہیں، حقیقت میں کچھ ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں لیکن ہم دور کیوں جائیں۔ ایک بالکل تازہ مثال ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سامنے آئی ہے۔'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے جب میں نے کھڑکی کی درز سے اس کمرے میں جھانکا تو مجھے کچھ اور ہی منظر نظر آیا۔ تم اس اکیلے کمرے میں خورشید کے سامنے اپنے کپڑے اتار رہی تھیں۔ اگر میں بس یہی منظر دیکھ کر واپس چلا جاتا تو میرے ذہن میں تمہارے اور خورشید کے بارے میں برا خیال آ جاتا تھا۔ جبکہ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ یہی کچھ وہاں راجوال والے گھر میں ہوا ہے۔ تم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ ''پورا'' نہیں تھا۔ اور جو ''پورا'' تھا وہ تم نے دیکھا نہ کسی اور نے۔''

''میں کچھ بھی نہیں جی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''جس وقت تم نے مجھے اور شہوار کو لڑتے دیکھا، خنجر میرے ہاتھ میں نہیں شہوار کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خود کو زخمی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں خنجر اس سے چھڑا رہا تھا۔ اسی دوران میں وہ گر گئی اور سر پر چوٹ لگنے سے بے سدھ ہو گئی۔ میں اسے اٹھا کر پلنگ پر لے آیا تھا۔''

''پھر... پھر کیا ہوا ان کے ساتھ؟''

''ثمینہ! تمہاری طرح مجھے بھی کچھ پتا نہیں۔ میری بات پر یقین کرنا کیونکہ یہی سچ ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس واقعے کے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوا ہے۔''

ثمینہ پریشان، الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو اس منحوس رات میں ہوا تھا۔ شہوار کو چوٹ لگنے کے بعد میرا رویہ اس سے تبدیل ہوا... ہم دونوں میں کسی حد تک صلح ہو جانا... پھر صبح منہ اندھیرے میرا تیمور کے ساتھ نکل جانا... میں نے سب کچھ ثمینہ کے گوش گزار کیا۔ وہ حیرت کے عالم میں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکتے رہے۔

اچانک کمرے کا بند دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ اس کی بند کنڈی اکھڑ کر دور جا گری تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے ایک رائفل پر پڑی۔ یہ رائفل ایک ڈھاٹا پوش شخص کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈھاٹا پوش کا منہ کھلتا اور وہ مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر ہاتھ اٹھانے کا حکم دیتا... یا اس قسم کی کوئی اور حرکت کرتا، میں برق رفتاری سے اس کی رائفل کے اوپر جا پڑا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور گولی کمرے کے کچے فرش میں دھنس گئی۔ میں نے سر کی بھرپور ضرب ڈھاٹا پوش کے چہرے پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا اس چارپائی پر جا گرا جہاں مست حال خورشید نیم غنودگی میں تھا۔

طوفانی ضرب کے سبب رائفل حملہ آور کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا شخص نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ہولسٹر سے باہر آ رہا تھا اور ہاتھ میں سیاہ پسٹل تھا۔ میں نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے، دستے کی طرف سے اس کے ہاتھ پر چوٹ لگائی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکلا اور ہوا میں اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی ثمینہ اور خورشید کے چلانے کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ ثمینہ ہم کر ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔



## محمد علی جناحؒ ..... کراچی کے ماہ و سال، شادی تک

☆6 سال کی عمر میں گھر پر گجراتی ٹیوشن کی ابتدا۔

☆9 سال کی عمر میں قریبی پرائمری اسکول میں داخلہ۔

☆ اسکول جانے سے گریز اور دو ماہ کے لیے والد صاحب کے دفتر میں آمد و رفت۔

☆ دفتر سے اکتاہٹ، اسکول میں واپسی کا مطالبہ۔

☆ پرانے اسکول میں واپسی مگر حساب میں کمزوری۔

☆10 برس کی عمر میں سندھ مدرسۃ الاسلام میں گجراتی کی چوتھی جماعت میں داخلہ۔

☆ نصاب سے عدم دلچسپی اور پھوپھی کے ساتھ بمبئی روانگی۔

☆ بمبئی کے انجمنِ الاسلام اسکول میں داخلہ اور گجراتی کی چوتھی جماعت میں کامیابی۔

☆ کراچی واپسی۔ 23 دسمبر 1887ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں دوبارہ داخلہ۔

☆5 جنوری 1891ء کو انگریزی کی چوتھی کلاس سے اسکول کو خیرباد۔

☆ لارنس روڈ (حالیہ نشتر روڈ) کے ایس ایم ایس ہائی اسکول میں داخلہ۔

☆ اسکول ناپسند۔ 9 فروری 1891ء کو سندھ مدرسۃ اسلام میں تیسری بار داخلہ۔

☆ گرامر ٹریننگ کمپنی کے انگریز جنرل منیجر کی طرف سے لندن میں 3 سالہ کاروباری "بیت" کی پیشکش۔

☆ میٹھی بائی (والدہ) پریشان۔ جناح پونجا (والد) رضامند۔

☆ والدہ کو خوف کہ کنوارے بیٹے کو ولایت بھیجنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

☆ پاٹیلی کی ایمی بائی سے شادی کی تجویز۔ محمد علی جناح کی ہچکچاہٹ کے بعد رضامندی۔

☆ 30 جنوری 1892ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام کی انگریزی کی پانچویں جماعت سے رخصتی (بسلسلۂ عقدِ مسنونہ)

☆ کراچی سے دیرہ والی کی بندرگاہ کے ذریعے آبائی گاؤں، پانیلی میں آمد اور شادی کی پُرشکوہ تقریب۔

☆ دلہن والوں کا سماجی رسوم پر اصرار، وہ تین ماہ یا کم از کم ایک ماہ سے پہلے اپنی بیٹی کو کراچی بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔

☆ جناح پونجا کے کاروباری نظریات، مواصلاتی رابطے مفقود یا انتہائی سست و فوری طور پر کراچی جانے کے خواہاں۔ میٹھی بائی اپنے شوہر کی دیکھ بھال کے لیے ان کے ساتھ جانے پر کمربستہ۔ محمد علی اپنے والدین کے ہم خیال۔

☆ دونوں خاندانوں میں تناؤ اور سخت کشیدگی۔

☆ برسوں میں مذاکرات، مباحثے۔ محمد علی خاموش تماشائی۔

☆ مفاہمت کی سب کوششیں ناکام ہونے پر محمد علی کسی کو بتائے بغیر، خاموشی سے اپنی سسرال پہنچے اور کہا کہ وہ جب تک چاہیں اپنی بیٹی کو گھر رکھیں۔ وہ خود اپنے والدین کے ساتھ کراچی جا رہے ہیں۔ وہاں سے 3 سال کے لیے یورپ چلے جائیں گے۔ شاید ان کی بیٹی اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں کراچی پہنچے گی۔ اس بے باکانہ گفتگو نے مسئلہ حل کر دیا۔ والدین ایمی بائی کو فوراً سسرال بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔

یہی وقت تھا جب میری نظر دروازے سے گزر کر گھر کے صحن کی طرف گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دو تین مزید افراد تیزی سے کمرے کی طرف آرہے ہیں۔ یہ کون تھے؟ پولیس کے سادہ پوش؟ میرے سسر آصف جاہ کے ہرکارے؟ یا پھر موکل پارٹی کے لوگ؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وقت درکار تھا اور میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ ایک سیکنڈ بھی نہیں تھا۔ یہ بس فیصلے کا لمحہ تھا اور فیصلہ یہ کرنا تھا کہ مجھے رکنا ہے یا بھاگ جانا ہے۔ رکنے میں نقصان کے سوا اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ دوسرے ڈھاٹا پوش نے پھرتی سے اپنے گرے ہوئے پسٹل تک پہنچنے کی کوشش کی۔ میں نے لات چلا کر اسے برآمدے میں پھینک دیا۔ پہلے ڈھاٹا پوش کے قدموں کے قریب دو فائر کرنے کے بعد میں نے کھڑکی ..... سے جست لگائی اور باہر آگیا۔ ایک دیوانہ وار کوشش کے ساتھ میں دیوار پر آیا اور باہر کیچڑ میں کود گیا۔ دھماکوں سے کئی چنگاریاں دیوار کے بالائی کنارے پر بکھریں۔ بارش کی بوچھاڑیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں اندھادھند ایک تنگ گلی میں بھاگتا چلا گیا۔ اس سے آگے کھیت اور درخت تھے۔ درخت سے آگے خودرو جنتروں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ میں ان جنتروں میں گھستا چلا گیا۔ ذہن میں بار بار یہ خیال لپک رہا تھا کہ مجھے تلاش کرنے والے اچانک یہاں کیسے پہنچ گئے؟ کیا وہ پہلے سے یہاں موجود تھے؟ یہ امکان کافی روشن تھا۔ ہوسکتا تھا کہ پولیس والے سادہ لباس میں اس گھر کی نگرانی کررہے ہوں۔ انہیں توقع ہو کہ موجودہ حالات میں، میں ثمینہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

مسلسل بارش کے سبب زمین بھاگنے کے لیے بالکل غیر موزوں تھی۔ خودرو جھاڑیاں میرے چہرے اور ہاتھوں پر گہری خراش ڈال رہی تھیں لیکن میں دیہاتی ماحول کا پالا پوسا ہوا تھا۔ انہی نشیب و فراز میں بھاگ بھاگ کر جوان ہوا تھا۔ لڑکپن کی اندھیری راتوں میں، میں نے ایسے ہی کھیتوں کھلیانوں میں دوڑیں لگائی تھیں اور یاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ شاید میں آج بھی آنکھ مچولی کھیل رہا تھا مگر یہ بے حد سنگین تھی۔ مجھ پر قتل کا الزام آگیا تھا اور میں ایک بااختیار چودھری ہونے کے باوجود چھپتا پھر رہا تھا۔

مجھے اپنے عقب میں ہوائی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً کچھ لوگ میرے تعاقب میں بھی آئے تھے مگر میں جلد ہی ان کی پہنچ سے دور نکل گیا۔ میرا گھوڑا وہیں گاؤں کی گلی میں بندھا رہ گیا تھا۔ میرے پاس اپنا پستول موجود تھا۔ اس لیے میں نے حملہ آور سے چھینی ہوئی رائفل وہیں ایک جوہڑ میں پھینک دی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک ٹریکٹر ٹرالی نظر آ گئی۔ بجلی کی چمک نے ٹرالی کو نمایاں کیا تو اس پر دو کسان، چارے کے بہت سے گٹھوں سمیت بیٹھے نظر آئے۔ میں نے ان سے درخواست کی اور انہوں نے دیہی علاقوں کی مخصوص سادہ لوحی کے ساتھ مجھے سوار کرلیا۔ تاریکی کے سبب میرے چہرے کی خونی خراشیں وغیرہ ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔

☆☆☆

رات کے آخری پہر میں ایک بار پھر کاچھووالی میں تیمور کے پاس پہنچ چکا تھا۔ چاچا رفاقت میری غیر موجودگی سے بے خبر نہیں رہے تھے۔ تیمور کے ساتھ ساتھ وہ بھی جاگ رہے تھے۔ انہوں نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ لمبڑ برادری کے لوگ اور پولیس والے ہر جگہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“

پھر انہوں نے غور سے میرے چہرے کی خراشوں کو دیکھ کر کہا۔ ”لگتا ہے کہ تمہارا کسی سے ٹاکرا ہوا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، تیمور نے پوچھا۔ ”گھوڑا کہاں ہے؟“

”گھوڑا وہیں رہ گیا ہے شام پور میں۔“

پھر میں نے تفصیل سے سب کچھ تیمور اور چاچا رفاقت کے گوش گزار کردیا۔ ساتھ ساتھ میں انگیٹھی پر خود کو اور اپنے گیلے کپڑوں کو سینکتا رہا۔ ثمینہ سے اپنی ملاقات اور مکالمے کا سارا احوال میں نے انہیں سنایا اور بتایا کہ ثمینہ نے میرے خلاف بیان کیوں اور کس وجہ سے دیا ہے۔ آخر میں، میں نے اچانک اندر گھس آنے والے بندوں کا ذکر کیا اور ان کے چنگل سے نکلنے کی تفصیل بتائی۔

اس ساری روداد میں تیمور اور چاچا رفاقت کے لیے پریشانی کی ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ جس گھوڑے پر میں گیا تھا، وہ وہیں رہ گیا تھا۔

چاچا رفاقت نے کہا۔ ”پولیس والے اب گھوڑے کے ذریعے اپنی تفتیش آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے پنڈ میں چتکبرے گھوڑے چار پانچ ہی ہیں۔ ان میں سے دو میرے پاس ہیں۔ داغ کی وجہ سے بھی مصیبت پڑ سکتی ہے۔“

داغ اس نشانی کو کہتے ہیں جو جانوروں کی شناخت کے لیے ان کے جسم پر بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک طویلے یا مویشی خانے کے جانوروں کا داغ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی پھر چاچا رفاقت نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ”بہرحال، ایک بات تو امید دلانے والی ہوئی ہے۔ ثمینہ کے سامنے اصل صورت حال آگئی ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی دلیری دکھائے اور اپنا نیا بیان لکھوا دے تو کیس کافی کمزور پڑ سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ ثمینہ کا بیان ہی ہے جس نے تمہیں اتنی بری طرح پھنسایا ہے۔“

”لیکن یہاں یہ مسئلہ بھی ہے کہ مخالف پارٹی ثمینہ پر اثر ڈالے گی۔“ تیمور نے کہا۔ ”اور مخالف پارٹی تو رہی ایک طرف، خود پولیس بھی پارٹی بنی ہوئی ہے۔ اب دیکھیں نا... ثمینہ کا بیان کچھ اور طرح تھا مگر اسے توڑ مروڑ کر لکھا کچھ اور طرح گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم جتنی جلدی کسی اچھے وکیل کا انتظام کرلیں، اتنا ہی بہتر ہے۔ وکیل ہی ہمیں مشورہ دے گا کہ ہم ثمینہ کو آلے دوالے کے پریشر سے کس طرح بچا کر رکھیں۔“

”دیکھیں جی، اگر تو ثمینہ عقل مند ہوئی، وہ اپنے بدلے ہوئے بیان کے بارے میں ابھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ مگر مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ سیدھی سادی کڑی ہے۔ اسے ان قانونی چکروں کا کیا پتا؟“ چاچا رفاقت نے اپنی رائے کو خود ہی رد کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

میرا دل اس وقت کافی اچاٹ تھا۔ کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی سوچا نہیں تھا کہ مجھ پر اس طرح قتلِ عمد کا الزام لگے گا اور میں اپنی جان بچاتا پھروں گا۔ کہتے ہیں کہ دفعہ 302 ایسی بلا ہے کہ اسے ہرے بھرے درخت پر بھی لکھ دیا جائے تو وہ تھوڑے عرصے میں سوکھ کر کانٹا ہوجاتا ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت مجھے اب معلوم ہورہی تھی۔ صبح چاچا رفاقت نے زبردستی دہی اور پراٹھے کا ناشتا کرایا۔ وہ خود بھی پریشان تھے لیکن مجھے تسلی دینے کی کوشش کررہے تھے۔

شام تک ہمیں کچھ تسلی ہوگئی۔ لگ رہا تھا کہ شاید چتکبرے گھوڑے والا معاملہ زیادہ خطرناک ثابت نہ ہو۔ میرے اور تیمور کے کپڑے پچھلے چند دنوں میں برباد ہوگئے تھے۔ چاچا رفاقت کہیں سے ہم دونوں کے لیے ہمارے ناپ کے دو جوڑے لے آئے۔ ساتھ میں شیو کے لیے ریزر اور بلیڈ وغیرہ بھی تھے۔ ہم نے کئی دنوں کے بعد نہا کر کپڑے پہنے۔ چاچا رفاقت نے ملازمہ سے مٹروں والے چاول اور دیسی مرغی کا قورمہ بنوایا تھا۔ ابھی ہم نے دو دو لقمے ہی لیے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایسی ہر ”دستک“ ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز کردیتی تھی۔ چاچا رفاقت نے ہمارے کمرے کی بتی بجھا کر دروازہ بند کردیا اور بیرونی دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو جی۔“ باہر سے ساجے کے ٹو کی آواز آئی۔ ہمیں کچھ اطمینان ہوا... لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہیں رہا۔ کے ٹو اندر آیا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ پاؤں اور جوتے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔

بلب کی روشنی میں اس نے بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور بولا۔ ”یہ کیا ہوا ہے خاور! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

”خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب بھی پوچھ رہے ہو کہ خیریت ہے؟“ اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

”یار! کچھ منہ سے بھی تو بولو۔“

”واقعی تمہیں کچھ پتا نہیں۔“ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ تم بکواس کرو کہ کیا ہوا ہے۔“ میں نے اس کا کندھا جھنجوڑا۔

”ثمینہ قتل ہوگئی ہے... اور... شام پور میں سب کہہ رہے ہیں کہ اسے بھی تم نے مارا ہے۔“

میرے سر پر جیسے کسی نے کئی ہزار پاؤنڈ وزنی بم گرا دیا تھا۔ تیمور کا چہرہ بھی سکتہ زدہ رہ گیا۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں بے دم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میں کراہا۔

”وہی جو ساری دنیا کہہ رہی ہے۔ ثمینہ کے سینے میں دو گولیاں لگی ہیں۔ وہ گھر میں ہی مر گئی تھی۔ آج صبح سویرے پولیس تمہاری والدہ اور بہن عارفہ کو بچے سمیت پکڑ کر تھانے لے گئی تھی... ابھی کچھ ہی دیر پہلے بیگم بلقیس انہیں بڑی مشکل سے گھر لے کر آئی ہیں۔ پر لگتا ہے کہ پولیس والے انہیں صبح پھر لے جائیں گے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے یار! ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ایک بھنور سے نکل نہیں پائے تھے کہ دوسرے نے جکڑ لیا تھا... یا اللہ! یہ کن گناہوں کی اتنی سخت سزا مل رہی ہے... میں نے دل ہی دل میں فریاد کی۔

کے ٹو کی آب دیدہ نظریں بہ دستور میرے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ جیسے میرے تاثرات سے اندر کے حالات جاننے کی کوشش کررہا تھا۔ ”کیا... تم نے... خود لاش دیکھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیسی بات کررہے ہو۔ میری مت ماری گئی تھی جو میں لاش دیکھنے شام پور جاتا۔ پولیس ہر جگہ تمہیں کھوجتی پھر رہی ہے۔ جس کسی سے تمہارا تھوڑا بہت بھی میل جول رہا ہے، اسے پکڑا جا رہا ہے اور الٹا لٹکایا جا رہا ہے۔ میں کل صبح

سویرے سے نکلا ہوا ہوں، ابھی تک گھر نہیں گیا۔''

''میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا ہورہا ہے۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں کل رات شام پور ضرور گیا تھا اور ثمینہ سے بھی ملا ہوں لیکن اس ملاقات کی سزا ثمینہ کو موت کی صورت میں ملے گی، یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔'' مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو جمع ہو گئے ہیں۔ سینے میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔

ثمینہ کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھیں... اس کی آواز... اس کے آخری الفاظ! کیا واقعی وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی؟ مر کر مٹی ہو چکی تھی؟ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں... کس نے چلائی تھیں یہ دو گولیاں؟ جو دو یا تین فائر میں نے کیے تھے وہ تو زمین میں لگے تھے۔ اس وقت ثمینہ سہمی سمٹی کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوف لہریں لے رہا تھا اور یہ اس کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی تھی۔

وہ یتیم مسکین لڑکی جس کی حفاظت کا وعدہ والی جی نے کیا تھا... اور مرتے وقت جس کی ذمے داری مجھے سونپی تھی، کل رات ماری گئی تھی... عین جوانی میں، اپنی ناتمام آرزوؤں سمیت اور اس کی موت کا ذمے دار بھی مجھے ٹھہرایا جارہا تھا۔

میرا دل چاہا کہ میں سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پناہ گاہ سے نکلوں اور شہوار و ثمینہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ کر عبرت ناک نشاں بنادوں۔

''تم ہی کچھ بتاؤ خاور... آخر کیا ہوا ہے ثمینہ کے ساتھ؟'' کے ٹو نے پوچھا۔ اس کی تیز کھوجتی ہوئی نظریں میری آنکھوں میں گڑ گئی تھیں۔

مجھے اس کے انداز نے تاؤ دلا دیا۔ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف... اگر مجھ پر شبہ ہے تو پھر پکڑ لو مجھے۔ قانون کی مدد کرو۔ مجھے باندھ کر ڈال دو یہاں اور پولیس کو بلا لو۔ تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے اور میری بھی جان چھوٹے اس بھاگ دوڑ کے عذاب سے۔ لگوا دو مجھے ہتھکڑیاں!'' میں نے دونوں ہاتھ کے ٹو اور تیمور کے سامنے کر دیے۔

میرے انداز نے کے ٹو کا چہرہ متغیر کر دیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''یار! کیسی بات کرتے ہو تم؟ ہم تم پر شبہ کر سکتے ہیں؟ کیا ہم جانتے نہیں ہیں تمہیں؟ ہم تو صرف یہ بات کر رہے ہیں کہ...''

''تم کوئی بات نہ کرو۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں بس پیش ہو جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے گھر والوں کے لیے اور تم سب کے لیے اور مصیبتیں کھڑی کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے جب کوئی جرم نہیں کیا تو پھر کیوں بھاگوں؟ میں گرفتاری دوں گا اور پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''لیکن بیٹا جی! اس کے لیے بھی طریقے کی ضرورت ہے۔ گرفتاری سے پہلے ہمیں ایک دفعہ کسی اچھے وکیل سے مشورہ کر لینا چاہیے۔'' چاچا رفاقت نے کہا۔

''جن دو وکیلوں کے نام تم نے بتائے تھے، ان میں سے بس ایک ہی مل سکا ہے۔'' کے ٹو نے کہا۔ ''لیکن وہ بھی ڈانواں ڈول نظر آرہا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لیڈر برادری کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ یہ خطرناک لوگ ہیں اور معاملہ ان کی بیٹی کے قتل کا ہے۔ لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پھر لاہور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کل تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

چاچا رفاقت اندر گئے اور کچھ دیر بعد بڑے نوٹوں کی ایک گڈی کے ساتھ واپس آئے۔ انہوں نے یہ گڈی زبردستی ساجے کے ٹو کی جیب میں ڈال دی۔

کے ٹو چلا گیا تو ہم ایک بار پھر امید و بیم کی کیفیت میں ڈوب گئے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر بے بے جی اور عارفہ کی طرف سے تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اطمینان بھی تھا اور وہ یہ کہ بلقیس موجود ہے اور وہ ان کی ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔

کل رات کے مناظر رہ رہ کر میری نگاہوں میں گھومتے تھے۔ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ ثمینہ سے میری باتوں کے دوران میں وہ لوگ آناً فاناً اندر گھسے تھے۔ اگر مجھے ہلکا سا شبہ بھی ہوتا کہ وہ میرے بعد ثمینہ کو نقصان پہنچائیں گے تو میں بھاگنے کے بجائے ان سے لڑ کر وہیں مر جانے کو ترجیح دیتا۔ یہاں سوال یہ بھی تھا کہ وہ تھے کون؟

''تمہارا کیا خیال ہے تیمور... وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''لگتا تو یہی ہے کہ میاں وارث نے گھر کے آس پاس اپنے اہل کار چھپائے ہوئے تھے۔ اسے پتا تھا کہ ثمینہ کے بیان نے تم کو ضرور تنگ کرنا ہے اور ہو سکتا ہے کہ تم ثمینہ کو جھنجوڑنے کے لیے اس کے پاس آؤ۔''

''لیکن ایک بات شک میں ڈالتی ہے۔ اگر وہ پولیس والے تھے تو انہیں چوروں پر ڈھائے باندھنے کی کیا ضرورت تھی... اور پھر ثمینہ کا قتل؟''



''جب پولیس کسی کی دشمنی پر اُتر آئے تو پھر کیا نہیں کر سکتی۔ اگر ان لوگوں نے تمہیں پھنسانے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے تو پھر وہ ہر کام کر سکتے ہیں۔ ثمینہ کے مرنے سے ہمارے مخالفوں کو دو فائدے ہوئے ہیں۔ ایک تو اس کا پہلا بیان ہی آخری بیان بن گیا ہے۔ یعنی تم ہی شہوار کو مارنے والے ہو۔ دوسرے ثمینہ کی موت کا الزام بھی سیدھا سیدھا تم پر آرہا ہے۔''

''یار! میرا دھیان آصف جاہ کی طرف بھی جارہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شام پور میں جو کچھ ہوا، انہوں نے کیا ہو۔''

''یہ بھی ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔

کھانا ہمارے سامنے ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ چاچا رفاقت سمیت کسی نے اس میں سے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔ بلب کی زرد روشنی یرقان زدہ نظر آرہی تھی۔ کسی قریبی کمرے میں چاچے رفاقت کی بیمار بیوی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

...اگلے روز کے ٹو واپس نہیں لوٹا۔ اس سے اگلے روز بھی ہم اس کا انتظار کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ہماری پریشانیوں میں گونا گوں اضافہ ہو گیا۔ کئی طرح کے اندیشے ذہن میں کلبلانے لگے۔ کہیں اسے بھی تو کسی نے نقصان نہیں پہنچا دیا تھا... یا کہیں وہ بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو؟ اگر کوئی ایسی بات تھی تو یہ ہمارے لئے بہت خطرناک تھی۔ ایسی صورت میں یہ ٹھکانا بھی ہمارے لیے محفوظ نہیں تھا۔ کسی بھی وقت گھر کے دروازے پر پولیس کی دستک ہو سکتی تھی۔

دوپہر کے وقت میں نے ایک بار پھر تیمور اور چاچا رفاقت سے مشورہ کیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ہم جتنی دیر کر رہے ہیں، اپنے کیس کو اتنا ہی خراب کرتے چلے جارہے ہیں۔ میری رائے تھی کہ میں علاقے کے کسی معتبر شخص کے ذریعے اپنی گرفتاری دے دوں...

چاچا رفاقت ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گئے تو واپسی پر انہوں نے ایک اہم اطلاع دی۔ انہیں پتا چلا تھا کہ دوپہر ایک بجے کے قریب جاگیر کی دو گاڑیاں ''کا چھووالی'' کے پاس سے گزر کر ڈیک نالے کی طرف گئی ہیں۔ ایک گاڑی میں مسلح محافظ تھے اور خیال ہے کہ دوسری گاڑی میں جاگیر کی والی بیگم بلقیس خود تھیں۔

بلقیس کے ذکر نے میرے سینے میں ہلچل سی مچائی۔ اس کے ساتھ ہی کئی سوال ابھرے۔ وہ جاگیر سے اتنی دور کیا کرنے آئی تھی اور کہاں گئی تھی؟

چاچا رفاقت نے کہا۔ ''اندازہ ہے کہ بیگم جی، ڈیک نالے کے کنارے پر کسی گاؤں میں گئی ہیں۔ یقینی بات ہے کہ ان کی واپسی بھی اسی راستے سے ہوگی۔''

یہ بات خود میرے ذہن میں بھی آرہی تھی۔ اگر بلقیس نے واپس یہاں سے گزرنا تھا تو پھر اس سے ایک مختصر ملاقات کی صورت بھی نکل سکتی تھی۔ میں اس کے سامنے اپنی زبان سے اپنی بے گناہی بیان کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے گھر والوں کے بارے میں بھی بات کر سکتا تھا لیکن اس میں خطرہ بھی موجود تھا۔ اگر مخالف پارٹی کے کچھ لوگ یا کوئی مخبر وغیرہ بلقیس کے اردگرد موجود تھے تو میں پھنس سکتا تھا۔

سوچ بچار کے بعد میں نے تیمور کے ساتھ باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ سورج ڈھلتے ہی دھوپ غائب ہو گئی تھی اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ چاچا رفاقت کے پاس ایک تانگا موجود تھا۔ میں نے اپنا چہرہ اونی مفلر میں چھپا لیا۔ گرم چادر بھی اوڑھ لی۔ گھر کے احاطے سے ہی ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ چاچے رفاقت کا خاص ملازم اچھو تانگا ہانکنے لگا۔ قریباً دس منٹ بعد ہم گاؤں سے نکل کر ایک چھوٹی راج بہا کے کنارے گھنے درختوں میں پہنچ چکے تھے۔ راج بہا کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ ڈیک نالے کی طرف جاتا تھا۔ ہم نے تانگا وہاں کھڑا کر دیا۔ پروگرام کے مطابق اچھو نے اپنے اوزاروں کی مدد سے تانگے کا ایک پہیا علیحدہ کر دیا اور اس کے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا۔ اب ہمیں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ راستے میں تانگے کا پہیا نکل گیا ہے اور ہم مرمت میں مصروف ہیں۔

ہم کافی دن بعد باہر نکلے تھے۔ خاص طور سے تیمور تو کئی روز سے مسلسل چاچے رفاقت کے گھر میں بند تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تازہ ہوا کو اپنے کشادہ سینے میں بھر کر بولا۔ ''یار! یہ کھیت، یہ پگڈنڈیاں، یہ درخت اور درختوں پر اڑتے ہوئے پنچھی، سب کچھ ویسا ہی ہے، پر ہم کتنے بدل گئے ہیں ان دو چار دنوں میں... لگتا ہے کہ یہ کوئی اور دنیا ہے... ہم کسی اور دنیا میں ہیں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ جو کچھ ہے وقتی ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

ہم باتیں کرتے رہے۔ ہمیں قریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ پھر کچے راستے پر گاڑی کی اڑائی ہوئی گرد نظر آنی شروع ہوئی۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں، میں نے پہچان لیا۔ یہ حویلی کی جیپ ہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی اور میں چادر لپیٹے جھاڑیوں... سے نکل آیا۔ میری قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ جیپ دھول اڑاتی بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اگلی نشستوں پر ڈرائیور صوفی اسلم اور دو تین مسلح محافظ نظر آئے۔ پچھلی نشستوں پر بلقیس اور تاجو موجود تھیں۔ میں جیپ کے سامنے آگیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا

اشارہ کیا۔ محافظ ایک دم چوکس ہو گئے۔ ان میں شبیر بھی موجود تھا۔

''کیا بات ہے؟'' شبیر نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔ اس کی گرفت آٹو میٹک رائفل پر مضبوط تھی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اپنے چہرے سے مفلر ہٹا دیا۔ گاڑی میں موجود تقریباً سبھی افراد چونک گئے۔ میں نے بلقیس کی حیران آنکھیں دیکھیں۔ بس ایک جھلک دکھا کر یہ آنکھیں اوٹ میں کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔ ''شبیر! دروازہ کھولو۔ میں دو منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

شبیر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ متذبذب بھی تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بلقیس کی طرف دیکھا، پھر کوئی واضح اشارہ نہ پا کر اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں اگلی نشستوں پر شبیر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ یہ سب میرے ساتھی تھے یا ملازم تھے لیکن اب سب کے چہروں پر بے گانگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ پریشان اور گنگ بیٹھے تھے۔ ان سب کی موجودگی میں، میں بلقیس کو بے تکلفی سے مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ بے تکلفی اب گزرے زمانوں کی بات ہو چکی تھی۔ میں نے بلقیس کی طرف دیکھے بغیر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں چند لفظوں میں بس آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے شہوار کو نہیں مارا اور نہ ثمینہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر بلقیس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کہا۔ ''تم جو کچھ کہنا چاہ رہے ہو، وہ سب ہمیں پتا ہے لیکن... حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ بھائیا جی عزیز نے بڑے وکیل راٹھور صاحب کو بلایا ہوا تھا، وہ بھی کوئی امید دلا کر نہیں گئے۔ ان کا بھی یہ کہنا ہے کہ تم نے بھاگ کر اپنا کیس اور خراب کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے جی کہ مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔ اور ہو سکتا ہے کہ میری جگہ چودھری عزیز بھی ہوتے تو ان سے ایسی غلطی ہو جاتی۔ لیکن غلطیوں کو ٹھیک بھی تو کیا جاتا ہے۔ اب میں پیش ہونا چاہتا ہوں۔''

اس بات کا بلقیس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ جیسے خود کو اس مسئلے پر رائے دینے کا اہل نہیں سمجھ رہی تھی۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں اس کا چہرہ تقریباً اوجھل تھا۔ بس ناک کا مختصر حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہی چمک جو آنکھوں کے راستے دل میں اترا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''بے بے جی اور عارفہ کا کیا حال ہے؟''

بلقیس نے دھیمی لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی تک تو خیریت سے ہیں۔''

بلقیس کے پاس ہی نشست پر تہ کی ہوئی جائے نماز رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ راستے میں بھی اس نے نماز قضا نہیں کی ہے۔ وہ کافی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں ایک بار پھر آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں، ان دونوں اموات میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ پتا نہیں مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔''

''بس اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔'' اس نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا۔

لیکن یہ عام لہجہ نہیں تھا اور یہ فقرہ بھی عام نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ فقرہ ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ ان دنوں کی طرف... جب ہمارے درمیان ایک موا صلاتی رابطہ تھا اور ہم ایک تیز بہاؤ میں بہتے جا رہے تھے۔ اور ان سارے واقعات کی طرف جو اس ''دورِ جنوں'' میں رونما ہوئے۔

اسی دوران میں مجھے جیپ کے عقب میں ایک اور گاڑی کے آثار نظر آئے۔ وہ دھول اڑاتی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ چار رفاقت نے دو گاڑیوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ دوسری گاڑی شاید کھوڑی پیچھے رہ گئی تھی۔

''یہ کون آ رہا ہے؟'' میں نے شبیر سے پوچھا۔

''باقی کے گارڈ ہیں۔ ساتھ میں چودھری عزیز بھی ہیں۔'' شبیر نے بتایا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''یہ ہمارے ساتھ ہی تھے۔ راستے میں چودھری عزیز کا ایک جاننے والا مل گیا تھا، وہ دو منٹ کے لیے ان کے پاس رک گئے تھے۔ ہم نے ذرا آگے مغلوں کے باغ میں رک کر ان کا انتظار کرنا تھا۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ یہاں چودھری عزیز سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چند ہی لمحوں بعد تیز رفتار جیپ ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں اگلی نشست پر چودھری عزیز نظر آ رہا تھا۔ پچھلی نشستوں پر گارڈز بھرے ہوئے تھے۔ عام طور پر حویلی کی جیپ کے ساتھ جو گارڈز جاتے تھے، وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ مگر کبھی کبھی راستے کی مناسبت سے گاڑی بھی استعمال کی جاتی تھی۔

میں بلقیس والی جیپ سے نکل کر چودھری عزیز کے پاس پہنچ گیا۔ چودھری عزیز بھی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور مجھ سے بغل گیر ہوا۔ اس نے میرا خراشوں سے بھرا ہوا چہرہ اور میرا ابتر حلیہ دیکھا تو... اس کے

چہرے پر دکھ کے سائے لہرا گئے۔

"یار! یہ سب کیا ہوگیا ہے؟" اس نے ایک بار پھر مجھے گلے سے لگایا۔

... ڈکیت بارے والے واقعے کے بعد سے چودھری عزیز بہ تدریج بہت بدل گیا تھا۔ اس نے صوفی اسلم کو ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی آگے "مغلوں والے باغ" میں لے جائے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اس اجڑے...... ویران باغ میں داخل ہوگئیں۔ یہاں ایک دو جگہ ٹوٹی پھوٹی پرانی دیواریں اور دو چار برجیاں موجود تھیں۔ چودھری عزیز نے اپنی گاڑی کے سارے محافظوں کو گاڑی سے باہر نکال دیا۔ اب صرف وہ اور میں گاڑی میں تھے۔ شام کے سائے گہری تاریکی میں بدلتے جارہے تھے۔

چودھری عزیز نے اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو رات دن دعا کررہا تھا کہ کسی طرح تم سے ملاقات ہوجائے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور کیسے یہاں پہنچا ہوں۔ چودھری عزیز کو بتا دینے میں حرج تو نہیں تھا مگر خطرہ اس بات کا تھا کہ کل کلاں کہیں چودھری بھی پولیس کی تفتیش میں نہ جکڑا جائے۔ میں نے کاچھو والی کا نام نہیں لیا اور اسے یہی بتایا کہ ابھی یہاں وہاں بھٹک رہا ہوں اور تیمور بھی میرے ساتھ ہے۔

چودھری عزیز کی آنکھوں میں تشویش کے گہرے سائے دکھائی دیتے تھے۔ اس نے میرا کندھا دبایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایک بات پتھر پر لکیر ہے... اور تم بھی اس کو اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔ اگر اس موقع پر تم نے گرفتاری دی تو پولیس نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ پورا پروگرام بنا ہوا ہے۔ مجھے ساری بات کا پتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو چودھری؟"

"وہی جو سچ ہے۔ یہ تو اللہ کا کوئی خاص کرم ہے جو میری تمہاری ملاقات ہوگئی ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔" چودھری کی آواز بہ دستور لرز رہی تھی۔ اس نے لہجہ مزید دھیما کرتے ہوئے کہا۔ "اندر خانے موکھلوں اور لمبڑوں میں پورا گٹھ جوڑ ہوچکا ہے۔ میاں وارث نے ان کو یقین دلایا ہے کہ وہ اس ہلے گلے میں تمہیں ہر صورت پار کردے گا۔ گرفتاری کے وقت پولیس مقابلہ بنا دینا یا حراست سے دوبارہ فراری کا ڈراما رچانا ان کے لیے بالکل مشکل نہیں۔"

"یہ تم نئی بات بتا رہے ہو چودھری عزیز... میں تو آج کل میں پیش ہونے کا سوچ رہا تھا۔ تیمور کا بھی یہی خیال تھا۔"

"مجھے بھی اسی بات کا ڈر لگا ہوا تھا... یہ دیکھو، تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اس طرح کا خیال ابھی ذہن میں نہیں لانا ہے۔ وہ خبیث میاں وارث زہری ناگ بنا ہوا ہے۔ دو دن پہلے وہ قلعہ والا میں تمہارے سسر آصف جاہ سے بھی مل کے آیا ہے۔ لمبی رقم لی ہے اس نے... بلکہ خانہ خراب دونوں طرف سے پیسا کھا رہا ہے۔ اس کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں گئی ہوئی ہیں۔"

"دونوں طرف سے پیسا کھا رہا ہے... کیا مطلب؟"

چودھری عزیز نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔ "تمہیں بلقیس نے بتایا نہیں کہ ہم کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ چودھری نے پوچھا۔ "تمہاری والدہ اور بہن کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟" میں چونک گیا۔ ایک بار پھر نفی میں جواب دیا۔

چودھری عزیز نے کہا۔ "آج صبح سویرے پانچ بجے کے قریب انہیں پھر پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ تو دس بجے بلقیس نے اور میں نے بڑی مشکل سے ان کی جان چھڑائی ہے۔ میاں وارث نے پورا ستر ہزار روپیا لیا ہے۔"

میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ جی چاہا کہ خودکشی کر لوں یا میاں وارث اور اس جیسے سارے دشمنوں کو ختم کر ڈالوں۔ "اب وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

چودھری عزیز بولا۔ "میاں وارث سے اتنا معاملہ طے ہوا ہے کہ وہ دونوں عورتوں کو بے جا تنگ نہیں کرے گا اور اگر ان سے تفتیش کی ضرورت پڑی بھی تو ہم انہیں خود اپنے ساتھ لے کر آئیں گے اور لے جائیں گے۔ میاں وارث کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد ہم تمہاری والدہ اور بہن کو بے سبب ایک قریبی موضع کیکراں والی چھوڑ آئے ہیں۔ ابھی ہم انہیں چھوڑ کر ہی آرہے ہیں۔ یہ سب کچھ بڑی رازداری سے ہوا ہے۔ ان دونوں نے ٹوپی والے دیسی برقعے پہن رکھے تھے۔ شبیر کے سوا کسی محافظ کو بھی پتا نہیں کہ یہ عورتیں کون ہیں۔ یہاں بلقیس کی ایک خالہ زاد بہن خدیجہ رہتی ہے۔ اس کے گھر میں وہ بالکل حفاظت اور آرام سے رہیں گی۔"

"وہاں راجوال میں کوئی مسئلہ تھا؟"

"سب سے بڑا مسئلہ تو یہ موکھل اور لمبڑ ہی ہیں۔ خاص طور سے لمبڑ آصف جاہ۔ بلقیس کو اور مجھے ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ آصف جاہ تمہارے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ وہ بالکل آگ بگولا ہورہا ہے۔ اس کے کندھے سے ہر وقت رائفل لٹکی رہتی ہے اور وہ علاقے میں جیپ بھگاتا پھرتا ہے۔ اس کے دو نہایت خطرناک کارندے بھی ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

چودھری عزیز نے مجھے آصف جاہ کے بارے میں اور بھی کئی باتیں بتائیں جن سے پتا چلتا تھا کہ اس نے میری تلاش میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

چودھری عزیز سے پندرہ بیس منٹ تک بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اپنی گرفتاری پیش کرنے کا فیصلہ نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

چودھری عزیز نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن خاور... تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوں جوں وقت گزرے گا، حالات ٹھیک ہونا شروع ہوجائیں گے۔ اور اگر نہ ہوئے تو تم کچھ دنوں کے لیے بالکل روپوش ہوجانا۔ ہم تمہاری جان کا خطرہ کسی طور مول نہیں لے سکتے۔ تمہارا نقصان جاگیر کا نقصان ہے۔ ابھی والی جی کی جاگیر کو اور ہم سب کو تمہاری بہت ضرورت ہے یار۔" اس نے ایک بار پھر جذباتی انداز میں میرا کندھا دبایا۔

اس نے مجھے ڈسکے کا ایک ٹیلی فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ "اس نمبر پر فراست علی نام کا ایک بندہ ہوگا۔ تم اس کو میرے لیے جو بھی پیغام دو گے، وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے مل جائے گا۔ گاؤں کی تازہ ترین صورت حال بھی تمہیں فراست سے معلوم ہوتی رہے گی۔ تم جہاں بھی جاؤ وقتاً فوقتاً فراست کو فون کرتے رہنا۔ میں نے بھی تمہیں کوئی پیغام دینا ہوا تو فراست کے ذریعے دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے ابھی کچھ عرصے کے لیے روپوش رہنا چاہیے لیکن اس معاملے کو زیادہ لمبا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ کسی بڑے پولیس افسر یا پھر معتبر سیاسی بندے کے ذریعے گرفتاری دے دی جائے۔ جن لوگوں کے ذریعے گرفتاری دی جائے، وہ ہمیں اس بات کی ضمانت دیں کہ ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔ مجھے یقین ہے چودھری عزیز کہ اگر ہم عدالتوں تک پہنچ گئے تو کامیاب ہوجائیں گے۔ ہماری بے گناہی ثابت ہوجائے گی وہاں۔"

"تم درست کہہ رہے ہو، پر اس کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔ میں اپنے طور پر بھی کچھ ایسے ضامن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں جو گرفتاری دینے میں ہماری مدد کرسکیں لیکن جب تک ہمیں تسلی بخش ضامن نہیں ملیں گے ہم نے میاں وارث کے قریب نہیں پھٹکنا۔" چودھری عزیز کا لہجہ حتمی تھا۔

اس نے بلقیس والی جیپ میں جا کر اس سے بھی پانچ دس منٹ مشورہ کیا۔ پھر آ کر مجھے بتایا۔ "خاور! تم اماں جی اور بہن عارفہ کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ ہمارے ہوتے کوئی ان کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ بس تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔ بلکہ میرے خیال میں تو کوشش کرو کہ کچھ عرصے کے لیے اس علاقے سے ہی نکل جاؤ۔" میں نے چودھری عزیز سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح میرے سسر آصف جاہ سے ملاقات کرے اور میری طرف سے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کرے۔ چودھری عزیز نے کہا کہ وہ اگلے چند دن میں خود یا کسی بندے کے ذریعے آصف جاہ سے ضرور بات کرے گا۔

اس مزید غم زدہ کردینے والی ملاقات کے بعد بلقیس، چودھری عزیز اور ان کے گارڈز اپنے راستے پر آگے بڑھ گئے... جبکہ میں تانگے کی طرف واپس آگیا۔ وہاں سخت سردی میں تیمور اور اچھو میرا انتظار کررہے تھے۔

رات کو انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر ہاتھ سینکتے ہوئے میں نے چاچا رفاقت کو بلقیس اور چودھری عزیز سے ملاقات کی پوری تفصیل بتائی۔ یہ بات چاچا رفاقت کو بھی پسند آئی کہ بلقیس نے میری والدہ اور بہن کی جان پولیس والوں سے چھڑا کر انہیں ڈیک نالے کے کنارے ایک دور دراز گاؤں میں پہنچا دیا ہے۔

کے ٹو کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اس کے حوالے سے مختلف اندیشے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ کے ٹو پر ہمیں پورا اعتبار تھا، اس پر کسی طرح کا شبہ کرنا بہت مشکل تھا۔ بس ذہن میں بار بار یہی خیال ابھر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہوگیا ہو۔

رات کو پریشانی کے عالم میں، میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تیمور سو گیا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر پریشانی اور تکلیف کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ بس میری دوستی کی سزا بھگت رہا تھا۔ میں انہی خاردار راستوں پر چلتے چلتے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک پیارے دوست باگو کو کھو چکا تھا، اب یہ دوسرا نشانے پر تھا۔ اگر تیمور بنگلا ٹائیگر والے کیس کی تاریخ پر نکلتے ہوئے میرا ہم سفر نہ ہوتا تو شاید آج اس حالت کو نہ پہنچتا۔

اچانک کچھ مدھم آوازوں نے مجھے چونکایا۔ میں لحاف سرکا کر اٹھا اور ننگے پاؤں آوازوں کی سمت گیا۔ یہ آوازیں چاچا رفاقت کے کمرے سے ابھر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ

چہرے پر دکھ کے سائے لہرا گئے۔

''یار! یہ سب کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے ایک بار پھر مجھے گلے سے لگایا۔

... ڈکیت بارے والے واقعے کے بعد سے چودھری عزیز بہ تدریج بہت بدل گیا تھا۔ اس نے صوفی اسلم کو ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی آگے ''مغلوں والے باغ'' میں لے جائے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اس اجڑے..... ویران باغ میں داخل ہو گئیں۔ یہاں ایک دو جگہ ٹوٹی پھوٹی پرانی دیواریں اور دو چار برجیاں موجود تھیں۔ چودھری عزیز نے اپنی گاڑی کے سارے محافظوں کو گاڑی سے باہر نکال دیا۔ اب صرف وہ اور میں گاڑی میں تھے۔ شام کے سائے گہری تاریکی میں بدلتے جا رہے تھے۔

چودھری عزیز نے اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو رات دن دعا کر رہا تھا کہ کسی طرح تم سے ملاقات ہو جائے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے۔''

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور کیسے یہاں پہنچا ہوں۔ چودھری عزیز کو بتا دینے میں حرج تو نہیں تھا مگر خطرہ اس بات کا تھا کہ کل کلاں کہیں چودھری بھی پولیس کی تفتیش میں نہ جکڑا جائے۔ میں نے کاچھو والی کا نام نہیں لیا اور اسے یہی بتایا کہ ابھی یہاں وہاں بھٹک رہا ہوں اور تیمور بھی میرے ساتھ ہے۔

چودھری عزیز کی آنکھوں میں تشویش کے گہرے سائے دکھائی دیتے تھے۔ اس نے میرا کندھا دبایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ایک بات پتھر پر لکیر ہے... اور تم بھی اس کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو۔ اگر اس موقع پر تم نے گرفتاری دی تو پولیس نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ پورا پروگرام بنا ہوا ہے۔ مجھے ساری بات کا پتا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو چودھری؟''

''وہی جو سچ ہے۔ یہ تو اللہ کا کوئی خاص کرم ہے جو میری تمہاری ملاقات ہو گئی ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔'' چودھری کی آواز بہ دستور لرز رہی تھی۔ اس نے لہجہ مزید دھیما کرتے ہوئے کہا۔ ''اندر خانے موکھلوں اور لیٹروں میں پورا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے۔ میاں وارث نے ان کو یقین دلایا ہے کہ وہ اس ہلے گلے میں تمہیں ہر صورت پار کر دے گا۔ گرفتاری کے وقت پولیس مقابلہ بنا دینا یا حراست سے دوبارہ فراری کا ڈراما رچانا ان کے لیے بالکل مشکل نہیں۔''

''یہ تم نئی بات بتا رہے ہو چودھری عزیز... میں تو آج کل میں پیش ہونے کا سوچ رہا تھا۔ تیمور کا بھی کہنا تھا۔''

''مجھے بھی اسی بات کا ڈر لگا ہوا تھا... یہ دیکھو تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اس طرح کا خیال ابھی ذہن میں نہیں لانا ہے۔ وہ خبیث میاں وارث زہری ناگ بنا ہوا ہے۔ دو دن پہلے وہ قلعہ والا میں تمہارے سسر آصف جاہ سے بھی مل کے آیا ہے۔ لمبی رقم لی ہے نے... بلکہ خانہ خراب دونوں طرف سے پیسا کھا رہا ہے۔ کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں گئی ہوئی ہیں۔''

''دونوں طرف سے پیسا کھا رہا ہے... کیا مطلب؟''

چودھری عزیز نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔ ''تمہیں بلقیس نے بتایا نہیں کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں؟'' میں نفی میں سر ہلایا۔ چودھری نے پوچھا۔ ''تمہاری والدہ بہن کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟'' میں چونک گیا ایک بار پھر نفی میں جواب دیا۔

چودھری عزیز نے کہا۔ ''آج صبح سویرے پانچ کے قریب انہیں پھر پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ نو دن بلقیس نے اور میں نے بڑی مشکل سے ان کی جان چھڑا ہے۔ میاں وارث نے پورا ستر ہزار روپیا لیا ہے۔''

میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ جی چاہا کہ خود کو لوں یا میاں وارث اور اس جیسے سارے دشمنوں کو ختم ڈالوں۔ ''اب وہ دونوں کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

چودھری عزیز بولا۔ ''میاں وارث سے اتنا معاملے ہوا ہے کہ وہ دونوں عورتوں کو بے جا تنگ نہیں کرے گا اور ان سے تفتیش کی ضرورت پڑی بھی تو ہم انہیں خود اپنے ساتھ لے کر آئیں گے اور لے جائیں گے۔ میاں وارث کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد ہم تمہاری والدہ اور بہن کو بچے سب ایک قریبی موضع کیکراں والی چھوڑ آئے ہیں۔ ابھی ہم انہیں چھوڑ کر ہی آ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ بڑی رازداری سے ہے۔ ان دونوں نے ٹوپی والے دیسی برقع پہن رکھے تھے۔ شبیر کے سوا کسی محافظ کو بھی پتا نہیں کہ یہ عورتیں کون ہیں۔ یہاں بلقیس کی ایک خالہ زاد بہن خدیجہ رہتی ہے۔ اس کے گھر میں وہ بالکل حفاظت اور آرام سے رہیں گی۔''

''وہاں راجوال میں کوئی مسئلہ تھا؟''

''سب سے بڑا مسئلہ تو یہ موکھل اور لیٹرے ہی ہیں۔ عام طور سے لیٹرے آصف جاہ۔ بلقیس کو اور مجھے ہر وقت یہ ڈر رہتا کہ آصف جاہ تمہارے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا وہ بالکل آگ بگولا ہو رہا ہے۔ اس کے کندھے سے ہر وقت رائفل لٹکی رہتی ہے اور وہ علاقے میں جیپ بھگاتا پھرتا ہے۔ اس کے دو نہایت خطرناک کارندے بھی ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔''

چودھری عزیز نے مجھے آصف جاہ کے بارے میں اور بھی کئی باتیں بتائیں جن سے پتا چلتا تھا کہ اس نے میری تلاش میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

چودھری عزیز سے پندرہ بیس منٹ تک بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اپنی گرفتاری پیش کرنے کا فیصلہ نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

چودھری عزیز نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''لیکن خاور... تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوں جوں وقت گزرے گا، حالات ٹھیک ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اور اگر نہ ہوئے تو تم کچھ دنوں کے لیے بالکل روپوش ہو جانا۔ ہم تمہاری جان کا خطرہ کسی طور مول نہیں لے سکتے۔ تمہارا نقصان جاگیر کا نقصان ہے۔ ابھی والی جی کی جاگیر کو اور ہم سب کو تمہاری بہت ضرورت ہے یار۔'' اس نے ایک بار پھر جذباتی انداز میں میرا کندھا دبایا۔

اس نے مجھے ڈسکے کا ایک ٹیلی فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نمبر پر فراست علی نام کا ایک بندہ ہو گا۔ تم اس کو میرے لیے جو بھی پیغام دو گے، وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے مل جائے گا۔ گاؤں کی تازہ ترین صورت حال بھی تمہیں فراست سے معلوم ہوتی رہے گی۔ تم جہاں بھی جاؤ وقتاً فوقتاً فراست کو فون کرتے رہنا۔ میں نے بھی تمہیں کوئی پیغام دینا ہوا تو فراست کے ذریعے دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے ابھی کچھ عرصے کے لیے روپوش رہنا چاہیے لیکن اس معاملے کو زیادہ لمبا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ کسی بڑے پولیس افسر یا پھر معتبر سیاسی بندے کے ذریعے گرفتاری دے دی جائے۔ جن لوگوں کے ذریعے گرفتاری دی جائے، وہ ہمیں اس بات کی ضمانت دیں کہ ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہو گا۔ مجھے یقین ہے چودھری عزیز کہ اگر ہم عدالتوں تک پہنچ گئے تو کامیاب ہو جائیں گے۔ ہماری بے گناہی ثابت ہو جائے گی وہاں۔''

''تم درست کہہ رہے ہو، پر اس کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔ میں اپنے طور پر بھی کچھ ایسے ضامن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں جو گرفتاری دینے میں ہماری مدد کر سکیں لیکن جب تک ہمیں کسی بخش ضامن نہیں ملیں گے ہم نے میاں وارث کے قریب نہیں پھٹکنا۔'' چودھری عزیز کا لہجہ حتمی تھا۔

اس نے بلقیس والی جیپ میں جا کر اس سے بھی پانچ دس منٹ مشورہ کیا۔ پھر آ کر مجھے بتایا۔ ''خاور! تم اماں جی اور بہن عارفہ کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ ہمارے ہوتے کوئی ان کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ بس تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔ بلکہ میرے خیال میں تو کوشش کرو کہ کچھ عرصے کے لیے اس علاقے سے ہی نکل جاؤ۔'' میں نے چودھری عزیز سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح میرے سسر آصف جاہ سے ملاقات کرے اور میری طرف سے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کرے۔ چودھری عزیز نے کہا کہ وہ اگلے چند دن میں خود یا کسی بندے کے ذریعے آصف جاہ سے ضرور بات کرے گا۔

اس مزید غم زدہ کر دینے والی ملاقات کے بعد بلقیس، چودھری عزیز اور ان کے گارڈز اپنے راستے پر آگے بڑھ گئے... جبکہ میں تانگے کی طرف واپس آ گیا۔ وہاں سخت سردی میں تیمور اور چھوٹا میرا انتظار کر رہے تھے۔

رات کو انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر ہاتھ سینکتے ہوئے میں نے چاچا رفاقت کو بلقیس اور چودھری عزیز سے ملاقات کی پوری تفصیل بتائی۔ یہ بات چاچا رفاقت کو بھی پسند آئی کہ بلقیس نے میری والدہ اور بہن کی جان پولیس والوں سے چھڑا کر انہیں ڈیک نالے کے کنارے ایک دور دراز گاؤں میں پہنچا دیا ہے۔

کے ٹو کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اس کے حوالے سے مختلف اندیشے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ کے ٹو پر ہمیں پورا اعتبار تھا، اس پر کسی طرح کا شبہ کرنا بہت مشکل تھا۔ بس ذہن میں بار بار یہی خیال ابھر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہو گیا ہو۔

رات کو پریشانی کے عالم میں، میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تیمور سو گیا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر پریشانی اور تکلیف کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ بس میری دوستی کی سزا بھگت رہا تھا۔ میں انہی خاردار راستوں پر چلتے چلتے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک پیارے دوست باگو کو کھو چکا تھا، اب یہ دوسرا انشانے پر تھا۔ اگر تیمور بنگلا ٹائیگر والے کیس کی تاریخ پر نکلتے ہوئے میرا ہم سفر نہ ہوتا تو شاید آج اس حالت کو نہ پہنچتا۔

اچانک کچھ مدھم آوازوں نے مجھے چونکایا۔ میں لحاف سرکا کر اٹھا اور ننگے پاؤں آوازوں کی سمت گیا۔ یہ آوازیں چاچا رفاقت کے کمرے سے ابھر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ

چاچے کی بیمار بیوی اس سے جھگڑ رہی ہے۔ میں کچھ اور آگے بڑھ کر دروازے کے پاس آیا تو آوازیں ذرا وضاحت سے سنائی دینے لگیں۔

چاچی کہہ رہی تھی۔ ''ہونا ہوانا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ٹھگڑیاں لگتی ہیں اور مجھے... یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو بات بھی تھی... تم خود بتا رہے ہو کہ ان پر قتل کا ماملہ بنا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے کہ اس کے پیو سے تمہاری یاری دوستی تھی، پر اس یاری دوستی کے لیے اپنا آپ برباد کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے...''

''اوآہستہ بول اللہ دی بندی! وہ سن نہ لیں۔''

''سن لیں سنتے ہیں تو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ جو جمع پونجی تھی وہ تو تم نے ان کے ہاتھ میں تھما دی ہے وکیل کرنے کے لیے... اب اور لوڑ پڑے گی تو بھینسیں اور گھوڑے بیچنا شروع کر دینا۔'' چاچے کی بیوی تڑخ کر بولی۔

''میں کہتا ہوں چپ کر جا۔ تو میرے ماملوں میں نہ بول۔''

''کیوں نہ بولوں...'' چاچے کی بیوی نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا دم الٹ گیا ہے۔ چاچا رفاقت اسے پانی وغیرہ پلانے میں مصروف ہو گیا۔

صبح ابھی گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز ابھری نہیں تھی کہ میں اور تیمور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے محسن چاچے رفاقت کے گھر سے نکل آئے۔ چاچے رفاقت کے گھر سے ہم نے دو کسیوں کے سوا اور کچھ نہیں لیا تھا۔ یہ کسیاں ہمارے کندھوں پر تھیں۔ ہم نے گرم چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں اور کاشت کاروں ہی کے انداز میں کھیتوں کے درمیان تنگ پگڈنڈیوں پر چلتے آگے بڑھ رہے تھے۔

''ایک دم کیوں چھوڑ دیا گھر؟'' تیمور نے پوچھا۔

''بس مجھے کل سے پریشانی سی لگی ہوئی ہے۔ بلقیس اور عزیز کے ساتھ کوئی ایک درجن محافظ بھی تھے۔ ان محافظوں نے بھی مجھے یہاں دیکھ لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جگہ اب ہمارے لیے کچھ زیادہ محفوظ نہیں رہی۔ پھر ابھی تک کے ٹوکا بھی کوئی پتا نہیں چل رہا۔'' میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''رات کو میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ لیاقت کالے کا چاچا ایم پی اے امین چودھری کافی اثر رسوخ والا بندہ ہے۔ سنا ہے کہ اگلے مہینے وزیر بھی بننے والا ہے۔ تک اس کے رابطے ہیں۔ اس کا رویہ ہمارے ساتھ دوستی رہا ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' تیمور نے تائید کی۔ ''طور سے تمہارے ساتھ اسے کافی لگاؤ ہے۔ تمہیں ہر وقت مشورے دینے کی فکر میں رہتا ہے۔''

''تو کیوں نہ اسے ایک اور مشورے میں شامل جائے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم اس کے مشورے سے اور کے ذریعے گرفتاری دیں۔''

''بات تو سمجھ میں آتی ہے۔'' تیمور نے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

ہم منہ اندھیرے کا چھوڑ والی سے روانہ ہوئے تھے۔ بجے کے قریب ہم قلعہ والا کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ کڑاکے کی سردی کا ایک ابر آلود دن تھا۔ یخ ہوا چل رہی تھی۔ قلعہ والا سے قریباً دو میل پہلے ہی ایم پی اے امین چودھری ڈیرا آجاتا تھا۔ علاقے کا واحد ٹیوب ویل امین چودھری ڈیرے پر تھا۔ یہاں بہت سے درخت تھے اور نیم پختہ سا بھی بنی ہوئی تھی۔

میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا مگر تب حالات تھے۔ اب تو میں اور تیمور کھیت مزدور کے حلیے میں پولیس سے اپنی جان بچاتے پھر رہے تھے۔ قلعہ والا وہ تھا جہاں ہمیں دہرا خطرہ لاحق تھا۔ ایک پولیس کا دوسرا آصف جاہ کا۔ ڈیرے کے دروازے پر ایم پی اے امین ہری نمبر پلیٹ والی جیپ کھڑی تھی۔ گیٹ کا مسلح محافظ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا۔ تاہم میرے تعارف کرانے پر اس کے چہرے پر شناسائی اور حیرت کے تاثرات آئے۔ اس کا نام سعید شاہ تھا۔

وہ مصافحہ کرنے کے بعد مجھے اور تیمور کو تیزی سے لے گیا اور بیٹھک میں بٹھا دیا۔ اپنی کسیاں ہم نے باہر ہی دی تھیں۔ ابھی دن کا آغاز ہی ہوا تھا اس لیے بیٹھک پڑی تھی۔ میں نے سعید شاہ سے کہا۔

''ابھی یہاں کسی کو میرے آنے کی خبر نہیں چاہیے۔ سب سے پہلے میں امین صاحب سے ملنا ہوں۔''

''میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔'' سعید شاہ نے کہا اور نکل گیا۔

درحقیقت یہاں آکر میں نے جرأت مندی سے مول لیا تھا۔ اس جرأت مندی کی بنیاد اس یقین پر تھی کہ



چودھری کی سوچ لبڑ آصف جاہ کی سوچ سے مختلف ہو گی۔ امین ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات سنے گا اور مشورہ دے گا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد سعید شاہ واپس آیا۔ اس نے کہا۔ ''چودھری خاور! آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا... میں دراصل ابھی ڈیرا پر آیا ہوں۔ دوسرے ساتھی نے بتایا ہے کہ چودھری بی ذرا باہر نکلے ہوئے ہیں۔''

''لیکن ان کی گاڑی تو دروازے پر ہی ہے۔''

''شاید پیدل نکل گئے ہیں... آپ... ناشتا کریں گے؟''

''نہیں، کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

سعید شاہ نے دوبارہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور دروازہ برابر کر کے باہر چلا گیا... دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ اچھے لباس میں تھی۔ وہ ایک گول تھالی میں گرم دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس لے کر نمودار ہوئی اور ہمارے سامنے سے گزر کر ایک طرف اوجھل ہو گئی۔

عورت کی صورت مجھے کچھ جانی پہچانی لگی۔ ذہن پر تھوڑا سا زور دیا تو اچانک یاد آ گیا۔ اسے کافی عرصہ پہلے دیکھا تھا مگر کچھ صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو تادیر حافظے پر نقش رہتی ہیں۔ شروع شروع میں جب لیاقت کالے نے ٹھمن وال جانے والا راستہ بند کر دیا تھا اور میں اس سے وجہ پوچھنے اس کے ڈیرے پر پہنچا تھا تو وہاں ایک لڑکے کو دیکھا تھا جسے سزا کے طور پر دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ایک عورت کو دیکھا تھا جو لیاقت کے کارندوں سے لڑکے کے لیے رحم کی درخواست کر رہی تھی۔ اس عورت کا مسکین چہرہ ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھا۔ یہ وہی عورت تھی۔ اس نے لیاقت کے کارندوں سے کہا تھا کہ ہم بہت جلد قرضہ واپس کر دیں گے، وہ اس لڑکے کو چھوڑ دیں۔

آج وہ عورت یہاں لیاقت کالے کے چاچے ایم پی اے امین کے ڈیرے پر نظر آئی تھی۔ پچھلے برسوں میں اس کے ساتھ پتا نہیں کیا کچھ ہو چکا تھا۔ شاید وہ تھوڑے سے قرضے کی پاداش میں یہاں عرقید کی سزا بھگت رہی تھی۔ اس کی عمر اب پینتالیس کے قریب نظر آتی تھی۔

دو منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ اس نے آواز دی۔ ''شاہین بیٹی!''

کہیں اندر سے آواز آئی۔ ''آئی امی۔''

پھر ایک اکیس بائیس سال کی لڑکی ہاتھ میں ڈونگا سا پکڑے ماں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ اطراف میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی ڈیرے پر ویرانی ہی نظر آ رہی تھی۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ امین صاحب سے ملاقات کیوں نہیں ہو پا رہی تھی؟ کہیں ہمارے لیے کوئی مسئلہ تو کھڑا ہونے والا نہیں تھا؟

تیمور وہیں بیٹھا رہا۔ میں اٹھا اور ٹہلنے والے انداز میں ایک راہداری میں چلا گیا ہمت کر کے تھوڑا آگے گیا تو مجھے کچھ مدھم آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں میں امین چودھری کی بھاری آواز میں نے صاف پہچان لی۔

اس کا مطلب تھا کہ امین چودھری ڈیرے پر ہی تھا لیکن مجھ سے ملنے سے کترا رہا تھا۔ میں اپنے اندرونی تجسس کو نہ دبا سکا اور آوازوں سے قریب تر ہو گیا۔ ایک بند دروازے کے عقب سے سعید شاہ کی آواز ابھری۔ ''اس نے آپ کی گاڑی دیکھ لی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ امین صاحب کی گاڑی تو ادھر ہی ہے۔''

''تو کیا... میں کہیں پیدل نہیں جا سکتا۔'' چودھری امین نے غصے سے کہا۔ ''جاؤ، اس سے کہہ دو کہ وہ ایک دوست کی گاڑی پر گئے ہیں، شاید جلدی نہیں آئیں گے۔''

''اور اگر وہ دوبارہ آنے کا کہے؟''

''دیکھو شاہ! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اسے ٹرخا دو... بلکہ اس سے کہہ دو کہ خوامخواہ خود کو آفت میں نہ ڈالے۔ یہاں ہر طرف آصف جاہ کے بندے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ بے موت مارا جائے گا۔'' چودھری امین کے لہجے میں سخت بے زاری تھی۔ پھر تھوڑے سے توقف کے ساتھ اس نے کہا۔ ''تمہارے سوا اور کسی نے دیکھا ہے اسے یہاں؟''

''کریم اور فضلو نے بھی دیکھا ہے، پر پہچانا صرف میں نے ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہارے سوا کسی کو اس بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اور جاؤ... اسے چلتا کر دو یہاں سے۔''

سعید شاہ دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ میں خود کو اس کی نظر سے بچانے کے لیے کمرے کی عقبی سمت چلا گیا۔ جاگیردارانہ اور وڈیرانہ انداز کے مطابق ڈیرے کی کھڑکیاں رنگ برنگے شیشوں کی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھڑکی کے شیشے کا سبز پینٹ ایک جگہ سے ذرا سا اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سوراخ میں سے آنکھ لگائی تو اندر کمرے کا نصف حصہ دکھائی دینے لگا۔ امین چودھری صرف ایک دھوتی میں تھا۔ وہ پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ رات کی شراب نوشی کا خمار ابھی

تک اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہی لڑکی جس نے ابھی تھوڑی دیر قبل ”آئی امی جی“ کہا تھا، ذرا شرمائی لجائی ہوئی امین کی آغوش میں بیٹھی تھی اور اپنے نازک ہاتھوں سے اس کے چوڑے چکلے چہرے کی شیو بنا رہی تھی۔ صابن سے لتھڑے ہوئے جبڑے پر اس کے ہاتھ روانی سے چل رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح کی ”خدمت گزاریاں“ اس کا روز کا معمول ہیں۔

میں کھڑکی سے نظر ہٹا کر واپس بیٹھک میں پہنچ گیا۔

سعید شاہ وہاں تیمور کے قریب موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا۔ ”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ تم ہمیں یہاں بٹھا کر غائب ہی ہوگئے۔“

”میں چودھری امین صاحب کا ہی پتا کر رہا تھا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ اس کی گاڑی میں گئے ہیں۔ وہ شاید اب جلدی نہیں آئیں گے۔ آپ کو بے کار میں انتظار کرنا پڑے گا۔“ سعید شاہ کے لہجے میں رکھائی تھی۔

میں نے تیمور کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور سعید شاہ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے... پھر ہم چلتے ہیں۔“

سعید شاہ نے میرے قریب آ کر ذرا رازداری سے کہا۔ ”ویسے یہاں آپ کے لیے خطرہ بہت ہے۔ وڈے لمبڑ آصف جاہ صاحب کے بندے مسلسل آپ کی تلاش میں ہیں۔“

”اطلاع کا شکریہ!“ میں نے کہا اور باہر نکلنے سے پہلے مفلر ایک بار پھر چہرے سے لپیٹ لیا۔ تیمور نے بھی اپنا چہرہ جزوی طور پر گرم چادر میں چھپالیا۔

ڈیرے سے باہر نکلے تو اِکّا دُکّا ملازم چلتے پھرتے نظر آئے۔ ایک نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر شخص سخت سردی میں معمولی سے کپڑے پہنے بھینسوں کے لیے گتاوا تیار کر رہے تھے۔ میری نظر نوجوان کے چہرے پر پڑی اور میں ایک بار پھر چونکا۔ یہ غریب صورت نوجوان چند سال پہلے کا وہی لڑکا تھا جسے میں نے لیاقت کالے کے ڈیرے پر سزا بھگتتے دیکھا تھا۔ شاید اس کی سزا ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اب اس کی ماں اور بہن بھی اس ”سزا“ میں شریک ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جس لڑکی کو امین چودھری کی شیو بناتے دیکھا تھا، وہ یقیناً اس کی بہن تھی۔

جاگیرداروں اور وڈیروں کے گرد مزارعوں اور ملازموں کی ایسی کہانیاں موجود ہی رہتی ہیں... ان لمحوں میں نہ جانے کیوں میرا ذہن اماں دلشاد کی بیٹی گڈی اور ... طرف منتقل ہوگیا۔ گڈی کی کہانی بھی تو اس سے ملتی ... تھی۔ وہ کم سن... والی جی کی ملازمۂ خاص تھی۔ ... خدمت کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ اور پھر وہ ایسی ... کے لیے بھی مجبور ہوگئی جس نے اسے توڑ پھوڑ کر قبر کی ... میں پہنچا دیا۔ گڈی اور شاہین اور ایسے ناموں والی ... کتنی لڑکیاں اب بھی ان جاں سوز مرحلوں سے گزر ... تھیں۔

اب سرما کی زرد کمزور دھوپ اپنی جھلک دکھا ... تھی۔ ہم دونوں ڈیرے سے قریباً دو میل دور آنے ... گھنی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے درمیان ایک ہموار جگہ ... بیٹھ گئے۔ بھوک اور تھکن سے برا حال تھا۔ بھوک ... بھی ضرورت سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ تیمور بھی جان ... تھا کہ ایم پی اے امین نے اپنے ڈیرے پر موجود ہونے ... باوجود ہم سے ملاقات نہیں کی۔

وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہاں ... لمبڑ آصف جاہ کے ڈر نے کام دکھایا ہے۔“

”ہوسکتا ہے... لیکن یہ دنیا ویسے بھی بڑی جلدی آنکھ ... پھیرتی ہے۔ مصیبت میں کسی کے ساتھ کھڑے ہونا اور ... جانا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔“

”لیکن یار! یہ امین تو بڑا دبنگ بندہ ہے اور آج ... تمہاری دوستی کا دم بھی بھر رہا تھا۔ اس سے یہ امید نہیں تھی۔“

”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“

”خیر، اتنی دوستی تو اس نے ضرور نبھائی ہے کہ ہمیں ... ڈیرے پر ہی پکڑوا نہیں دیا۔“ تیمور نے ٹھنڈی سانس بھر ... ہوئے کہا۔

اچانک کچھ آوازوں نے مجھے چونکایا۔ میں نے کان ... کر سنا۔ یہ کتوں کی آوازیں تھیں... ہوا کی لہروں پر ڈوبتی ... ابھرتی یہ آوازیں قریباً ایک کلو میٹر دور سے آرہی تھیں۔ ... یکایک میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ میرا دھیان ... آصف جاہ کے خطرناک سلوکی ہاؤنڈز کی طرف چلا گیا ... کہیں یہ وہی خطرناک کتے تو نہیں؟ یہ سوال ایک ... ہوئے نیزے کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔

آوازیں بہ تدریج قریب آتی گئیں اور پھر ایک جگہ رک ... گئیں۔ میں نے سرکنڈوں کے اندر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ... سرکنڈے اور درخت قدرے بلندی پر تھے۔ مجھے اپنے ... میں دور تک کھیت اور درخت نظر آئے۔ ان کھیتوں ...



درختوں کے بیچ ایک ہموار میدان سا تھا۔ اس میدان کے منظر نے میرے دل و دماغ میں زلزلہ برپا کر دیا۔ یہاں دو بڑی جیپیں موجود تھیں اور ان جیپوں کے گرد وہی آٹھ عدد خوفناک کتے منڈلا رہے تھے جو میں نے دو تین ماہ پہلے آصف جاہ کی حویلی میں دیکھے تھے۔ اتنی دور سے بھی میں کتوں کی متحرک دُموں اور ان کی لپلپاتی زبانوں کی خطرناکی کو محسوس کر سکتا تھا۔

تیمور بھی سرکنڈوں میں سے سر اٹھا کر نشیب میں میدان کا منظر دیکھنے لگا۔ ”یہ کیا ہے؟“ اس نے کمزور آواز میں پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے ہمارے تارے پوری طرح گردش میں ہیں۔ ان دونوں جیپوں میں سے ایک کو میں بڑی اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ لمبڑ آصف جاہ کی ہے۔“

لمبڑ آصف جاہ کا نام سن کر تیمور کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اس کے ہونٹ پہلے ہی خشک تھے، کچھ اور خشک نظر آنے لگے۔ ”اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا امین چودھری نے کام دکھایا ہے؟“ تیمور نے لڑکھڑاتے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ سعید شاہ کا کام بھی ہوسکتا ہے یا پھر... کوئی تیسرا بندہ...“

دور میدان کا منظر تہلکہ خیز تھا۔ اب میں نے آصف جاہ کو بھی پہچان لیا تھا۔ وہ بوسکی کی شلوار قمیص میں تھا۔ وہ ہاتھوں کے اشارے سے اپنے بندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ مسلح افراد سے بھری ہوئی ایک جیپ دائیں رخ پر مڑ گئی۔ تین گھڑ سوار بھی ساتھ تھے۔ دوسری جیپ جس میں آصف جاہ خود بیٹھا تھا اور جس کے آگے چار گھڑ سوار آٹھ عدد کتوں کے ساتھ اچھالے مار رہے تھے، سرکنڈوں کی طرف بڑھی۔

اب اس امر میں شبہے کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں تھی کہ آصف جاہ کو کسی طرح ہماری یہاں موجودگی کی اطلاع ہوگئی ہے اور وہ سراپا قہر ہماری طرف لپک رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ ان لوگوں نے پیچھے آنے میں ہمارے قدموں کے نشانوں سے بھی مدد لی ہو۔

میں نے تیمور کو اشارہ کیا۔ تیمور نے اپنی گرم چادر کے نیچے اپنی سیون ایم ایم رائفل کو تیار حالت میں کیا۔ میں نے بھی اپنے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔ ہم جھک کر دس بارہ فٹ اونچے سرکنڈوں کے اندر ہی اندر بھاگتے مخالف سمت میں بڑھے۔ کتوں کی آوازیں تیزی سے قریب آرہی تھیں۔ یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی آوازیں تھیں۔ کچھ ماہ پہلے میں نے ایک خرگوش کی لٹکتی ہوئی انتڑیاں دیکھی تھیں۔ شاید آج ایسا کچھ ہمارے ساتھ ہونے والا تھا۔ ”کیا کرنا ہے؟“ تیمور نے بھاگتے بھاگتے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

## عطاءالحق قاسمی کی تصنیف ”وصیت نامے“ سے انتخاب

## ملک التجار ظاہر شاہ کی وصیت

بیٹے! یوں تو ہماری تاجر برادری کسی بات پر متفق نہیں ہوتی مگر بحمد للہ پوری برادری ٹیکس نہ دینے پر پوری طرح متفق ہے۔ ہماری تاجر برادری کے اکثر لوگ اسلامی ذہن کے مالک ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک غیر اسلامی حکومت کو ٹیکس ادا کرنا کفر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے چنانچہ ان کی اس دینی غیرت کے آگے سی بی آر والے بے بس نظر آتے ہیں۔ بہت زیادہ منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور اشیا میں ملاوٹ کے حوالے سے اگرچہ علمائے اسلام ہم سے متفق نہیں کیونکہ یہ لوگ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اجتہاد سے کنارہ کشی کر چکے ہیں۔ اگر یہ اجتہاد سے کام لیں تو انہیں یقیناً منافع خوری... ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ میں سے کوئی چیز خلاف اسلام نظر نہیں آئے گی کیونکہ اسلام تجارت کے پھلنے پھولنے پر زور دیتا ہے۔ تاجر طبقہ خوش حال ہوگا تو ملک خوش حال ہوگا اور اگر ملک خوش حال ہوگا تو اسلام کا بول بالا ہوگا۔

☆☆☆

ایک دفعہ جمعہ کے روز... مولوی منبر پر بیٹھا تقریر کر رہا تھا، لوگ بہت جوش و خروش سے اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے وہ تو خالی خولی نعرے لگا رہے تھے جبکہ میں نے جیب سے ہزار ہزار روپے کی گڈی نکالی اور مولوی پر سے نوٹ نچھاور کرنا شروع کر دیے۔ ایک تو اس سے میرا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا دوسرے میں مولوی کے دل سے اپنے خلاف موجود زہر کم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ میری عبادات کے باوجود مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں جن میں مجھے نفرت محسوس ہوتی ہے اور تیسرے میں چاہتا تھا کہ مسجد میں موجود لوگ دین اسلام کے لیے میرے دل میں جو جذبہ ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ان کے دلوں میں بھی دین سے محبت اور نیک کاموں کے ضمن میں سخاوت کی شمع روشن ہو لیکن مولوی غلام رسول نے مجھے جھڑک دیا اور کہا۔ ”یہ مجروں والا کام مسجد میں نہ کرو۔“ مجھے یہ مولوی کمیونسٹ لگتا ہے، بیٹے میری وصیت ہے اس مولوی کو چھوڑنا نہیں۔

"کچھ پتا نہیں۔ بس بھاگتے چلو۔"

یوں لگتا تھا کہ پیچھے آنے والے پھیل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ چند کتوں کی آوازیں انتہائی دائیں جانب سے آرہی تھیں۔ ایک جیپ کی مدھم آواز بائیں جانب سے سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز خاصی قریب تھی۔ بیس پچیس منٹ پہلے جب ہم تھکن سے چور ہو کر ان سرکنڈوں میں بیٹھے تھے، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا ہونے والا ہے۔

ہم سرکنڈوں اور جھاڑیوں سے نکل کر دوسری طرف پہنچے۔ یہاں ایک سوئے (چھوٹی نہر) کے کنارے ایک چھوٹا سا تانگا کھڑا نظر آیا۔ یہ بالکل مختصر سا "ریسی تانگا" تھا۔ ایک نوجوان لڑکا تانگے کے صحت مند گھوڑے کے سامنے چارا ڈال رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بری طرح چونکا پھر پسٹل میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ مزید ڈر گیا۔ لڑکے کو ایک طرف دھکیل کر، ہم جست لگاتے ہوئے تانگے پر سوار ہو گئے۔ لڑکے کا رنگ ہلدی تھا، وہ معمولی سی مزاحمت بھی نہیں کر سکا۔ میں نے لگام کو مخصوص جھٹکا دیا۔ گھوڑا تو جیسے اشارے کا منتظر تھا۔ وہ مڑا اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ آصف جاہ کی جیپ اور اس کے کتوں کو سرکنڈوں سے نکلنے میں تھوڑی سی تاخیر ہوئی، اس وقت تک ریسی تانگے کا گھوڑا سرپٹ ہو چکا تھا۔ سوئے کے ساتھ ساتھ راستہ خاصا ہموار تھا۔ گھوڑے کو برق رفتاری دکھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

لیکن کچھ بھی تھا، ریسی تانگا، جیپ اور کتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کتے دم بہ دم تانگے کے قریب پہنچ رہے تھے۔ پھر جیپ پر سے تانگے پر پہلا فائر ہوا۔ گولی ایک تیز سیٹی کے ساتھ ہمارے سروں پر سے گزری۔

میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ میری ملاقات اپنے سسر آصف جاہ سے ایسے حالات میں ہو۔ میں تو اس کے روبرو بیٹھنا چاہتا تھا۔ اپنی آنکھوں میں سچی نمی لے کر اسے اصل حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر یہاں جو ہو رہا تھا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ سلوکی ہاؤنڈ کتوں کا تانگے کی طرف بڑھنے کا منظر لرزہ خیز تھا۔ یہ کتے ایک دفعہ تانگے کے قریب آجاتے تو پھر انہوں نے پلک جھپکتے میں اوپر چڑھ آنا تھا، یا پھر گھوڑے کو زخمی کر کے گرا دینا تھا... شاید ان حالات میں وہ اپنے مالک کا اشارہ بھی بروقت قبول نہ کرتے اور ہمیں چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔ "اب کیا کرنا ہے خاور؟ گولی چلاؤں؟" تیمور نے پوچھا۔

"چلانی پڑے گی۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں جیپ سے دو مزید فائر ہوئے۔ میری بائیں ران میں انگارہ سا اتر گیا۔ اگلے دو ہاؤنڈ زنا تانگے سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ان کی لپک دل ہلا دینے والی تھی۔ شدید ترین خطرے میں گھرنے کے بعد تیمور کی ساری حسیں پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنا سیون ایم ایم سے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور دو تے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے گرے۔ ان میں سے ایک سوئے کے مٹیالے پانی میں گرا تھا... دو کے "ہٹ" ہونے کے باوجود تربیت یافتہ کتوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اسی جوش و خروش سے تانگے کی طرف بڑھتے گئے۔ تاہم اب ہمیں تھوڑا سا وقت ضرور مل گیا تھا۔ پچھلے کتوں کا تانگے سے فاصلہ چالیس پچاس میٹر سے کم نہیں تھا۔

"گاڑی کے ٹائر پر فائر مارو۔" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

تیمور نے ٹائر پر گولی چلانے کے لیے رائفل سیدھی کی مگر اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی یکے بعد دیگرے تین چار فائر ہوئے۔ ان میں سے ایک گولی تیمور کی کلائی میں لگی، دوسری جوان سفید گھوڑے کی گردن چیرتی ہوئی نکل گئی۔ بدقسمت جانور پوری رفتار سے بھاگتا ہوا منہ کے بل گرا۔ ہم ویسے بھی ایک ڈھلوان جگہ پر تھے۔ اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ریسی تانگے کے فضا میں اچھلنے اور ہمارے دور تک لڑھکنے کا منظر کیا ہوگا۔

چند سیکنڈ کے لیے اردگرد کا ہر منظر نگاہوں میں گڈمڈ ہو گیا۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا سرکنڈوں میں گرا۔ بائیں ران میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اس کے علاوہ پشت پر بھی شدید چوٹ کا احساس ہوا۔ میں نے ریس کے تانگے کو گھوڑے سے علیحدہ ہوتے اور ٹوٹ کر سوئے کے پانی میں گرتا دیکھا۔

"بھاگو خاور۔" تیمور کی آواز مجھے اپنے بالکل پاس سے سنائی دی۔

میں اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اٹھا اور زخمی ٹانگ کے ساتھ بھاگنے لگا۔ کتوں کی آوازیں ہمارے عقب میں بہ مشکل تیس چالیس قدم کے فاصلے پر تھیں۔ وہ خوں خوار جانور کسی بھی وقت ہمیں چھاپ سکتے تھے۔ اور پھر مجھے پہلے کتے کی عصیلی آواز اپنے بالکل عقب میں سنائی دی۔ اس آواز کے تاثر کو لفظوں میں بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ بالکل یہی لگ رہا تھا کہ موت مجھ پر جھپٹ رہی ہے۔ میں بھاگتے بھاگتے



پلٹا۔ نہایت دبلے منہ اور دبلی کمر والا برق رفتار سلوکی ہاؤنڈ مجھ سے فقط چند قدم کی دوری پر تھا۔ میں نے اس پر پسٹل کا فائر کیا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ وہ ڈگمگایا اور کئی لڑھکنیاں کھا گیا۔

میں نے دیکھا، ایک دوسرا کتا تیمور پر جھپٹ رہا تھا۔ تیمور نے بھاگتے بھاگتے رائفل کے آہنی بیرل کو کتے کے منہ پر لٹھ کی طرح رسید کیا۔ اس کے دانت ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کریہہ آواز نکال کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جو نکووال اور شام پور کے راستے میں آتی تھی۔ میں دو چار دفعہ پہلے بھی یہاں سے گزر چکا تھا۔ مجھے وہ پرانا مورچا نظر آرہا تھا جو غالباً 65ء کی نشانی تھا۔ ہم بغیر کسی منصوبے یا فیصلے کے اندھا دھند دوڑتے ہوئے مورچے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا۔ ہمیں اپنے پیچھے آنے والے خونی جانوروں سے بچنا ہے۔ مورچے کے داخلی راستے پر لکڑی کا ایک عارضی سا دروازہ نظر آیا۔ ہم نے دروازے میں گھسنا چاہا، وہ اندر سے بند تھا۔ تیمور نے پیچھے ہٹ کر اپنے کندھے کی بھرپور ضرب دروازے کو لگائی۔ اندر کنڈی ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ تیمور اندر کی طرف گرا۔ یہی وقت تھا جب ایک سلوکی ہاؤنڈ نے سرکنڈوں سے نکل کر مجھ پر جست لگائی۔ میں نے پھرتی سے خود کو بچایا تاہم میری گرم چادر کتے کے جبڑوں میں آگئی۔ اس کی یہ ظاہر دبلی گردن میں غیر معمولی طاقت تھی۔ اس نے مجھے جھٹک کر زمین پر گرانا چاہا تاہم میں دروازے کے اندر گھس گیا۔ میرے اندر آتے ہی تیمور نے پوری طاقت سے دروازہ بند کیا لیکن کتے کا جسم رکاوٹ بن گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی اور گردن اندر گھسانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آواز سے مورچے کا اندرونی خلا گونجنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے عقب میں کسی عورت کے چلانے کی آواز بھی آرہی تھی۔ میں نے اپنی پشاوری چپل سے چند شدید ٹھوکریں کتے کے منہ پر لگائیں اور تیمور دروازہ بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اوپر کی کنڈی تو ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے درمیان والا آہنی کنڈا چڑھا دیا۔

چند ہی لمحے بعد اس پناہ گاہ کے چاروں طرف غصیلی انسانی اور حیوانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ ایک کہرام اس پناہ گاہ کے اندر بھی تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ایک جواں سال عورت بستر کی چادر لپیٹے کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک نیم برہنہ شخص لرزتے ہاتھوں سے اپنی پھٹی پرانی

جاسوسی ڈائجسٹ
سسپنس ڈائجسٹ
سائل نہیں ملتے
ماہنامہ پاکیزہ
اندرون ملک چھوٹے شہروں اور قصبوں کے معزز قارئین کی یہ شکایت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔
ہاکرز اور بک اسٹال والے صرف اتنی کاپیاں خریدتے ہیں جن کے بک جانے کا انہیں سو فیصد یقین ہو کیونکہ بچ رہنے والی ایک کاپی ان کی کئی کاپیوں کا نفع کھا جاتی ہے۔
کوئی بھی خسارے کا ایسا سودا پسند نہیں کرتا
رسائل کے یقینی حصول کے دو طریقے ہیں
○ اپنے ہاکر یا بک اسٹال والے کو تاکید کر دیں کہ وہ ہر مہینے باقاعدگی سے آپ کو رسالہ فراہم کرے وہ اپنی تعداد بڑھا لے گا۔
یا
○ آپ ادارے کو صرف 500 روپے (ڈاک خرچ اس میں شامل ہے) بھیج کر ہمارے کسی بھی پرچے کے سالانہ خریدار بن جائیں اور مزید کسی خرچ یا بھاگ دوڑ کے بغیر 12 شمارے رجسٹرڈ ڈاک سے بروقت اپنی ایڈریس پر حاصل کرتے رہیں۔
○○
اس شرح سے آپ زائد سالوں اور چاروں پرچوں کے لیے بہ یک وقت زرسالانہ ارسال کر کے بے فکر ہو سکتے ہیں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
شہر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر 5802552-5386783-5804200
فیکس نمبر 5802551

لنگی باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیچے ایک چٹائی پر ڈیڑھ دو ماہ کا شیر خوار بچہ گلے کی پوری قوت سے دہائی دینے میں مصروف تھا۔

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ دہشت زدہ مرد اور عورت بچے سمیت دروازہ کھول کر باہر بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ تیمور رائفل ان کی طرف سیدھی کرتے ہوئے گرجا۔ ''خبردار! بیٹھ جاؤ نیچے... ورنہ گولی مار دوں گا۔''

لڑکی نما عورت نے شیر خوار بچے کو اٹھایا اور سینے سے چمٹا کر اپنے خاوند کے پہلو میں سہمی ہوئی بیٹھ گئی۔ یہ دونوں شکل سے بھک منگے لگتے تھے۔ مورچے میں روزمرہ ضرورت کی بہت سی چیزیں بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عورت کا لباس بھی تھا۔ تب میری نظر ایک اور بچے پر پڑی۔ یہ چار پانچ سالہ لڑکا، اردگرد برپا ہونے والی قیامت سے بے خبر ابھی تک کیبل اوڑھے سو رہا تھا۔

اسی اثنا میں دھماکوں سے دو گولیاں مورچے کے چوبی دروازے میں لگیں اور دو سوراخ بناتی ہوئی دیوار سے ٹکرائیں۔ پھر بپھرے ہوئے کتے دیوانہ وار دروازے سے ٹکرانے لگے... یوں لگا کہ وہ چند سیکنڈ اسی طرح ٹکراتے رہے تو شیشم کے تختوں کا یہ دروازہ اپنی جگہ برقرار نہیں رہ سکے گا۔ جوابی فائر ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے پسٹل کو مورچے کے پختہ فرش پر رکھ کر دروازے کی نچلی درز سے گولیاں چلائیں۔ اس فائرنگ سے کسی جانور کو نقصان پہنچا یا نہیں، اس کا پتا تو نہیں چلا تاہم کتوں کا غضب ناک شور ایک دم فاصلے پر چلا گیا۔ مورچے میں موجود رخنوں میں سے ایک رخنے میں تیمور نے اپنی رائفل رکھ دی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ سے مورچے پر آنے والا زبردست دباؤ ایک دم کم ہو گیا۔ یوں لگا کہ کتوں کے ساتھ ساتھ کتوں کے مالک بھی کچھ پیچھے ہٹ گئے ہیں اور اپنی پوزیشنیں درست کر رہے ہیں۔

عورت نے عاجزی سے بتیسی نکالی اور اپنے سانولے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''کھدا کا واسطہ ہے، اساں کو جانے دو۔ اساں بے قصور ہیں۔ کھام کھاہ اس لڑائی میں اساں کا نقصان ہو جائے گا۔''

مرد نے بھی کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر میں نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ ''دیکھ نہیں رہے ہو، باہر شکاری کتے گھوم رہے ہیں۔ دو سیکنڈ میں چیر پھاڑ دیں گے تم سب کو۔''

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس کے گلے میں منکوں کا ہار تھا اور بالوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔

''اچھا جی! تساں جو کہو گے، اساں ویسا ہی کر گے... پر... مینڈی جنانی (بیوی) کو جرا کپڑے پہنا دیں۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''تو پہن لے کپڑے۔ ہم نہیں دیکھ رہے اس طرف۔'' میں نے کہا۔

عورت نے اپنا شیر خوار بچہ شوہر کی گود میں دیا۔ دراصل ایک دبلی پتلی بچی تھی۔ پھر وہ لرزتی کانپتی جھکی... چولی، گھاگرا اور اوڑھنی وغیرہ لے کر مورچے کے ایک تاریک گوشے میں چلی گئی۔

میری ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ تیمور کی کلائی بھی خون اگل رہی تھی تاہم وہ رائفل کے پیچھے موجود تھا اور گاہے بہ گاہے سرکنڈوں کی طرف فائر کر رہا تھا۔ ایک رخنے میں سے دو تین فائر میں نے بھی کیے۔ یہ کسی کو نشانہ بنانے کے لیے نہیں تھے۔ یہ دفاعی فائر تھے۔ مقصد یہی تھا کہ بپھرے ہوئے حملہ آور ہم سے دور رہیں۔

''کتنی گولیاں ہیں تمہارے پاس؟'' میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''سو کے قریب ہوں گی۔'' تیمور نے اپنے جسم سے بندھی ہوئی ''بلٹ اسٹرپس'' کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اور تمہارے پاس؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''بیس کے قریب رہ گئی ہیں۔'' میں پھر کراہا۔

''لگتا ہے تمہیں تکلیف زیادہ ہے؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی طرح آصف جاہ سے ایک دفعہ میری بات ہو جائے تو شاید یہ آفت ٹل جائے... یا کم از کم ہمیں کچھ وقت ہی مل جائے۔''

''لیکن بات ہو کیسے؟''

میں ایک رخنے کی طرف بڑھا۔ یہ رخنے فائرنگ وغیرہ کے لیے ہی بنائے گئے تھے اور زمین سے قریباً پانچ فٹ بلند تھے۔ میں نے ایک رخنے سے منہ لگایا اور پوری طاقت سے پکار کر کہا۔ ''آصف جاہ صاحب! میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایک دفعہ میری بات سن لیں، پھر آپ جو سزا دیں گے میں مان لوں گا۔ بس ایک دفعہ مجھے موقع دیں۔''

پتا نہیں کہ میری آواز مطلوبہ لوگوں تک پہنچی یا نہیں لیکن دو گولیاں ضرور پہنچ گئیں۔ ایک گولی میرے چہرے کے بالکل قریب مورچے کے کنکریٹ میں لگی۔ دوسری اوپر سے پرواز

کر کے گزر گئی۔ میں رخنے سے پیچھے ہٹ گیا۔ خوں خوار کتے مسلسل شور مچا رہے تھے تاہم اب انہیں فائرنگ کی زد سے دور ہٹا لیا گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی اور پکار کر کہا میں آصف جاہ صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوشش بھی ناکام گئی۔

ایک دن پہلے چودھری عزیز سے اپنی ملاقات میں، میں نے چودھری عزیز اور بلقیس سے کہا تھا کہ وہ آصف جاہ سے بات کرنے کی کوشش کریں اور میری طرف سے اس کا ذہن صاف کریں... مگر لگتا تھا کہ یا تو وہ ابھی تک بات نہیں کر سکے یا پھر آصف جاہ نے حسبِ توقع ان کی بات کو اہمیت نہیں دی۔

میں نے تیمور کو رائفل سمیت رخنے کے سامنے رہنے دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ وقفے وقفے سے گولی چلاتا رہے تاہم یہ بھی کہا کہ وہ کسی پر نشانہ لے کر فائر نہ کرے۔ خود میں نے ایک بلیڈ کی مدد سے اپنی شلوار ٹینے کے نیچے سے پھاڑی اور ران کے زخم کو دیکھا۔ خود کار رائفل کی گولی ران کا گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ خون بہنے کی وجہ سے نیچے کی ساری ٹانگ لہولہان ہو رہی تھی۔ میں نے ایک کونے میں موجود چولہے میں سے کچھ راکھ لی اور اس کے ذریعے خون بند کرنے کی کوشش کی... پھر ایک پھٹے پرانے کپڑے کی پٹی میں نے کس کر زخم پر باندھ دی۔

آصف جاہ کے بندے مورچے کے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ ان کی مدھم آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ''کہیں، اب یہ لوگ پولیس کا انتظار تو نہیں کر رہے؟'' تیمور نے کہا۔

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا پتا کہ یہ لوگ خود ہی ہمیں پکڑنا اور اپنے کسی ڈیرے شیرے پر لے جانا چاہتے ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یا پھر یہیں مار کر ڈھیر کرنے کا ارادہ ہو۔'' تیمور نے لقمہ دیا۔ تیمور کے دونوں ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ یہ چوٹ تانگے سے گرنے کے سبب آئی تھی۔ اسی طرح کی کئی چوٹیں اور خراشیں ہم دونوں کے پورے جسم پر موجود تھیں۔

چار پانچ سالہ بچہ بھی اب اٹھ بیٹھا تھا اور اپنی دو ماہ کی بہن کی آواز سے آواز ملا کر ریں ریں کر رہا تھا۔ جواں سال عورت نے اب کپڑے پہن لیے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں دہشت کے گہرے سائے تھے۔ اپنی ریں ریں کرتی بچی کو چپ کرانے کے لیے اس نے بچی کا منہ چھاتی سے لگایا اور اوپر اوڑھنی ڈال دی۔

اس کے مرد نے ایک بار پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اساں کو جانے دو جناب! اساں آپ کو دعائیں دیں گے۔ مینڈے چھوٹے چھوٹے بچوں پر ترس کھاؤ جی۔''

میں نے اسے سرتاپا گھورا۔ وہ بس ایک ڈرپوک مسکین بھک منگا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چار چھ ماہ سے اس نے یہ ویران مورچا خالی دیکھ کر یہاں اپنی گرہستی بسالی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے پکی لکڑی کا دروازہ لگا لیا تھا اور کچھ رخنوں کے آگے پولیتھین کے ٹکڑے کیلوں سے تان دیے تھے۔ ایسی ویران جگہیں اکثر اسی طرح آباد ہو جایا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی علاقے کے کسی معتبر شخص سے اس کی رہی اجازت بھی لے لی جاتی ہے۔

میں نے اس شخص سے نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام ناجا بتایا۔ میں نے کہا۔ ''ناجے! ہم تجھے اور تیرے بچوں کو باہر نکال دیتے ہیں لیکن اس کے بدلے تو نے ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''تساں جو حکم کرو گے، میں کروں گا جی۔'' وہ بتیسی نکال کر بولا۔

''جو حکم نہیں... بس ایک کام ہے۔ تم یہ دروازہ کھول کر باہر نکلو اور جو لوگ ہم پر گولی چلا رہے ہیں، انہیں بتاؤ کہ ہم ان سے لڑنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ چاہتے ہیں تو ہم اپنے ہتھیار مورچے سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ ہم ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بتاؤ کہ یہ سب کچھ شاہ خاور نے کہا ہے۔''

''پپ... پر... یہ کون ہیں جی۔ کہیں یہ اساں کو تو گولی نہیں مار دیں گے؟''

''جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے نکلو گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ساری بات سمجھا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

دو تین منٹ کے اندر ناجا تیار ہو گیا۔ میں نے مورچے کا دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ پہلے ناجے نے اپنی بیوی کی سفید اوڑھنی ہوا میں لہرائی پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔

میں نے ایک بار پھر رخنے سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔ ''آصف جاہ صاحب... ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میری آواز سن رہے ہیں...''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ وہ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ناجا ابھی دروازے سے فقط ایک قدم ہی آگے گیا تھا، تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز سے رائفل کا برسٹ چلا... میں نے ناجے کو اچھلتے اور مورچے کی دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔



اس کے جسم میں قریباً نصف درجن سوراخ ہو گئے تھے۔ مورچے کی دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ کئی فٹ تک نشیب میں لڑھک گیا۔

ناجے کی بیوی نے بھی یہ ہولناک منظر دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور روتی چلاتی ہوئی اپنے خاوند کے خونچکاں جسم پر جا گری۔ چھوٹی بچی اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے جھنجوڑنے لگی۔ ''ناجے... ناجے... ہائے میں مر گئی... ناجے۔'' اس کا نوحہ دل دہلا دینے والا تھا۔

یقیناً عورت کے لیے قیامت آ گئی تھی لیکن یہ قیامت صغریٰ تھی۔ اس سے بڑی قیامت ابھی آنے والی تھی۔ اچانک مورچے کی چھت پر ایک سلوکی ہاؤنڈ کی غصیلی آواز سنائی دی۔ پھر ہم نے سلوکی ہاؤنڈ کو نوحہ کناں عورت پر جھپٹتے دیکھا۔ عورت اس نئی آفت کے بعد اپنے مرد کے خونچکاں جسم کو بھول گئی اور چلاتی ہوئی مخالف سمت میں بھاگی لیکن وہ سلوکی ہاؤنڈ سے تیز کہاں بھاگ سکتی تھی۔ چند قدم بعد ہی کتے نے اسے جا لیا۔ اس کے بعد کا منظر دیکھنا آنکھوں کا عذاب تھا۔ بچی عورت کے ہاتھوں سے گر گئی۔ کتا اس پر جھپٹا... اب ایک طرف بچی، کتے کے منہ میں تھی۔ دوسری طرف ماں کے ہاتھ میں تھی۔ جانور نے اسے اپنی طرف کھینچا، ماں نے اپنی طرف... وہ شیر خوار تھی۔ ابھی اس کے جسم میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ اس بے پناہ کھینچا تانی کو جھیل سکتی۔ چند ہی ساعتوں میں اس کا ایک بازو جسم سے علیحدہ ہو گیا۔

یہی لمحے تھے جب ایک تیسرا سانحہ ہوا۔ میں اور تیمور سکتے کی سی کیفیت میں باہر دیکھ رہے تھے۔ چار پانچ سالہ بچہ بھی روتا چلاتا ہوا مورچے سے نکل گیا اور اپنی ماں کی طرف بھاگا۔ تیمور نے آخری لمحوں میں اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ معصوم بچے کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس جان لیوا آفت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسے صرف اپنی ماں نظر آئی تھی۔

کتے نے بچے کی آواز سنی تو شیر خوار بچی کو چھوڑ کر بچے کی طرف پلٹا۔ یہ سارا بس دو تین سیکنڈ کا کھیل تھا۔ کتے کے کان لمبے بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔

میں جیسے ہوش میں آیا۔ پسٹل میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ ایک گولی کتے کے سینے میں لگی دوسری سر میں۔ وہ کریہہ آواز نکال کر سرکنڈوں میں گر گیا۔ بچہ بھاگتا ہوا ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ موت سے کتنا قریب سے ہو کر گزرا ہے۔

ماں کے سینے سے خون آلود لوتھڑا چمٹا ہوا تھا۔ یہ وہ بچی تھی جس کے زندہ رہنے کے امکان اب بہت کم تھے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے بچے کا بازو پکڑا اور روتی کراہتی ہوئی... مخالف سمت میں بھاگتی چلی گئی۔

''یار! یہ کیا ہو گیا ہے؟'' تیمور کراہا۔

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر ایک طویل برسٹ نے مجھے خاموش کرا دیا۔ کنکریٹ کے بہت سے ٹکڑے اڑ کر مورچے کے اندر آ گرے۔ اچانک ہی مورچے پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ یوں لگا کہ ایک اور کتا مر جانے کے طیش نے... گھیرا ڈالنے والوں کو تابڑ توڑ فائرنگ پر مائل کر دیا تھا۔ چاروں طرف چنگاریاں سی بکھرنے لگیں۔ لکڑی کے دروازے میں اور پولیتھین کے ٹکڑوں میں درجنوں سوراخ مزید ہو گئے۔ ہم دونوں خود کو بہ مشکل بچا پا رہے تھے۔

میں نے لیفٹیننٹ آصف جاہ کے غیظ و غضب کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ آج اس غیظ و غضب کا خوف ناک تجربہ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہماری موت سے کم کسی چیز پر تیار نہیں ہے۔ موت اور فوری موت، اسی جگہ پر! وہ کسی اور جھمیلے میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ثبوت وہ لاش تھی جو مورچے کے پچھلی دروازے سے آٹھ دس قدم کی دوری پر پڑی تھی۔ ناجے کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اس پر اندھا دھند فائرنگ کر دی گئی تھی۔ غالباً گھیرا ڈالنے والوں کو یہی لگا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی باہر نکلا ہے۔ اگر میرے گمان میں یہ بات ہوتی کہ آصف جاہ کی طرف سے ایسی وحشت اور اندھے پن کا مظاہرہ کیا جائے گا تو میں ناجے نام کے اس بندے کو کبھی باہر نہ بھیجتا۔

میں نے بار بار پھر رخنے سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔ ''آصف جاہ! تم ظلم کر رہے ہو... تم ظلم کر رہے ہو۔ تم ہماری صفائی سنے بغیر ہمیں مار دینا چاہتے ہو۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔'' میرے لہجے میں اب آتش تھی اور آصف جاہ کے لیے شدید غم و غصہ تھا۔

پہلے کی طرح دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بس آصف جاہ کے ہرکاروں کی بہت مدھم دور افتادہ آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ اپنی پوزیشنیں تبدیل اور گھیرا مضبوط کر رہے تھے۔ گاہے بہ گاہے ایک دو فائر مورچے کے دروازے کی طرف کر دیے جاتے تھے۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ پولیس سمیت کوئی ہماری مدد کو آ سکے گا۔ شہوار کا باپ اپنی تمام تر حشر سامانیوں

کے ساتھ اپنے بے گناہ داماد کے گرد موت کا گھیرا قائم کر چکا تھا۔ اس کے جنون نے اسے سراپا قہر بنا دیا تھا۔

میں بے دم سا ہو کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک رخنے کے اندر سے کتے کے ساتھ ساتھ تاجے کی لاش بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی منکوں والی مالا اس کی سانسوں کی ڈور کی طرح ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے یہ شخص زندگی کی تمام تر حرارت اور توانائی سے معمور تھا اور یہ مورچا اس کا مسکن تھا۔ میں نے ایک بار پھر مورچے کا جائزہ لیا۔ یہ کافی کشادہ تھا اور اس کے دو حصے تھے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس مورچے میں پناہ گزیں ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت اور حالات تھے، ساتھی بھی اور تھا، کیفیت بھی اور۔ نکووال سے آتے ہوئے میں اور بلقیس شدید بارش میں گھر گئے تھے اور تاجو سمیت اس پناہ گاہ میں گھس گئے تھے... پھر تاجو مجھے اور بلقیس کو تنہائی فراہم کرنے کے لیے چھتری لے کر باہر صوفی اسلم اور شبیر کے پاس چلی گئی تھی۔ کتنے خوب صورت لمحے تھے وہ۔ تابڑ توڑ برستی بارش میں اس ویران پناہ گاہ میں ہماری سرگوشیاں گونجی تھیں۔ ہماری تیز سانسیں ایک دوجے میں گڈمڈ ہوئی تھیں۔ اس سامنے والی دیوار کے ساتھ کھڑے تھے ہم... اس دائیں طرف والے رخنے کے کنارے پر بلقیس نے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا لمس جیسے ابھی تک اس کنارے پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ جیسے کل کی بات تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور ہمارے دلوں میں انہونیوں کی آس تھی۔ مگر اب وہ سب کچھ گزرے زمانے کی بات ہو گئی تھی اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ اور اب موت کے اس گھیرے میں آنے کے بعد تو یوں لگ رہا تھا جیسے اب میں کبھی اس چہرے کو دیکھ ہی نہیں سکوں گا۔ یہاں سے میری اور تیمور کی گولیوں سے چھلنی لاشیں برآمد ہوں گی۔ ہمیں راجوال کے نواحی قبرستان میں کہیں دفنا دیا جائے گا۔ علاقے کے مکین کچھ عرصے تک اس واقعے کو یاد رکھیں گے پھر سب کچھ بھلا دیا جائے گا۔ کبھی کبھی بے بے جی اور عارفہ قبرستان کا رخ کیا کریں گی ورنہ کسی کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ یہاں جاگیر کا سابقہ سالار شاہ خاور دفن ہے... جسے کسی وقت کچھ لوگوں نے بڑی محبت سے جاگیر کا نجات دہندہ قرار دیا تھا بلکہ شیر شاہ کا خطاب بھی دے ڈالا تھا۔

''یار! بچی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا بڑا افسوس ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔'' تیمور کی افسردہ آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میں نے کہا۔ ''بچی کے زخمی ہونے میں تو اس کی ماں کی اپنی غلطی بھی شامل ہے۔ اسے ایک دم باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا لیکن اس بندے کی موت تو سراسر ہماری وجہ سے ہوئی ہے۔'' میں نے بڑے تاسف سے چند قدم دور پڑی لاش کو دیکھا۔ خون بچی زمین میں جذب ہو گیا تھا اور تاجے کی بے نور آنکھیں افق کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''خیر، غیب کا علم تو کسی کو نہیں ہوتا۔'' تیمور نے ڈھارس بندھائی۔ ''اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو شاید امین چودھری کے ڈیرے کا رخ ہی نہ کرتے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''مجھے تو روپے میں سے چودہ آنے یقین ہے کہ امین چودھری نے ہی لمبڑ کو ہمارے پیچھے لگایا۔ اگر اس نے...''

تیمور کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ کم از کم چھ گولیوں کا ایک برسٹ مورچے کی دیوار سے ٹکرایا۔ دو گولیاں ایک رخنے سے گزر کر اندر بھی گھس آئیں۔ ایک گولی نے میلے کچیلے واٹر کولر میں سوراخ کر دیا اور پانی فرش پر بہنے لگا۔ دوسری گولی بچی کے چھوٹے سے فیڈر کے آر پار ہو گئی۔ بچا کھچا دودھ سوراخوں سے بہہ گیا۔ شاید یہ اس بات کا شگون تھا کہ اس فیڈر کو استعمال کرنے والی ننھی سی جان بھی اس دنیا میں نہیں رہی۔

کتے کے بچی پر جھپٹنے کا منظر نگاہوں میں گھوما اور سینے میں انگارے سے دہک گئے۔ برسٹ چلنے کے بعد تیمور نے بھی دو جوابی فائر کیے۔ جواب میں پھر ایک برسٹ چلا، اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

اگر امین چودھری نے واقعی مخبری کی تھی تو پھر وہ ہرگز قابلِ معافی نہیں تھا... لیکن قابلِ معافی ہونے یا نہ ہونے کا سوال تو تب پیدا ہوتا تھا جب ہم یہاں سے نکل سکتے۔ اور فی الحال ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔ ''ہمارے پاس زیادہ گولیاں نہیں ہیں۔ بہت ہوا تو دو ڈھائی گھنٹے انہیں مزید روک سکیں گے۔ اس سے بہتر نہیں ہے کہ فائر کرتے کرتے باہر نکلیں اور جان بچانے کی ایک کوشش کریں؟''

''میرے اپنے ذہن میں بھی یہی خیال ہے لیکن اس کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا... دو بج گئے ہیں۔ ڈھائی تین گھنٹے میں شام ہو جانی ہے۔ اندھیرا ہو گیا تو پھر ہمارے بچ نکلنے کا چانس بڑھ جائے گا۔ دائیں طرف سے سرکنڈے بالکل پاس ہیں۔ ہم کسی طرح سرکنڈوں میں گھس گئے تو کسی نہ کسی طرح رستہ نکل آئے گا۔''

''لیکن کیا شام تک یہ خبیث ہمیں زندہ رہنے دیں گے؟''



''بات پھر وہی غیب کے علم کی آ جاتی ہے جو تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس۔'' میں نے کہا۔

ران کا زخم ٹھنڈا ہونے کے بعد بہت تکلیف دے رہا تھا، کچھ یہی کیفیت تیمور کی بھی تھی۔ لمبڑ آصف کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم بے حد تھکے ہوئے تھے اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر اب موت کے گھیرے میں آنے کے بعد تھکن اور بھوک ایک گمبھیر و اذیت ناک اندیشے کے نیچے دب گئی تھیں۔ سامنے ایک پتیلی میں ابلے ہوئے سفید چاول پڑے تھے۔ ایک پیالے میں آلو کا سالن بھی موجود تھا مگر ہماری توجہ ان چیزوں کی طرف بالکل نہیں تھی۔ بس ہم تھوڑا تھوڑا پانی پی کر اپنے خشک گلے تر کر رہے تھے۔

سردیوں کا سورج تیزی سے مغربی افق کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ سائے طویل ہو رہے تھے۔ بیش قیمت کتے کی لاش پر چند کوے منڈلا رہے تھے۔ باقی کتوں کی آوازیں کچھ فاصلے سے آ رہی تھیں۔ یقیناً انہیں کسی درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ اس ویران جگہ پر ان آوازوں کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ اچانک میں اور تیمور بری طرح چونکے۔ مورچے کی چھت پر سے چند خشک ٹہنیاں اڑتی ہوئی آئیں اور دروازے کے قریب گریں۔ ابھی ہم کچھ سمجھ نہ پائے تھے کہ مزید شاخیں دروازے کے سامنے گرنے لگیں۔ ایک پوری کی پوری جھاڑی بھی جیسے جڑوں سے اکھاڑ کر دروازے کے سامنے پھینک دی گئی تھی۔

''کہیں... یہ آگ وغیرہ لگانے کے چکر میں تو نہیں...'' تیمور کی ہراساں آواز ابھری۔

''لگ تو... ایسا ہی رہا ہے۔'' میں نے تائید کی۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی پیشانیوں پر پسینا چمکنے لگا تھا۔

تیمور نے ایک گہری سانس لی اور پھر جیسے خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرنے لگا... میرے اندر کا خوف بھی اب بے پناہ طیش میں بدلنے لگا تھا۔ مجھے موت کے خوف سے انکار نہیں لیکن موت کے خوف سے چوہے کی موت مرنا بھی مجھے ہرگز قبول نہیں تھا... اور شاید یہی کیفیت تیمور کی بھی تھی۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھول گئے تھے اور آنکھوں میں ہیجانی لہر نمودار ہو رہی تھی۔

لمبڑ آصف جاہ نے اپنے جنونی ہونے کا پورا پورا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ وہ ہمیں اسی تنگ و تاریک جگہ میں جلا کر راکھ کر دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ان ویران درختوں میں وہ خود ہی مدعی، خود ہی جج اور خود ہی جلاد بن گیا تھا۔ اس کے ہرکاروں نے دیکھتے ہی دیکھتے مورچے کے اردگرد خشک ٹہنیوں اور جھاڑیوں کا انبار سا لگا دیا۔ مورچے کی چھت ایک طرف سے زمین کے برابر تھی۔ وہ اس طرف سے آتے تھے اور چھت پر کھڑے ہو کر سامنے کی طرف ٹہنیاں اور جھاڑیاں پھینک دیتے تھے۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر ایک بار پھر اپنی آواز ان سفاک ہرکاروں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ میں نے ایک سوراخ سے منہ لگایا اور پکار کر کہا۔ ''میری بات آصف جاہ سے کرواؤ۔ میں اسے اس کی بیٹی کے قاتل کا نام بتانا چاہتا ہوں۔ تم ہمیں بے گناہ مار رہے ہو۔ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میری آواز سن رہے ہو تم؟''

خبر نہیں کہ وہ سن رہے تھے یا نہیں لیکن جواب کوئی نہیں آیا۔

دور فاصلے پر مجھے لمبڑ کے کارندوں کی حرکت نظر آئی۔ وہ مورچے کے عین سامنے خود کو چوکس کر رہے تھے۔ مقصد یقیناً یہی تھا کہ اگر ہم آگ سے بچنے کے لیے مورچے سے باہر نکلیں تو وہ ہمیں کامیابی سے گولیوں کی باڑ پر رکھ سکیں۔

شام کے سائے طویل ہو رہے تھے اور یہ بات ظاہر تھی کہ وہ ہمیں تاریکی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ نازک ترین لمحے پہنچ گئے تھے۔ اب کسی بھی وقت خشک ٹہنیوں کے انبار کو اور اردگرد کے سرکنڈوں کو آگ لگائی جا سکتی تھی اور ہم دم گھٹ کر یا کوئلہ ہو کر مر سکتے تھے۔ ہم دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو پیغام دیا کہ اب باہر نکلنا ہے۔ مرنا ہے یا مار دینا ہے۔ میں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ ''یار تیمور! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم سب کو بڑے دکھ دیے ہیں... بڑے بھائی کو، ماں جی اور عارفہ کو... باگو کو اور اس کے گھر والوں کو...''

''خبردار... میں منہ توڑ دوں گا تمہارا۔'' تیمور نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا اور میرے گلے سے لگ گیا۔

ہم کچھ دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے پیوست کھڑے رہے۔ ہم نے اپنے دونوں ہتھیار فل لوڈ کر لیے۔ چہروں پر کپڑوں کے منڈاسے باندھ لیے... اور باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس تیاری کے دوران میں یا اس سے پانچ دس منٹ پہلے میں نے اور تیمور نے ایک اور قابلِ تحیّر منظر دیکھا... طاقتور رائفل کا ایک برسٹ چلا اور سلوکی ہاؤنڈ کی لاش پر منڈلاتے ہوئے دو تین کوے اور ایک گدھ پھڑ پھڑا کر

زمین پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ان پرندوں کو آصف جاہ کے چہیتے پالتو کی لاش پر چونچ مارنے کی سزا ملی تھی۔ اس سے آصف جاہ اور اس کے کارندوں کی وحشت کا ایک اشارہ ملتا تھا۔

...تو میں بات کر رہا تھا اس مورچے سے باہر نکلنے کی جو اب تک ہماری پناہ گاہ بنا رہا تھا اور جس نے اپنی دیواروں پر ہمارے نام کی بے شمار گولیاں پچھلے چار گھنٹے میں برداشت کی تھیں۔ ہم دروازے کی طرف بڑھے...اور پھر انہی لمحوں میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ ان آوازوں کا رخ کچھ عجیب سا تھا۔

''کیا چکر ہے؟'' تیمور نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''لگتا ہے یہ فائر دائیں طرف کے درختوں سے ہو رہے ہیں۔''

ہم کچھ دیر مزید ان آوازوں پر غور کرتے رہے۔ اب بائیں طرف سے بھی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ''کہیں... یہ آپس میں تو نہیں لڑ پڑے۔'' تیمور نے پُرامید لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میں نے دور ایک درخت پر سے کسی بندے کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فائرنگ میں شدت آگئی۔ باہر نکلنے کے لیے یہ موقع بہترین تھا۔ اگر ہم نہ نکلتے تو یہ ہماری بہت بڑی حماقت ہوتی۔ ہم نے دروازہ کھولا اور ناجے کی لاش کو پھلانگ کر جھک کر بھاگتے ہوئے دائیں طرف کے سرکنڈوں کی طرف بڑھے۔ دو تین گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے بالکل پاس سے گزریں۔ ہم دونوں نے بھی جوابی فائر کیے اور سرکنڈوں میں گھس گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک گولی تیمور کو لگی ہے مگر کہاں؟ اس کا جواب نہیں ملا... بھاگنے سے میری ران میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر یہ ان ٹیسوں پر دھیان دینے کا وقت نہیں تھا۔

سرکنڈوں میں گھسنے کے فوراً بعد ہمیں اوندھے منہ گرنا پڑا۔ ہمیں نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ گولیاں تسلسل سے ہماری طرف آ رہی تھیں۔ بدبودار کیچڑ میں کرالنگ کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے گئے۔

اچانک مجھے کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ایک کار نظر آئی۔ اس کار کے عقب سے مورچے کے سامنے والے درختوں کی طرف فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں اس کار کو یہاں دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اس مونگیا رنگ کی کار کو میں پہچانتا تھا۔ یہ اللہ بخشے چودھری نشاط کے چھوٹے بھائی شاہ نواز کے استعمال میں ہوا کرتی تھی۔ اب شاہ نواز اشتہاری تھا اور اس کے تایا کے پتر یہ کار استعمال کرتے تھے۔ میرے ذہن میں فوراً آیا کہ کار یہاں ہے تو ہو سکتا ہے کہ شاہ نواز بھی یہاں ہو۔

میں اور تیمور رینگتے ہوئے دس پندرہ قدم مزید آگے گئے۔ تب میں نے پکار کر کہا۔ ''شاہ نواز... میں خاور ہوں... شاہ نواز!''

میری پکار کا جواب میری توقع سے بھی زیادہ جلدی ملا۔ یہ شاہ نواز کی آواز تھی۔ فائرنگ کے سماعت شکن شور میں بھی میں نے اس آواز کو بہ آسانی پہچان لیا۔

وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''خاور! ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ ہم گاڑی کے پیچھے ہیں۔ تم اسی طرح لیٹے لیٹے آگے آؤ۔ کھڑے نہیں ہونا۔''

اس آواز نے ہمارے مردہ جسموں میں نئی زندگی دوڑا دی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں اس ویرانے میں نشاط کے بھائی شاہ نواز سے ملاقات ہوگی۔ ہم اسی طرح رینگتے اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے آگے بڑھے اور کار تک پہنچ گئے۔ شدید فائرنگ کے سبب ایک طرف کے سرکنڈوں کو آگ لگ گئی تھی اور دھوئیں کے مرغولے شام کے جھٹپٹے کو گہرا کر رہے تھے۔ ہمارے لیے گاڑی کے ایک طرف کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ ہم اسی طرح جھکے جھکے گاڑی میں داخل ہو گئے۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر گئے تھے۔ جونہی میں نے گاڑی کا دروازہ بند کیا، وہ ایک جھٹکے سے حرکت میں آگئی... ڈرائیونگ سیٹ پر خود شاہ نواز موجود تھا۔ اس کا ایک ساتھی رائفل سمیت پہلو والی نشست پر موجود تھا...اور گاہے بہ گاہے مورچے کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

گاڑی دھوئیں کے مرغولوں میں سے برق رفتاری کے ساتھ گزری اور کچے راستے پر آگئی۔ یہ وہی راستہ تھا جو سوئے کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' شاہ نواز نے ڈرائیونگ کرتے کرتے مڑ کر دیکھا۔

''ہاں، میں تو ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا پھر تیمور کو ٹٹولا۔ ''کہاں لگی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ زخم کندھے سے ذرا نیچے تھا۔ یہ گولی کا نہیں کارتوس کے موٹے چھرے کا زخم تھا۔ خون نکل رہا تھا۔ میری ران کا زخم بھی تازہ ہو کر پھر سے خون اگلنے لگا تھا۔ ''کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا؟'' میں نے کراہتے ہوئے شاہ نواز سے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں۔'' اس نے تیزی سے ڈرائیونگ



کرتے ہوئے کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا، دھوئیں کے مرغولے ایک گھٹا کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ شاید یہ دھواں ہی تھا جس نے ہمیں آصف جاہ کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ دھوئیں کے اندر شعلوں کی سرخی بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ غالباً سرکنڈوں کے ساتھ ساتھ خشک ٹہنیوں کے انبار نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔

☆☆☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور تیمور ایک بہت پرانے قبرستان میں ایک چھوٹے سے ڈھارے میں موجود تھے۔ ڈھارے میں ایک ملنگ نما شخص موجود تھا اور چٹائی پر بھنگ گھوٹنے کا ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ شاہ نواز اور اس کے دو ساتھیوں نے ملنگ کے ساتھ مل کر ہماری مرہم پٹی کی۔ ہمیں دیسی گھی ڈال کر گرم دودھ پلایا گیا اور درد کم کرنے کے لیے ڈسپرین وغیرہ دی گئی۔ ڈھارے کے اندر سرسوں کے تیل کے دو دیے روشن تھے۔

شاہ نواز کی عمر اٹھائیس سال کے قریب تھی، اس کی شکل چودھری نشاط سے زیادہ نہیں ملتی تھی۔ چہرے پر ایک دو پرانے زخموں کے نشان اس کی آتش مزاجی اور مہم جو طبع کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی تھا لیکن اس وقت ہمارے لیے زندگی کی نوید بن کر آیا تھا۔

کسی قریبی کمرے سے کسی عورت کے رونے کی مدھم آواز آئی۔ اس کے رونے میں بلا کا کرب تھا۔ ''کون ہے یہ؟'' میں نے شاہ نواز سے پوچھا۔

''وہی جس کی اطلاع پر ہم وہاں پہنچے اور تمہیں نکالا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''یہ اس بندے کی زنانی ہے جو وہاں مورچے میں آصف جاہ کے کارندوں کے ہاتھوں مرا ہے۔ جب یہ وہاں مورچے سے نکلی تو اسے آصف جاہ کے بندوں نے پکڑ لیا اور ایک جیپ میں بٹھا کر دروازہ بند کر دیا۔ پر یہ موقع دیکھ کر وہاں سے نکل گئی اور بھاگ کر یہاں آگئی۔ یہ کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔''

''یہاں کیوں آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''بس...اس کو چھپنے کے لیے کوئی جگہ چاہیے تھی۔ اس کا بندہ ناجا یہاں دو تین بار چاچے ملنگے کے پاس بھنگ پینے آیا تھا۔ یہ چاچے ملنگے کے پاس آگئی۔'' شاہ نواز نے لمبے بالوں اور گہرے سانولے رنگ والے ادھیڑ عمر ملنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں مورچے کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس عورت نے ہی ہمیں ساری بات بتائی۔ تم نے اس کے بندے ناجے کے سامنے اپنا نام لیا تھا۔ جب اس نے تمہارا نام بتایا تو مجھے شک ہو گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں مورچے پر پہنچا۔ وہاں لمبڑ آصف جاہ کی جیپ اور اس کے کتے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ سورے اور جوائی (سسر اور داماد) میں ''میچ'' پڑا ہوا ہے... وہاں مورچے کو آگ لگانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مجھے آصف جاہ کے زہریلے پن کا پتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو تمہارا سورا تمہیں اندر ہی بھون ڈالے گا۔ اوپر والے کا شکر ہے کہ ہم کامیاب رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی بندے کی جان بھی نہیں گئی۔ بس چار پانچ زخمی ہوئے ہیں۔''

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاہ نواز کا کردار واقعی دلیرانہ تھا۔ اچانک میرا دھیان ناجے کی زخمی بچی کی طرف گیا۔ ''زخمی بچی کا کیا بنا؟'' میں نے شاہ نواز سے پوچھا۔

''وہ تو رستے میں ہی مر گئی تھی۔ جب وہ یہاں پہنچی تو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس کے لیے پچھواڑے قبر کھود دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دفنا دیں گے۔'' شاہ نواز نے بے پروائی مگر تاسف کے ساتھ کہا۔

میرے سینے میں دھواں سا بھر گیا۔ جواں سال ناجے کی لاش بھی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ امکان تھا کہ اس کا چھلنی جسم بھی سرکنڈوں کی آگ میں جل کر کوئلہ ہو گیا ہوگا۔

عورت کا دردناک نوحہ پھر سنائی دیا۔ وہ کبھی بلند اور کبھی دھیمی آواز میں رو رہی تھی۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر اس کی مانگ اور گود دونوں اجڑ گئی تھیں۔

شاہ نواز کے بعد میں نے مختصر لفظوں میں اسے اپنی روداد سنائی اور اسے بتایا کہ کس طرح میں امین چودھری کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس کے پاس گیا تھا اور کیسے وہاں جا کر مایوسی ہوئی اور پھر آصف جاہ ہمارے پیچھے لگا۔

ساری روداد سننے کے بعد شاہ نواز بھی کچھ الجھن میں نظر آیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ امین چودھری نے تم سے ملنے سے انکار کر دیا... مگر آصف جاہ کو اطلاع دینے والی بات شاید درست نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سعید شاہ نے کام دکھا دیا ہو۔ ویسے بھی وہ آصف جاہ کی برادری میں سے ہے۔''

عورت پھر نوحہ کرنے لگی۔ غالباً اپنی شیر خوار بچی کی لاش پر رونے والی وہ اکیلی ہی تھی۔ تیمور نے کہا۔ ''یار! میرا تو خون کھول رہا ہے۔ جی چاہتا ہے رائفل لوڈ کر کے قلعہ والا پہنچ

جاؤں اور کچھ نہیں تو آصف جاہ کے کتوں کو تو ضرور چھلنی کر دوں۔ ایسے خطرناک جانوروں کو اس طرح جیتے جاگتے انسانوں کے پیچھے چھوڑنا سنگ دلی کا اخیر ہے۔"

شاہ نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بھئی۔ اس وقت تو تم دونوں کو اپنا آپ بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ آصف جاہ کا رویہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ پولیس علیحدہ سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ کل رات باغ والے ڈیرے پر تایا عزیز سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ تایا بھی تمہاری طرف سے بہت پریشان ہیں۔ انہیں پکا یقین ہے کہ میاں وارث تم دونوں کو پولیس مقابلے میں پار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بندے سادہ کپڑوں میں دن رات تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کئی جگہوں پر ناکے بھی لگے ہوئے ہیں۔"

"تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

شاہ نواز نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر خاص انداز سے ایک طویل کش لیا اور بولا۔ "سچی رائے پوچھتے ہو، یا بس گزارے مافق؟"

"میں تم سے سچی رائے کی توقع ہی رکھتا ہوں۔"

"سچی رائے تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے اس دنیا سے نبھا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ مکر فریب اور جوڑ توڑ کی دنیا ہے۔ یا تو ہم اپنا آپ مار لیں اور دنیا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے اپنا سر جھکا لیں یا پھر دوسرا راستہ یہ ہے..." شاہ نواز نے اپنی گود میں رکھی روسی ساخت کی رائفل کو تھپتھپایا۔

میں شاہ نواز کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ جذباتی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مسئلہ یہ ہے شاہ نواز کہ میں یہ دونوں راستے اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسی بات بھی نہیں ہے کہ میں خود سے ہونے والی زیادتی کو خاموشی سے سہہ لوں گا۔ مجھ پر دو انسانوں کی جان لینے کا جھوٹا الزام ہے۔ مجھے ہر صورت میں اپنی صفائی دینی ہے۔"

"صفائی دینے کے لیے زندہ ہونا بھی تو ضروری ہوتا ہے اور میں نے کل جو اندازہ لگایا ہے، وہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ یہ بڑی دیر سے موقع کی تلاش میں تھے۔ اب قدرت کی طرف سے انہیں یہ موقع مل گیا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق تھانے دار وارث کے ساتھ موکھلوں کا پورا اکٹ مکا ہو گیا ہے۔"

"جاگیر کے عام لوگوں کی سوچ کیا ہے؟"

"یہ سوچ بھی الٹ گئی ہے۔ خاص طور سے اماں دلشاد کی بیٹی کی موت کے بعد لوگوں کو یقین ہو گیا ہے کہ تم نے [illegible] کے قتل کی چشم دید گواہ کو ختم کیا ہے۔ جو لوگ تمہارے [illegible] زیادہ حمایتی تھے، وہ بھی چپ ہو گئے ہیں۔ رہی سہی کسر موکھلوں کے پروپیگنڈے نے پوری کر دی ہے۔ تایا عزیز [illegible] رہے تھے کہ آج کل یہ پروپیگنڈا زوروں پر ہے۔ دلشاد کی یتیم بیٹی ثمینہ کی موت کو تو بہت زیادہ اچھالا جا رہا ہے۔ اس بات کی گواہیاں بھی مل گئی ہیں کہ ثمینہ کے قتل کے بعد تم دیوار پھاند کر فرار ہوئے تھے۔ ثمینہ کے چاچے کے پتر اور اس کی بیوی نے تمہیں دیوار پھاندتے ہوئے دیکھا ہے اور پہچانا بھی ہے۔"

میں شاہ نواز کو اس بارے میں ساری تفصیل پہلے بھی بتا چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ثمینہ کو صرف اس لیے مارا گیا کہ وہ میرے خلاف اپنا بیان بدلنے والی تھی۔

کوئی دو گھنٹے بعد گہری تاریکی میں ناجے کی کٹی پھٹی بچی کو ایک چھوٹی سی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ دکھیاری عورت اپنے سر کے سائیں کی لاش بھی چاہتی تھی تاہم شاہ نواز نے اسے سمجھایا کہ وہ لاش ابھی اسے نہیں مل سکتی۔ غم زدہ عورت نے ایک بار بھی پولیس کے پاس جانے کی بات نہیں کی... نہ ہی وہ کسی اور طرح دادرسی چاہ رہی تھی۔ اپنے جیسے بے شمار لاچار لوگوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ظلم کرنا، طاقتور کا حق اور ظلم سہنا کمزور کا مقدر ہے۔

☆☆☆

ہم دو دن تک وہیں ملنگے سائیں کی کٹیا میں رہے اور اپنے زخموں کی بری بھلی مرہم پٹی کرتے رہے۔ میری ران کا زخم زیادہ تکلیف دہ تھا۔ روز رات کو بخار ہو جاتا تھا اور میں درد سے تڑپتا رہتا تھا۔ اس قدیم قبرستان میں شاہ نواز اپنے قریباً آٹھ ساتھیوں سمیت روپوش تھا۔ ملنگے کی کٹیا کے پیچھے دو تین کچے کمرے تھے۔ یہ لوگ عارضی طور پر آج کل یہیں مقیم تھے۔ شاہ نواز کے چچازاد بھائی دو تین بار اس سے ملنے کے لیے یہاں آئے تھے اور خورد و نوش کا بہت سا سامان دے کر گئے تھے۔ قبرستان کی دو خالی قبروں کو ان لوگوں نے خفیہ پناہ گاہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اگر کسی وقت کوئی خطرہ ہوتا تو شاہ نواز اور اس کے دو مفرور ساتھی اس خفیہ پناہ گاہ میں چلے جاتے تھے۔

یہ تیسرے روز آدھی رات کی بات ہے۔ شاہ نواز کا ایک چچازاد بھائی اکرم اس سے ملنے آیا۔ وہ اپنے ساتھ سلور کے دو ڈبوں میں بہت سا دیسی گھی اور میٹھی دال کینی بھانڈا وغیرہ لایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک نہایت اہم اور تکلیف دہ خبر بھی تھی۔ اس کا پتا مجھے اکرم کے جانے کے بعد شاہ نواز سے لگا۔ میں اور تیمور، اکرم کے سامنے نہیں آئے تھے۔

مٹی کے دیے کی روشنی میں شاہ نواز کا چہرہ دکھ اور پریشانی کی آماج گاہ نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔ "شاہ خاور! وہی کچھ ہوا ہے جس کا مجھے ڈر تھا۔ آج شام موکھلوں نے راجوال کی عزت خاک میں ملا دی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" میں اور تیمور ایک ساتھ بولے۔

"قریباً دو سو بندوں نے گاؤں پر ہلّا بولا ہے۔ ان میں لبڑوں کے گھڑ سوار بھی شامل تھے۔ انہوں نے لوگوں کو مارا پیٹا ہے۔ عورتوں کو بے عزت کیا ہے اور کوئی پچاس بھینسیں ہانک کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"پر راجوال کے گھڑ سوار کہاں تھے؟"

"یار! گھڑ سوار تو تب لڑتے ہیں جب ان کو کوئی لڑانے والا ہو۔ بیگم بلقیس میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ گھوڑے پر چڑھ کر میدان میں آ جاتی۔ تایا عزیز بیمار پڑا ہے۔ نصر اللہ ہی نصر اللہ تھا، اس نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا پھر ڈھے گیا۔ اس کی دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگی ہیں۔ دو بندے جان سے گئے ہیں۔ پندرہ بیس زخمی ہوئے، باقی بھاگ گئے۔ لبڑوں اور موکھلوں نے خوب لوٹ مچائی۔ گاؤں کے قریباً سو بندوں کو حویلی کے سامنے زمین پر لٹا کر جوتے مارے ہیں۔"

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ "پر یہ ہوا کس وجہ سے؟"

"بس ان کو کوئی بہانہ چاہیے تھا، وہ مل گیا۔ اتوار کی رات موکھلوں کے گاؤں میں رسا گیری کی واردات ہوئی ہے۔ ایک زمیندار کی دس پندرہ بھینسیں چوری ہوئی ہیں۔ ان میں سے چار بھینسیں راجوال کے ایک کسان کے ڈیرے سے ملی ہیں۔ بس اسی بات کا بتنگڑ بنایا گیا اور پھر جھگڑے کو لڑائی میں بدل دیا گیا۔ بہت بے عزتی ہوئی ہے لوگوں کی۔ عورتوں کے سروں سے دوپٹے کھینچے گئے ہیں۔ انہیں تھپڑ مارے گئے ہیں۔ بندوں سے نکیریں نکلوائی گئی ہیں... پولیس نے بس تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ میرا تو دل رو رہا ہے یار!"

"پولیس نے کیوں کچھ نہیں کیا؟"

"ان کے پاس کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے ہزار بہانے ہوتے ہیں۔ وہ موقع پر اس وقت پہنچے جب موکھل اور لبڑ اپنا کام کر چکے تھے۔ بعد میں رسا گیری کے کیس کو بہانہ بنا کر پولیس نے بھی مخالف پارٹی کی طرف داری کی۔ حویلی کے اندر گھس کر بیگم بلقیس اور تایا عزیز کو ڈرایا دھمکایا گیا... اس دوران میں موکھل پاشا نے حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر ہوائی فائرنگ کی اور اعلان کیا کہ اس سے پہلے بھی ہمارے گاؤں میں رسا گیری ہوتی رہی ہے اور ہمارے مویشی چوری ہو کر جاگیر میں ہی آتے رہے ہیں۔ اس نے حکم صادر کیا کہ گاؤں میں کم از کم سو بھینسوں کا انتظام کیا جائے اور یہ بھینسیں ابھی ان کے حوالے کی جائیں۔ کچھ لوگ بیچ بچاؤ کے لیے درمیان میں آئے اور پچاس بھینسوں پر راضی نامہ ہوا۔ حویلی سے جو پندرہ بھوری بھینسیں لی گئیں، وہ اس کے علاوہ تھیں۔"

"ان باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔" تیمور نے تاسف سے سر ہلایا۔

"جب دشمن کا وار چل جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اکرم نے بتایا ہے، راجوالیوں نے اپنی بھینسیں اپنے ہاتھوں سے میدان میں پہنچائیں اور پھر ٹرکوں پر چڑھائیں۔"

میرے سینے میں آگ بھڑکنے لگی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شاہ نواز نے جو بات کہی تھی، اس پر پھر سے غور کروں۔ شاہ نواز کی طرح ہی رائفل تھام لوں اور ویرانوں میں نکل جاؤں۔ اس کے بعد دشمنوں کو چن چن کر پکڑوں اور بدلہ لوں مگر شاید یہ سب کچھ میرے خون میں شامل نہیں تھا۔ میں موت اور مصیبت سے ڈرتا نہیں تھا مگر آخر وقت تک صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بے جی نے بچپن سے جو نصیحتیں کانوں میں ڈالی تھیں، وہ کسی الوہی صدا کی طرح سماعت میں گونجتی رہتی تھیں۔

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے۔ میں ایک کمرے میں بیٹھا اپنی زخمی ران کی پٹی خود ہی بدل رہا تھا۔ ملنگے سائیں نے دو چار جڑی بوٹیوں سے ایک سیاہی مائل مرہم بنایا تھا جو میں اور تیمور دونوں لگا رہے تھے۔ اس سے افاقہ تھا۔ شاہ نواز کے ساتھیوں میں ایک ادھیڑ عمر شخص تیز دھار چاقو سے گولی نکالنا جانتا تھا۔ اس نے اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کیا تھا اور تیمور کی کلائی میں سے گرم چاقو کی مدد سے گولی نکال دی تھی تاہم اس کوشش میں کچھ رگیں کٹ گئی تھیں اور تیمور کا ہاتھ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا...

اسے رات کو شدید درد بھی تھا۔ درد سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ کثرت سے شراب پی رہا تھا۔ اپنی ران کی پٹی بدلتے ہوئے میں نے تکلیف سے سسکاری لی تو وہ بولا۔ "تھوڑی سی پی لو۔ درد سے لڑائی آسان ہو جائے گی۔"

"مجھے ایسی آسانی نہیں چاہیے۔" میں نے حتمی لہجے میں

کہا۔ ''میں جو کچھ چھوڑ چکا ہوں، وہ چھوڑ چکا ہوں۔''

''اور جس کے لیے چھوڑ چکے ہو، وہ تمہیں چھوڑ چکی ہے۔ اس نے اب کبھی پلٹ کر تمہاری طرف نہیں دیکھنا ہے، میری بات یاد رکھنا۔'' تیمور نے شرابیوں کے انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ''اول تو وہ شادی کرے گی نہیں اور اگر کرے گی تو اپنی برادری کے کسی اُچے شملے والے سے کرے گی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے۔'' میں نے شراب کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

''یار! تیری ساری زندگی برباد ہوگئی ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اگر... اگر تیرے دل میں اس کے لیے اتنی ہی تڑپ ہے تو پھر مجھے بتا... مجھے بتا یار... میں تیرے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔ اسے راجوال سے اٹھا کر لے آؤں گا یہاں۔ پھر تم دونوں کہیں دور نکل جانا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔''

''تو اپنی زبان بند نہیں کرسکتا؟'' میں نے اسے جھڑکا۔

''دیکھ خاورے! آج میری زبان سے سچی باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے پتا ہے، تیرے دل سے وہ آج بھی نکلی نہیں ہے۔ اگر تو اس کے بغیر مر گیا نا تو مرنے کے بعد تیری روح بھی اس کے لیے تڑپتی رہے گی۔''

اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر کمرے سے نکل جاتا، ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ گاڑی کے انجن کی آواز تھی... اور قبرستان کے بالکل پاس سے آرہی تھی۔ ایسی کسی آواز کو سنتے ہی شاہ نواز اور اس کا اشتہاری دوست زیرِ زمین جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے... تاہم اس مرتبہ ایسی کوئی نوبت نہیں آئی۔ معلوم ہوا کہ آنے والا کوئی غیر نہیں اپنا ہے۔ یہ شاہ نواز کا چچا زاد اکرم ہی تھا۔ اکرم کے ساتھ ایک اور نہایت اہم شخص بھی یہاں پہنچا تھا۔ یہ چودھری عزیز تھا۔

چودھری عزیز کی یہاں اچانک آمد نے ہمیں حیران کیا۔ بند کمرے میں میری اور چودھری کی ملاقات ہوئی۔ چودھری کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں چار پانچ دن سے بیمار ہوں لیکن یہاں تمہارے پاس آنا بھی بہت ضروری تھا۔ تم پہلے بھی بہت مصیبت میں ہو، میں تمہیں اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو چودھری عزیز۔''

اس نے کہا۔ ''ماضی میں بہت کچھ ہوتا رہا ہے خاور! کبھی ہم دوست بنے ہیں، کبھی دشمن... لیکن ایک بات میں تسلیم کرتا ہوں اور سچے دل سے کرتا ہوں۔ تم نے جاگیر اور حویلی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ تمہاری کئی برسوں کی مسلسل کوششوں سے جاگیر کی دیواریں بچی ہوئی ہیں... میں نہیں چاہتا کہ جاگیر کی بنیادیں اور دیواریں مضبوط کرنے والا اب خود بربریت کی دیوار بن جائے... تمہارے اردگرد حالات بہت خراب ہو چکے ہیں خاور۔ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے... پولیس، موکل اور لبریہ تینوں ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ تمہیں تین چار دن سے زیادہ دیں گے۔ اور ایسا بھی صرف اس لیے ہے کہ ہم نے تمہاری والدہ اور بہن عارفہ کو محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے ورنہ ان لوگوں نے تمہیں مجبور کر دینا تھا کہ تم خود ان کے سامنے پیش ہو جاؤ۔''

''اب تمہاری کیا رائے ہے چودھری عزیز؟''

''رائے نہیں ہے، فیصلہ ہے۔ اور تمہیں اس فیصلے پر ہر صورت عمل کرنا پڑے گا۔'' چودھری نے اپنائیت بھرے تحکم سے کہا۔

''کیسا فیصلہ؟''

''تم تیار رہو۔ میں نے تمہیں یہاں سے نکالنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ تم والی جی کے ایک پرانے دوست غلام خان کے ساتھ آزاد علاقے میں جا رہے ہو۔ تمہیں شاید پتا ہی ہو، غلام خان کا اپنا ٹرک ہے اور وہ اس کی ڈرائیوری بھی خود ہی کرتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ساری بات کر لی ہے۔ پرسوں صبح تین چار بجے کے قریب تم اور تیمور ایک ٹریکٹر ٹرالی میں پکی سڑک تک پہنچو گے۔ وہاں سے غلام خان ٹرک پر سوار کرے گا۔ وہ پسرور سے کچھ فریچر وغیرہ لے کر کرم ایجنسی کے علاقے ٹل میں جا رہا ہے۔ وہ تم دونوں کو اپنے سامان میں اس طرح چھپا لے گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ ٹل سے آگے تم لوگ کوئل بس میں سفر کرو گے اور افغانستان کے بارڈر کی طرف نکل جاؤ گے۔ غلام خان ہر قدم پر تم دونوں کے ساتھ ہوگا اور جب تک تمہاری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو جائے گا، واپس نہیں آئے گا۔''

اگلے ایک گھنٹے میں ہمارے درمیان یہی بات ہوئی کہ ہم نے یہاں سے کس طرح نکلنا ہے اور قبائلی علاقے میں کس طرح چند ماہ کے لیے خود کو روپوش کرنا ہے۔ اس گفتگو میں شرکت کے لیے میں نے تیمور اور شاہ نواز کو بھی بلا لیا تھا۔ شاہ نواز کو بھی چودھری عزیز کے خیالات سے مکمل اتفاق تھا۔ اسے بھی لگ رہا تھا کہ جس طرح کے حالات بن گئے ہیں، مجھے آٹھ دس مہینوں یا پھر ایک ڈیڑھ سال کے لیے قبائلی علاقے میں روپوش ہو جانا چاہیے۔

ہمیں قریباً پچھتر فیصد رضامند کرنے کے بعد چودھری عزیز اور اکرم واپس چلے گئے۔ چودھری عزیز سے دو دن پہلے والی لڑائی کے حوالے سے کچھ مزید خبریں ملیں۔ مجھے اپنے تین چار ساتھیوں کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔ اس کے علاوہ حامد کے سر پر بھی لاٹھیاں لگی تھیں۔ جب موکل پاشا اور اس کے ساتھی دندناتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے اور ملازموں کو ڈرا دھمکا کیا تو حامد کم عمر ہونے کے باوجود رائفل پکڑ کر باہر نکل آیا۔ بلقیس اسے پکڑتی ہی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر موکل پاشا کے ساتھی چکما دے کر اس کے عقب میں چلے گئے اور لاٹھی کی دو تین ضربیں اس کے سر پر لگا کر رائفل اس سے چھین لی۔ رونق علی کے معمولی زخمی ہونے کی اطلاع بھی مجھے ملی۔ یہ ساری خبریں دکھی کرنے والی تھیں۔ میں مورچے والے واقعے کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔ مجھے یہ تجسس تھا کہ ناجے کی لاش کا کیا بنا۔

اس کے بارے میں چودھری عزیز یا اکرم کوئی خاص اطلاع فراہم نہیں کر سکے۔ بس یہی پتا چلا کہ وہاں سے ایک کوئلہ لاش ملی تھی۔ جسے لاپتا قرار دے کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ ملزموں کے کسی ساتھی کی لاش ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں نے شدید تذبذب کے عالم میں گزارے۔ میں جیسے ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک راستہ فرار کا تھا، دوسرا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کا۔ دونوں راستوں پر خطرات موجود تھے لیکن میں دونوں میں سے کوئی راستہ بھی اختیار کرتا، اس سے پہلے میں ایک بار بے بے جی اور عارفہ سے ملنا ضرور چاہتا تھا۔ میں بے بے جی کی بائیکی کی طرف بیٹھ کر دیر تک ان کی ٹانگیں دبانا چاہتا تھا اور ان کی مامتا کو اپنے سارے دکھڑے سنانے کے بعد ان کی رائے اور ان کی دعائیں چاہتا تھا۔ ماں کے پاؤں پکڑ کر مجھے جو سکون ملتا تھا، اس کو بیان کرنے کے لیے میرے الفاظ بالکل ناکافی ہیں۔

''کس سوچ میں ہو یار؟'' تیمور نے دودھ پتی والی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وہی جو تم سوچ رہے ہو۔ کس طرف جانا چاہیے؟''

میں نے خود کو کھدر کے لحاف میں لپیٹ کر جواب دیا۔

''میں تو گرفتاری دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ آگے جیسا تم کہو گے ویسا کروں گا۔''

''یار! میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک اور کام کرنا چاہتا ہوں۔ بس ایک بار ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے۔ پر میری ماں تو اب قبر میں ہے۔'' تیمور نے عجیب لہجے میں کہا پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ ''یار! یہ کیا بات ہے۔ بندہ جب کسی سخت مصیبت میں پھنستا ہے تو چاہے وہ کتنا بھی برا ہو، اسے ماں کی گود ایک بار ضرور یاد آتی ہے۔ میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ ماں میرے سامنے ہو اور میں ایک بار اس کی گود میں سر رکھ کر اچھی طرح رو لوں۔''

''تو پھر ہم دونوں چلیں گے یار... ماں تو ہمارے پاس ہے نا۔ سمجھو کہ وہ ہم دونوں کی ماں ہے۔''

اسی دوران میں شاہ نواز ایک میلی سی لالٹین لیے اندر داخل ہوا۔ غالباً اس نے ہمارے آخری فقرے سنے تھے۔ وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ''میں ایک بار پھر کہتا ہوں، جو قدم اٹھانا بہت سوچ کر اٹھانا۔ سمجھو ہر جگہ شکاریوں نے جال بچھائے ہوئے ہیں تمہارے لیے... میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ ابھی ملنے ملانے والے خیال ذہن میں نہ لاؤ۔ زندگی رہی تو یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو جائے گا۔''

شاہ نواز کی ہمدردی اور اس کا خلوص اپنی جگہ تھے۔ مگر میرے اندر کی تڑپ اپنی جگہ تھی۔ نہ جانے کیوں ہر گھڑی مجھے لگ رہا تھا کہ ایک نادیدہ ڈور مجھے کھینچ رہی ہے۔ اس ڈور کا تعلق میری ماں اور اس کی ممتا سے تھا۔

سردیوں کی اس طویل یخ بستہ رات میں، میں نے اپنے سارے اندیشوں کو ایک طرف رکھ دیا اور کچے راستوں پر ایک طویل سفر طے کر کے اپنی ماں سے ملنے ڈیک نالے کے کنارے واقع اس کیکراں والی گاؤں میں پہنچ گیا۔ میں اور تیمور دو گھوڑوں پر یہاں پہنچے تھے۔ ویسے تو شاہ نواز ٹریکٹر کا انتظام کر کے بھی دے رہا تھا مگر میری سمجھ کے مطابق گھوڑوں کا سفر زیادہ محفوظ تھا۔ ہم نے کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرنے والے بالکل اندرونی راستے استعمال کیے تھے اور خیر خیریت سے کیکراں والی پہنچ گئے تھے۔ صرف ایک جگہ راستے میں ہمیں چند پہرے داروں نے للکارا اور بعد ازاں ہوائی فائر بھی کیا تاہم ہم گھنی جھاڑیوں میں گھس کر آگے نکلنے میں کامیاب رہے۔ ان لوگوں نے سخت سردی میں پیچھے آنے کی ضرورت نہیں سمجھی یا پھر ہمت نہیں کی۔

کیکراں والی کافی بڑا گاؤں تھا اور شاداب تھا۔ درخت کثرت سے تھے۔ شاید اسی وجہ سے نام کیکراں والی پڑ گیا تھا۔ میں نے چودھری عزیز سے اس گھر کا اتا پتا پوچھ لیا تھا جہاں والدہ اور عارفہ رہائش پذیر تھیں۔ یہ ایک حویلی نما گھر تھا۔ دستک دینے پر ایک ادھیڑ عمر ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس کے کندھے پر دیسی ساخت کی رائفل تھی اور سردی کے

سبب منہ سے بھاپ خارج ہورہی تھی۔ ہمارے چہرے مفلروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ملازم ہمیں دیکھ کر قدرے پریشان ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اختر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شوکت اختر، بلقیس کی خالہ زاد خدیجہ کا شوہر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک زمیندار ٹائپ گنجا شخص دروازے پر نمودار ہوا اور ہم سے بات چیت کرنے لگا۔

دس منٹ بعد ہم دونوں ایک گرم کمرے میں داخل ہورہے تھے۔ یہاں بڑے سائز کی لالٹین روشن تھی۔ مٹی کی صاف ستھری دیواروں پر رنگ دار پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ گھر کے سارے مکین سوئے پڑے تھے۔ انہیں جگانے میں کچھ دیر لگی۔ پانچ دس منٹ بعد میں نے عارفہ کو دیکھا وہ لپکتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ وہ میرے گلے سے لگی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''بھابی چلی گئی بھائی جان... ظالموں نے اسے ہم سے چھین لیا۔ یہ کوئی اس کے مرنے کی عمر تھی۔''

میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد عارفہ کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''بے بے جی کہاں ہیں؟''

''وہ جاگ گئی ہیں لیکن میں نے ابھی انہیں کچھ بتایا نہیں۔ خوشی سے ان کے دل کو کچھ ہو نہ جائے۔'' عارفہ نے کہا۔

وہ مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آگئی۔ یہاں بے بے جی بستر پر حیران پریشان سی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت نمودار ہوئی۔ میں بستر پر بیٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔ یہ بڑی جذباتی ملاقات تھی۔ وہ روتے ہوئے بار بار میرا منہ چومنے لگیں۔ ''ہائے میرے پتر! کیا حال ہوگیا ہے تیرا۔ سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے میرا سوہنا... اللہ کرے دن چڑھنے سے پہلے مرجائیں تیرے سارے ویری دشمن... تجھ پر جھوٹے الزام لگانے والے... تجھے دربدر کرنے والے۔ اللہ کرے، کسی کی آئی، ان کو آئے۔''

ماں نے مجھے بانہوں میں چھپا لیا جیسے وہ اپنے اردگرد پولیس کو دیکھ رہی ہو، آصف جاہ کو دیکھ رہی ہو اور موگھلوں کو۔ وہ مجھے ان سب کی نظروں سے اوجھل کردینا چاہتی ہوں۔ مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میرے جیسی ناسمجھ اولاد کبھی کبھی انہیں اپنے رویے سے دکھی بھی کرتی ہے مگر ان کے دلوں سے پھر بھی دعا ہی نکلتی ہے۔ شاید ماں ہی کا دوسرا نام دعا ہے۔ دعا جو لرزتے کانپتے سوکھے ہونٹوں سے نکلتی ہے اور فرش سے عرش تک اس کے رستے میں آنے کی جرأت کوئی نہیں کرپاتا۔

وہ میرے لیے بڑی یادگار رات تھی۔ میں اور تیمور دیر تک ماں کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر تیمور ساتھ والے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ میں ماں کے پاس بیٹھ گیا اور لحاف میں ہاتھ ڈال کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ اپنے سارے اندیشے اور دکھ انہوں نے مجھ سے بیان کرڈالے۔ یہ اندیشے اور دکھ میرے حوالے سے ہی تھے۔ شہوار کے ساتھ ساتھ ثمینہ کی موت کا بھی انہیں شدید دکھ تھا۔ میں نے انہیں اپنے جسمانی زخموں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا مگر ماں تو بتائے بغیر بھی بہت کچھ جان جاتی ہے۔ ''تیری ٹانگ پر چوٹ لگی ہوئی ہے نا؟'' انہوں نے کچھ دیر بعد اچانک پوچھا۔

میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ بس گول مول جواب دے دیا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر جذباتی انداز میں کہا۔ ''دیکھ خاورے! یہ میرا خون ہے۔ اس خون کو مجھ سے پوچھے بغیر گرائے گا نا، تو میں تجھ سے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گی۔''

''نہیں بے بے جی... بس چھوٹا سا زخم لگا ہے۔''

''چھوٹا سا زخم لگنے سے رنگ اس طرح پیلا پھٹک نہیں ہوجاتا۔ جا ذرا شیشے میں شکل دیکھ اپنی۔'' انہوں نے ناراض ہوکر کہا۔

میں نے ہر کسی کو بتایا تھا کہ سچائی کیا ہے۔ اپنے ہمدرد کو یقین دلایا تھا کہ شہوار اور ثمینہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ لیکن یہ صفائی ماں کے سامنے پیش کر کے جو سکون حاصل ہوا، وہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ میں خود کو بہت حد تک ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

جب میں نے ماں کو بتایا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس چلا جاؤں گا تو وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''بالکل نہیں۔ خبردار ایسی کوئی بات کی تو۔ میں نے تجھے کہیں نہیں جانے دینا۔ زیادہ نہیں تو پانچ چھ دن تجھے اور تیرے دوست کو ضرور اپنے پاس رکھوں گی۔ پتا نہیں کہاں کہاں جل ہورہے ہو۔ روکھی سوکھی کھا کر ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ تم دونوں کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاؤں گی۔ دیکھنا، دو چار دن میں ہی چہرے کی رونق واپس آجائے گی۔''

وہ ماں کی زبان بول رہی تھیں مگر مجھے حالات کی زبان سمجھنی پڑ رہی تھی۔ میں نے انہیں اپنی مجبوریاں بتائیں اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بہت آزردہ خاطر ہوئیں۔ عارفہ بھی اپنے بچے سمیت آگئی اور میرے بازو سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔ آخر ہمارے درمیان طے ہوا کہ میں آج رات نہیں



جاؤں گا۔ کل بھی سارا دن ان کے پاس رہوں گا اور رات کو دس گیارہ بجے یہاں سے نکلوں گا۔

رات کافی ہوچکی تھی لیکن عارفہ اسی وقت ہمارے لیے گڑ والے چاول پکانے میں مصروف ہوگئی۔ میں بے بے جی کے پاس بیٹھا رہا اور ان سے باتیں کرتا رہا۔ ان کی ممتا کی گرمی لحاف کے راستے میرے جسم میں منتقل ہورہی تھی اور عجیب سا سکون بخش رہی تھی۔ میں نے بڑے محتاط لفظوں میں اور بڑی نرمی کے ساتھ بے بے جی کے کانوں تک یہ بات پہنچادی کہ مجھے کچھ عرصے کے لیے یہاں سے باہر جانا پڑے گا۔

''کہاں؟'' بے بے جی کے چہرے پر پھر اندیشوں کے سائے لہرا گئے۔

''شاید کراچی یا پھر کوئٹہ وغیرہ کی طرف۔'' میں نے جان بوجھ کر قبائلی علاقے کا نام نہیں لیا۔ میرے جانے کی خبر نے ان کی آنکھوں میں نمی بھر دی۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''بے بے جی! دیکھیں، لوگ برسوں کے لیے دبئی، کویت وغیرہ چلے جاتے ہیں۔ یہ تو چند مہینوں کی بات ہے اور پھر کسی نہ کسی طرح آپ تک اپنی خیر خیریت بھی پہنچاتا رہوں گا۔ چودھری عزیز اور بلقیس وغیرہ کا آپ سے رابطہ رہے گا۔''

''لوگ دبئی، کویت وغیرہ جاتے ہیں تو وہ اپنی خوشی سے جاتے ہیں۔ تو تو جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ تیرے پیچھے پلس لگی ہوئی ہے۔ میں کس منہ سے تجھے کہوں کہ جا چلا جا۔'' ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں نے کہا۔ ''بے بے جی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی ابھی چل تو نہیں پڑا ہوں۔ ابھی تو بس سوچ رہے ہیں۔''

انہوں نے جذباتی انداز میں مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''نہ پتر! ایسے جانے والے بڑی مشکل سے واپس آتے ہیں۔''

انہوں نے مجھے اپنے گاؤں ہی کی ایک دو مثالیں دیں۔ میں جانتا تھا کہ بے بے جی جو کہہ رہی ہیں وہ درست ہے۔ سر پر دہرے خون کا الزام لے کر دربدر بھٹکتے پھرنا اور چھپنا کوئی سہل کام نہیں تھا۔ پھانسی کا پھندا لگ جائے تو جان چھوٹ جاتی ہے، سر پر جھولتا رہے تو بندہ مرمر کر جیتا ہے۔ سردیوں کی طویل رات بہت جلد گزر گئی۔ صبح بے بے جی نے اپنے ہاتھ سے ناشتا تیار کیا... دیسی گھی کا پراٹھا، انڈوں کا آملیٹ جس میں پیاز اور ٹماٹر تھے۔ گھی سے تربتر حلوہ جس میں چینی کے بجائے گڑ ڈالا گیا تھا اور ثابت بادام جھلک دکھا رہے تھے۔ ساتھ میں دہی کی گاڑھی لسی جسے اردو دھکا کہا جاتا ہے۔ ماں کے ہاتھ کی یہ نعمتیں کسی اور وقت میسر ہوتیں تو ان کا مزہ کچھ اور ہوتا۔ یہ بڑے دگرگوں حالات تھے، پھر بھی ہم دونوں نے دل جمعی سے ناشتا کیا۔ خدیجہ اور اس کا زمیندار شوہر بھی ہماری تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ یہ زندہ دل اور جی دار لوگ تھے۔ خدیجہ کے خدوخال میں کہیں کہیں بلقیس کی جھلک ملتی تھی اور میں نہ چاہنے کے باوجود اسے یاد کرنے پر مجبور ہورہا تھا۔ میں ذہن کو اس سے دور رکھنے کی بہت کوشش کرتا تھا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی حوالے سے یاد آتی ہی رہتی تھی۔ اسے مکمل طور پر بھول جانا شاید میرے بس میں ہی نہیں تھا۔

دس گیارہ بجے کے قریب گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ خدیجہ کا شوہر تو کھیتوں میں جا چکا تھا، خدیجہ نے دروازہ کھولا۔ اندر آنے والا چودھری عزیز کا خاص ملازم انورا تھا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ انورے کی آمد غیر متوقع تھی۔

انورا ابھی مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ گرم جوشی سے ملا۔ جب سے چودھری عزیز کا رویہ بدلا تھا، انورا بھی میری عزت کرنے لگا تھا۔ یہ انورا چودھری عزیز کا وہی گن مین تھا جو فاضل کے گھر ڈکیت بارے سے ملنے آیا تھا اور جس کی آمد کے سبب ہم نے چودھری عزیز کو بھی پکڑ لیا تھا۔ اس واقعے کو اب قریباً دو برس گزر چکے تھے۔

انورے کے پاس سامان کی ایک گٹھڑی تھی۔ اس گٹھڑی میں نئے کپڑے، جوتے اور استعمال کی کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ یہ سامان چودھری عزیز نے میری والدہ اور بہن کے لیے بھیجا تھا۔ اس سے پہلے بھی انورا یہاں کے ایک دو چکر لگا چکا تھا۔ اس صورتِ حال سے اندازہ ہورہا تھا کہ بلقیس اور چودھری عزیز، بے بے جی اور عارفہ کا ہر طرح خیال رکھ رہے ہیں۔ گٹھڑی میں کچھ چیزیں بلقیس کی طرف سے بھی تھیں۔ ان میں اشیائے خورونوش بھی تھیں۔ باداموں والا گڑ اور چاول کی پنیاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا ٹرانسسٹر ریڈیو عارفہ کے لیے اور خوب صورت فراک وغیرہ اس کے بچے کے لیے تھی۔

انورے کی بیوی اس سے آٹھ دس سال چھوٹی تھی۔ اس کا نام عابدہ پروین تھا مگر یہ اپنے نام کے بالکل الٹ تھی۔ نہ عابدہ تھی اور نہ ہی نیک پروین تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کا بھی

والی جی اور چودھری نشاط سے تعلق واسطہ رہا تھا۔ بہرحال، اب وہ انورے کی بیوی تھی اور دو بچوں کی ماں ہو کر تھوڑی سی سنجیدہ بھی ہوگئی تھی۔ اور اگر دیکھا جاتا تو انورا بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ رونق علی نے مجھے بتایا تھا کہ جب جاگیر میں ناچ گانا اور رنگ بازی عروج پر تھی تو انورا، چودھریوں کے لیے نت نئی لڑکیاں ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ ان میں سے کئی لڑکیوں کو آگے بھیجنے سے پہلے وہ خود آزماتا تھا۔ ان کی نوک پلک ٹھیک کرتا تھا اور انہیں پیش ہونے کے آداب سکھاتا تھا۔

انورے کی طرح اس کی بیوی پروین نے بھی میری خیر خیریت پوچھی۔ اس کی آنکھ کے نیچے سیاہ نشان سا نظر آرہا تھا۔ ”یہ تجھے کیا ہوا ہے پینو؟“ میں نے پوچھا۔

وہ انورے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”بس یہ اسی مارکٹائی کی نشانی ہے جی جو موکھلوں اور لمبڑوں نے راجوال میں کی ہے۔ ایک شرابی موکھل نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ ایک اور نے اس کی بہن کے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ انہوں نے بڑی زیادتی کی ہے جی۔ پورا گاؤں سوگ میں ڈوبا ہوا ہے۔“

پروین نے بڑی اپنائیت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چودھری جی! آپ کے آنے کے بعد تو ہم لاوارث سے ہوگئے ہیں۔ دل کرتا ہے کہ گاؤں ہی چھوڑ جائیں۔“

”یہ سب کچھ وقتی ہے۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

اس نے اپنی سرمہ لگی آنکھوں کو جھپکایا اور اپنے چمکیلے دوپٹے کو سر پر درست کیا۔ وہ بھرپور جسم کی مالک تھی اور ان عورتوں میں سے تھی جو لباس جسم چھپانے کے لیے نہیں نمایاں کرنے کے لیے پہنتی ہیں۔

انورا مجھے گاؤں کے حالات سے آگاہ کرنے لگا اور ان خطرات کے بارے میں بتانے لگا جو پولیس اور آصف جاہ کے ہرکاروں کی صورت میرے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ آصف جاہ کے چار قیمتی کتوں کی موت علاقے میں اسی طرح مشہور ہوئی ہے جس طرح قریباً دو سال پہلے بنگالی شیر کی موت مشہور ہوئی تھی۔

ہماری گفتگو کے دوران میں عارفہ کا بچہ کھیلتا ہوا، پینو کی گود میں چلا آیا تھا۔ وہ اسے بار بار چوم رہی تھی۔ نظر شناس عورت، بچے کو پیار بھی اس انداز سے کرتی ہے کہ اس میں مرد کی دلچسپی کا سامان موجود ہوتا ہے۔

مجھے یہ انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا... میں اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بے بے جی، اپنے نواسے کو پینو کی گود سے لینے کے لیے جھکیں۔ انہوں نے بچے کو اٹھایا تو پینو کا رنگین دوپٹا بچے کی مٹھی میں تھا۔ بچہ گود سے نکلا تو دوپٹا بھی کھنچ گیا اور تب میری نظر پینو کے سر کے کلپ پر پڑی۔ چاندی کے اس کلپ میں ایک چھوٹا سا ہشت پہلو نیلم لگا ہوا تھا۔ میں چونک سا گیا۔ مجھے شک پڑا کہ یہ نیلم میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ اصلی تھا یا نقلی لیکن میں نے دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

میں انورے اور تیمور کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ بیٹھا اور ان سے باتیں کرتا رہا مگر نہ جانے کیوں میرا دھیان اس چھوٹے سے نیلے پتھر کی طرف ہی رہا۔ انورے نے مجھے اور تیمور کو بڑی رازداری سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”کل رات، ٹرک والے غلام خان سے چودھری صاحب کی ساری بات ہوگئی ہے۔ وہ کل رات اپنا ٹرک لے کر مقررہ جگہ پر پہنچ جائے گا۔ اس نے ہر طرح تسلی دی ہے۔“

”اور ٹریکٹر؟“ تیمور نے پوچھا۔

”وہ تو ہمارے ہاتھ کا کام ہے۔ اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ انورے نے کہا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک میرے ذہن میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ اس چھوٹی سی پھلجڑی میں اتنی روشنی تھی کہ میرا دماغ روشنی سے بھر گیا۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ یہ چھوٹا سا ہشت پہلو نیلا پتھر میں نے کہاں دیکھا تھا... یہ شہوار کے اس ہلکے پھلکے ہار میں تھا جو وہ کبھی کبھی رات کے وقت پہنتی تھی۔ کیا یہ واقعی وہی نیلم تھا؟

اگر یہ وہی تھا تو پھر انورے کی بیوی کے کلپ میں کیسے آیا؟

اور اگر یہ وہی تھا تو پھر...؟

ایک دم بہت سے چنگھاڑتے ہوئے سوالوں نے میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ مجھے اپنے جسم میں ایک نہایت تیز سنسناہٹ رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا... میری آنکھوں کے سامنے اس خاص بناوٹ کے نیلم کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ نیلم شہوار کے ہار کا ہی ہے۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”آتا ہوں دو منٹ میں۔“ میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آگیا۔ میرے اندر ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ میں نے اس سے پہلے شہوار کے قتل کے حوالے سے بہت سے لوگوں کے بارے میں سوچا تھا، کئی ایک پر شک بھی تھا مگر عجیب بات ہے کہ ابھی تک میرا ذہن انورے یا چودھری عزیز



وغیرہ کی طرف نہیں گیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں کافی عرصے سے چودھری میں مثبت تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا اور کچھ موقع ایسے بھی آئے تھے جب اس نے موقع مہیا ہونے کے باوجود میرے ساتھ دشمنی نہیں کی تھی۔ لیکن آج سردیوں کے اس بیمار بیمار سی دھوپ والے اداس دن میں ایک چھوٹے سے اشارے نے میرے دل و دماغ کی ساری کیفیتیں بدل ڈالی تھیں۔ انورا اور اس کا آقا چودھری عزیز ایک دم ہی ایک نئے رنگ میں میرے سامنے آرہے تھے۔ میں نے رات کو چلے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر اب سب کچھ بدل گیا۔ انورے اور اس کی بیوی نے اگلے روز واپس جانا تھا اس لیے میں نے بھی ارادہ بدل دیا۔ بے بے جی اور عارفہ کو میرے ساتھ کچھ مزید وقت گزارنے کو مل رہا تھا۔ وہ خوش ہوئیں۔ سارا دن ہماری خاطر مدارت ہوئی۔ ہمارے کپڑے دھوئے گئے۔ بے بے جی نے اپنے ہاتھوں سے میرے سر میں تیل لگایا اور پردیس میں رہنے کے طور طریقے بتائے۔ میں اب بھی ان کے لیے بچہ ہی تھا۔

رات گئے تک باتیں کرنے اور دودھ پتی پینے کے بعد سب سو گئے۔ انورے اور تیمور نے دودھ پتی کے بجائے لال پری سے شغل کیا تھا اس لیے وہ پہلے ہی سو گئے۔ میرے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ میں نے اشارے سے پینو کو چھت پر بلایا۔ پہلے تو وہ پریشان ہوئی مگر جب اس نے میرے چہرے پر کسی غلط تاثر کے بجائے گہری سنجیدگی دیکھی تو کچی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں چلی آئی۔ یہاں پرالی کے بہت سے گٹھے اور کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ میں برآمدے میں جلتی ہوئی لالٹین اوپر لے آیا تھا تاہم اس کی لو بہت نیچی رکھی تھی۔ کمرے کی نیم تاریکی میں پہنچ کر پینو نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔

”جی سالار جی... مم... میرا مطلب ہے چودھری جی... کیا بات ہے؟“ اس کے سرخی لگے ہونٹ کانپے۔

میں نے اس کا چمکیلا دوپٹا پیچھے کیا۔ اس کا نقرئی کلپ لالٹین کی روشنی میں چمکنے لگا۔ میں نے کلپ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ نیلا نگ سچا ہے یا جھوٹا؟“

وہ ایک دم ٹھرا گئی۔ میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ ”کون سا نگ جی؟“ وہ گڑبڑائی۔

”یہ نیلے والا۔ یہ کہاں سے لیا ہے تو نے؟“ میرا لہجہ سپاٹ تھا۔

”وہ جی... سنیارے نے ہی لگا کر دیا تھا کلپ میں... لیکن... آپ... کیوں...؟“

میرے دل نے گواہی دے دی کہ پروین عرف پینو کی گھبراہٹ اور تھرتھراہٹ بے معنی نہیں ہے۔ ایک دم ہی میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرے سامنے مرد ہے یا عورت۔ میں نے اڑنگا لگا کر پینو کو پرالی کے ڈھیر پر گرا دیا۔ میرا ایک گھٹنا اس کے پیٹ پر اور دوسرا اس کی گردن پر اس طرح آیا کہ اس کا منہ پورا کھل گیا مگر آواز نہیں نکل سکی۔ میں نے اپنے گلے کا مفلر اندر تک اس کے گلے میں گھسیڑ دیا... اور اوپر اپنی ہتھیلی رکھ دی... اب اگر وہ بھرپور کوشش بھی کرتی تو آواز نہیں نکال سکتی تھی۔

میں نے اپنی قمیص کے نیچے سے گراری دار چاقو نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ”مجھے سچ سچ بتا دے۔ یہ نگ میری بیوی کے ہار کا ہے نا؟“ میں پھنکارا۔

وہ مسلسل مزاحمت کرتی رہی اور گلے سے غوں غاں کی آوازیں نکالتی رہی۔ میں نے اس کی گردن پر چاقو کا دباؤ بڑھایا اور پھر زہریلی سرگوشی کی۔ ”سر کو ہاں میں ہلا کر جواب دے... یہ نگ شہوار بیگم کے ہار کا ہے نا؟“

اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ ڈھیٹ پنے کا مظاہرہ کر رہی تھی... میرے جسم کا سارا خون جیسے میرے دماغ کو چڑھنے لگا۔ قریب ہی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس میں لالٹینوں میں ڈالنے کے لیے مٹی کا تیل تھا۔ میں نے بوتل پکڑی اور سارا تیل پینو کے جسم پر انڈیل دیا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر جلا لیا۔ لائٹر کا شعلہ اس کی آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تجھے جلا کر کوئلہ کر دوں گا۔ یہ آخری موقع ہے... بالکل آخری موقع... اپنا سر ہلا کر بتا دے کہ یہ شہوار کے ہار کا نگ ہے؟“

ان لمحوں میں، میں واقعی ہر حد تک جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ میری آواز میں کچھ ایسی درندگی تھی کہ پینو کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا۔ اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی اور اس کی سرمہ لگی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔ پورے کمرے میں مٹی کے تیل کی بو پھیل گئی تھی۔ تاہم مجھے امید تھی کہ یہ بو نیچے نہیں پہنچے گی۔ میں نے کہا۔ ”دیکھ، میں تیرے منہ سے کپڑا نکال رہا ہوں لیکن اگر تو نے ہلکی سی آواز بھی نکالی نا تو اسی جگہ جان سے مار ڈالوں گا تجھے... اور خون کے الزام تو مجھ پر پہلے ہی لگ چکے ہیں، اب ایک اور بھی لگ جائے گا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہے نا؟“ جلتا ہوا لائٹر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے لائٹر بجھایا اور جیب میں ڈال لیا۔ تیز دھار چاقو بہ دستور میرے دوسرے ہاتھ میں موجود تھا۔ اس کا آٹھ انچ لمبا پھل لالٹین کی زرد روشنی میں دمک رہا تھا۔ میں نے مظفر پپو کے منہ سے نکال لیا... اور اسے حکم دیا کہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔

''ہاں، اب بتا۔ شہوار کے ہار کا یہ نگ تیرے پاس کیسے پہنچا؟'' میں نے کلپ اس کے بالوں سے کھینچتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں پتا، یہ کس کا ہار تھا۔ انورے نے اسے نمک دانی میں نمک کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھ لیا۔ اس کا یہ ایک نگ پہلے ہی اترا ہوا تھا۔ میں نے لے لیا۔''

وہ اپنے بیان سے مکر رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے سر ہلا کر اقرار کیا تھا کہ یہ شہوار کے ہار کا نیلم ہے۔ اب کہہ رہی تھی کہ اسے پتا نہیں۔

میں نے چاقو پھر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ''مجھے صرف ایک بات بتا۔ یہ نیلم، شہوار کے ہار کا ہے یا نہیں؟''

''میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے نہیں پتا وہ کس کا ہار تھا۔ انورے نے اسے نمک دانی...''

''یہ بکواس تو پہلے کر چکی ہے... مجھے بتا اب وہ ہار کہاں ہے؟'' میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔

کلپ اترنے کی وجہ سے وہ بکھر چکے تھے۔

''مجھے نہیں پتا... میں سچ کہتی ہوں۔ ایک دن میں نے دیکھا تو ہار وہاں لون دانی (نمک دانی) میں نہیں تھا۔'' وہ رو رہی تھی اور اس کا سرمہ اس کے رخساروں کو سیاہ کر رہا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ انورے نے ہار کہیں بیچ دیا ہے... اور تم یہ بھی بتانا چاہ رہی ہو کہ انورے کو اس بات کا پتا نہیں کہ تم نے ہار میں سے ایک نگ لیا تھا؟''

اس نے ان دونوں سوالوں کے جواب تقریباً اثبات میں دیے۔ وہ کافی موٹی کھال کی عورت تھی اور یہ بات صاف صاف ماننے کو تیار نہیں تھی کہ کلپ کا نیلا نگ جس ہار سے اترا ہے وہ شہوار کا ہار تھا۔ بہرحال، اس کا یہ اقرار بھی کافی تھا کہ یہ نگ سونے کے ہار سے اترا گیا ہے اور یہ ہار انورے نے گھر کی ایک فالتو نمک دانی میں نمک کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی آہٹ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، دروازہ کھلا اور خدیجہ کے شوہر اختر کا سراپا نظر آیا۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور ہم دونوں اس کے روشن دائرے میں آ گئے۔ یقینی بات تھی کہ چند ساعتوں کے لیے تو اختر بھونچکا رہ گیا ہوگا۔ اس کو بہ ظاہر یہی لگا ہوگا کہ میں یہاں انورے کی شوخ شنگ بیوی کے ساتھ شاید کسی طرح کی زبردستی کر رہا ہوں۔ تاہم میرے سنجیدہ اور گمبھیر تاثرات دیکھ کر وہ کسی حد تک سنبھل گیا...

''کیا بات ہے خاور بھائی؟'' وہ ہکلایا۔

''میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے میری تھوڑی سی مدد کرو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اچھا ہوا کہ تم یہاں آ گئے ہو۔''

اختر دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ دو تین منٹ کے اندر ہم نے پپو کے ہاتھ اس کے دوپٹے سے اور پاؤں میرے مفلر سے باندھ دیے۔ اس کے منہ میں ایک پرانا کپڑا اس طرح ٹھونس دیا گیا کہ وہ واویلا نہ کر سکے۔ ویسے اس کی امید اب کم ہی تھی کہ وہ ایسا کرے گی۔

میں نے اختر کے ساتھ مل کر اسے پرالی کے گٹھوں پر لٹا دیا اور سردی سے بچانے کے لیے اس پر ایک پھٹا پرانا کمبل ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر وہ کچھ دیر کے لیے یہاں چپ چاپ پڑی رہے گی تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس کے بعد ہم نیچے آئے اور تیمور کو جگا کر اسے سب کچھ بتایا۔ یہ ساری روداد اس کے لیے بھی سخت تعجب کا باعث بنی۔ وہ بڑبڑایا۔ ''کبھی کبھی میرا ذہن انورے اور چودھری عزیز کی طرف جاتا تھا مگر پھر میں خود ہی اپنے خیال کو غلط کر دیتا تھا۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' اختر نے مجھ سے پوچھا۔

''اس حرامی کو الٹا لٹکانا ہے اور اس وقت تک لٹکانا ہے جب تک اس کے اندر سے سب کچھ باہر نہ آ جائے۔'' میرا اشارہ انورے کی طرف تھا۔

انورے کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ شراب پی کر سویا تھا، لہٰذا نیند کی حالت میں بھی اس کے سخت کیر چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور ہر بدبودار سانس کے ساتھ مونچھیں تھوڑا سا پھڑ پھڑا جاتی تھیں۔ وہ عیاشیوں کے حوالے سے راجوال کے چودھریوں کا درمیانی آدمی یعنی مڈل مین تھا۔ چودھریوں کے لیے عورتوں کا انتخاب کرتے ہوئے وہ نہ جانے کتنی عورتوں کو اپنے چوڑے چکلے جسم کے نیچے روند چکا تھا۔

ہم نے انورے کے پاؤں حالتِ نیند میں ہی ایک رسی سے باندھ دیے۔ وہ بس تھوڑا سا کسمسایا اور دوبارہ خراٹے لینے لگا۔ جب ہم رسی کی مدد سے اسے چارپائی کے ساتھ باندھ رہے تھے تو وہ جاگ گیا اور ہمیں گھورنے لگا۔ پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تب تک رسی کے تین چار بل اس کی چارپائی کے ساتھ جکڑ چکے تھے۔ ''یہ... یہ کیا ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''ابھی تجھے تیرے سادے سوالوں کے جواب دے دیتے ہیں۔'' تیمور نے مضبوط رسی کو چارپائی کے گرد ایک اور چکر دیتے ہوئے کہا۔

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ پھر یوں لگا کہ وہ چلّانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے تیز دھار چاقو اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ ''آواز نکالے گا تو آواز کے ساتھ ہی تیرے گندے خون کا فوارہ بھی نکلے گا۔'' میرا لہجہ دوٹوک تھا۔

انورے کا ہیئر کلپ ضرور پہچان لیا تھا۔ انورے کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی تک اسے بھی اس بات کا پتا نہیں ہے کہ کلپ میں یہ نیلا نگینہ کہاں سے آیا ہے اور کس نے لگایا ہے۔ مگر انورے کی اس لاعلمی سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرے لیے یہ بات تقریباً صاف ہو چکی تھی کہ شہوار کا ہار انورے کے پاس موجود رہا ہے اور یہ ہار اس نے اپنے گھر کی ایک نمک دانی میں چھپایا ہوا تھا۔ دیہات میں نمک دانی یا لون دانی لکڑی کے اس مستطیل ڈبے کو کہا جاتا ہے جس میں نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ کے لیے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوتے ہیں۔

میری دو تین زوردار ٹھوکروں کی وجہ سے انورے کے منہ سے خون رسنے لگا تھا اور وہ کراہ رہا تھا... میں نے کہا۔ ''دیکھ انورے! تو پہلے کی طرح سلطانی گواہ بن جا۔ اس رات میرے گھر میں میری بیوی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بتا دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں، تجھے پولیس کے روبرو بھی سلطانی گواہ بنا دوں گا۔''

انورے نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ ''میں سچ کہتا ہوں، چودھری خاور! اس بار تمہیں بڑی سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم مجھ سے ایسے سوال پوچھ رہے ہو جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

''کیا تو اس بات سے انکار کرتا ہے کہ تو نے نیلے نگ والا ہار گھر کی نمک دانی میں چھپا رکھا تھا؟''

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''نہیں... یہ بات صحیح ہے۔ مجھے یہ ہار ایک صبح اپنے گھر کی چھت پر پڑا ہوا ملا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ رولڈ گولڈ ہے۔ کسی میلے وغیرہ سے خریدا گیا ہوگا۔ پھر بھی مجھے شک تھا۔ میں نے اسے گھر میں چھپا دیا۔''

''اب وہ ہار کہاں ہے؟''

''میں اسے گوجرانوالہ لے گیا تھا۔ وہاں ایک سنیارے کو دکھایا۔ وہ سونے کا نکلا۔ میں نے... بیچ دیا... دراصل مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔''

''تجھے پتا نہیں چلا کہ ہار میں سے ایک نگ غائب ہے؟''

''میں قسم کھاتا ہوں۔ میں جو کچھ بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔ مجھے بالکل پتا نہیں کہ میری بیوی نے نمک دانی میں یہ ہار دیکھا تھا اور اس نے ہار میں سے کوئی نگ وغیرہ نکالا ہے۔ میں نے سنیارے کو ہار بیچتے ہوئے اس میں نگ کی خالی جگہ ضرور دیکھی تھی۔''

بھی ہار سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہرحال، اس نے اپنی

''تیرے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ تو اس ہار کے مالک کا پتا کرے؟''

''مم... میں نے سوچا تو تھا مگر پھر میری ضرورت نے مجھے مجبور کر دیا۔''

''تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ ہار تیرے گھر کی چھت پر کیوں پھینکا گیا اور کس نے پھینکا۔ ان دنوں... ہی میری بیوی کا قتل ہوا تھا۔ کیا تیرا دھیان اس واردات کی طرف نہیں گیا؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بتایا ہے نا کہ میں کافی دنوں تک اسے رولڈ گولڈ ہی سمجھتا رہا۔ مجھے نہیں پتا تھا یہ اصلی ہے۔''

''تجھے سب پتا تھا انورے... اور تو اب بھی سب کچھ جانتا ہے لیکن بتانا نہیں چاہتا۔'' تیمور نے اس کے سر پر پشاوری چپل کی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ میری جان بھی لے لوگے تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ باقاعدہ روتے ہوئے بولا۔

ایک عجیب سی مایوسی میرے رگ و پے میں اترنے لگی۔ کچھ دیر پہلے امید کی جو کرن روشن ہوئی تھی، وہ ناامیدی کی تاریکی میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بہرحال، ہم انورے سے پوچھ تاچھ میں لگے رہے۔ اس دوران میں ہم نے ایک دو بار اسے سیدھا کر کے پانی بھی پلایا۔

رات پچھلے پہر یوں لگا کہ انورے کی ہمت جواب دینا شروع ہوگئی ہے پھر اس کے منہ سے ایک دو سوالوں کے الٹے سیدھے جواب بھی نکلے...

درست کہتے ہیں کہ انسان بڑی پیچیدہ شے ہے۔ اس کے اندر کا حال جاننا بہت بہت مشکل ہوتا ہے... وہ انورا جو کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہیں تھا... صبح تقریباً چار بجے کے قریب سب کچھ مان گیا... ڈھائی تین بجے کے قریب تیمور کے ہاتھوں زبردست پھینٹی کھانے کے بعد اس نے جزوی طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ جانتا تھا کہ نیلے نگوں والا ہار سونے کا ہے اور اس کا تعلق متوفیہ شہوار سے ہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ یہ بھی مان گیا کہ شہوار کے قتل میں چودھری عزیز کا ہاتھ ہے... اور چار بجے کے لگ بھگ وہ سب کچھ تسلیم کر گیا۔ تب تک اس کی حالت بہت پتلی ہو چکی تھی۔ مسلسل الٹا لٹکے رہنے سے اس کا چہرہ نیلگوں ہو گیا تھا۔ ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہو چکی تھی، ناک اور منہ سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ تیمور نے پلاس کی مدد سے اس کے پاؤں کی دو انگلیاں قریب قریب چٹل کر کر دی تھیں۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ بڑے زوروں سے میں گیا ہوں... ہم نے بھی بڑے زوروں سے خود کو انورے سے منوایا تھا۔ ایک اسپیچ ایسی آئی کہ وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح فر فر بولنے لگا۔ اب ہم نے اس کے منہ میں سے خون آلود کپڑا نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا... اور اس کی زبان روانی سے چل رہی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک الٹی چارپائی کے ساتھ الٹا بندھا ہوا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے اور پوچھا۔ ''جب تم گھر میں گھسے تو کیا وقت تھا؟''

وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بولا۔ ''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔''

''اور کون تھا تمہارے ساتھ؟''

''بس فیاض میواتی ہی تھا۔ وہ باہر کھڑا رہا تھا۔''

''جب تم نے شہوار کو دبوچا تو اس نے شور مچایا؟''

''نہیں جی... بی بی اس وقت نیند میں تھی... اور...'' وہ ایک بار پھر بلند آواز میں رونے لگا اور روتے روتے بولا۔ ''میں بے قصور ہوں جی۔ میری بی بی جی سے کوئی دشمنی نہیں تھی، کوئی بیر نہیں تھا۔ وہ تو میرے چھوٹے بچے سے بڑا پیار کرتی تھی... مم... میں نے تو بس چودھری عزیز کا حکم مانا۔ میں نہ مانتا تو وہ... مجھے برباد کر دیتا... آپ سب جانتے ہو، نوکروں کے لیے حکم نہ ماننا کتنا مشکل ہوتا ہے...''

تیمور نے اس کے سر پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلایا۔ تیمور پھنکارا۔ ''تیری صفائیاں ہم بعد میں سنیں گے۔ پہلے ہمیں پوری تفصیل بتا۔ تو نے شہوار بی بی کو کیسے مارا اور پھر ثمینہ کی جان کیسے لی۔''

وہ ایک بار پھر زور و شور سے نفی میں سر ہلانے اور واویلا کرنے لگا۔ ''میں نے اس کو نہیں مارا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے تو کئی ماہ سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی... اسے کس نے مارا، مجھے کچھ پتا نہیں۔'' اس کا اشارہ ثمینہ کی طرف تھا۔

وہ بڑی کلاس کا خنڈا تھا۔ مگر مچھ کی طرح ڈھیٹ اور لومڑی کی طرح شاطر... دو گھنٹے پہلے تک وہ شہوار کے قتل سے بھی اسی طرح انکار کر رہا تھا مگر ناقابلِ برداشت اذیت کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد اس نے یہ قتل مان لیا تھا۔ تیمور نے ایک بار پھر پلاس کا منہ کھولا اور انورے کے جسم کے نازک حصوں کا امتحان لینا چاہا مگر میں نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ میں نے انورے کے منہ پر چھینٹے دیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چل، شہوار کے بارے میں بتا... جو کچھ بتانا ہے۔''



اس کے بعد انورے نے اذیت سے کراہتے ہوئے اور رک رک کر ٹوٹے پھوٹے فقروں میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

شہوار کے کمرے میں گھس کر اس کو بے دردی سے قتل کرنے والا انورا ہی تھا۔ اس قتل کے بارے میں چودھری عزیز کی منصوبہ بندی تو شاید پہلے سے جاری ہو مگر اس کا فوری پروگرام میرے اور شہوار کے جھگڑے کے فوراً بعد بنا۔ چودھری عزیز بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تھا۔ اس کے اندر کئی برس سے انتقام کا عفریت پرورش پا رہا تھا... یہ عفریت کسی مناسب ترین موقع کی تلاش میں تھا۔ اس رات یہ مناسب ترین موقع اسے مل گیا۔ شہوار کے ساتھ جھگڑے کے دوران میں، میں جذباتی ہوا تھا اور طیش کے عالم میں، میرے منہ سے اسے مار دینے کی دھمکی نکل گئی تھی۔ چودھری نے اس صورتِ حال سے فوری فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک ہی گھنٹے کے اندر اپنے خاص خدمت گار انورے کو موت کے فرشتے کا روپ دے دیا۔

انورے نے نہایت بے دردی سے شہوار کے نازک جسم پر چاقو کے بے در پے وار کیے تھے۔ اس نے شہوار کا سر اپنی بغل میں لے کر اس کا منہ اتنے زور سے دبائے رکھا تھا کہ وہ بدقسمت آواز تک نہیں نکال سکی تھی۔ بعد میں جب انورے کو یقین ہو گیا کہ اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تو وہ اسے گھسیٹ کر قریبی کمرے میں لے گیا اور لاش چارپائیوں کے پیچھے ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے کمرے میں واپس آ کر اپنی انگلیوں کے نشان وغیرہ صاف کیے۔ اسی کارروائی کے دوران میں اس کی نگاہ طلائی ہار پر پڑی اور اس نے وہ موقع سے اٹھا لیا... دکھ کی بات یہی تھی کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، میں صرف چند قدم کے فاصلے پر دوسرے کمرے میں سو رہا تھا...

انورے کے تفصیلی بیان سے سارے زخم تازہ ہو گئے۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی... میں بڑی حسرت سے سوچنے لگا، اگر خود پر حملے کے وقت شہوار تھوڑی بہت آواز نکال پاتی تو شاید میں جاگ جاتا اور اس کی مدد کو پہنچ جاتا۔ بہرحال، اس قسم کے بڑے المیے کے بعد اس طرح کے خیال تو ذہن میں آتے ہی ہیں۔

شہوار کے قتل کے بعد جو کچھ ہوا، وہ چودھری عزیز اور انورے وغیرہ کی منشا کے عین مطابق تھا۔ الزام میرے اوپر آیا۔ پھر ایک اور گڑبڑ ہوئی۔ میں نے بہ وجوہ میاں وارث کو گرفتاری نہیں دی اور تیمور سمیت پولیس کی حراست سے نکل گیا۔

ثمینہ کے بیان نے میرے خلاف کیس مزید مضبوط کر دیا۔ وہ بے چاری وہی کچھ بتا رہی تھی جو اس نے دیکھا تھا مگر اس کے دیکھنے اور اصل واقعے میں بہت فرق تھا۔ اب شہوار کے قتل کو تو انورا مان گیا تھا مگر ثمینہ کی موت ابھی تک معما تھی۔ ہم نے اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں کافی کوشش کی مگر انورا اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ قتل بھی چودھری عزیز نے ہی کرایا ہو مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، نہ ہی چودھری نے مجھے کچھ بتایا ہے۔''

ثمینہ کے قتل کے علاوہ ابھی ایک دو مزید سوال بھی حل طلب تھے۔ چودھری عزیز نے ایک خطرناک ترین گیم کھیلا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ایک دو موقع ایسے آئے تھے جب وہ مجھے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا سکتا تھا... یا مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ کرا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ دوسرے وہ بے بے جی اور عارفہ کو پناہ بھی فراہم کر رہا تھا۔ اگر اس کا ارادہ ہوتا تو چند گھنٹے کے اندر پولیس یہاں کیکراں والی پہنچ سکتی تھی۔ والدہ اور عارفہ کو گھسیٹ کر تھانے لے جایا جا سکتا تھا۔ چودھری ان کو تحفظ کیوں فراہم کر رہا تھا؟

کیا یہ بھی اس کی سیاست بازی کا حصہ تھا؟

وہ میری بربادیوں کے حوالے سے اپنے ہاتھ صاف رکھنا چاہتا تھا؟

بلقیس اور دیگر لوگوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے آخر تک میرا اور میرے گھر والوں کا ساتھ دیا ہے؟

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انورے کو ہم جتنا نچوڑ سکتے تھے، نچوڑ چکے تھے۔ اس سے زیادہ اس کے اندر سے کچھ نکلنے والا نہیں تھا اور اس کی جان ہم نکالنا نہیں چاہتے تھے، یہ عدالت اور قانون کا کام تھا۔

ہم نے اگلے ایک گھنٹے میں تیزی سے چند فیصلے کیے اور میں واپس اپنی پناہ گاہ یعنی سائیں ملنگے کے پاس قبرستان جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ تیمور کو یہیں اختر کے گھر میں رہنا تھا اور انورے کو بیوی سمیت اپنی نگرانی میں رکھنا تھا۔ لیکن آخری وقت فیصلہ بدل گیا اور انورے کی نگرانی اختر اور اس کے ایک نوکر کے سپرد ہو گئی۔ رات کے آخری حصے میں ہم نے پھر گھوڑوں پر ایک طویل سفر کیا اور واپس اپنی پناہ گاہ پہنچ گئے۔ قبرستان کے اندر جنتر کے بے شمار درختوں میں سائیں ملنگے کی کٹیا پوری طرح چھپی رہتی تھی۔ وہ صبح منہ اندھیرے

باداموں والی بھنگ گھوٹنے میں مصروف تھا۔ ڈنڈے سے بندھے ہوئے گھنگرو چھن چھنا چھن کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ یہاں بیٹری سے چلنے والا ایک ریکارڈ ٹیپ بھی موجود تھا۔ سائیں کا ایک چیلا استیاق رانجھا اس ٹیپ پر پہلے شاہ کی کافیوں کی کیسٹ چلاتا رہتا تھا یا پھر لوک گیت ہوتے تھے۔

اس وقت بھی ٹیپ چل رہا تھا اور آواز گونج رہی تھی۔

سدا نہ باغیں بلبل بولے، سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے، حسن جوانی، سدا نہ صحبت یاراں

میری آمد کے ساتھ ہی میر احسن شاہ نواز بھی جاگ گیا۔ ہم دونوں علیحدہ کمرے میں جا بیٹھے۔ میں نے شاہ نواز کو ساری بات بتائی اور اس کی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ شاہ نواز کے خیالات چودھری عزیز کے بارے میں کبھی بھی اچھے نہیں رہے تھے مگر..... عزیز اور شاہ نواز کے بڑے بھائی نشاط میں اچھے تعلقات تھے اس لیے شاہ نواز اس حوالے سے خاموش رہنا ہی پسند کرتا تھا۔

پوری روداد سن کر شاہ نواز کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔ میری طرح اس کے ذہن میں بھی وہی سوال پیدا ہوئے۔ وہ کہنے لگا۔ ''اگر عزیز اس حد تک چلا گیا ہے تو پھر اس نے تمہیں پکڑوانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ دوسری بات یہ کہ وہ تمہاری والدہ اور بہن کی بھی پوری حفاظت کر رہا ہے۔''

''یہ ساری باتیں وہ خود ہی بتائے گا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تمہیں مارنے کے بجائے یہاں سے بھگانے میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ شاید اس میں عزیز کو اپنے کچھ فائدے نظر آتے ہوں۔''

میں نے اور شاہ نواز نے اسی وقت مشورہ کیا۔ اس مشورے کے بعد شاہ نواز نے ایک بندے کو فوری طور پر پیغام دے کر راجوال، چودھری عزیز کی طرف بھیجا۔ اس بندے کے پاس میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مختصر خط بھی تھا۔ اس خط میں، میں نے چودھری عزیز کو بتایا تھا کہ میں اس کے پروگرام کے مطابق غلام خان کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ مگر اس سے پہلے میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں، کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر آج کسی طرح وہ تھوڑی دیر کے لیے آجائے تو اس کی بہت مہربانی ہوگی۔

توقع کے عین مطابق ہماری اس کوشش کا نتیجہ مثبت نکلا۔ چودھری عزیز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کل رات ٹیکراں والی گاؤں میں میری ملاقات اس کے ہرکارے انور سے ہو چکی ہے اور انور نے رات بھر الٹا لٹکنے کے بعد بہت کچھ اگل دیا ہے۔

چودھری عزیز شام کے فوراً بعد ہی ہمارے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہ ایک دوست کی کار میں آیا تھا۔ رونق علی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ کار ڈرائیور کے طور پر فیاض میواتی آیا تھا۔ رونق علی کو ہلکا بخار تھا۔ تہ در تہ گرم کپڑوں کی وجہ سے وہ اور بھی موٹا نظر آ رہا تھا۔ وہ جھجکی بلکہ جن چھپا ڈال کر مجھ سے ملا اور بہت دیر تک گلے لگا رہا۔

''یار خاور ے! یہ سب کیا ہو گیا ہے... تم کیا گئے ہو؟ ساری رونقیں شوقینیں ہی اپنے ساتھ لے گئے ہو۔ اب کون مجھے پرہیزیں شرہیزیں بتائے گا اور میری صحت کا خیال شیال رکھے گا؟''

''پرہیزیں بتانے سے بھی تمہارا کون سا بھلا ہو جاتا تھا رونق بھائی... بس تمہارا معدہ ہی کرکرا ہوتا تھا۔''

''چلو، کچھ ہوتا ہی تھا نا۔ اب سنا ہے کہ تم کہیں جا رہے ہو؟''

''میں کہاں جا رہا ہوں، یہ تمہارے سامنے کھڑے ہیں بھیجنے والے۔'' میں نے چودھری عزیز کی طرف اشارہ کیا۔

چودھری بڑے تدبر سے بولا۔ ''میں بھی کہاں بھیج رہا ہوں، بس حالات بھیج رہے ہیں لیکن یہ سب کچھ عارضی ہے خاور۔ بہت جلد ہم یہاں سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔''

''مجھے تو نہیں لگتا کہ اب جلد ہی کچھ ہو سکے گا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کیوں نہیں ہو سکے گا یار!'' چودھری نے میرا کندھا تھپکا۔ ''ہم نے یہاں کوئی آرام سے تھوڑا بیٹھنا ہے۔ مجھے ایک ایک دن گن گن کر کاٹنا ہے۔ ہماری کوشش ہونی ہے کہ جلد سے جلد تمہاری بے گناہی ثابت ہو سکے اور کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے۔''

''ثبوت ملنا ہی تو مشکل ہوتا ہے چودھری۔ لوگ بڑی صفائی سے کام کرتے ہیں۔ اپنے پیچھے نشان تک نہیں چھوڑتے۔''

''لیکن یہ بھی تو کہا جاتا ہے نا کہ ہر مجرم کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔'' چودھری نے ایک بار پھر تدبر سے سر ہلایا۔ ''موکھلوں یا لبڑوں نے بھی کہیں نہ کہیں کوئی نشان ضرور چھوڑا ہوگا۔''

''پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم موکھلوں اور لبڑوں پر شک کرتے رہیں مگر یہ ہمارے اندر کے ہی کسی بندے کا کام ہو۔''

میں نیم تاریکی میں چودھری کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ رنگ ضرور بدلا ہوگا۔ اس نے بڑی محبت سے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”خاور! تم ان باتوں کے لیے اپنے دماغ کو پریشان نہ کرو۔ جن لوگوں نے تمہارے خلاف سازش کی ہے انہوں نے دراصل ہمارے خلاف کی ہے، حویلی کے خلاف اور جاگیر کے خلاف کی ہے۔ ہم انہیں کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔ یہ تو بس ایک عارضی انتظام ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ جس طرح تیز آندھی میں درخت ذرا جھک جاتے ہیں، ہم بھی جھکے ہیں۔“

”بالکل ایسا ہی ہے یار!“ رونق علی نے توند اور سر کو ایک ساتھ ہلا کر تائید کی۔

رونق اور چودھری عزیز کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ پچھلے چند دن میں راجوال کے اندر بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ راجوال میں لبڑوں اور موکھلوں کی مار دھاڑ کے بعد لوگ بے حد مایوس تھے۔ خود بلقیس بھی مایوسی کا شکار تھی۔ اس نے بڑوں کے اکٹھ میں کہا ہے کہ وہ جاگیر کا انتظام چلانے میں بڑی مشکل محسوس کر رہی ہے۔ ایک عورت ہونے کی وجہ سے وہ علاقے کے زمینداروں سے زیادہ میل جول بھی نہیں رکھ پاتی۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ ”کارِمختار“ کی کرسی کسی اور کو سونپ دی جائے۔ کم از کم تب تک جب تک حامد اسے سنبھالنے کے قابل نہیں ہوتا۔

”پھر کیا فیصلہ ہوا ہے؟“ میں نے چودھری عزیز سے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں۔ یقین کرو خاور! مجھے اب ”کارِمختاری“ کا کوئی شوق نہیں رہا۔ لوگ جب مجبور کرتے ہیں تو میرا دل ہولنے لگتا ہے۔ مگر جب آلے دوالے دیکھتا ہوں تو کوئی ایسا نظر بھی نہیں آتا جسے ذمے داری دے سکوں۔“ کسی اداکار کی طرح عزیز آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی لے آیا... جیسے والی جی کا غم پھر اس کے دل میں تازہ ہوگیا ہو۔

میرے سینے میں آگ بھڑکنے لگی۔ چودھری وہی کچھ کر رہا تھا جس کی اس سے توقع تھی۔ ابھی میں یہاں سے ”فرار“ نہیں ہوا تھا۔ چودھری نے پہلے ہی جاگیر کی کرسی پر اپنے پنجے گاڑ لیے تھے۔

میں خاموش رہا تو چودھری نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے خاور! اگر بلقیس نے واقعی مختاری چھوڑ دی تو پھر کیا کیا جائے؟“

”ایسے میں تو تمہارے سوا کسی اور کا نام ذہن میں نہیں آتا۔“ میں نے چودھری کے تاثرات دیکھتے ہوئے [illegible] ”بہرحال، اس بارے میں تفصیل سے بات کر لیتے ہیں [illegible]“

”ہاں ایک دو باتیں مجھے... بھی پوچھنی ہیں۔ [illegible] قانونی نکتوں کے بارے میں تم سے بات کرنی تھی [illegible] زمین کا معاملہ بھی تھا۔“

”چلو آؤ... یہاں کافی سردی ہے۔ اندر ذرا تسلی [illegible] بیٹھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

[illegible] ہیں، چودھری عزیز، تیمور، رونق، شاہ نواز اور [illegible] وغیرہ سائیں ملنگے کی کٹیا سے نکل کر پیچھے واقع کمرے [illegible] چلے گئے۔ یہاں بڑے کمرے میں کچے کوئلوں والی [illegible] دہک رہی تھی۔ زمین پر مونگ پھلی کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے اور کھونٹیوں سے کپڑے لٹک رہے تھے۔ یہاں لکڑی کی [illegible] بڑی جالی دار ڈولی کے پیچھے وہ چور راستہ تھا جو بہ وقتِ ضرورت شاہ نواز اور اس کے ساتھی سراج کو دو کھولی [illegible] کے اندر پہنچا دیتا تھا۔ ان دونوں قبروں کو ملا کر قریباً [illegible] ضرب چھ فٹ کی جگہ بن جاتی تھی۔

چودھری نے اپنی گرم چادر کے نیچے ہاتھ ڈالا اور [illegible] اندرونی جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر [illegible] تھما دی۔ ”یہ تم دونوں کے خرچے وغیرہ کے لیے ہے۔ اور [illegible] ضرورت پڑے گی تو غلام خان انتظام کر دے گا۔ [illegible] رہو۔“ اس نے بڑی محبت سے کہا۔

پھر اس نے دو امام ضامن نکالے۔ ایک میری طرف اور دوسرا تیمور کی طرف بڑھا دیا۔ ”ان کو بازوؤں پر باندھ لو۔ ہمارے جدّی پیر عطا اللہ جہلمی صاحب نے دیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہر آسمانی آفت سے محفوظ رہو گے۔“

”مگر زمینی بلاؤں کا کیا بنے گا؟“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

”زمینی بلا؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”زمینی بلا... جیسے تم۔“ میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ ہکا بکا سا میری طرف دیکھنے لگا۔ ”تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

میرا جواب ایک نہایت زوردار تھپڑ کی صورت میں [illegible] چودھری کے مکار چہرے پر لگنے والے اس تھپڑ نے اس کی ٹوپی اچھال کر دور گرا دی اور وہ خود بھی ایک پہلو پر جھک [illegible] اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں اور اس کے ساتھ نیچے والا ہونٹ بھی۔

”یہ... یہ کیا ہے؟“ وہ سکتہ زدہ آواز میں بولا۔

اس کا جواب ایک اور تھپڑ کی صورت میں تھا۔ چٹاخ [illegible]



آواز پورے کمرے میں گونجی۔ اس بار رونق علی بھی چپ نہیں رہ سکا۔ وہ چلایا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو خاور؟“

”تم چپ رہو۔ تمہیں ابھی کچھ پتا نہیں۔“ میں نے کہا اور لرزتے کانپتے چودھری عزیز کو گریبان سے پکڑ کر چارپائی سے اٹھا لیا۔

چودھری کے ساتھی فیاض میواتی نے پستول نکالنے کے لیے اپنی گرم چادر کے نیچے ہاتھ ڈالنا چاہا مگر شاہ نواز اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے فیاض میواتی کا بازو پکڑ لیا اور تیمور نے اس کو پستول سے محروم کر دیا۔ دوسری طرف چودھری عزیز نے بھی دو زناٹے کے تھپڑ کھا کر ذرا تن فن دکھائی۔ اس نے خود کو مجھ سے چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ ایک بار تو یہی لگا کہ وہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مگر پھر اپنے زور میں وہ خود ہی گر گیا۔ انگیٹھی الٹ گئی اور انگارے کچے فرش پر بکھر گئے۔ میں نے چودھری کی گردن پر پاؤں رکھا اور سراج نے اس کی قمیص کے نیچے لگے ہولسٹر میں سے بھرا ہوا ماؤزر نکال لیا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے خاور؟“ رونق نے تھر تھر کانپتے ہوئے پوچھا۔

”یہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے رونق۔ اس کنجر نے روپ بدل رکھا ہے۔ شہوار کو اپنے پالتو غنڈے انورے سے مروانے والا یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ثمینہ کی جان بھی اسی نے لی ہے۔“

رونق کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

چودھری نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کی چربی دار گردن میرے پاؤں کے نیچے تھی۔ اس کی آواز اس کے گلے سے باہر نہیں آسکی۔ ہاں، یہی وہ آستین کا سانپ تھا جس نے پہلے دن سے مجھے اپنا ”دشمن اول“ سمجھا اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا... قریباً پانچ منٹ بعد کمرے کا منظر یہ تھا کہ ہم نے چودھری عزیز کی مشکیں کس دی تھیں اور وہ کسی حوالاتی کی طرح زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ سے بہنے والے خون نے اس کی کلف لگی سفید قمیص کو ہی لہولہان نہیں کیا تھا، اس کی شلوار بھی داغ دار ہوگئی تھی۔

میں نے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ ”چودھری عزیز! تم ایک بہت کمینے اور کینہ پرور بندے ہو۔ اپنی اسی کینہ پروری کی وجہ سے تم آج پھر اس مقام پر آگئے ہو جہاں چند سال پہلے تھے۔ تب بھی یہی سین تھا نا۔ تم بندھے ہوئے تھے اور میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ریوالور میں دو گولیاں تھیں۔ اس وقت تم نے زمین پر ناک رگڑی تھی۔“

چودھری عزیز واویلا کرنے لگا۔ ”تمہیں کیا ہوگیا ہے... تم کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“

”تم نے خود کچھ نہیں کیا ہے لیکن کروایا تم نے ہی ہے سب کچھ۔ اور جن سے کروایا ہے، وہ گواہی دے چکے ہیں۔ سب کچھ بک دیا ہے انہوں نے۔“ میں نے اس کے سینے پر لات رسید کی۔ وہ بری طرح کھانسنے اور ابکائیاں لینے لگا۔

میں رونق کو کمرے سے باہر لے گیا اور دو چار منٹ کے اندر اسے انورے اور پروین کے اقبالی بیانات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ رونق علی بھی ششدر رہ گیا۔

”یاور خاور! یقین نہیں آرہا۔ اگر واقعی یہ سب کچھ بھائیا عزیز نے کیا ہے تو پھر یہ بہت بڑا بہروپیا ہے۔ ہمارے درمیان رہتے ہوئے... اس نے ہم کو ذرا بھی شک نہیں ہونے دیا۔“

”اس نے اونٹ والا کینہ دکھایا ہے رونق بھائی۔ ہم نے دو ڈھائی سال پہلے اس سے زمینوں کے کاغذوں پر دستخط انگوٹھے کرا لیے تھے اور اسے پوری طرح دبا بھی لیا تھا لیکن یہ خبیث اندر ہی اندر سلگتا رہا ہے۔ اوپر سے کچھ اور ہوگیا مگر اندر سے وہی زہری ناگ رہا جو اپنی ”ڈس“ اپنے اندر جمع کرتا رہتا ہے۔“

”یا خدا! ہم تمہاری ووہٹی کے قاتل کو موکھلوں اور لبڑوں شمبڑوں میں ڈھونڈتے رہے ہیں اور یہ ہمارے ساتھ ساتھ بیٹھ کر ہمیں مشورے دیتا رہا ہے۔“

اگلا آدھ گھنٹا چودھری عزیز کے لیے بڑا سخت تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہی دکھتی رگ جس نے پہلے بھی اسے ہاتھ پاؤں جوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے اچھی طرح گدڑ کٹ لگانے کے بعد میں نے ریوالور میں دو گولیاں ڈال لیں اور چودھری کو خوش خبری سنائی کہ میں اب چرخی گھما گھما کر اس کی کنپٹی پر چھ فائر کروں گا۔ اگر وہ قدرتِ الٰہی سے بچ گیا تو اسے چھوڑ دوں گا۔

چودھری عزیز جیسے لوگ حساب کتاب کے ماہر ہوتے ہیں۔ اسے پتا تھا کہ چھ بار ریوالور کا گھوڑا دبانے کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ کل صبح نو دس بجے کے لگ بھگ اس کی نمازِ جنازہ ادا ہو جائے گی۔ اس کا رنگ ہلدی ہوگیا اور لگا کہ اسے بڑا تسلی بخش قسم کا ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ میں نے اسے تھوڑی سی مہلت دی اور ایک بار پھر سوچنے کا موقع دیا۔

اس ''مہلت بریک'' کے بعد جب چودھری عزیز سے پوچھ گچھ کا سلسلہ دوبارہ جوڑا گیا تو وہ ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ درحقیقت اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اتنا آناً فاناً تھا کہ وہ اندر سے کرچی کرچی ہوگیا تھا۔ قریباً دس پندرہ منٹ بعد چودھری عزیز نے چند بڑی بڑی قسمیں کھانے کے بعد یہ اعلان کیا کہ ثمینہ کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اس نے مان لیا کہ شہوار کا قتل اسی نے کروایا ہے۔

''تو پھر کس کا ہاتھ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ثمینہ کو موکھل پاشا نے مارا ہے۔'' چودھری عزیز کا انکشاف دھماکا خیز تھا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''وقت پڑنے پر ثبوت بھی دے دوں گا۔'' چودھری عزیز نے اپنے خون آلود ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔

''کیوں مارا گیا ہے اسے؟''

''موکھل پاشا کو پتا چل گیا تھا کہ لڑکی اپنا بیان بدلنے والی ہے۔''

''اسے کیسے پتا چلا؟''

''جب ثمینہ تم سے ملی، پاشا کے بندے تمہارے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے تمہاری اور ثمینہ کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔''

میری آنکھوں کے سامنے وہ بارش کی رات آگئی جب میں آخری بار ثمینہ سے ملا تھا... اس رات کے سارے مناظر نگاہوں میں گھومنے لگے۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ موکھل پاشا کا کام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے مخبر رلی... نے ٹوہ لگائی تھی۔'' چودھری عزیز نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے انداز نے واضح طور پر گواہی دی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اب بھی بہت کچھ چھپا رہا تھا۔

تیمور نے میرے اشارے پر چودھری کو تھوڑی سی مار اور لگائی۔ یہ تھوڑی سی مار بھی اس کے لیے بہت تھی۔ اس کی ناک سے خون رسنے لگا اور جبڑا چٹخنے کی آواز بھی آئی۔ وہ کمرے کے کچے فرش پر مٹی اور خون میں لت پت تھا۔ اس کا سر ہماری ٹھوکروں کی زد میں تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ مجھے الوداع کہنے کے لیے میواتی کے ساتھ گاڑی سے اتر رہا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس کی ساری شان و شوکت خاک میں ملنے والی ہے اور وہ اس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔

ایک دم اس پر غشی طاری ہوگئی۔ میں نے تیمور کو ہاتھ روکنے کا اشارہ کیا۔ اپنے چودھری کی یہ درگت بنتے دیکھ کر میواتی بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آچکی تھی کہ وہ اور اس کا چودھری اس قبرستان میں بری طرح پھنس چکے ہیں اور اب کوئی معجزہ ہی انہیں بدترین انجام سے بچا سکتا ہے۔

یہ فیاض میواتی نامی بندہ کچھ سمجھ دار لگتا تھا۔ اس نے سخت قسم کی مار پیٹ کا شکار ہونے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیے اور جو کچھ اسے معلوم تھا، بتانے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ خاص لہجے کی اردو بولتا تھا۔ وہ بولا۔ ''ہمار کو جو کچھ بھی معلوم ہے، ہم آپ کو بتا دیوت ہے۔ پر آپ نے ہمار کو مارنا نہیں۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ نہیں ماریں گے۔

''ہم آپ سے دوسرے کمرے میں جاکر بات کرنا چاہوت ہے۔''

''ٹھیک ہے آجاؤ۔''

دوسرے کمرے میں جاکر میواتی نے لرزتے کانپتے لہجے میں انکشاف کیا کہ چودھری عزیز ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ثمینہ کو مارنے میں اس کا ہاتھ نہیں، اسے موکھل پاشا نے ہی مارا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھلے کئی مہینے سے موکھل پاشا اور چودھری عزیز میں رازداری کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔

موکھل پاشا اور چودھری عزیز کے درمیان رابطے کی بات میرے دماغ میں بھی پرورش پا رہی تھی، اب میواتی نے انکشاف کیا تو میرا شک ایک دم پختہ تر ہوگیا۔

میں جانتا تھا کہ موکھل پاشا ان لوگوں میں سے ہے جو اپنے انتقام کی خاطر ہر حد تک جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف چودھری عزیز کی خصلت بھی اب بالکل واضح ہوگئی تھی... وہ طویل عرصے سے نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ اور منصوبہ یہی تھا کہ وہ مجھے اپنے انتقام کا ایندھن بنا کر نظروں سے اوجھل کرنا اور راجوال کی گدی دوبارہ سنبھالنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ ابلیس سے بھی ہاتھ ملا سکتا تھا، موکھل پاشا تو پھر بھی انسان تھا... یا کہہ لیں کہ ''انسان نما'' تھا۔

میں نے میواتی سے کہا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ ثمینہ کو موکھل پاشا نے مارا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا رہے ہو کہ موکھل اور عزیز کے درمیان خفیہ رابطہ تھا۔'' میواتی نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ ثمینہ کے قتل میں عزیز کا ہاتھ نہیں؟''

''ہمار کے کہنے کا مطلب یہ ہے جی کہ ثمینہ کو مارن کا فیصلہ موکھل پاشا نے اپنے طور پر کیا تھا۔ دراصل... جب... موکھل پاشا نے آپ کو ثمینہ سے بات کرتے ہوئے سنا اور اس کو پتا چل گیا کہ اب ثمینہ اپنا بیان بدل لیوے گی تو اس نے فیصلہ کر جانا کہ وہ اس کو ختم کر دے اور اس کی موت کا الزام بھی آپ پر آ جاوے۔ بعد میں...''

''ہاں کہو کہو... رک کیوں گئے؟''

''بعد میں جی... موکھل پاشا اور چودھری عزیز میں تھوڑا سا اختلاف بھی ہوا تھا۔ چودھری کہوت تھا کہ اس لڑکی کا خون ہمار کو اپنے سر نہیں لینا چاہیے تھا لیکن پھر بعد میں چودھری نے اپنی رائے پاسا کی رائے سے ملالی تھی۔''

حالات کی کڑیاں بڑی تیزی کے ساتھ آپس میں مل رہی تھیں اور یہ سیدھے سادے حالات تھے۔ وہی چودھراہٹ کا گھمنڈ، وہی بدلے کی آگ اور وہی اونچی پگ کی ہوس! لیکن ایک بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چودھری عزیز نے اب تک مجھے کیوں مسلسل معاف کیا تھا؟ نہ صرف مجھے معاف کیا تھا بلکہ میری ماں اور بہن کو بھی محفوظ پناہ گاہ دی ہوئی تھی۔ اس نے انسپکٹر میاں وارث کو ستر ہزار روپیا نقد ادا کر کے تھانے کچہری سے بے بے جی اور عارفہ کی جان چھڑائی تھی۔ اور اب بھی بہ ظاہر ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایک دم میرا ذہن بلقیس کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ بلقیس کے مجبور کرنے پر ایسا کر رہا تھا... لیکن بلقیس اسے کیسے مجبور کر سکتی تھی؟ وہ تو منت سماجت ہی کر سکتی تھی؟

پھر میرا دھیان ان رجسٹریوں کی طرف چلا گیا جو چودھری کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر میرے پاس محفوظ تھیں۔ تو کیا ان رجسٹریوں کا جادو اپنا کام دکھا رہا تھا؟ شاید ایسا ہی تھا۔

وہ رجسٹریاں بلقیس کے نام تھیں اور بلقیس ہی چاہتی تو وہ ساری زمین واپس چودھری عزیز کو مل سکتی تھی۔ اس لیے چودھری کے لیے ضروری ہو چکا تھا کہ وہ بلقیس سے بنا کر رکھے۔ بلقیس اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی مگر چودھری تو جانتا تھا۔

تو کیا وہ بلقیس کی خاطر میری جان بخشی کر رہا تھا اور میرے گھر والوں کو پناہ دے رہا تھا؟

پھر میرا دھیان ابھی تھوڑی دیر پہلے کی اس بات کی طرف چلا گیا جو چودھری نے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم نہ بھی بلاتے تو میں نے آنا تھا۔ ایک دو قانونی نکتوں کے بارے میں تم سے بات کرنی تھی اور کچھ زمین کا معاملہ بھی تھا۔''

غالباً وہ اپنی زمین کی بات کر رہا تھا۔ وہ رجسٹریاں میرے پاس تھیں اور وہ مجھے الوداع کہنے سے پہلے ان رجسٹریوں کا مستقبل جاننا چاہتا تھا۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔

میواتی سے آدھ گھنٹا مزید گفتگو ہوئی اور بہت سی باتیں کھل کر سامنے آگئیں۔ یہ نہایت انکشاف انگیز گفتگو تھی... جسم میں سنسناہٹ اور سینے میں جلن محسوس ہونے لگی۔ میرا ایک اور اندازہ بالکل درست ثابت ہوگیا۔ میواتی نے ڈرامائی انداز میں بتایا۔ ''پچھلے منگل راجوال میں موکھلوں اور لبڑوں نے جو بھی مار دھاڑ کی اس کا چودھری عزیز کو پہلے سے پتا تھا۔ ہمار کے اندازے کے مطابق موکھل پاسا نے چودھری کو پہلے سے بتا دیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے گاؤں والوں کو ذلیل کرنے کا کام بھی ملی بھگت سے ہوا؟''

''میں نے کہا ہے نا جی کہ چودھری عزیز اور پاسا کی لائن آپس میں ملی ہوئی تھی۔ چودھری کی طرح پاسا بھی یہی چاہوت تھا کہ جاگیر کی کارمختاری بیگم جی کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اور ان کا مقصد تقریباً پورا ہوگیا ہے جی۔ کچھ دن پہلے بیگم جی نے خود کہہ دیا ہے کہ وہ مختاری چھوڑنا چاہوت ہیں۔''

جی چاہ رہا تھا کہ شہوار اور ثمینہ کے قاتل چودھری عزیز کو اس کی ساری خونی کدورت سمیت اسی جگہ گولیوں سے چھلنی کر ڈالوں۔

مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور اگر کرتا بھی تو اپنا ہی نقصان کرتا۔ پھر اپنا گناہ قبول کر کے میری بے گناہی کا ثبوت کون دیتا؟

مجھے اکرم کی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ جس دن راجوال پر موکھلوں نے ہلا بولا اور خون خرابا ہوا، چودھری عزیز بیمار پڑا تھا... یقیناً وہ بیمار ہوا نہیں تھا، بیمار بنا تھا... وہ دونوں طرف سے سچا ہونا چاہتا ہوگا۔

میواتی بے حد خوف زدہ تھا اور جان بخشی کے لیے بار بار میرے پاؤں پکڑ رہا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی بہت تسلی دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ابھی اس کے مزید تعاون کی ضرورت ہے۔ اسے ایک مسلح بندے کی تحویل میں چھوڑ کر میں واپس چودھری عزیز کے پاس آگیا۔

چودھری عزیز اب ہوش میں آگیا تھا۔ اس کا رنگ اب بھی ہلدی تھا اور وہ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر دہشت سمٹ آئی... بندے کا جذبۂ انتقام اور زیادہ سے زیادہ کی ہوس اسے کہاں سے کہاں

پہنچا دیتی ہے۔ اگر دیکھا جاتا تو چودھری کے پاس کیا نہیں تھا۔ اس کی زیادہ تر زمین اس کی اپنی ملکیت میں ہی تھی۔ جو ساڑھے تیرہ مربعے میرے پاس تھی، وہ بھی میں نے بس ضمانت کے طور پر اس سے بلقیس کے نام لکھوا رکھی تھی اور اگر وہ ٹھیک ٹھیک چلتا رہتا تو یہ بھی اس کو ایک دن واپس ہی مل جانی تھی۔ اس کی دو تجوریاں پیسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دنیا کا ہر عیش و آرام اسے حاصل تھا لیکن اس کے باوجود آج وہ ایک قاتل بن گیا تھا اور بربادیوں کی طرف اس کے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں چودھری عزیز سے پھر بات چیت شروع کرتا، رونق علی نے مجھے اشارے سے باہر بلایا۔ میں باہر گیا تو رونق علی کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر نظر آیا۔ یہ بیٹری سے چلنے والا وہی ٹیپ ریکارڈر تھا جس پر سائیں ملنگا اور اس کے ساتھی کافیاں اور لوک گیت وغیرہ سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ رونق پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے خاور... تیرے اور تیمور کے سارے دلدّر دور ہونے والے ہیں۔ آج جو کچھ سامنے آیا ہے یہ جاگیر کے لوگوں کی آنکھیں کھول دے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ بھائیا عزیز جو بھی بات شات کرے وہ ہم اس پر ریکارڈ کرلیں۔ یہ ایک بڑا اپکا ثبوت ہوگا۔“

”بڑا مناسب مشورہ ہے۔“ میں نے تائید کی۔

”میں تو کہتا ہوں خاور! یہ بڑا سنہری موقع ہے۔ اس کا بیان شیان ریکارڈ کرنے کے بعد اس کو گاڑی پر بٹھاتے ہیں اور راجوال پہنچ جاتے ہیں۔ آج سے گاؤں کا میلہ شروع ہے۔ صبح نو دس بجے تک وہاں کافی خلقت جمع ہوگئی ہوگی۔ دوسرے پنڈوں کے لوگ بھی جمع ہوں گے۔ ان سب کے سامنے عزیزے کا کچا چٹھا کھول دیتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کمینے کو پولیس کے حوالے شوالے کرنے کی ضرورت شرورت ہی نہیں ہوگی۔ لوگ وہیں مار مار کر اس کا اور انورے کا پھلوس نکال دیں گے... اور ہاں، انورا کہاں ہے؟“ رونق نے پوچھا۔

”کاچھو والی میں۔ اس کنجر کی مشکیں بھی بندھی ہوئی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

اگلا آدھ گھنٹا کافی سنسنی خیز تھا۔ میں، رونق، تیمور اور شاہ نواز کمرے میں موجود تھے اور چودھری عزیز ہمارے سامنے اپنا کالا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔ اس کی زبان میں روانی تھی اور اگر زبان کہیں اٹکتی بھی تھی تو تیمور کی دہشت کا موبل آئل اسے پھر رواں دواں کر دیتا تھا۔ چودھری کو غالباً معلوم نہیں تھا کہ اس کے بالکل پاس رکھے ہوئے کمبل کی اوٹ میں ٹیپ ریکارڈر موجود ہے جو اس کی آواز کو محفوظ کر رہا ہے۔

اس دوران میں اچانک شاہ نواز کا ساتھی سراج باہر سے آیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ اس نے مجھے اور شاہ نواز کو اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ریوالور قمیص کے نیچے اڑسا اور شاہ نواز کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔ بلا کی سردی تھی۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ ملنگے کی کٹیا کے ساتھ ساتھ دور تک پرانی قبریں نظر آنے لگی تھیں۔ ان قبروں میں اُگے ہوئے جنتر، کیکر اور بیریاں... اور ان درختوں کے پیچھے دور تک خودرو جھاڑیاں اور راج بہا کی طرف جاتا ہوا کچا راستہ اور اوپر آسمان پر اڑتی ہوئی پرندوں کی ڈاریں... سب کچھ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ سراج نے ایک دیوار کی اوٹ میں رہتے ہوئے ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا اور بولا۔ ”وہ دیکھو جی۔“

مجھے قبرستان کی چار فٹ اونچی کچی دیوار کے پیچھے دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ پھر میری نگاہ کچی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے گئی اور میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اور جھاڑیوں کے پیچھے... اور قبروں کے کچے پکے کتبوں کے عقب میں درجنوں مسلح افراد کی موجودگی ثابت ہو رہی تھی۔ یہ ایک خوفناک گھیرا تھا جو رات کی تاریکی میں ہمارے اردگرد نہایت خاموشی اور ہوشیاری سے بنایا گیا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ ”یہ کیا ہوا ہے یار؟“ میں نے شاہ نواز سے کہا۔

”مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے جتنا تمہیں۔“ شاہ نواز نے جواب دیا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ یہ پولیس ہے۔“

مجھے لگا کہ حالات ایک دم پھر پلٹا کھا گئے ہیں۔ یہ کیسی صبح طلوع ہوئی تھی جس نے روشنی کی ہر کرن کو گھپ اندھیرے میں بدل دیا تھا۔ جب میرے اور تیمور کے پاس اپنی بے گناہی کے نہایت ٹھوس ثبوت آگئے تھے... اور ہم اپنے خیرخواہوں اور چاہنے والوں کے سامنے سرخرو ہونے کے قابل ہوئے تھے، میاں وارث اور اس کے بے شمار ہرکاروں نے ہمیں گھیر لیا تھا اور ان سے کسی خیر کی توقع نہیں تھی۔ وہ لوگ صرف اور صرف ہماری لاشیں گرانا چاہتے تھے اور یہ لاشیں اپنے آقاؤں کو دکھا کر ان سے نقد داد وصول کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ بہت دنوں سے شب و روز جس موقع کے منتظر تھے، وہ آج اس ویران قبرستان میں انہیں مل گیا تھا...

[اس سرپھرے نوجوان کی مزید معرکہ آرائیاں آئندہ ماہ پڑھیے]

# سعیٔ رائگاں

مریم کے خان

بچپن کی باتیں اور شرارتیں کتنے ہی ماہ و سال بیت جائیں یادوں کی صورت میں ذہن و دل پہ نقش ہو کر رہ جاتی ہیں ... اکثر تنہائی میں یاد کرنے پر لبوں پہ مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں۔ دو لڑکوں کی شرارتیں، حرکتیں جو انہیں ہر بار ایک نئی مشکل سے دوچار کر دیتی تھیں۔

**وہ کوششیں جو تکمیلی مراحل طے کرنے کے باوجود ادھوری رہ جاتی تھیں**

بیل کو دیکھتے ہی میں نے دوڑ لگائی اور وہ مجھے آوازیں دیتا میرے پیچھے لپکا۔ مگر میرا رکنے یا اس کی بات سننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بدقسمتی سے میں ایک ایسی گلی میں پھنس گیا جو آگے سے بند تھی اور موٹے بیل نے ہانپتے کانپتے مجھے آلیا ورنہ اس کا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ گلی تپلی سی تھی اور سارا راستہ بیل کے بیل نما وجود نے گھیر رکھا تھا۔ میں نے اس کے برابر سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس نے بہ آسانی مجھے پکڑ لیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مروڑا اور غرا کر بولا۔

”جب میں نے رکنے کو کہا تھا تو رکے کیوں نہیں؟“

”پلیز۔“ میں کراہا۔ ”میرا بازو ٹوٹ جائے گا۔“

”اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔“ اس نے میرا بازو مزید مروڑا تو میں چلا اٹھا۔ ”ہاں اب کچھ مزہ آیا۔“ وہ سچ مچ مزہ لینے کے انداز میں بولا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اپنی گرفت کو نرم کیے بغیر کہا اور مجھے لگا کہ اس کی خوف ناک

گرفت میری کہنی کا جوڑ نکال دے گی۔ ”بولو بات کرو گے؟“

”اچھا۔“ میں نے ہار مان لی۔ ”کروں گا اب تو میرا بازو چھوڑ دو موٹے سور۔“

بیل کو گالیوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے صرف اس پر اعتراض تھا کہ میں اس سے بات کیوں نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے اپنا بازو سہلایا۔ ”اب بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”جول، ایک موقع ہے۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی سرگوشی پوری گلی میں بہ آسانی سنی جا سکتی تھی۔

”مجھے معاف رکھو۔“ میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میں ابھی پچھلے زخم نہیں بھولا ہوں۔“

”نہیں، اس بار ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”ایسی یا ویسی کوئی بات ہو یا نہ ہو، میں تمہارے ساتھ کسی کام میں شامل نہیں ہوں گا۔“ میں نے صاف انکار کر دیا۔

”لگتا ہے مجھے تمہارا بازو توڑنا پڑے گا۔“ اس نے پھر میرا بازو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ مگر میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں گلی سے نکل نہیں سکتا تھا کیونکہ راستے میں بیل حائل تھا۔ البتہ میں آسانی سے اس کے ہاتھ بھی نہیں آتا۔

”بیل! تم احمق ہو اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مرواتے ہو۔“

”بے شک مجھ سے کبھی کبھی حماقت ہو جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ہمیشہ ہی احمقانہ کام کرتا ہوں۔“

”کبھی کبھی۔“ میں ہنسا۔ ”مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی کام کیا ہو اور مجھے اس میں کوئی زک نہ پہنچی ہو۔“

”اس بار ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”بہت آسان کام ہے۔“

”سب سے آسان جیل جانا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مگر تمہارے ساتھ یہ کام بھی مشکل ہو جاتا ہے۔“

”اس بار ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے پھر بے خیالی میں دہرایا۔

”کیا۔“ میں اچھل پڑا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ آسانی سے جیل ہوگی۔“

”مم... میرا مطلب ہے کہ اس بار کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“

”نہ ہو مگر میں تمہارے ساتھ شامل نہیں ہوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”بے شک تم میرا ہاتھ توڑ دو یا سر۔“

”جول میرے بھائی ایک بار تو سن لو۔“ اس نے اس بار دوسرا حربہ آزمایا۔ ”آخر ہم کزن بھی تو ہیں۔“

”یہی تو بدقسمتی ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”ورنہ میں تم پر کب کی لعنت بھیج چکا ہوتا۔“

”پلیز میرے بھائی۔“ بیل نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تو میں حسب معمول پسیج گیا تھا۔

”او کے بولو۔“ ”مگر زیادہ دیر نہیں، مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔ ابھی گھر جا کر ہوم ورک بھی کرنا ہے۔“

آپ ہوم ورک کے لفظ پر نہ چونکیں۔ چودہ سال کا بچہ اسکول میں ہی تو پڑھتا ہے اور جو اسکول میں پڑھتا ہے اسے ہوم ورک بھی کرنا پڑتا ہے۔ بیل مجھ سے ایک برس بڑا تھا اور ایک کلاس پیچھے تھا بلکہ مجھے تو حیرت تھی کہ وہ اس کلاس تک بھی کیسے آ گیا۔ کیونکہ اسے تعلیم سے اتنی رغبت تھی جتنی کہ کسی بلی کو گھاس سے ہو سکتی ہے بلکہ بلی تو پھر بھی کبھی کبھی گھاس کھا لیتی ہے میں نے اسے کبھی غلطی سے بھی کتاب کے پاس نہیں دیکھا تھا۔ اس کا زیادہ وقت کھانے، سونے اور جاگنے کے دوران دولت حاصل کرنے کے احمقانہ منصوبے بنانے میں گزرتا تھا۔

ہم یعنی ہمارا خاندان امریکا کی ریاست جنوبی ڈکوٹا کے دارالحکومت پیری کے پاس ایک چھوٹے سے شہر میں کئی نسلوں سے رہ رہا تھا۔ شہر کی آبادی بس اتنی تھی کہ جو چند مربع کلومیٹرز میں سما جائے اور ہم چند گھنٹوں میں سارا شہر گھوم سکتے تھے۔ ہمارا خاندان زراعت پیشہ تھا اور شہر سے باہر زمینوں پر کاشت کرتا تھا۔ میرا باپ ایک کسان تھا اور خاصا خوف ناک باپ تھا۔ میری اس سے جان نکلتی تھی اور یہ اسی کا خوف تھا جو میں تعلیم پر اتنی توجہ ضرور دیتا تھا کہ کسی کلاس میں فیل نہ ہوں ورنہ میرے باپ نے دھمکی دے رکھی تھی کہ وہ مجھے کھیتوں میں کام پر لگا دے گا۔ ایک بار اس نے مجھے بتانے کے لیے کہ زمین پر کام کرنا کس قدر دشوار ہوتا ہے، مجھ سے چند دن کام بھی کرایا تھا۔ میرے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ تعلیم حاصل کر کے بے شک کہیں آفس بوائے بن جاؤں گا لیکن زمین پر کبھی کام نہیں کروں گا۔ اپنے یہ عزائم میں نے اپنے باپ سے چھپا رکھے تھے جو ہائی اسکول کے بعد مجھے زمین پر اپنے ساتھ کام کرانے کی سوچ رہا تھا۔ ابھی ہائی اسکول پاس کرنے میں کئی برس باقی تھے مگر کبھی کبھی خیال آتا کہ اگر میں کوئی ملازمت حاصل نہ کر سکا تو مجھے اپنے باپ کی زمین پر کام کرنا ہوگا۔ اس تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

دوسری طرف بیل بے فکر تھا کیونکہ اس کا باپ جو رشتے میں میرا دور پار کا چچا بھی لگتا تھا اس سے بھی زیادہ موٹا کاہل اور غبی تھا۔ اس نے اپنی زمین کرائے پر دے دی تھی



اور اس سے آنے والی آمدنی شراب میں اڑا دیا کرتا تھا۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے بیل کی ماں ملازمت کرتی تھی اور دونوں باپ بیٹے کو اس کی بالکل بھی پروا نہیں تھی۔ ان کو صرف اپنی پڑی رہتی تھی۔ میری ماں ان باپ بیٹے کو گالیاں دیتی کیونکہ بیل کی ماں اس کی بہن تھی اس طرح بیل سے میرا دہرا رشتہ بنتا تھا اور یہی رشتہ میرے گلے کی زنجیر بن گیا۔

بچپن سے بیل کا ہمارے گھر آنا جانا تھا اور وہ شروع سے مجھ پر حکم چلانے لگا تھا۔ اگر میں اس کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی پس و پیش سے کام لیتا تو وہ مجھے کسی ایسی جگہ لے جا کر جہاں کوئی اور نہ ہو میری ایسی مرمت کرتا کہ مجھے اس کی بات ماننے میں ہی عافیت نظر آتی۔

جب میں دس سال کا ہوا تب میں نے پہلی بار بیل کے ساتھ کسی غیر قانونی سرگرمی میں حصہ لیا تھا۔ ہمارے علاقے کی مارکیٹ میں ایک پھلوں کی دکان تھی جس کے مالک مسٹر سام تھے اور وہ بچوں پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ وہ ان کی دکان سے پھل نہ چرائیں، کوئی شریف ترین بچہ بھی ان کی دکان کے پاس چلا جاتا تو وہ پوری طرح چوکنا ہو جاتے تھے اور اس وقت تک اس پر کڑی نظر رکھتے تھے جب تک وہ ان کی دکان سے کم سے کم دس گز دور نہیں چلا جاتا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ بیل جیسے لڑکے پر وہ کس طرح نظر رکھتے ہوں گے جو ویسے ہی دکانوں سے چیزیں چرانے کے لیے مشہور ہو گیا تھا۔ جی ہاں بیل سات سال کی عمر میں ہی دکانوں سے کھانے کی چیزیں پار کرنے لگا تھا کیونکہ گھر پر اسے یہ چیزیں نہیں ملتی تھیں اور اس کی ماں سارا دن محنت کر کے جو کما کر لاتی تھی اس میں صرف تین وقت معمولی سا کھانا ہی بن سکتا تھا۔ اس لیے بچپن سے پیٹو اور کھانے پینے کا شوقین بیل اپنا شوق اس طریقے سے پورا کرنے لگا تھا۔ دو تین بار دکان داروں نے اسے پکڑا، اب وہ اتنا چھوٹا تھا کہ پولیس کیس بنتا ہی نہیں تھا۔ اس کے باپ کو بلا کر شکایت کی جاتی تو وہ جائے واردات پر ہی بیل کو اتنی سفاکی سے پیٹنا شروع کر دیتا کہ شکایت کرنے والے کو بھی ترس آنے لگتا تھا۔ کئی بار جب ایسا ہی ہوا تو دکان والے خود محتاط ہو گئے۔ اب بیل کسی دکان میں جاتا تو اس پر خصوصی نظر رکھی جاتی تھی۔

وہ کوئی چیز پار کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تب بھی اس کے جانے کے بعد دکان دار کو پتا چل ہی جاتا اور وہ پکڑ میں آ جاتا۔ اگلی بار وہ دکان دار بیل کی صورت دیکھتے ہی اسے دکان میں داخل ہونے سے روک دیتا تھا۔ بے عزتی کا تو اس پر خاص اثر نہیں ہوتا تھا مگر دکان میں داخلے سے محرومی اس

## اداکارہ چھمک چھلو کے انکشاف

میری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے زیارتوں پر جانا چاہتی ہوں اور حج کرنے کی بھی خواہش ہے مگر حج کے لیے محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ میں تمہارے بھائی کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر وہ شام کو زنانہ کپڑے پہن کر نکل جاتا ہے اور اگلے روز صبح واپس آتا ہے تو سو جاتا ہے اور اس وقت تک سویا رہتا ہے جب تک دوبارہ اس کے کام پر جانے کا وقت نہیں ہو جاتا۔ ویسے تو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر میں سمجھتی ہوں کہ وہ اپنا ٹیلنٹ ضائع کر رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی ٹی وی چینل والے سے بات کر کے کسی پروگرام کی کمپیئرنگ اسے دلوا دو تم دیکھنا کہ بڑے بڑے سیاست داں، منسٹر اور چیف منسٹر بھی اس پروگرام میں سفارش کروانے آئیں گے۔ اسے لوگوں کے دل موہنے کے انداز تم سے کہیں زیادہ آتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف ”نصیحت نامے“ سے انتخاب

کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ رفتہ رفتہ علاقے کی تمام ہی دکانوں میں اس کا داخلہ بند ہو گیا تو اس نے باہر کی دکانوں پر طبع آزمائی کی مگر کب تک... کچھ عرصے میں سارا شہر اس کے کرتوتوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی دکان دار یوں چوکنا ہو جاتا جیسے کوئی زہریلا سانپ اس کی دکان کی طرف آ رہا ہو۔

کھانا اور خوب کھانا بیل کی کمزوری تھی اس لیے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس نے جب پہلی بار مجھے چوری کرنے کو کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ انکار پر اس نے مجھے ہمارے باغ کے عقب میں واقع کوٹھری میں لے جا کر خوب مارا اور مجھے درانتی سے قتل کرنے کی دھمکی دی، اس کی دھمکی نے مجھے دہلا دیا تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ وہ سچ مچ میری گردن کاٹ دے گا۔ میں اس کی بات مان گیا تھا اور ساتھ ہی مجھے یہ خوف بھی مارے جا رہا تھا کہ اگر میرے باپ کو پتا چل گیا کہ میں نے چوری کی ہے تو وہ میرا نہ جانے کیا حشر کرے۔ مگر فی الحال تو مجھے بیل سے جان چھڑانی تھی اس لیے میں اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔

بیل کا منصوبہ کچھ یوں تھا کہ وہ کسی دکان میں جائے گا۔ ظاہر ہے دکان دار کی ساری توجہ اس پر مرکوز ہوگی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں اس کی بتائی چیز پار کر لوں گا۔ اس وقت میں نے غور نہیں کیا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور

مجھ جیسے نوآموز کے لیے تو بالکل بھی آسان نہیں ہے۔ جب کہ بیل اس معاملے میں مشاق ہو گیا تھا۔ دکان والوں کے محتاط ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ پار کر جاتا تھا۔ وہ مجھے ایک سپر اسٹور میں لے گیا جہاں بہت اچھی چاکلیٹس ملتی تھیں۔ سچی بات ہے جب میں اپنی ماں کے ساتھ شاپنگ کرنے وہاں جاتا تھا تو ان چاکلیٹ کو دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آتا۔ کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ چپکے سے ایک چاکلیٹ اٹھا لوں تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا مگر میری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا اور پھر میری جو عزت ہوگی، وہ الگ ہے ڈیڈی کے ہاتھوں خاطر تواضع بھی خوب ہوگی۔

اب بیل مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اس اسٹور سے چاکلیٹ چراؤں اور میں بادل ناخواستہ تیار ہو گیا تھا۔ اس رضا مندی میں یہ لالچ بھی شامل تھا کہ چرائی جانے والی چاکلیٹ میں سے نصف میری ہوگی۔ ہم شام کے وقت اسٹور پہنچے۔ میں پہلے اندر چلا گیا تھا اور بیل میرے جانے کے کچھ دیر بعد آیا تھا۔ میرا پہلے ہی خوف سے برا حال تھا جب بیل کو دیکھا تو میری گھبراہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا بہرحال اس کے اشارے پر میں چاکلیٹ والے حصے کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک اسٹور کا مالک اور سارے ملازمین بیل کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور اسے یوں اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے جیسے مرغی چوزے کو اپنی نظر میں رکھتی ہے کہ اسے چیل نہ لے جائے۔

میری طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا اس کے باوجود مجھے لگ رہا تھا کہ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہیں اور میرا ہاتھ چاکلیٹ کی طرف نہیں جا رہا تھا پھر میں نے ہمت کر کے ایک چاکلیٹ اٹھائی تھی کہ ایک طرف سے ایک ملازم آ گیا۔ میرے ہاتھ لرزنے لگے مگر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے کہا۔

''انکل، مجھے یہ چاکلیٹ چاہیے۔''

''بیٹے تم کاؤنٹر پر چلے جاؤ اور اس کی ادائیگی کر دو۔'' اس نے انجان سمجھ کر مجھے طریقہ بتایا۔ میں شرافت سے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس نصف ڈالر تھا جو کل ہی میرے والد نے مجھے دیا تھا اور چاکلیٹ کی قیمت بھی نصف ڈالر تھی، میں نے ادائیگی کی اور اسٹور سے باہر آ گیا۔ بیل نہ جانے کب اسٹور سے نکل گیا یا اسے اندر آنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ باہر ایک گوشے میں میرا منتظر تھا جیسے ہی میں اس کے نزدیک پہنچا اس نے جھپٹ کر مجھ سے چاکلیٹ چھین لی اور اس سے پہلے کہ میں اس سے واپس لیتا، اس نے ریپر پھاڑ کر نصف چاکلیٹ ایک ہی بار میں منہ میں ڈال لی تھی۔

''یہ میں نے لی ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''اپنی رقم سے۔''

''کیا؟'' اس کا منہ کھلا رہ گیا جسے اس نے باقی ماندہ چاکلیٹ سے پُر کیا اور بولا۔ ''احمق، میں نے کیا کہا تھا؟''

''میری ہمت جواب دے گئی تھی۔'' میں نے اعتراف کیا اور رو دینے والے لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس بس یہی آدھا ڈالر تھا۔''

جواب میں بیل نے بجائے اس کے کہ مجھے تسلی دیتا اس پر میری پھر مرمت لگائی کہ میں نے چاکلیٹ چرانے کے بجائے خریدی کیوں تھی۔ میری پٹائی لگانے کے بعد اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو اس سے تمہیں یہ تو پتا چل ہی گیا کہ آدمی اپنا ڈالر خرچ کر کے ایسی چیزیں لے تو اسے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔''

''میں آئندہ تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

''تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے۔'' اس نے میرا بازو پکڑ کر مروڑا۔ ''بولو چلو گے نا میرے ساتھ۔''

میرا یہ بازو ایک سال پہلے ہی سائیکل چلاتے ہوئے گرنے سے ٹوٹ گیا تھا اور میں تین مہینے تک بازو گلے میں لٹکائے گھومتا رہا۔ اب بھی کبھی کبھی اس میں درد اٹھتا تھا اور بیل اسے میری کمزوری بنا کر مروڑتا تھا تو میں اس کی ہر بات فوراً مان جاتا تھا چاہے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ اس وقت میں نے اس کی بات مان لی اور اس سے وعدہ کیا کہ اب میں اس کے لیے چاکلیٹ ضرور چراؤں گا۔ اگلی بار ہم ایک کینڈی شاپ میں گئے اور میں نے ہمت کر کے اس بار سچ مچ ایک چاکلیٹ چرا لی۔ چرانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس وقت میرے پاس ایک سینٹ بھی نہیں تھا اور بیل نے مجھے دھمکی دی تھی اگر میں چاکلیٹ لیے بغیر دکان سے باہر آیا تو وہ سچ مچ میرا بازو توڑ دے گا۔ میں نے اسے چاکلیٹ دی تو اس نے شکریہ ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور یہ چاکلیٹ بھی حسبِ سابق اکیلے ہی کھا گیا۔ جب چاکلیٹ مکمل طور پر اس کے حلق سے اتر گئی تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھنے کی اداکاری کی۔ ''اوہ معاف کرنا میں تمہیں تو بھول ہی گیا تھا۔ کوئی بات نہیں جب تم اگلی بار چاکلیٹ لاؤ گے تو میں تمہیں اس میں سے آدھی ضرور دوں گا۔''

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے وہ کبھی کھانے کی کوئی چیز کسی کو نہیں دیتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ



اب اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔ جب وہ اگلی بار مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تو میں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''اگر تم نے چاکلیٹ یا کوئی اور چیز کھانی ہے تو خود جا کر چراؤ۔''

''جول! اس بار میں تمہیں سچ مچ آدھی چاکلیٹ دوں گا۔'' اس نے یقین دلایا۔

''نہیں مجھے چاکلیٹ کھانے کا شوق نہیں ہے۔'' میں نے سفید جھوٹ بولا ورنہ مجھے بھی چاکلیٹ کھانے کا اتنا ہی شوق تھا جتنا کہ بیل کو تھا۔

''میں تمہارا بازو توڑ دوں گا۔'' اس نے اپنی آزمودہ دھمکی دی۔

''اگر تم نے ایسا کیا تو میں چلّا کر ممی کو بلا لوں گا۔''

اس نے سوچا اور دوسری دھمکی دی۔ ''اگر تم میرے ساتھ نہیں گئے تو میں تمہارے ڈیڈی کو بتا دوں گا کہ تم نے کینڈی اسٹور سے چاکلیٹ چرائی تھی۔ میں چاکلیٹ کی دکان کے مالک کو بھی یہاں لے آؤں گا اور وہ بتائے گا کہ اس دن اس کی چاکلیٹ چوری ہوئی تھی۔''

بیل کی اس دھمکی نے مجھے دہلا دیا تھا اگر وہ سچ مچ میرا بازو توڑنے پر آمادہ ہو جاتا تب بھی مجھے اتنا خوف نہیں ہوتا جتنا کہ یہ بات ڈیڈی کے علم میں آ جانے کا سن کر ہوا تھا۔ میں بچپن سے ڈیڈی سے بہت خوف کھاتا تھا۔ اس لیے میں فوراً اس کی بات مان گیا تھا۔ ''پلیز... جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔'' میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ بات ڈیڈی کو مت بتانا۔''

میری منت سماجت دیکھ کر بیل کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات دکھائی دیے تھے۔ اس نے جواب دیا۔ ''او کے... میں صرف تمہاری خاطر نہیں بتاؤں گا مگر جیسا میں کہوں تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں طوعاً و کرہاً بولا تھا۔

اس کے بعد ایک طرح سے میری باگ بیل کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور میں اس احمق کے اشاروں پر ناچنے لگا تھا۔ اس نے مجھے پہلے کھانے پینے کی چیزوں کی چوریوں میں استعمال کیا تھا۔ پھر جب سارے ہی شہر کے دکان دار ہم سے محتاط ہو گئے تو اس نے براہِ راست چوریاں شروع کر دیں، وہ میری مدد سے دکانوں اور گھروں میں نقب لگاتا تھا اور ہمارے جو ہاتھ آتا تھا لے کر چلتے بنتے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے مجھے اس کے اشارے پر کسی نہ کسی کام میں شریک ہونا ہی پڑتا تھا۔ اگر میں انکار کرنے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے ڈیڈی کی دھمکی دیتا تھا جس کے بعد میں فوراً سدھر جاتا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور میں کسی قدر سمجھ دار اور بیل سے نڈر ہو گیا۔ ایک بار اس نے شہر کے پاس ہی ایک فارم سے ٹرکی چرانے کا منصوبہ بنایا۔ ان دنوں ٹرکی بہت مہنگے ہو رہے تھے اور ان کی مانگ زیادہ تھی۔ یہ فارم شوارزرینڈل نامی شخص کا تھا اور وہ اپنے ٹرکیز کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ اس نے نہ صرف کتے رکھے تھے بلکہ فارم کے گرد خاردار تاریں بھی لگا رکھی تھیں اور ذرا سی آہٹ پر خود بھی مسلح ہو کر باہر نکل آتا۔ اتفاق سے اس کی ڈیڈی سے دوستی تھی اور میں ان کے ساتھ دو تین بار شوارزر کے فارم پر گیا تھا۔ اس نے ڈیڈی کو ان چوروں کے انجام کے بارے میں بتایا جنہوں نے اس کے فارم میں گھس کر چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک تو اس کے ہاتھ سے مارا ہی گیا تھا اور دوسرا چار مہینے اسپتال میں رہ کر وہیل چیئر پر رخصت ہوا تھا۔

اس لیے جب بیل نے اپنا منصوبہ میرے سامنے رکھا تو میں نے شدومد سے اس کی مخالفت کی تھی۔ ''شوارزر بہت خطرناک شخص ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ فارم میں گھسنے والے چوروں پر گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتا ہے۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اس کے فارم میں ہے ہی کیا سوائے ٹرکیز کے۔'' بیل نے ماننے سے انکار کر دیا۔

''ٹرکی ہی اس کا ذریعہ روزگار ہے اور وہ اس معاملے میں بہت حساس ہے۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' بیل بے پروائی سے بولا اور اس نے مجھے بھی راضی کر لیا تھا۔ ''میں نے ایک دکان والے سے بات کی ہے وہ ایک ٹرکی کے بدلے پچاس ڈالرز دینے کو تیار ہے۔''

''پچاس ڈالرز۔'' میں بھی ڈول گیا ورنہ اس سے پہلے میرا دل کسی صورت نہیں مان رہا تھا۔ یہ تو بیل کے مخصوص ہتھکنڈے تھے جن کی وجہ سے میں راضی ہوا تھا مگر پچاس ڈالرز نے مجھے دل و جان سے راضی کر لیا تھا۔

''یعنی ہم اگر چھ سات ٹرکیز لانے میں کامیاب رہے تو ہمیں تین سو ڈالرز سے بھی زیادہ مل سکتے ہیں؟''

''اس سے بھی زیادہ۔'' اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو سوچا ہے کہ ہم پندرہ بیس ٹرکیز چرا کر لے آئیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے اعتراض کیا۔ ''تمہیں پتا بھی ہے ایک ٹرکی کا وزن کتنا ہوتا ہے۔ تین سے چار کلوگرام تک... اور شوارزر کے پالے ٹرکیز تو زیادہ ہی صحت مند ہو جاتے ہیں۔''

''ہم ٹرالی لے جائیں گے اور اس میں سارے ٹرکیز

ڈال کر لے آئیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے سارا منصوبہ سوچ لیا ہے۔''

بیل کا سارا منصوبہ یہ تھا کہ ہم ایک ہاتھ سے کھینچنے والی چار پہیوں کی ٹرالی لے کر شوارز کے فارم کے عقبی حصے میں واقع جنگل تک جائیں گے۔ اس کے بعد فارم میں موجود ٹرکیز کو نیند کی دوا والی کشمش کھلائیں گے۔ جب وہ بے ہوش ہو جائیں گے تو ان کو ٹرالی میں ڈال کر لے آئیں گے۔ اس منصوبے میں کئی خامیاں تھیں۔ نمبر ایک کتوں کا کیا ہوگا۔ شوارز کے پاس بڑے خوں خوار قسم کے کتوں کی جوڑی تھی۔ بیل نے ان کا حل یہ نکالا کہ ان کے لیے بے ہوشی کی دوا ملا گوشت لے جایا جائے اور ان کو کھلا دیا جائے۔ اس کے بعد ہم خار دار تار کاٹ کر اندر داخل ہوں گے اور بے ہوش ہو جانے والے ٹرکیز سمیٹ کر وہاں سے رفو چکر ہو جائیں گے۔ بے ہوشی کی دوا بیل نے ایک میڈیکل اسٹور سے پار کی تھی۔ ٹرکیز کو چھپانے کے لیے ٹرالی کے اوپر گھاس کے گٹھے رکھ دیے جاتے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ مگر میں مطمئن نہیں تھا کیونکہ شوارز کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ ہم اسے بے ہوشی کی دوا تو نہیں کھلا سکتے تھے اور اس کے پاس شاٹ گن تھی۔ اگر وہ باہر آجاتا تو؟

''فکر مت کرو۔'' بیل نے روایتی بلکہ خاندانی بے پروائی سے کہا۔ ''اس کو بھی دیکھ لیں گے۔''

''سوچ لو ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں دیکھ لے۔'' میں نے اسے خبر دار کیا۔

مگر بیل اپنے یقین پر قائم رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ اتوار کی صبح ہم اس وقت گھر سے نکلے جب سب سو رہے تھے اور شہر سے نکل کر شوارز کے فارم کے عقبی حصے میں آئے پہلے ہم نے دوا ملی کشمش بکھیری اور پھر جیسے ہی کتے آئے ہم نے ان کے سامنے دوا ملے گوشت کے ٹکڑے ڈال دیے انہوں نے فوراً گوشت کھا لیا اور دوستانہ انداز میں ہمارے سامنے دم ہلانے لگے۔ شاید وہ مزید کا مطالبہ کر رہے تھے مگر ان کے لیے تو اتنا بھی کافی ثابت ہوا تھا اور کچھ دیر بعد وہ زمین پر لیٹے اور سو گئے۔ اس دوران میں ٹرکی بھی ایک ایک کر کے گرنے لگے اور چند لمحے میں فارم کے اس حصے میں بے ہوش ٹرکیز کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی تیس سے کم نہیں تھی۔ میں اور بیل بوکھلا گئے کہ اتنے ٹرکیز کیسے لے کر جائیں گے۔ بیل نے جلدی سے تاریں کاٹ کر راستہ بنایا اور ہم نے بھاگ بھاگ کر بے ہوش ٹرکیز کو ٹرالی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ پوری ٹرالی بھر گئی اور جب یہ پوری طرح بھر گئی تب بھی کچھ ٹرکیز باقی تھے۔ ان کو بہ حسرت و یاس ہم نے وہیں چھوڑا اور فوری طور پر روانہ ہو گئے۔ شکر ہے اس دوران میں شور نہیں ہوا تھا ورنہ شوارز خود نکل آتا اور ہم مارے جاتے۔ ٹرالی خاصی وزنی ہو رہی تھی اور اسے اکیلے کھینچنا خاصا مشکل کام تھا۔ جی ہاں، بیل مزے سے اردگرد کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا چل رہا تھا اور ٹرالی اکیلے مجھے کھینچنا پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''ٹرالی کھینچنے میں میری مدد کرو۔''

مگر بیل نے میری کوئی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا...... اس نے کہا۔ ''میں نے سارا کام کیا ہے اور اب ٹرالی تم کھینچو۔''

میں پورا زور لگا کر کھینچ رہا تھا اس کے باوجود مجھ سے ٹرالی نہیں کھینچی جا رہی تھی۔ ہماری رفتار نہایت سست تھی۔ ساری گڑ بڑ اسی وجہ سے ہوئی۔ کیونکہ اگر بیل میرا ساتھ دیتا تو ہمیں اتنی دیر نہ ہوتی اور وہ سب نہ ہوتا جو ہوا تھا۔ ابھی ہم شہر سے کچھ دور تھے کہ اچانک گھاس کے گٹھے ہلنے لگے، میں نے چلا کر بیل سے کہا۔ ''ٹرکی ہوش میں آرہے ہیں۔''

اس نے بدحواس ہو کر گھاس کا گٹھا دبانے کی کوشش کی مگر ٹرکی بہت زیادہ تھے، وہ زور لگا کر نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے اردگرد بیس ٹرکی جھومتے اور لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔ بیل ان کو بھاگ بھاگ کر پکڑ رہا تھا۔ اور وہ اس سے بچنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوتا، میں خاموشی سے بھاگ نکلا۔ کیونکہ میری چھٹی حس نے مجھے فرار کا مشورہ دیا اگر میں دیر کرتا تو بیل کی طرح پکڑا جاتا اور وہی حال ہوتا جو بیل کا ہوا تھا۔ اسے ٹرکیز کے ساتھ شوارز نے رنگے ہاتھوں پکڑا جو اپنے گم شدہ ٹرکیز تلاش کرنے نکلا تھا اور سخت مشتعل تھا۔

میں نے بیل کو دو دن بعد دیکھا اس کے چہرے کی سوجن کسی قدر کم ہوئی تھی اور مجھے دیکھ کر وہ غضب ناک آوازیں نکالتا میری طرف لپکا۔ میں جان بچانے کے لیے اس کے گرد بھاگنے لگا۔ جب وہ تھک کر کسی گدھے کی طرح ہانپنے لگا تو رک گیا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔

''جول حرامزادے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔''

''میرا قصور۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''یہ سب تمہارا قصور ہے اگر تم میری مدد کرتے تو ہم جلدی دکان تک آجاتے اور ٹرکیز کو ہوش میں آنے کا موقع نہیں ملتا۔''

مگر بیل کی سوئی اسی پر اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے سانس درست ہونے کے بعد پھر مجھے پکڑنے کی کوشش کی تاکہ میرا بازو مروڑنے کا پسندیدہ شغل کر سکے اور مجھے اپنا بازو بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا تھا۔ کئی دن تک میں نے بیل کا سامنا نہیں کیا تھا اور جب اس کا غصہ کسی قدر ٹھنڈا ہوا تو ہمارے تعلقات کا پھر سے آغاز ہوا۔ البتہ میں نے اس کے ساتھ کسی غیر قانونی کام میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ مزید بیل بھی فی الحال کسی ایڈونچر کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے کچھ عرصہ امن و سکون سے گزرا۔ مگر جلد اسے تکلیف اٹھی اور اس نے مجھے مجبور کرنا شروع کیا۔ میں ممکن حد تک مزاحمت کرتا رہتا تھا۔ اور جب بالکل مجبور ہو جاتا تو اس کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ یہ کھینچا تانی اسی طرح چلتی رہی۔ کبھی بیل کامیاب ہو جاتا اور مجھے اس کے کسی احمقانہ منصوبے میں شامل ہونا پڑتا اور کبھی میں اسے ہری جھنڈی دکھا جاتا تھا۔ اس نے دھونس جمانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا البتہ جیسے جیسے میں بڑا ہو رہا تھا وہ اب کم دھونس جمانے لگا تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب میں نے اس کے ساتھ کسی بھی غلط کام میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

بیل کافی عرصے سے مجھے تلاش کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی احمقانہ منصوبہ ہوگا اور میں کسی صورت اب اس کے کسی منصوبے میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ دو مہینے پہلے ہی میں خاصی عبرت حاصل کر چکا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ بیل نے ہمارے محلے میں رہنے والے ایک بڑے میاں کے گھر میں لگے اسٹرابیری کے پودے سے اسٹرابیری چرانے کا منصوبہ بنایا۔ ان کی اسٹرابیری بہت مزے کی اور میٹھی ہوتی تھی۔ اور ایک ہی پودے سے کوئی بیس کلو کے قریب اترتی تھی۔ ایک بار میں نے بھی اسٹرابیری چننے کا کام کیا تھا اور مجھے اس کا خوب تجربہ تھا۔ بیل نے مجھے بتایا۔

''اگر ہم نے دس کلو اسٹرابیری بھی حاصل کر لی تو سمجھ لو کہ سو ڈالرز کہیں نہیں گئے۔''

''سو ڈالرز کے لیے اتنا بڑا خطرہ۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''معمولی سا خطرہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بڈھا رچرڈ دوپہر میں گولی کھا کر سو جاتا ہے۔ اس وقت ہم بہ آسانی اپنا کام کر سکتے ہیں۔''

''کام کون کرے گا؟'' میں نے اصل سوال کیا۔

''ظاہر ہے تم۔'' اس نے روانی سے کہا۔ ''میں اس جسامت کے ساتھ چار دیواری نہیں چڑھ سکتا۔''

یعنی اگر پھنستا تو میں پھنستا اور بیل ایسے کسی موقع پر فرار ہونے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ مگر میں اسے انکار نہیں کر سکتا تھا اُس نے اتنی لجاجت سے مجھ سے کہا تھا۔ اب وہ دھونس کے بجائے یہ حربہ استعمال کرتا تھا۔ طے پایا کہ میں اسے اسٹرابیری جمع کر کے دوں گا اور وہ گلی میں کھڑا ہو کر اسے اپنی سائیکل کے ساتھ بندھی ٹوکری میں جمع کرتا رہے گا۔ جب میں سارا درخت خالی کر دوں گا تو ہم نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔

ہم نے دوپہر کا وقت منتخب کیا جب ویسے ہی سناٹا ہوتا ہے۔ اور عقبی گلی میں تو ویسے بھی کوئی نہیں جاتا۔ مسٹر رچرڈ کے ہاں کوئی کتا نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے کوئی شاٹ گن رکھی تھی اس لیے ہمیں کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ اگر بدقسمتی سے وہ باہر نکل بھی آتے تو مجھے بھاگنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی مسٹر رچرڈ بالکل کمزور سے آدمی تھے وہ کسی صورت میرا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے احتیاطاً اندر جاتے ہوئے منہ پر رومال لپیٹ لیا اور پھر اندر کود گیا۔ باہر سے بیل نے چلا کر کہا۔

''جلدی کرنا، کھانے مت بیٹھ جانا۔''

میرا دل دہل گیا تھا۔ بیل خبیث سب کو اپنی طرح پیٹو سمجھتا تھا اُس کی آواز سن کر مسٹر رچرڈ باہر آسکتے تھے۔ جب کوئی ردعمل نہیں ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور جلدی جلدی درخت سے پکی اسٹرابیری اتار کر ایک چھوٹے منہ والی گول ٹوکری میں جمع کرنے لگا۔ جب ٹوکری بھر گئی تو اسے لے جا کر دیوار سے بیل کو پکڑا دیا۔ اس نے فوراً مجھے دوسری خالی ٹوکری دے دی۔ میں اسے بھرنے لگا تھا۔ میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی ٹوکریاں بھر کر دے دیں اور درخت اسٹرابیری سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔

جس وقت میں اتنا مطمئن ہو گیا کہ ہلکے ہلکے گنگنانے بھی لگا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک چھوٹے قد کا مگر صورت سے ہی خطرناک نظر آنے والا کتا نمودار ہوا اور بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔ پہلے تو میں دنگ ہی رہ گیا۔ جب کتا مجھ سے چند قدم دور رہ گیا تو مجھے جان بچانے کا خیال آیا اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کتا بڑے خوں خوار انداز میں آیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ میری ایک آدھ بوٹی اتار کر دم لے گا۔ میں نے جان بچانے کے لیے ٹوکری کھینچ کر اس پر ماری اور خود دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے باوجود کتے نے میری پتلون کا پائنچا نوچ لیا۔ کتے کی آواز سنتے ہی بیل سائیکل سمیت غائب ہو گیا۔ میں نے دیوار سے بدحواسی میں چھلانگ لگائی تو گھٹنے کے بل فٹ پاتھ پر گرا اور اٹھ کر لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ مجھے خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس کے باوجود میں کسی نہ کسی طرح گھر پہنچے

میں کامیاب رہا اور ممی کو ایک بہانہ بنا کر مطمئن کیا۔ شکر ہے کہ مسٹر رچرڈ باہر نہیں آئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ کتا کہاں سے آیا اور مسٹر رچرڈ نے اسے پال لیا تھا تو وہ اتنی دیر تک کیا کرتا رہا تھا جب میں اسٹرابیری اتارنے میں مشغول تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ بِل کتے کی موجودگی سے واقف تھا تبھی وہ اس کی آواز سنتے ہی بھاگ نکلا۔ میں نے اس سے کہا بھی مگر اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''تم خود سوچو کتے کی موجودگی میں ہم کیسے یہ کام کر سکتے تھے۔ ممکن ہے بڈھے رچرڈ نے ابھی یہ کتا لیا ہو۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے تذبذب سے کہا' مجھے ابھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کتے کی موجودگی سے بے خبر تھا کیونکہ وہ کچھ اس قسم کا انسان ہے جو کسی کو بھی اپنے مطلب کے لیے جہنم میں جھونک سکتا ہے۔ اس کے بعد سے میں نے ایک بار پھر فیصلہ کر لیا کہ میں اب اس کے ساتھ کوئی کام نہیں کروں گا' یہ اور بات ہے کہ میرا یہ فیصلہ بھی حسب سابق بودا ثابت ہوا تھا اور بِل نے مجھے ایک بار پھر اپنے ساتھ کام کرنے پر راضی کر لیا تھا۔

☆☆☆

ہمارے شہر کا سب سے بڑا سپر اسٹور مسٹر ایڈم کی ملکیت ہے اور یہاں ہر چیز دستیاب ہوتی ہے۔ میری ممی خود مہینے کا سودا مسٹر ایڈم کے سپر اسٹور سے خریدتی ہیں کیونکہ وہ اپنے گاہکوں کو اچھا خاصا ڈسکاؤنٹ دیتے ہیں۔ ان کا یہ سپر اسٹور شہر کی مرکزی شاہراہ سے ایک گلی پیچھے تھا۔ اس کے ساتھ ایک پتلی سی گلی تھی جس میں عام طور سے اسٹور کا کچرا پھینکتے تھے۔ صبح سویرے صفائی کرنے والے آ کر سارا کچرا سمیٹ کر لے جاتے تھے۔

بِل مجھے شام کے وقت اس گلی میں لایا اور اس نے اسٹور کے بغلی دروازے کے برابر میں بنی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کی مدد سے ہم بہ آسانی اسٹور میں داخل ہو سکتے ہیں۔''

میں نے کھڑکی کا معائنہ کیا۔ ''اس میں تو صرف شیشہ ہے اور اسے تو کوئی بھی آسانی سے کھول سکتا ہے۔ اس میں لازمی الارم ہوگا۔''

''الارم نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا ایک کزن یہاں کام کرتا ہے۔ اس نے بتایا ہے اسٹور میں کہیں بھی الارم نہیں ہے' اس معاملے میں مسٹر ایڈم بے پروا آدمی ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر کھڑکی کا معائنہ کیا۔ یہ اوپر سرکنے والی کھڑکی تھی اور اس کا ایک ہی پٹ تھا۔ اس میں ایک ایک فٹ کے فاصلے سے لکڑیاں تھیں اور ان کے درمیان میں بہت موٹا سا شیشہ لگا تھا۔ اگر اسے توڑنے کی کوشش کی جاتی تو بہت شور ہوتا۔ میں نے بِل سے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا ہے' اس میں مسٹر ایڈم کی کوئی چال ہے ورنہ اپنی دکان کو اس طرح سے کون چھوڑتا ہے۔''

''کوئی چال نہیں ہے بس ان کو اس کا خیال نہیں آیا۔'' بِل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''فرض کر لو کہ ان کو خیال نہیں آیا تو کیا کسی چور کو بھی اس کھڑکی کا خیال نہیں آیا؟'' میں نے طنز کیا۔

''جول' میری بات کا یقین کرو۔ شاید ہی کسی نے اس گلی میں گھس کر اس کھڑکی کو دیکھا ہو۔''

''تم نے تو دیکھ لیا۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''وہ بھی اس لیے کہ میرے کزن نے بتایا۔ مجھے بھی یقین نہیں آیا جب تک میں نے خود آ کر نہیں دیکھ لیا۔''

واقعی یہ بہت چھوٹی سی اور گندی گلی تھی جس میں ہر کوئی نہیں گھس سکتا تھا۔ یہاں استعمال شدہ کارٹن اور دوسرا کچرا اس طرح بکھرا تھا کہ اس کے درمیان سے گزرنا بھی مشکل تھا۔ شاید اس وجہ سے کوئی یہاں نہیں آتا تھا اور یہ کھڑکی کسی کی نظرِ بد سے محفوظ رہی جب تک کہ بِل نے اسے نہیں دیکھ لیا۔ یوں تو وہ سخت غبی قسم کا لڑکا تھا مگر موقع تاڑنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسے کھانے اور ڈالرز کی خوشبو فوراً آجاتی تھی۔ اگر بِل کی بات درست تھی تو یہاں موقع تھا اور اگر کوشش کی جائے تو اچھی خاصی رقم ہاتھ آسکتی تھی کیونکہ اس سپر اسٹور کی روزانہ کی سیل ہزاروں ڈالرز میں تھی اور اس کے کیش بکس میں اچھی خاصی رقم کی موجودگی عین ممکن تھی۔

''ممکن ہے کیش بکس میں دو تین ہزار ڈالرز ہوں۔'' بِل نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''اتنے اونچے خواب مت دیکھو۔'' میں نے ٹوکا۔ ''ورنہ مایوسی ہوگی۔ بہتر ہے اس معاملے میں مزید معلومات حاصل کرو' ممکن ہے مسٹر ایڈم نے کوئی ایسی چیز لگا رکھی ہو جس کا تمہارے کزن کو بھی نہ پتا ہو۔''

''ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''تب تم خود ہی یہ کام کر لو۔'' میں وہاں سے جانے لگا تو اس نے لپک کر میرا راستہ روک لیا۔

''جول' میری بات کا یقین کرو۔'' اس نے خوشامد کی۔

''میں بہت بار تمہاری بات کا یقین کر چکا ہوں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''ہر بار مجھے مصیبت بھگتنا پڑی ہے اس لیے تم خود ہی یہ کام کرو۔''

''میں خود سے نہیں کر سکتا۔'' اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر میں خود کر سکتا تو تمہیں کیوں کہتا؟''

''کیوں نہیں کر سکتے؟''

''میں اس کھڑکی سے نہیں گزر سکتا۔'' اس نے جھینپ کر جواب دیا۔

واقعی وہ اس کھڑکی سے نہیں گزر سکتا تھا کیونکہ یہ مشکل سے ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی اور بِل کی چوڑائی کہیں سے بھی دو فٹ سے کم نہیں تھی۔ یعنی وہ اسی لیے مجھے شامل کرنے پر مجبور ہوا۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ یہ بہت آسان موقع تھا اور ہم بغیر کسی خاص خطرے کے اندر داخل ہو سکتے تھے بشرطیکہ ... سچ مچ الارم نہ لگا ہو۔

''میں خود آ کر دیکھوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔

اسی شام کو میں اکیلا سپر اسٹور میں آیا اور میں نے اس کھڑکی کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا' واقعی اس میں نہ تو کوئی تار دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی کہیں الارم کے آثار تھے۔ میں نے واپس آ کر بِل سے کہا۔

''مجھے منظور ہے مگر میری شرط ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''ایک تو جو ملے گا اس میں سے نصف میرا ہوگا۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''دوسرے آئندہ تم مجھے اس قسم کا کوئی کام کرنے کو نہیں کہو گے۔''

''مجھے یہ بھی منظور ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں اب خود ان چکروں سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''اگر تم رہنا چاہو تو شوق سے رہو مگر مجھے معاف رکھنا۔ اب میں اپنی ساری توجہ صرف تعلیم پر دینا چاہتا ہوں اگر میں نے ہائی اسکول میں اتنے نمبر نہیں لیے کہ مجھے کسی کالج میں داخلہ مل سکے تو میرے ڈیڈی مجھے اپنی زمین پر لگا دیں گے۔''

اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''میرا باپ بھی اب مجھے برسرِ روزگار دیکھنا چاہتا ہے۔''

طے ہوا کہ ہم نصف رات کے بعد کارروائی کا آغاز کریں گے اور اپنا کام جلد از جلد کر کے بھاگ جائیں گے۔

میں اور بِل رات دو بجے سپر اسٹور پہنچے... میں نے اپنے ساتھ اوزاروں والا تھیلا بھی لے رکھا تھا جس کی مدد سے میں کھڑکی کھولتا۔ بِل کا کام اردگرد کی نگرانی کرنا تھا تاکہ کوئی اس طرف آنے لگے تو وہ مجھے خبردار کر دے۔ گلی میں تاریکی تھی اور یہ ہمارے لیے اچھا ہی تھا۔ ورنہ رات کو جو نگران ... ہے وہ اس طرف چکر لگا کر ہمیں دیکھ سکتا تھا۔


# بیرونِ ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ، ماہنامہ سرگزشت

کے

# سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائیر میل
اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا یورپ اور افریقہ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرِ سالانہ 4000 روپے یا 65 امریکی ڈالر

امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرِ سالانہ 5000 روپے یا 80 امریکی ڈالر

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابلِ ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر ادائیگی کی صورت میں کوریئر چارجز اور بینک کمیشن کے 500 روپے اور بیرونِ ملک ادائیگی والے ڈرافٹ وغیرہ پر اس مد میں 20 امریکی ڈالر کا اضافہ کر لیں

رابطہ کے لیے

ثمر عباس: 0301-2454188

یا

بدرالدین سرکولیشن منیجر
فون نمبر (92)(21)5802552,5804200
فیکس نمبر (92)(21) 5802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION ,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
,KARACHI 75500
E-MAIL :JDPGROUP@HOTMAIL.COM

''کھڑکی کیسے کھولی جائے؟'' میں نے بیل سے پوچھا۔ ''کیونکہ مجھے کھڑکی کھولنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہتھوڑی اور چھینی سے کھولنے کی کوشش کرو۔''

''تمہیں اندازہ ہے کہ اس میں شور کتنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''پھر تم سوچو۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

میں نے ایک چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی میں کھڑکی کا معائنہ کیا اور ایک باریک سی چھینی اس کی پچلی درز پر رکھ کر اسے ہتھوڑی سے ہلکی ہلکی ضرب لگانے لگا۔ اس سے آواز تو ہو رہی تھی مگر یہ اتنی نہیں تھی کہ دوسروں تک جا سکتی۔ جب کسی قدر درز بن گئی تو میں نے اس میں انگلیاں پھنسا کر کھڑکی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر کھڑکی اپنی جگہ جمی رہی، میں نے بیل کی طرف دیکھا۔ ''تم کوشش کرو... مجھ سے تو نہیں کھل رہی ہے۔''

کسی بھی محنت کے کام سے بیل کی جان جاتی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر اس سے بھی نہیں کھلی۔ ''بہت سخت ہے، صحیح سے چھینی مارو۔''

''ابھی شور ہوگا تو کوئی آجائے گا۔'' میں نے اسے بتایا۔

میں نے پھر چھینی ہتھوڑی سنبھالی۔ خاصی دیر تک میں درز بڑی کرتا رہا، لکڑی بہت سخت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں لوہے کو کاٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب کھڑکی پھر بھی نہیں کھلی تو میں نے آواز کی پروا کیے بغیر ہتھوڑی کا بے دریغ استعمال کیا۔ ذرا سی دیر میں میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس روز گرمی بھی بہت تھی۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''منحوس کھڑکی نہیں کھل رہی ہے۔''

''تم صحیح سے کوشش کرو۔''

''اور کتنی کوشش کروں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو تم کوشش کرلو۔''

غصے میں آکر بیل نے ہتھوڑی اور چھینی سنبھالی اور کھڑکی کی درز بڑی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے تھیلے سے ڈرل مشین نکالی مگر پھر مجھے یاد آیا کہ یہاں بجلی کا کنکشن تو تھا ہی نہیں، ڈرل مشین کیسے چلتی۔ کچھ دیر میں بیل نے بھی ہانپتے ہوئے ہتھوڑی چھینی پھینک دی۔ اتفاق سے ہتھوڑی اس کے پاؤں پر گری اور وہ پاؤں پکڑ کر ناچنے لگا۔ اس کے منہ سے دبی دبی زبان میں گالیاں نکل رہی تھیں۔ صبح ہونے میں کچھ دیر رہ گئی تھی۔

''کچھ دیر میں روشنی ہو جائے گی۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''اس کے بعد ہم کسی کی نظروں میں آسکتے ہیں اس لیے ناچنے کے بجائے کچھ کرو۔''

''کیا کروں؟''

''کچھ بھی کرو۔ یہ کھڑکی کھولنے کی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔''

میری اس دھمکی پر بیل نے ایک بار پھر کوشش شروع کی مگر کھڑکی نہ کھلنا تھی اور نہ کھلی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی عام سی نظر آنے والی کھڑکی کیوں نہیں کھل رہی ہے۔ اس دوران میں جب کوئی آہٹ ہوتی تھی تو ہم ڈبوں اور کچرے کے درمیان دبک جاتے۔ کچھ دیر بعد روشنی نمودار ہونے لگی۔ گرمیوں میں صبح ویسے بھی جلد ہو جاتی ہے۔ بیل اب بہ آواز بلند گالیاں دے رہا تھا۔

اچانک سڑک پر کسی کار کی روشنی نمودار ہوئی اور ایک کار گلی کے سرے پر رکی۔ ہم جلدی سے ڈبوں کے درمیان دبک گئے .... کوئی اتر کر بھاگتے قدموں سے گلی کے اندر آیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ مسٹر ایڈم تھے اُن کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔ انہوں نے آتے ہی کھڑکی کے ساتھ کا دروازہ صرف ہینڈل گھما کر کھول لیا تھا اور اندر چلے گئے تھے میں دنگ رہ گیا۔ میں نے بیل سے سرگوشی میں کہا۔ ''تم نے دیکھا؟''

''ہاں اپنی بدقسمتی کو میں نے غور سے دیکھا ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ دروازہ کھلا ہے۔''

کچھ دیر بعد مسٹر ایڈم اور ان کا بیٹا باہر آئے۔ مسٹر ایڈم نے کہا۔ ''شکر ہے کسی کو پتا نہیں چلا کہ گلی کا دروازہ کھلا ہے۔ اور اندر کیش بکس میں دس ہزار ڈالرز تھے۔''

یہ سنتے ہی میں نے بیل کی چٹکی لی۔ اس نے تلملا کر مجھے مکا مارا۔ ہم دونوں کا صدمے سے برا حال تھا، دس ہزار ڈالرز ہمارے لیے تو بہت بڑی رقم تھی۔ مسٹر ایڈم کے لڑکے نے اس سے کہا۔ ''پاپا... تم یہ کھڑکی کیوں نہیں بند کراتے ہو، کہیں کوئی اس کے راستے اندر گھس گیا۔''

مسٹر ایڈم ہنسے۔ ''اسے کوئی نہیں کھول سکتا۔ یہ برسوں سے اسی طرح جام ہے اور اس میں بہت مضبوط قسم کے شیشے لگے ہیں۔ ان کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔''

مسٹر ایڈم اور اس کا بیٹا باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہ جانے سے پہلے دروازے کو لاک کر گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں نے اٹھ کر بیل کو لات رسید کی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جوابی کارروائی کرتا، میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

#

بیکر سارجنٹ کو اپنا کام بہت پسند تھا۔ وہ ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور عام طور سے طویل فاصلوں پر جاتا تھا۔ اس وجہ سے اسے کئی کئی دن اور بعض اوقات ایک دو ہفتے بھی گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی بیوی فیرن اس کے کام کو سخت ناپسند کرتی تھی کیونکہ اسے مہینے میں مشکل چند دن ہی اپنے شوہر کے ساتھ گزارنے کا موقع ملتا تھا۔ اور وہ یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ یہ اس کے شوہر کی مجبوری تھی، اس کا پیشہ تھا۔ بیکر کے پاس اپنا اٹھارہ وھیلرز ٹرک تھا اور وہ دوسروں کا سامان منزل پر پہنچاتا تھا۔ فیرن کا کہنا تھا کہ وہ طویل فاصلوں پر جانے کے بجائے آس پاس بھی کام کر سکتا تھا مگر بیکر ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے ایک تو اسے کام کم ملے گا اور دوسرے معاوضہ بھی کم ہو جائے گا۔ طویل فاصلوں پر سامان لے جانے کا کام ہر وقت دستیاب رہتا تھا اور دوسرے اس میں معاوضہ بہت اچھا ملتا تھا جس سے بیکر اور فیرن اچھی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کے پاس ایک اچھا مکان تھا جسے انہوں نے مناسب انداز میں آراستہ کیا تھا۔ ان کے پاس ایک نئے ماڈل کی کار تھی اور ایک چھوٹا ٹرک تھا جسے بیکر سامان لانے لے جانے اور دوسرے کاموں میں استعمال کرتا تھا۔ اس کا اٹھارہ وھیلرز ایک مخصوص پارکنگ میں کھڑا ہوتا تھا جہاں

**شب تاریک میں ایک ماہر فن کے دوسرے ماہر سے ٹکراؤ کا دلچسپ احوال**

دولت کے حصول کے لئے مہم جوئی اور جاں کوشی ایک جزو لازم ہے۔ سیم و زر اور بے تحاشا عیش وعشرت کی خاطر لوگ جان ہتھیلیوں پر رکھے رات کی تاریکی میں، جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے ہیں... کبھی کامیابی ان کے قدم چومتی ہے تو ...کبھی ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے ...ایسے ہی چند مجرموں کا احوال جو دولت کی طلب میں ہر خطرے میں کودنے کو تیار تھے۔

**سفید پانسے**

کاشف زبیر

اس کی دیکھ بھال ہوتی تھی اور وہ اسے کام کے وقت ہی نکالتا تھا۔

اس بار جب اسے کام ملا تو فیرن سے اس کا زبردست جھگڑا ہوا کیونکہ وہ اس پر زور دے رہی تھی کہ وہ یہ کام چھوڑ دے۔ بیکر نے ایک ایسا کام لے لیا تھا جس میں اسے دو ہفتے گھر سے دور رہنا پڑتا اور وہ ابھی تین دن پہلے ہی ہفتے بھر بعد گھر آیا تھا۔ فیرن کا غصے سے برا حال تھا اور ان کی چار سالہ ازدواجی زندگی میں پہلی بار اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔

''میں ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی جسے بیوی کی پروا نہیں ہے۔''

''فیرن! تم جذباتی ہو رہی ہو۔'' بیکر نے اسے سمجھایا۔ ''یہ میرا پیشہ ہے اور اسی کی وجہ سے ہمیں زندگی کی آسائشیں ملی ہوئی ہیں۔ اگر میں کوئی اور کام کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں ہے۔''

''تم یہاں بھی تو ٹرک چلا سکتے ہو۔'' فیرن نے پرانی بات کی۔

''میں تمہیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ مقامی طور پر اتنے بڑے ٹرک کی مانگ نہیں ہوتی اور نہ اس میں اچھا معاوضہ ملتا ہے پھر کام بھی کبھی ملتا ہے اور کبھی نہیں ملتا۔ یہاں تو مجھے ہر وقت آفرز رہتی ہیں۔''

''آفرز!'' فیرن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جس سے تمہیں دو دو ہفتے گھر سے باہر رہنے کا موقع ملتا ہے۔''

''میں جان بوجھ کر نہیں جاتا۔''

''جھوٹ مت بولو... تمہیں گھر سے باہر رہ کر خوشی ہوتی ہے، اب تم مجھ سے بے زار ہو گئے ہو۔''

''خدا کے لیے فیرن! کیا تم سچ مچ مجھے بے زار کرنا چاہ رہی ہو؟ میں اتنے دن بعد گھر آتا ہوں اور تم وہی موضوع لے کر بیٹھ جاتی ہو۔'' بیکر نے بے زاری سے کہا۔

''تو تم یہ کام نہیں چھوڑو گے؟'' فیرن چیخ کر بولی۔

''نہیں... میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔''

''تب تمہیں دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''اس پر میں آ کر بات کروں گا۔''

''بات نہیں، فیصلہ ہوگا۔'' فیرن بولی۔ ''باتیں بہت ہو چکی ہیں۔''

عام طور سے جب بیکر اپنا ٹرک لے کر لمبے سفر پر روانہ ہوتا تھا تو بہت خوش ہوتا تھا۔ بچپن سے اسے گھومنا پھرنا پسند تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں وہ ہیوی ڈیوٹی وہیکلز چلانے لگا تھا۔ تیس سال کی عمر میں اس نے اپنا ٹرک خرید لیا تھا۔ یہ ٹرک پرانا مگر اچھی حالت میں تھا۔ بیکر نے اس میں بہت سارا کام کرایا تھا اور اب یہ بہترین حالت میں تھا۔ گزشتہ پانچ سال میں بیکر اس پر دسیوں ہزار میل کا سفر کر چکا تھا۔ اسے اپنے ٹرک سے عشق تھا اور وہ اسے کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

مگر فیرن اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی بیکر کو احساس ہوتا تھا کہ وہ بھی ٹھیک کہتی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی اور اس کا بیکر پر پورا حق تھا۔ وہ اسے پورے مہینے میں پانچ چھ دن سے زیادہ نہیں دے پاتا تھا اور باقی وقت وہ گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ان کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے بہل جاتی اور شاید اس کے مایوس ہونے کی وجہ بھی یہی تھی۔ انہوں نے اپنا معائنہ کرا رکھا تھا۔ دونوں مکمل طور پر صحت یاب تھے بس قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ بیکر نے سوچا کہ اگر ان کے ہاں اولاد ہو جائے تو فیرن اس کی غیر موجودگی شاید اتنا نہ محسوس کرے۔

اس بار وہ یہی سوچ کر گھر آیا تھا کہ فیرن کو لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس جائے گا مگر اس سے پہلے ہی فیرن نے اس سے جھگڑا شروع کر دیا اور وہ بات درمیان میں رہ گئی۔ تین دن میں ان کا بیشتر وقت لڑتے جھگڑتے گزرا اور اب بیکر بہت کشیدہ اعصاب کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کا خاتمہ قریب ہے اور شاید اس بار وہ واپس آئے تو فیرن اسے گھر پر نہ ملے۔ اسے ایک کمپیوٹر ساز فرم کا خاص سامان لے کر نیو یارک سے سان فرانسسکو جانا تھا۔ یہ بہت قیمتی سامان تھا اور اس کی انشورنس بھی ہوئی تھی۔ اسے کمپنی کے مین پلانٹ سے کنٹینر اٹھانا تھا۔ وہ ٹرک لے کر وہاں پہنچا تو کنٹینر تیار تھا۔ ایک کرین نے اسے بیکر کے ٹرک پر لوڈ کیا اور وہ فوری طور پر روانہ ہو گیا۔

بیکر کا اصول تھا کہ وہ بارہ گھنٹے ڈرائیونگ کے بعد لازمی طور پر آٹھ گھنٹے آرام کرتا تھا تاکہ ڈرائیونگ کے دوران پوری طرح مستعد رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ریکارڈ پر ایک بھی حادثہ نہیں تھا اور اسی وجہ سے اسے اس قسم کے کام مل جاتے تھے۔ کمپیوٹر چپ بنانے والی اس فرم کے اپنے ٹرکس تھے مگر اتفاق سے اس وقت ان کے فلیٹ کا کوئی ٹرک دستیاب نہیں تھا اور چپس کی یہ کھیپ لازمی طور پر ایک ہفتے کے اندر سان فرانسسکو تک کمپنی کے پلانٹ پہنچانا تھی جہاں ان چپس .... کو کمپیوٹر بنانے میں استعمال کیا جاتا۔ اس وجہ سے کمپنی نے



بیکر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ کنٹینر لوڈ کرنے اور ضروری کاغذی کارروائی کے بعد بیکر ٹرک لے کر کوئی تین ہزار میل کے طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔ یہ فاصلہ اسے چار دن میں طے کرنا تھا اور اس دوران میں اسے آرام کا موقع کم ملتا۔ یہ اس کے اصول کے خلاف تھا مگر اسے معاوضہ بہت اچھا مل رہا تھا اس لیے وہ مان گیا۔

☆☆☆

جیو مرفی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو کمانے کے لیے جائز ناجائز کے چکر میں نہیں پڑتے ہیں... بلکہ دولت جہاں سے بھی مل رہی ہو، اسے حاصل کرنے میں دیر نہیں کرتے۔ اس کا ایک چھوٹا سا گینگ تھا اور وہ ہائی وے پر لوٹ مار کرتے تھے۔ ان کا نشانہ عام طور سے وہ ٹرک ہوتے تھے جو سامان کی ترسیل کرتے ہیں۔ ان سے ایک ہی واردات میں اتنا مال جاتا تھا جو مہینوں کے لیے کافی ہوتا تھا۔ جیو مرفی کے تین ساتھی تھے۔ ایک اس کی نائب اور محبوبہ ماریا، دوسرا ماریا کا بھائی جوزیو اور تیسرا بریٹ۔ ان کا کوئی مخصوص ٹھکانا نہیں تھا بلکہ وہ زیادہ تر ہائی وے پر گشت کرتے تھے اور جہاں رات ہو جاتی، وہیں ٹھکانا کر لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک وین تھی، یہ مکمل گھر تھا۔ اسے کھینچنے کے لیے ایک یک اپ ٹرک تھا جو اس سے الگ بھی ہو جاتا تھا۔ انہوں نے ہائی وے سے ذرا فاصلے پر ایک ویران سے احاطے کو اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا جہاں وہ سردیوں کے دوران قیام کرتے تھے۔ کسی بھی واردات کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے نیو اڈا سے کہیں اور چلے جاتے تھے۔ یہ ریاست کیلیفورنیا کے ساتھ لگتی ہے۔ دور تک پھیلی ویرانی اور صحرائی پس منظر اس ریاست کی خصوصیت ہے۔ جیو اس ویرانی اور صحرائی منظر کو بہت پسند کرتا تھا۔

سرما کسی قدر سخت ہو چلا تھا اس لیے وہ سب اس احاطے میں آ گئے تھے۔ یہ کوئی متروک کارخانہ تھا جس کی مشینری بھی اکھاڑ لی گئی تھی اور اب وہاں پر چند زنگ آلود ناکارہ مشینیں اور سوائے چار دیواری کے کچھ نہیں تھا۔ اس احاطے کے اندر ایک بیرک نما بڑی سی عمارت بنی تھی۔ جیو اپنی وین اس کے اندر ہی لے آیا تھا، یہ ہوم وین اس کا گھر تھی۔ اس میں وہ ماریا کے ساتھ رہتا تھا جبکہ جوزیو اور بریٹ کے پاس ہیوی بائکس تھیں۔ اس وقت وہ بیرک کے اندر الاؤ جلا کر بیٹھے تھے۔

''بہت دن ہو گئے کوئی اچھا شکار ہاتھ نہیں لگا ہے۔'' بریٹ نے ہاتھ تاپتے ہوئے کہا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا لمبا چوڑا شخص تھا اور اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ ہمہ وقت کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو۔ اس کے مقابلے میں جوزیو ورزشی جسم کا مگر خاموش طبع نوجوان تھا جو زیادہ تر دوسروں کی سنتا تھا۔ جیو مرفی طویل قامت مگر دبلے اور گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔ اس نے فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور وہ عام طور سے دھوپ کی عینک لگا کر رکھتا تھا۔

''آج کل اس طرف ہائی وے سے ٹرک کم گزرتے ہیں۔''

''مورین کی طرف سے بھی کوئی ٹپ نہیں ملی ہے۔'' ماریا نے کہا۔

مورین ایک نزدیکی قصبے میں بار ویٹر تھا اور اس بار میں عام طور سے یہاں سے گزرنے والے ٹرک ڈرائیور رکتے تھے۔ مورین ان میں سے کوئی اسامی پھانپ کر جیو کو اطلاع کرتا تھا۔ اگر اس کی اطلاع کارآمد نکلتی تھی تو جیو اسے بھی معقول انعام دیتا تھا۔ جیو ان دنوں خالی ہو رہا تھا اور وہ بھی کسی واردات کا سوچ رہا تھا مگر ان دنوں ہائی وے پولیس نے گشت بڑھا دیا تھا اور وہ کسی بھی واردات کی صورت میں فوراً زد میں آ جاتی تھی اس لیے جیو بہت محتاط تھا۔ احتیاط

کمزور اور بے اولاد مریض

مردانہ صحت کی مکمل بحالی مردانہ
جرثوموں کی کمی و کمزوری
اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے

15 مارچ سے کلینک کے نئے اوقات کار نوٹ فرمالیں
صبح 11 بجے تا 5 بجے شام
آنے سے پہلے فون پر وقت ملاقات طے کرلیں

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
ایم بی بی ایس۔ بی ایس سی آنرز (پنجاب)
معالج امراض مخصوصہ و بانجھ پن
موبائل 0321-6528001

شاہین ملٹی سسٹم کلینک
نزد پرلے پھاٹک گوجرہ روڈ جھنگ صدر
فون نمبر 47-7625822
اوقات کار صبح 11 بجے تا 7 بجے رات
چھٹی جمعۃ المبارک

ہی تھی کہ وہ ابھی تک کسی بھی موقعے پر پکڑے نہیں گئے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی پولیس ریکارڈ تھا۔

جیو کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ بھال کر کام کرتا تھا اور عام طور سے ایسے ٹرکوں پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتا تھا جن میں بہت قیمتی سامان ہو، ورنہ پولیس بہت مستعدی سے حرکت میں آجاتی تھی۔ اس کے چند پارٹیوں سے روابط تھے جو اس سے چوری کا مال خرید لیتی تھیں اور مال ان کو فروخت کر کے جیو اور اس کے ساتھی کیلیفورنیا کے کسی ساحلی مقام کی طرف نکل جاتے تھے اور چند مہینے کھل کر عیاشی کرتے تھے۔ اس دوران میں معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا اور وہ واپس لوٹ آتے تھے۔

جوزیو جوان کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا، اس نے تجویز دی۔ ”کیوں نہ ہائی وے کا ایک چکر لگالیں... ممکن ہے کہ کوئی اچھی چیز مل جائے۔“

جیو نے اس سے اتفاق کیا اور وہ چاروں بائکس پر روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

ماروٹ کیریز کوئی جانا پہچانا نام نہیں تھا مگر ایک حلقے کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ کسی بھی مشہور الیکٹرانک برانڈ کی نقل تیار کرنے میں ماہر تھا اور اس کے چند خفیہ کارخانوں میں یہ کام چلتا رہتا تھا۔ اس کا تیار کردہ سامان باقاعدہ نظام کے تحت فروخت کیا جاتا تھا اور سیلز مین گھر گھر جا کر اس قسم کی دو نمبر مصنوعات کو فروخت کرتے تھے۔ جب اصل نظر آنے والا کوئی برقی آلہ مارکیٹ سے نصف دام مل رہا ہو تو للچانے والے بہت مل جاتے تھے۔ یہی نہیں کہ ماروٹ نقلی چیزیں تیار کرتا تھا بلکہ وہ چوری بھی کرواتا تھا۔ اگر اسے اطلاع مل جاتی تھی کہ کوئی کمپنی اپنا سامان کہیں بھیج رہی ہے تو اس کے پاس ایک باقاعدہ گروہ تھا جس کی مدد سے وہ یہ سامان چوری کروالیتا تھا اور پھر یہ سامان بھی اسی طرح بیچ دیا جاتا تھا۔

اس صبح وہ دفتر آیا تو اسے ایک ای میل ملی۔ ای میل پڑھ کر ماروٹ کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اس نے فوری طور پر اپنے خاص آدمی جان کو طلب کرلیا۔ جان آیا تو ماروٹ نے اسے ہنگامی طور پر نیواڈا روانہ ہونے کا حکم دیا۔ جان نے دریافت کیا۔

”مجھے کیا کرنا ہے باس؟“

”نیویارک سے ایک ٹرک سامان لے کر آرہا ہے۔ مگر خیال رہے، اس بار بہت احتیاط کی ضرورت ہوگی کیونکہ مال بہت قیمتی ہے اور اس کی ہر ممکن حفاظت کی گئی ہوگی۔“

”تم بے فکر رہو باس... میں ہر حفاظت کو ناکام بنا سکتا ہوں۔“

”گڈ! مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم فوری طور پر روانہ ہو جاؤ اور اپنا کام کر کے ٹرک کو وہیں تبدیل کرلینا۔“

”میں سمجھ گیا باس۔“

”ٹھیک ہے، باقی تفصیل میں تمہیں کال کر کے بتاؤں گا۔“

”ٹرک ابھی کہاں ہے؟“

”وہ نیویارک سے روانہ ہوا ہے اور تمہارے پاس پورے دو دن ہیں۔“ ماروٹ نے جواب دیا۔ ”مگر ایک بات بتا دوں، اس میں غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے ہر صورت میں یہ ٹرک چاہیے۔“

”تم بے فکر رہو باس۔“ جان نے اعتماد سے کہا۔ ”کیا پہلے کبھی شکایت کا موقع دیا ہے۔“

”ہاں... ایسا ہوا نہیں ہے مگر اس بار معاملہ بہت بڑی مالیت کے سامان کا ہے۔ پتا ہے، اس ٹرک میں کیا ہے؟“ ماروٹ کا لہجہ ڈرامائی ہو گیا تھا۔ ”اس میں ستر لاکھ ڈالرز مالیت کی کمپیوٹرز چپس ہیں۔“

”ستر لاکھ ڈالرز!“ جان نے حیرانی سے کہا۔ ”یہ تو دنیا کا قیمتی ترین ٹرک بن گیا ہے۔“

”بس اس بات کا خیال رکھنا۔“ ماروٹ نے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جان روانہ ہو گیا۔ اس کی پوری ٹیم تھی جس میں اس سمیت چھ افراد تھے اور ان سب کو اپنے کام کا خاصا تجربہ تھا۔ ان کے پاس گاڑیاں اور سامان تھا جن کی مدد سے وہ ہائی وے پر راہزنی کرتے تھے۔ جان اپنے آدمیوں کو لے کر نیواڈا کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

بیکر بہت تھک گیا تھا۔ اس نے شاید ہی کبھی اتنے تسلسل سے ڈرائیونگ کی ہو کیونکہ اسے ٹرک کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹا سے زیادہ نہیں رکھنی تھی ورنہ سامان کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہ بارہ گھنٹے ڈرائیونگ کے بعد صرف چھ گھنٹے کے لیے رکتا تھا اور اس کے بعد دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ نیواڈا کی ریاست میں داخل ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہائی وے پر راہزنی کے معاملے میں یہ سب سے خطرناک ریاست تھی اور یہاں آئے دن ٹرکوں کو سامان سمیت اغوا کرلیا جاتا تھا اور وہ صحرا کی وسعتوں میں غائب ہو جاتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ دن میں سفر کرے گا مگر جب وہ لگاتار چھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ریاست کی حدود میں داخل ہوا تو رات کا آغاز ہی تھا۔ اس وقت وہ آرام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ چھ گھنٹے پہلے ہی تو روانہ ہوا تھا۔ اب دوبارہ اتنی جلدی نہیں رک سکتا تھا ورنہ اس کا سارا شیڈول متاثر ہو جاتا۔ البتہ اس نے سوچ لیا تھا کہ چھ گھنٹے بعد کوئی موٹیل آیا تو وہاں تین گھنٹے کے لیے ہی رک جائے گا اور اتنی دیر میں صبح کے آثار نمودار ہو جاتے تو وہ ریاست میں باقی سفر دن کی روشنی میں کرتا۔

رات ہوتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا مگر اسے فکر نہیں تھی کیونکہ اس کے ٹرک کے کیبن میں ائرکنڈیشنر اور ہیٹر دونوں طرح کے نظام موجود تھے اور اس وقت ہیٹر آن ہونے کے باعث کیبن میں معقول حد تک گرمی تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا ڈٹ کر کھالیا تھا اور رات کے لیے اس نے چند سینڈوچز بنوا لیے تھے تاکہ اسے نیند کا مسئلہ نہ ہو۔ ساتھ میں گرم کافی کا تھرماس تھا۔ اس کی مدد سے وہ سستی دور کر سکتا تھا۔ اس نے ایک ریڈیو اسٹیشن ٹیون کیا اور آنے والے علاقے میں موسم کی رپورٹ سننے لگا۔ وہ سفر کے دوران ان باتوں کا خیال رکھتا تھا۔ رات میں کسی قدر دھند تھی، اس نے رفتار مزید سست کرلی تھی۔ اچانک اسے سڑک پر ایک وین آڑی کھڑی دکھائی دی۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کرنا شروع کر دیا تھا مگر راستہ بند تھا۔ اسے رکنا ہی تھا۔ اس نے بریک پر دباؤ ڈالا۔ ٹرک رکنے لگا۔

☆☆☆

جیو اور اس کے ساتھی ہائی وے کا چکر لگا کر ہی آئے تھے کہ مورین کی کال آگئی۔ ”جیو! ایک اچھی ٹپ ہے مگر اس بار میرا حصہ دس فی صد ہوگا۔“ اس نے کہا۔

”ایسی کون سی ٹپ ہے؟“ جیو نے بے پروائی سے کہا۔ ”اور تم جانتے ہو میں کسی کو چونکانے والا کام نہیں کرتا۔“

”مگر اس وقت معاملہ مختلف ہے۔ تم اس بار ایک ہی ہاتھ مار کر اتنا کمالو گے کہ سالوں میں بھی نہیں کما سکتے۔“

اس بار جیو چونکا۔ ”ایسی کیا بات ہے؟“

”اگر تم مانتے ہو تو میں بتا رہا ہوں۔“

”مجھے منظور ہے۔“ جیو نے سوچ کر کہا۔

”ایک ٹرک ایک مشہور کمپیوٹر ساز کمپنی کی چپس لے کر جا رہا ہے۔ اس میں لاکھوں ڈالرز مالیت کی چپس ہیں اور یہ مارکیٹ میں فوراً بک جائیں گی۔“

”لاکھوں ڈالرز مالیت کی!“ جیو نے سیٹی بجائی۔ ”مگر


ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

اگست 2009ء ساون نمبر کی دلفریبیاں

**انجم انصار** اور **عالیہ بخاری** کے سلسلے وار ناول

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے کچھ اسی تناظر میں **قیصرہ حیات** کا ناول

زندگی ایک ہیرے کے مانند ہے جسے خود تراشنا پڑتا ہے **میمونہ خورشید علی** کے کچھ ایسے ہی کرداروں کی تلاش و جستجو کی کتھا

کارزارِ حیات میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے تگ و دو بہت ضروری ہے...... یادوں کی پرچھائیاں اور حیرت و استعجاب میں ڈوبی **نگہت سیما** کی پُراثر تحریر

بارش کی طلسماتی بوندیں ہر شخص کو اپنے سحر میں مقید کر لیتی ہیں اور ماضی میں دھکیل دیتی ہیں...... کچھ ایسی ہی خوبصورت یادوں کی باتیں...... **شائستہ زریں** کا بھیگا بھیگا سروے

اس کے علاوہ

بارش کی رم جھم پھواریں، **رخسانہ نگار، فرحانہ ناز ملک، عالیہ حرا، عقیلہ حق، سکینہ فرخ، قرۃ العین رائے، ثروت نذیر** اور **تانیہ رحمان** کی یادگار تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

**جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز**
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

یہ اتنی آسانی سے بھی نہیں بکتی ہیں۔"

"میں تمہیں پوری گارنٹی سے بتا رہا ہوں۔ اس ڈرائیور سے میری خود بات ہوئی ہے۔" مورین نے اصرار کیا۔

"اوکے! ٹرک کا نمبر اور دوسری تفصیل بتاؤ۔"

جیو نے ساری معلومات لے کر فون بند کر دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "تیار ہو جاؤ... اس بار بڑا کام کرنا ہے۔"

اس کی بات سن کر ماریا نے کہا۔ "ہم کمپیوٹر چپس کے فروخت کریں گے؟"

"تم فکر مت کرو... یہ بھی آسانی سے بک جاتی ہیں بلکہ ان کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔ ایک شخص ہے جو انہیں فوراً خرید لے گا۔"

"وہ کون ہے؟"

"تم نے ماروٹ کیرنز کا نام سنا ہے؟"

"اسے کون نہیں جانتا... دو نمبر کاموں کا بادشاہ ہے۔" جوزیو بولا۔

"وہ ان چپس کو ہاتھوں ہاتھ لے لے گا کیونکہ اسے اپنے نقلی آلات کے لیے ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔" جیو نے کہا۔ "اب تیار ہو جاؤ... ہمارے پاس ٹرک کو روکنے کے لیے چار گھنٹے ہیں۔"

"اسے یہاں لانا ہوگا؟" ماریا نے پوچھا۔

"ہاں کیونکہ وہ اٹھارہ وھیلر ہے۔ اسے چھپانے کے لیے یہی جگہ موزوں ہے۔"

ایک گھنٹے بعد وہ وین لے کر روانہ ہو رہے تھے۔ ریکی کے لیے جوزیو کی بائیک بھی ساتھ تھی۔ رات کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ بھی اچھی بات تھی کیونکہ رات میں کام آسان ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

وین سے کچھ فاصلے پر جیسے ہی بیکر نے ٹرک روکا، فوراً ہی دونوں طرف سے دو افراد کیبن پر چڑھ آئے۔ وہ مسلح اور نقاب میں تھے۔ بیکر کے پاس ایک پستول تھا مگر دو افراد اور شاٹ گنز کے سامنے وہ بے کار تھا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ اوپر کر لیے۔ انہوں نے آتے ہی کیبن کی تلاشی لی اور پھر اس کی تلاشی لے کر پستول برآمد کر لیا۔ پھر ان میں سے ایک نے جیب سے سیٹی نکال کر بجائی تو آگے کھڑی وین حرکت میں آ گئی۔

"تم لوگ کون ہو؟" بیکر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"اب بھی پوچھ رہے ہو۔" ایک نے سپینش لہجے میں کہا۔

"فضول باتیں کرنے کے بجائے اس وین کے پیچھے پیچھے چلو۔" دوسرے نے اسے حکم دیا۔

بیکر نے ٹرک آگے بڑھا دیا۔ "اگر تم نے سامان کی خاطر ٹرک اغوا کیا ہے تو میں بتا دوں کہ یہ عام ٹرک نہیں ہے۔ اس میں بہت خاص سامان ہے اور اس کے ہائی وے سے ہٹتے ہی اس کی تلاش شروع ہو جائے گی۔"

"چپ کرو۔" امریکی لہجے والے نے اسے جھڑکا۔

"میرا خیال ہے کہ باس کو اس بارے میں بتا دو۔" اسپینی لہجے والے نے کہا۔ اس پر دوسرے نے سوچا اور پھر جیب سے ایک موبائل نکالا۔

"میں بول رہا ہوں۔" اس نے نام لیے بغیر کہا۔ "ڈرائیور کا کہنا ہے کہ ٹرک میں ٹریکر ہے۔"

پھر دوسری طرف سے ہدایات سن کر اس نے موبائل بند کر دیا اور ڈرائیور سے بولا۔ "ذرا آگے جہاں ٹرک کچے راستے پر مڑے گا اسے روک لینا۔"

"اوکے! جیسا تم کہو... لیکن پلیز مجھے کچھ مت کہنا۔ میں صرف ایک ڈرائیور ہوں۔" بیکر نے التجا کی۔

"تم فکر مت کرو اگر تم نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" امریکی لہجے والے شخص نے اسے تسلی دی۔ بیکر کو تسلی ہو گئی کہ وہ اسے قتل نہیں کرنا چاہتے۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ کوئی غلط حرکت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ کچھ دیر بعد وین ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ ذرا آگے جا کر وہ رکی تو بیکر نے بھی ٹرک روک لیا۔

جیو وین سے اتر کر آیا۔ اس کے پاس ایک جدید آلہ تھا۔ اس نے اس کی مدد سے ٹرک کا معائنہ کیا اور جلد سگنل پکڑ لیا۔ سگنل کنٹینر کے اندر سے آ رہا تھا۔ اسے روکنے کے لیے کنٹینر کو کھولنا ضروری تھا۔ اس نے آسان حل نکالا اور ایک جامر کنٹینر کی سطح پر چپکا دیا۔ یہ جدید قسم کا چھوٹا سا جامر تھا جو ۳۰ فٹ کے دائرے میں ہر قسم کے سگنل جام کر دیتا تھا۔ اب کنٹینر میں لگا ٹریکر بے کار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ پھر آگے روانہ ہو گئے۔ بیکر پریشان تھا، وہ اسے بھی لے جا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے بارے میں ان کے ارادے ٹھیک نہیں تھے، تب ہی وہ اسے اپنے ٹھکانے کی طرف لے جا رہے تھے اور ایسے شخص کو وہ کس طرح چھوڑ سکتے تھے جس نے ان کا ٹھکانا دیکھ لیا ہو۔

"سنو... اگر تم نے ٹرک لے جانا ہے تو لے جاؤ، مجھے جانے دو۔" اس نے بنتی لہجے میں کہا۔

"خاموش رہو تمہیں کچھ نہیں ہوگا، ہم ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس سے پولیس ہماری طرف متوجہ ہو جائے۔" اسپینی لہجے والے شخص نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے درمیان میں بٹھا لیا اور ڈرائیونگ امریکی لہجے والے شخص نے سنبھال لی۔ بیکر نے کسی قدر سکون کا سانس لیا۔ اسے اس وقت فیرن شدت سے یاد آ رہی تھی۔ وہ نہ جانے کیا کر رہی ہوگی؟ اسے خبر بھی نہیں ہوگی کہ اس کا شوہر کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

☆☆☆

جان کیڈ اپنی وین میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا اور اس وقت وہ ایک سیٹلائٹ کی مدد سے بیکر کے ٹرک کو دیکھ رہا تھا۔ یہ اصل میں ٹریکر کمپنی کا ہی سیارچہ تھا جس کا سگنل اس نے پکڑ لیا تھا اور اس کی مدد سے ٹرک پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نقشے کے مطابق وہ ابھی ٹرک سے کوئی دو سو میل کے فاصلے پر تھے۔ اس کا ایک ساتھی ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ باقی تاش کھیل رہے تھے۔ جان نے اپنے لیے ایک بیئر نکالی اور اس کا گھونٹ لیا تھا کہ اچانک ہی ٹرک رک گیا۔ اس نے چونک کر اسکرین پر دیکھا۔ واقعی ٹرک رک گیا تھا مگر پھر وہ مطمئن ہو گیا کہ ممکن ہے ڈرائیور کو فطرت نے پکارا ہو۔ چند لمحے بعد ٹرک دوبارہ حرکت میں آیا تو اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اسکرین پر ہائی وے کا جال سا نظر آ رہا تھا اور ٹرک ایک جلتے بجھتے نقطے کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔

مگر کوئی دس منٹ بعد ٹرک پھر رکا اور اچانک ہی جلتا بجھتا نقطہ اسکرین سے غائب ہو گیا۔ وہ اچھل پڑا۔ اس نے جھپٹ کر سیل فون اٹھایا اور ماروٹ کو کال کی۔ اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ "کسی نے ہمارے پہنچنے سے پہلے ٹرک اغوا کر لیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" ماروٹ نے خفگی سے کہا۔

"یقین کریں جناب... اب ٹرک ٹریکر پر نہیں آ رہا ہے۔"

"تم کتنی دور ہو؟"

"کوئی دو سو میل۔"

"فوری طور پر اس جگہ پہنچو... ممکن ہے کہ ٹرک ابھی وہیں ہو۔"

"یس باس!" جان نے کہا اور ڈرائیونگ کرنے والے کو پوری رفتار سے چلنے کا حکم دیا۔ اس نے فوری طور پر وین کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔

☆☆☆

جیسے ہی ٹرک ٹریکر سے غائب ہوا، کمپنی کے سینٹر میں کھلبلی مچ گئی۔ فوری طور پر پولیس کو اس کی اطلاع دی گئی تھی۔ اتفاق سے یہ بات ایک ٹی وی رپورٹر کے علم میں آ گئی تھی اور آدھے گھنٹے کے اندر یہ خبر اس چینل سے نشر ہو رہی تھی۔ اس کے پاس ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام تک تھا۔ اس کے چند منٹ بعد بیکر کے ایک دوست نے اس کے گھر فون کیا۔ فیرن سو رہی تھی۔

"فیرن! تم نے خبر سنی۔" بیکر کے دوست نے اس سے کہا۔

"کون سی خبر؟" فیرن بے زاری سے بولی۔

"ٹی وی لگاؤ۔ بیکر کا ٹرک غائب ہو گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش کر رہی ہے۔"

فیرن نے فون پٹخا اور جھپٹ کر ٹی وی آن کر دیا جس پر بیکر کے بارے میں خبر آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کے مطابق قیمتی چپس سے لدے اس ٹرک کو لازمی طور پر ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا اور ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ ڈرائیور کے بارے میں پولیس نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ اسے یا تو مار دیا گیا تھا یا پھر ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ فیرن کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس نے جلدی سے پولیس کا نمبر ملایا۔ وہ اس وقت بیکر کے لیے بہت پریشان تھی اور سارے اختلافات بھول گئی تھی۔ اس کے دل سے اس کی سلامتی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

بیکر ان دونوں کے درمیان میں سہما بیٹھا ہوا تھا۔ ایک گھنٹا گزر چکا تھا اور سفر ابھی جاری تھا۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ ٹرک کس طرف جا رہا ہے۔ آخر ٹرک رکا اور اسے کسی نے سہارا دے کر ٹرک سے اتارا۔ لمس بتا رہا تھا کہ یہ کوئی عورت تھی۔ اس کے پاس سے بڑی بھینی سی خوشبو آ رہی تھی۔ بیکر نے کان لگا کر سننا چاہا مگر یہاں کوئی آواز نہیں تھی، بالکل سناٹا تھا... جیسے وہ ہائی وے سے دور کسی ویرانے میں ہوں۔ اسے لا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا مگر اسے آنکھوں سے پٹی اتارنے کی اجازت نہیں تھی، اسپینش لہجے والے شخص نے بتایا۔

"دوست یہ تمہارے اپنے مفاد میں ہے۔ ایسی کسی کوشش میں تم اس جگہ کے بارے میں جان گئے تو پھر ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔"

"دوسری صورت میں تمہیں تمہارے ٹرک سمیت ہائی وے پر چھوڑ دیں گے۔" اس بار ایک نئی مردانہ آواز نے کہا۔ بولنے والا جیو تھا۔ وہ ٹرک کو بیرک کے اندر لے آئے تھے تاکہ اگر پولیس ہیلی کاپٹر استعمال کرے، تب بھی ٹرک کو نہ

دیکھ سکے۔ ماریا کو بیکر کے سر پر چھوڑ کر وہ ٹرک کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ سیل بند کنٹینر تھا اور اسے کھولنا آسان نہیں تھا مگر ان کے پاس سامان تھا۔ جوزیو اور بریٹ ویلڈنگ ٹارچ لے آئے اور انہوں نے دس منٹ میں کنٹینر کے دروازے کو سیل کرنے والی دونوں فولادی راڈز کاٹ ڈالیں۔ راڈز ہٹا کر انہوں نے کنٹینر کا دروازہ کھولا تو اندر مخصوص سائز کے ایلومینیم کے سیل بند باکس تھے۔ ان میں چپس تھیں اور پورا کنٹینر ان باکسز سے بھرا ہوا تھا۔ جیو کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ یہ بلاشبہ ملین ڈالرز کا سامان تھا اور اسے امید تھی کہ اسے ان کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ اس نے بریٹ سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ماروٹ سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔ "ہمارے پاس اس سے رابطے کا نمبر نہیں ہے۔"

"نمبر لینا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر یہاں سے اور اپنے نمبر سے کال کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" جیو نے سوچ کر کہا۔ "ہمیں باہر سے جا کر کال کرنی ہوگی۔"

"کب کال کرنی ہے؟"

"جیسے ہی روشنی ہوگی۔ بریٹ! تم جا کر وین بھی اندر لے آؤ اور یہاں سے ایسی تمام چیزیں ہٹا دو جن سے پتا چلے کہ یہاں کوئی رہتا ہے۔" جیو نے حکم دیا اور ماریا کے پاس آیا۔ "اس کی پوری نگرانی کرنا۔ بہتر ہوگا کہ اس کے ہاتھ کرسی سے باندھ دو۔"

ماریا نے بیکر کے ہاتھ باندھ دیے۔ اس نے زبانی احتجاج کیا مگر عملاً کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ جیو اور ماریا آرام کرنے چلے گئے' جوزیو بھی ایک طرف دراز ہو گیا اور بریٹ بیکر کی نگرانی کرنے لگا۔ تین گھنٹے بعد جیو اندر سے نکلا پھر اس نے بریٹ کو آرام کرنے بھیج دیا۔ اب بیکر کی نگرانی جوزیو کر رہا تھا۔ جیو اور ماریا بانک پر ہائی وے کی طرف روانہ ہوئے تاکہ ماروٹ کو کال کر سکیں۔

☆☆☆

ماروٹ اپنے آدمیوں سے مسلسل رابطے میں تھا، وہ اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں آخری بار ٹرک نظر آیا تھا۔ ظاہر ہے، اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ جان پریشان تھا کہ وہ اپنے باس کو کیا منہ دکھائے گا کیونکہ وہ دعویٰ کر کے آیا تھا کہ وہ ٹرک لے آئے گا۔ اس نے ماروٹ کو کال کی۔

"باس! یہاں ٹرک کا نام و نشان نہیں ہے اور نہ ہی راستے میں ایسا کوئی ٹرک نظر آیا ہے۔"

"احمق... تمہارا کیا خیال ہے، ہائی جیک کرنے والے ٹرک کو ہائی وے پر رکھیں گے۔" ماروٹ نے اسے جھڑکا۔ "تم خود کیا کرتے ہو؟"

"سوری باس!" جان نے خفت سے کہا۔

"اسے ہائی وے کے آس پاس دیکھو۔"

"ابھی تو تاریکی ہے باس۔"

"صبح ہونے والی ہے۔ ایسے راستوں پر خاص طور سے دیکھنا جن سے اتنا بڑا ٹرک گزر سکتا ہو اور ٹائروں کے نشانات چیک کرنا۔"

"میں سمجھ گیا باس۔" جان نے مستعدی سے کہا۔ حالانکہ ابھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہائی وے کی دونوں جانب بے شمار راستے تھے جن پر ٹرک لے جایا جا سکتا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ ٹرک ہائی جیک کرنے والے اسے کہاں لے گئے تھے۔ ویسے بھی اسے ٹرک ہائی جیک کرنے کا تجربہ تھا لیکن ایک ہائی جیک کیے جانے والے ٹرک کو تلاش کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی اسے یہ کام آتا تھا۔ اس لیے وہ آرام سے بیٹھ گیا۔ جب تک صبح نہیں ہو جاتی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف ماروٹ کا فکر سے برا حال تھا کیونکہ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ایک ہائی جیک ہونے والے ٹرک کو پولیس بھی بہت مشکل سے تلاش کر پاتی ہے۔ اس کے آدمیوں کو تو اس کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ ٹرک مل سکے۔ کوئی دوسری پارٹی اس کے آدمیوں سے پہلے فائدہ اٹھا گئی تھی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اور اس وقت تو اس کا افسوس اور بھی بڑھ گیا جب ٹرک کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اس میں موجود کمپیوٹر چپس کی مالیت ستر لاکھ ڈالرز سے زیادہ تھی۔ کچھ دیر میں صبح نمودار ہونے لگی۔ اس نے اپنے لیے کافی بنائی۔ وہ اپنے دفتر میں ہی تھا اور یہیں سے اپنے آدمیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے یہ سوچ کر فون اٹھایا کہ اس کے آدمیوں کی کال ہوگی مگر دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز آئی۔ "مسٹر کیرنز؟"

"بات کر رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا اور نمبر دیکھا۔ یہ کسی کال بوتھ کا نمبر تھا۔ "بولو کیا بات ہے؟"

"مجھے تم سے ایک بزنس ڈیل کرنی ہے۔"

"میں اتنی صبح بزنس نہیں کرتا۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"او کے... تمہاری مرضی!"



"ایک منٹ۔" ماروٹ نے کہا۔ "تم بزنس کی نوعیت بتاؤ گے؟"

"بے کار ہے کیونکہ تم اتنی صبح بزنس نہیں کرتے۔"

"لیکن کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔"

"اگر تم خبریں دیکھ رہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ نیواڈا میں ایک ٹرک غائب ہو گیا ہے جس میں خاصی بڑی مالیت کی کمپیوٹر چپس موجود ہیں۔"

"ہاں شاید ایسی کوئی بات ہوئی تو ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا مگر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"لگتا ہے میں نے تمہیں غلط فون کر دیا... گڈ بائی مسٹر کیرنز!"

"ایک منٹ!" ماروٹ نے جلدی سے کہا۔ "لگتا ہے تم بہت جلدی میں ہو۔ کسی بھی قسم کے بزنس میں وضاحت ضروری ہوتی ہے۔ اگر میں نے کسی ٹرک کے بارے میں خبر دیکھی ہے تو اس سے تمہیں کیا؟"

"کیا تمہیں اس خبر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"اگر میں کہوں ہے تو...؟"

"تو میں کہوں گا کہ یہ میرے پاس ہے۔"

"کیا ٹرک تمہارے پاس ہے؟"

"مسٹر کیرنز! اتنی بے پروائی سے کام مت لو۔" اس آدمی نے درشتگی سے کہا۔ "فون محفوظ نہیں ہوتا۔"

"او کے... اگر وہ تمہارے پاس ہے تو تم نے مجھے کیوں فون کیا ہے؟"

"کیا تمہیں اس کی ضرورت ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ فون پر اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں ہے۔ ایسا کرو، کوئی جگہ بتاؤ جہاں میرا آدمی تم سے آ کر مل لے۔"

"ہائی وے انیس پر ستروس میل پر ایک بار ہے، کولڈ بے لی کے نام سے... میں وہاں تمہارے آدمی سے مل سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آج شام تک میرا آدمی وہاں تم سے رابطہ کر لے گا۔ وہ سات بجے تک پہنچ جائے گا۔"

"اس سے کہنا کہ اپنے کالر میں کالا گلاب لگا کر آئے۔ میں اس سے مل لوں گا۔" اس آدمی نے کہا۔ "اور یاد رکھنا، میں جو سودا کروں گا وہ نقد ہوگا، اس میں ادھار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔"

"تم فکر مت کرو، میں بھی نقد کام کرنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے بھی ادھار پسند نہیں ہے۔" ماروٹ نے معنی خیز انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے فون پر آنے والا نمبر نوٹ کیا اور اس کے بعد جان کو کال کی۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ جو چیز اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی وہ تقدیر نے پھر سے اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔

"جان... معلوم کرو کہ نیواڈا میں اس نمبر کا فون بوتھ کہاں ہے اور دوسرے تم نے آج شام کولڈ بے بی نامی بار میں ایک شخص سے ملنا ہے۔"

اس نے جان کو ساری بات سمجھائی۔ وہ بھی پُرجوش ہو گیا تھا۔ "باس! یہ تو کمال ہو گیا ورنہ ان لوگوں کو تلاش کرنا سوئی کو بھوسے میں تلاش کرنے کے برابر تھا۔"

"اب کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔" ماروٹ نے اسے خبردار کیا۔ "وہ بے خبر ہیں اور انہیں بے خبری ہی میں مارنا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا باس۔" جان نے کہا۔

☆☆☆

بیکر کو اس جگہ بندھے ہوئے کئی گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اس کے ہاتھ اکڑ گئے تھے اور اسے شدت سے حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ آخر اس نے دل کڑا کر کے اپنی تکلیف کا اعلان کر دیا۔ امریکی نے پاس سے کہا۔ "شور مت کرو۔"

"مجھے واش روم جانا ہے۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

اسے جواب نہیں ملا مگر کچھ دیر بعد اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا گیا اور ایک جگہ لا کر اس کے ہاتھ کھول دیے گئے مگر آنکھوں سے پٹی نہیں اتاری گئی۔ اسی حالت میں اس نے اپنی تکلیف دور کی اور پھر اسے واپس لا کر کرسی پر بٹھا کر دوبارہ باندھ دیا گیا۔ اس نے کہا۔ "سنو... تم لوگوں نے جو لینا تھا، وہ لے لیا ہے... اب مجھے جانے دو۔"

"اتنی جلدی نہیں، ابھی ہمیں کچھ کام کرنا ہے... اس کے بعد تمہیں آزاد کر دیں گے۔" امریکی نے نرمی سے کہا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے اسے ناشتا کرایا اور گرم کافی بھی دی۔ ان کا رویہ نرم تھا۔ اس سے بیکر کو کچھ ڈھارس بندھی تھی کہ شاید وہ اسے سچ مچ چھوڑ دیں۔ اپینی شخص اس سے کسی قدر بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ بیکر نے اسے بتایا کہ اس کا اپنی بیوی سے اسی بات پر جھگڑا تھا کہ وہ یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ اور اس بار تو اس کی بیوی نے آخری نوٹس بھی دے دیا تھا۔ جوزیو نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"میرے پرس میں اس کی تصویر ہے، دیکھ لو۔"

جوزیو نے اس کے پرس سے فیرن کی تصویر نکال کر دیکھی اور حیرت سے بولا۔ "تمہاری بیوی اتنی حسین ہے اور تم اس کی ایک بات نہیں مان سکتے۔ میری بیوی ایسی ہو تو میں اس کے کہنے پر سب چھوڑ دوں۔"

"مجھے اس کام سے عشق ہے۔"

"تم احمق ہو... عشق انسان سے ہوتا ہے، کام اور چیزوں سے کون عشق کرتا ہے۔"

"کیوں، تم لوگ بھی تو پیسے کے لیے اتنا خطرناک کام کرتے ہو۔" بیکر نے بے ساختہ کہا اور پھر ڈر گیا۔ "سوری! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

جوزیو ہنسا۔ "نہیں، تم نے ٹھیک کہا۔ بہرحال، میرا خیال ہے کہ تم اپنی بیوی کی بات مان لو۔ ویسے بھی اب یہ کام خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ میں اکیلا ہوں اس لیے مجھے زیادہ احساس نہیں ہے۔ ممکن ہے کل کو میری بیوی آ کر مجھ سے یہ کام چھڑوا دے۔"

اس دوران میں جیو اور ماریا لوٹ آئے تھے۔ ماریا بیکر کی نگرانی کرنے لگی اور جیو ان دونوں کو ماروٹ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

"اب شام کو کیرنز کے آدمی سے ملنے جانا ہے۔"

بریٹ نے کہا۔ "تمہارا جانا مناسب نہیں ہے... میرا خیال ہے کہ میں چلا جاتا ہوں۔"

"میں بھی تو جا سکتا ہوں۔" جوزیو نے شکوہ کیا۔

"نہیں، تم لہجے سے پکڑے جاؤ گے۔" جیو نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اس سے کہا تھا کہ میں آؤں گا۔"

"میرا لہجہ امریکی ہے۔" بریٹ نے سر ہلایا۔ "تم دونوں میرے پیچھے رہو گے... ممکن ہے وہ کوئی چکر چلائے۔"

"ہو سکتا ہے۔" جیو نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہمیں پتا چلانا ہے کہ کنٹینر میں موجود سامان کی مالیت کیا ہے؟"

جیو اور ماریا آتے ہوئے کھانے پینے کا سامان بھی لے آئے تھے۔ جیو کی وین میں ایک سیٹلائٹ ریسیور موجود تھا۔ اس کی مدد سے وہ کئی چینلز دیکھ سکتے تھے۔ اس نے خبریں دیکھیں اور یہ جان کر وہ اچھل پڑا کہ کنٹینر میں موجود چپس کی مالیت ستّر لاکھ ڈالرز تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے چور مارکیٹ میں بھی بیچتے تو کم سے کم نصف قیمت تو مل جاتی۔ پینتیس لاکھ ڈالرز کا سوچ کر ہی اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ کسی بڑے شہر میں اپنا سیٹ اپ قائم کر کے کئی سال عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس نے ان تینوں کو بتایا تو وہ بھی پُرجوش ہو گئے۔

☆☆☆

جان نے اپنے کوٹ کے کالر پر سیاہ گلاب لگا رکھا تھا۔ وہ ٹھیک سات بجے کولڈ بے بی نامی بار میں داخل ہوا تھا اور اس کے ساتھی باہر موجود تھے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا جس کی مدد سے وہ اپنے ساتھیوں سے رابطے میں تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بریٹ اندر آیا اور اس نے سیاہ گلاب دیکھتے ہی جان کی میز کا رخ کیا۔ جان نمایاں جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"ہیلو... میں ٹرک کے حوالے سے آیا ہوں۔"

"میں ایم کے کا نمائندہ ہوں۔" جان نے کہا۔

بریٹ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "ٹرک ہمارے پاس ہے۔"

"تمہارا مطالبہ کیا ہے؟"

"اصل قیمت کا ساٹھ فی صد!"

"تم پانچ منٹ رکو... میں باس سے بات کر کے آتا ہوں۔"

بریٹ احتیاطاً اکیلا آیا تھا اور جیو اس کے پیچھے تھا۔ جان نے باہر جا کر ایک فون بوتھ سے ماروٹ کا نمبر ملایا۔

"باس! وہ ساٹھ فی صد مانگ رہے ہیں۔"

"ان کا دماغ خراب ہے۔" ماروٹ غرّایا۔ "چوری کے مال کے اتنے کون دیتا ہے؟"

"باس! مان لینے میں کیا حرج ہے؟ ہم نے کون سا دینا ہے۔"

"نہیں، بارگیننگ کرو ورنہ انہیں شک ہو جائے گا۔" ماروٹ نے اسے ہدایت کی۔ "چوتھائی سے شروع کر کے چالیس فی صد تک آ جانا... اس سے زیادہ اوپر جانے سے انکار کر دینا۔"

"ٹھیک ہے باس!"

"اپنے آدمیوں سے کہنا پوری طرح ہوشیار رہیں، یہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔"

جان اندر آیا اور اس نے بریٹ کے سامنے بیٹھتے ہی کہا۔ "باس چوتھائی سے زیادہ دینے پر آمادہ نہیں ہے۔"

"لگتا ہے تمہارے باس نے مجھے وقت ضائع کرنے کے لیے بلایا ہے۔" بریٹ کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ!" جان نے جلدی سے کہا۔ "ابھی بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

بریٹ پھر سے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ان دونوں میں بحث ہوتی رہی پھر جان چالیس فی صد پر آ کر اٹک گیا۔ بریٹ نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں اپنے ساتھیوں سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔"

بریٹ باہر آیا۔ اس نے بھی فون بوتھ سے جیو کو کال کی جو کچھ دور موجود تھا۔ "وہ چالیس فی صد سے زیادہ نہیں دے رہے ہیں۔"

"چالیس فی صد کم ہیں۔" جیو نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بھی ٹھیک ہیں۔"



"نہیں، اس کو ابھی جواب مت دو۔ اس سے کہو کہ کل اسی وقت یہاں ملے۔" جیو نے کہا۔ "پھر تم ہدایت کے مطابق موٹیل چلے جاؤ۔ میں دیکھوں گا کہ کوئی تمہارے پیچھے تو نہیں آ رہا۔"

بریٹ اندر آیا اور اس نے جان سے کہا۔ "ابھی ہم اس پر بات کریں گے اور اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔ تم کل اسی وقت یہاں آ سکتے ہو؟"

"ہاں میں آ جاؤں گا۔" جان نے سر ہلایا۔

بریٹ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ایک مقامی موٹیل کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ ان لوگوں کو شبہ تھا کہ ان کا تعاقب کیا جائے گا۔ وہ اپنی بانک پر تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے عقب میں روشنیاں دیکھیں لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ وہ سیدھا موٹیل پہنچا جہاں اس کے پاس ایک کمرا تھا..... یہ خاصی بارونق جگہ تھی جہاں کوئی اس کے خلاف کچھ کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا۔ یہاں وہ محفوظ تھا۔ ماروٹ کیرنز اس دنیا کا مگرمچھ تھا اور اس سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو بہت جتن کرنا پڑ رہے تھے۔

☆☆☆

جیو واپس آیا تو ماریا اور جوزیو، بیکر کے ساتھ گپیں مار رہے تھے۔ اس نے ان کو ایک طرف بلایا۔ "مجھے لگ رہا ہے کیرنز کنٹینر مفت میں حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کے آدمیوں کا یہاں پورا ٹولہ ہے۔"

"بریٹ تو ٹھیک ہے؟" جوزیو نے پوچھا۔

"ہاں، وہ محفوظ ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ایک بار کیرنز سے براہ راست بات کر کے دیکھو۔" ماریا نے اسے مشورہ دیا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" جیو نے کہا۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" جوزیو نے بیکر کی طرف دیکھا۔

"جیسے ہی سودا ہو گا، ہم جانے سے پہلے اسے یہاں چھوڑ جائیں گے۔" جیو نے جواب دیا۔

"یہ بے چارہ اپنی بیوی کے لیے بہت پریشان ہے۔" ماریا بولی۔

جیو ہنسا۔ "حالانکہ پریشان اس کی بیوی کو ہونا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے کہ اسے سونے کے لیے وین میں بند کر دیتے ہیں۔" ماریا کی اس تجویز پر جیو نے اسے گھورا۔

"تاکہ یہ وین لے کر فرار ہو جائے۔"

طے پایا کہ بیکر الاؤ کے پاس ہی سوئے گا اور ان میں سے ایک اس کی نگرانی کرے گا۔ پہلے جوزیو کے ذمے یہ کام لگا اور جیو ماریا کے ساتھ سونے کے لیے چلا گیا۔ رات دو بجے جیو آ گیا اور جوزیو سونے چلا گیا۔ جب صبح کے آثار نمودار ہوئے تو جیو نے ماریا کو اٹھا دیا۔

"اب تم اسے دیکھو... میں کیرنز کو کال کرنے جا رہا ہوں۔"

جیو بانک لے کر نکلا۔ اس نے ایک دوسرے بوتھ سے ماروٹ کو کال کی۔ وہ دفتر میں ہی تھا۔ "کل تمہارا آدمی مجھ سے ملا تھا۔"

"وہ تم نہیں تھے؟" ماروٹ نے کہا۔

"وہ میرا آدمی تھا... مگر میں اس آفر کو مسترد کرتا ہوں۔ میں پچاس فی صد سے ایک ڈالر بھی کم نہیں لوں گا۔"

"دیکھو، یہ لوٹ کا مال ہے۔" ماروٹ نے اس سے کہا۔

"ہاں مگر یہ بہت خاص مال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی دوسری پارٹی مجھے اس کے عوض ساٹھ فی صد دے دے گی۔"

"یہ بھول ہے تمہاری۔" ماروٹ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اس کا سودا سوائے میرے کوئی نہیں کرے گا۔"

"چلو دیکھ لینا۔" جیو ہنسا۔ "اور ہاں اگر تمہیں میری قیمت قبول ہو تو اپنے آدمی سے کہنا کہ اپنے کالر میں سرخ گلاب لگا کر آئے۔ میں اس سے ملوں گا نہیں، صرف دیکھ کر چلا جاؤں گا۔"

"پھر بات کیسے ہو گی؟"

"بات میں تم سے اسی نمبر پر کروں گا... یا مجھے کوئی نمبر دے دو۔"

"میں تمہیں اسی نمبر پر ملوں گا۔"

"اب بات کا انحصار اس پر ہے کہ تم میری دی ہوئی قیمت پر راضی ہو جاؤ ورنہ میں کسی اور پارٹی سے بات کر لوں گا۔" جیو نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

بریٹ نے جان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ لیا تھا وہ ایک بڑی سی وین میں تھے اور انہوں نے موٹیل سے کچھ دور ہی وین پارک کی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک آ کر اسی لائن کے ایک کمرے میں مقیم ہو گیا تھا جس میں بریٹ رہ رہا تھا۔ وہ پوری طرح اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ بریٹ نے دل ہی دل میں جیو کو داد دی جس نے یہ منصوبہ بنایا تھا ورنہ یہ اب تک ان کے ٹھکانے پر پہنچ کر ٹرک پر قبضہ کر چکے ہوتے۔ صبح سویرے اسے جیو کی کال آئی اور اس نے اسے ساری رپورٹ دی۔ جیو نے اسے ماروٹ کیرنز سے ہونے والی گفتگو سے

آگاہ کیا۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ ان لوگوں کی نیت خراب ہے اور یہ ہم سے مال چھیننا چاہتے ہیں۔'' بریٹ بولا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے مگر آج شام تک دیکھ لیتے ہیں۔''

''دیکھنے کون آئے گا؟''

''میں۔'' جیو نے کہا۔ ''تمہارا اس وقت کمرے سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

''کیا یہ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کریں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ کر بھی سکتے ہیں... کیونکہ میں نے انہیں تقریباً انکار کر دیا ہے۔ تمہارے پاس پستول ہے؟''

''ہاں، وہ تو ہر وقت تیار ہوتا ہے۔''

''اگر یہ تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کریں تو تم اپنا پورا بچاؤ کرنا۔''

''اگر میں یہاں سے نکل جاؤں؟''

''نہیں، ابھی نہیں... پہلے میں ان لوگوں کو دیکھوں گا اس کے بعد تمہیں وہاں سے نکالیں گے۔''

جیو سے بات کر کے بریٹ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا تھا۔ اگرچہ اس قسم کے حفاظتی انتظامات ان لوگوں کو روکنے کے قابل نہیں تھے جو اس کی نگرانی کر رہے تھے۔

☆☆☆

جیو اور ماریا کولڈ بے بی بار میں موجود تھے اور ایک محبت کرنے والے جوڑے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ ویسے تو وہ ایک دوسرے سے سچ مچ محبت کرتے تھے مگر اس وقت وہ اداکاری کر رہے تھے۔ وہ چھ بجے سے بار میں موجود تھے۔ سات بجے جان بار میں داخل ہوا۔ آج اس نے کالر پر سرخ گلاب لگا رکھا تھا۔ اس نے ایک نظر بار کا جائزہ لیا اور اسی میز پر آ بیٹھا۔ جیو نے اسے ایک نظر دیکھا اور دوبارہ ماریا میں مگن ہو گیا۔

ماریا نے سرگوشی میں کہا۔ ''اس نے سرخ گلاب لگا رکھا ہے۔''

''یہ دھوکا ہے۔'' جیو نے جوابی سرگوشی کی۔ ''یہ ہم سے مال چھین لینا چاہتے ہیں۔''

''پھر یہاں آنے کا مقصد؟''

''ایک تو میں کیرنز سے بات کروں گا۔ دوسرے ہمیں بریٹ کو بھی اس جگہ سے نکالنا ہے۔''

''وہ کیسے نکالیں گے؟''

''ابھی نکالیں گے، یہ ابھی یہاں ہیں۔'' جیو مسکرایا اور ماریا کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نشے میں جھومنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ جیو نے ایک کار کرائے پر لی تھی جو باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس میں وہاں سے روانہ ہوئے۔

''اتنی محنت کے بعد بھی ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔'' ماریا مایوسی سے بولی۔

''اس قسم کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہے۔'' جیو نے اسے تسلی دی۔ ''اور مال ابھی ہمارے پاس ہے، ہم اس کا کوئی اور گاہک تلاش کر لیں گے۔''

''مشکل ہے... جنہیں ہم مال بیچتے ہیں، وہ اتنی بڑی چیز نہیں لے سکتے۔''

''تم فکر مت کرو... کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' جیو نے کہا اور موبائل نکال کر بریٹ سے رابطہ کیا۔ ''ہم آ رہے ہیں تمہیں لینے کے لیے۔''

''یہاں اب وہی ہے جو میرے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرا ہے۔ باقی گئے ہوئے ہیں۔''

''گڈ! تم نکل کر بار میں آؤ اور جیسے ہی میں مس کال دوں، باہر نکل کر ایک نیلے رنگ کی فورڈ میں آ جانا۔''

''میں سمجھ گیا۔''

کچھ دیر میں وہ اس موٹیل کی پارکنگ میں تھے۔ جیو اور ماریا نے کار سے نکل کر وہاں موجود ہر گاڑی کے ایک عقبی ٹائر کی ہوا نکالنا شروع کر دی۔ وہاں کل چار ہی گاڑیاں اور دو موٹر سائیکلیں تھیں۔ جب ماریا آخری بائیک کے پہیے کی ہوا نکال رہی تھی تو جیو نے کار کا انجن اسٹارٹ کر کے بریٹ کے موبائل پر مس کال دی تو وہ دوڑا ہوا چلا آیا۔ وہ اور ماریا ایک ساتھ کار میں گھسے اور جیو نے کار دوڑا دی۔ اس نے عقبی آئینے میں ایک آدمی کو دوڑتے ہوئے باہر آتے اور ایک کار کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

''یہ خبیث کسی بدروح کی طرح میرے پیچھے تھا۔'' بریٹ نے عقبی نشست سے کہا۔

''فکر مت کرو، اس سے جان چھوٹ گئی ہے۔'' جیو ہنسا۔ ''ہم نے ساری کاروں کے پہیوں کی ہوا نکال دی ہے۔''

''شان دار۔'' بریٹ بھی ہنس دیا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''اب میں کیرنز سے آخری بار بات کروں گا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ نہیں مانے گا۔ وہ تو مال مفت میں لینے کی فکر میں ہے۔''

''ایک بار بات کرنے میں حرج نہیں ہے۔'' جیو فکر مند سا تھا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ جن کے ساتھ ہم ڈیل کرتے ہیں، وہ پچاس ساٹھ ہزار ڈالرز والی پارٹیاں ہیں۔ تیس چالیس لاکھ ڈالرز کی ڈیل وہ نہیں کر سکتیں۔''



یہ درست تھا، وہ سب ہی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ جیو نے جہاں سے کار کرائے پر لی تھی، وہ واپس کی۔ اس سے کچھ ہی دوران کی دین کا پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ وہ اس میں سوار ہو کر اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

''وہ کار سے ہمارا سراغ لگا سکتے ہیں۔'' ماریا نے کہا۔

''نہیں، میں نے پک اپ اسی وجہ سے دور کھڑی کی تھی۔''

وہ کوڈام پہنچے تو جوزیو ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے مل کر میٹنگ کی اور اس میں ساری صورتِ حال رکھی۔ ''یہ تو طے ہے کہ کیرنز کنٹینر زبردستی حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' جیو نے ان سے کہا۔

''اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور گاہک نہیں ہے جسے ہم یہ کنٹینر بیچ سکیں۔'' ماریا نے اس کی تائید کی۔ ''یہ سفید ہاتھی ہے، اسے ہر کوئی نہیں خرید سکتا۔''

''پھر ہم کیا کریں؟'' جوزیو نے سوال کیا۔ ''جب ہم نے اسے اغوا کیا تھا تو ہمیں بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر کیا ہے۔''

ان میں بحث ہونے لگی کہ اب کیا کریں۔ ماروٹ کیرنز سے ایک بار پھر رابطہ کیا جائے اور اس کے سامنے ایک آپشن رکھ دیا جائے کہ اس نے سودا کرنا ہے یا نہیں... اور یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ اس کی چالاکی ان پر کھل گئی ہے۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے سوائے اس کے کہ ایک بار پھر ماروٹ کیرنز سے بات کی جائے۔ وہ رات سونے کے لیے لیٹے تو ماریا نے جیو سے کہا۔

''کیا ہم کیرنز کو کوئی دھمکی نہیں دے سکتے جس سے وہ سودا کرنے کی صورت میں کوئی گڑبڑ نہ کرے۔''

''ہم اسے کیا دھمکی دے سکتے ہیں؟'' جیو سوچ میں پڑ گیا پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔ وہ جتنا اس پر سوچتا رہا، اتنا ہی اسے یہ خیال اچھا لگا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کو بلا لیا۔ رات گئے تک وہ اس بارے میں بات کرتے رہے۔

☆☆☆

ماروٹ کیرنز اپنے عالی شان بیچ ہاؤس میں تھا جو کیلیفورنیا کے ایک ساحلی علاقے میں تھا۔ وہ دو راتوں سے بمشکل سویا تھا۔ اس معاملے نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ اس وقت بھی وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے جان سے بات کی تھی۔ اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کے آدمی دونوں بار ناکام رہے تھے، ان کا ایک ہی آدمی نظر میں تھا اور وہ اسے بھی نکال کر لے گئے تھے۔ اچھی طرح گرجنے برسنے کے بعد ماروٹ نے جان سے کہا۔ ''یہ تمہارے پاس آخری موقع ہو گا، جب میں تمہیں کوئی کام دوں تو اسے ویسا ہونا چاہیے جیسا کہ میں کہوں۔''

''اوکے باس!'' جان نے میرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے زیرِ نگرانی آدمی پر صرف ایک شخص کو چھوڑ کر غلطی کی تھی۔

ماروٹ کو یقین تھا کہ اس شخص کی ایک بار کال ضرور آئے گی کیونکہ اس کنٹینر کو اس کے سوا کوئی نہیں خرید سکتا تھا۔ وہ اب بھی اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس کنٹینر کو حاصل کر لے۔ اس کی توقع کے عین مطابق فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنے دفتر والے فون کی کال کو یہاں منتقل کرا لیا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''میں نے سوچا، تم سے ایک بار بات کر لی جائے۔''

''مجھے بھی یقین تھا کہ تم ایک بار... ضرور کال کرو گے۔'' ماروٹ مسکرایا۔

''لیکن تم اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہیں یہ مال بیچنے پر مجبور ہوں۔ اب اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو میں اسے آگ لگا دوں گا۔'' جیو نے اسے دھمکی دی تھی۔

''میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ قیمت اب پینتالیس فی صد ہو گی۔''

''مجھے منظور ہے مگر مال میری بتائی ہوئی جگہ پر آئے گا...''

''یہ بھول جاؤ۔'' جیو نے اس کی بات کاٹی۔ ''تمہارا ایک آدمی آئے گا اور میں اسے مال دکھاؤں گا۔ اس کے بعد تم مجھے ادائیگی کرو گے اور مال خود لے جاؤ گے۔''

''اوکے!'' ماروٹ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے یہ بھی منظور ہے۔ میرا آدمی کہاں آئے؟''

''وہ بائنگ پر روٹ انیس پر آئے گا۔ کسی بھی جگہ اسے روک کر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اسے غیر مسلح ہونا چاہیے اور اس کے پیچھے کوئی نہ ہو۔''

''اب ہائی وے پر ٹریفک میری مرضی سے تو نہیں چلتا ہے۔'' ماروٹ نے اسے یاد دلایا۔

''ٹھیک ہے مگر مجھے شک ہوا تو میں اسے نہیں روکوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس کے آس پاس کوئی نہ ہو۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''اسے آج شام سات بجے روانہ کرنا۔''

''اوکے!'' ماروٹ بولا۔ ''ادائیگی کس صورت میں ہو گی۔''

''جب تمہارا آدمی تصدیق کر دے گا کہ مال ہمارے

پاس ہے اور وہی ہے جو تم سے کہا ہے تو تمہارا ایک اور آدمی رقم لے کر میرے بتائے ہوئے مقام پر آئے گا۔''

''میرے پاس اتنے فالتو آدمی نہیں ہیں۔'' ماروٹ نے اعتراض کیا۔

''کوئی بات نہیں، تم خود آجانا۔'' جیو نے استہزائیہ انداز میں مشورہ دیا۔ ''جب ہمیں رقم مل جائے گی تو تمہارے آدمی کو ٹرک سمیت جانے دیا جائے گا۔''

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟''

''ہمیں نہ تو تمہارا آدمی رکھنا ہے اور نہ ہی اس مال کا کچھ کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میرا آدمی آجائے گا مگر ایک بات یاد رکھنا، میرے ساتھ دھوکا ہوا تو میں تمہیں پاتال سے بھی کھینچ نکالوں گا۔''

''فکر مت کرو... میں تمہیں جانتا ہوں اس لیے کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔'' جیو نے اسے اطمینان دلایا۔

☆☆☆

شام کا سورج غروب ہونے کے قریب تھا جب روٹ انیس کی سڑک پر ایک بائک سوار نمودار ہوا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ جوزیو اسے ایک جگہ سے دیکھ رہا تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں ہے تو اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ بائک والا متلاشی نظروں سے پہلے ہی چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً جوزیو کو دیکھ لیا۔ اس نے بائک گھمائی اور اس کے پاس آکر رکا۔ جوزیو کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اشارے سے بائک سوار کو ہاتھ اوپر کرنے کو کہا اور پھر اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔

''تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''جس نے تمہیں یہاں انتظار کرنے کو کہا ہے۔'' بائک سوار نے جواب دیا، وہ جوان لڑکا تھا۔ ''کہاں چلنا ہے؟''

''یہ بائک چھوڑ دو۔ میرے پاس بائک ہے۔'' جوزیو نے اسے آگاہ کیا۔ ''وہ تم چلاؤ گے، میں تمہارے پیچھے بیٹھوں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' نوجوان شخص بائک سے اتر آیا۔ جوزیو کی بائک ٹیلے کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ اس پر روانہ ہوگئے۔ کیونکہ جیو نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا اس لیے جوزیو اسے لے جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے بعد انہیں اپنا یہ ٹھکانا چھوڑنا پڑتا مگر چالیس لاکھ ڈالرز اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ ہاتھ آجاتی تو اس ٹھکانے کی کسے پروا تھی۔ وہ گودام تک پہنچے جہاں باقی افراد ان کے منتظر تھے۔ بریٹ نے ایک بار پھر اس شخص کی تلاشی لی۔ یہ اجنبی تھا.... اس سے پہلے انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک کونے میں بندھے بیٹھے بکر کو دیکھ کر چونکا۔

''یہ اس ٹرک کا ڈرائیور ہے۔'' ماریا نے اسے بتایا۔

''اور ٹرک یہ ہے۔''

''تم چاہو تو اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔'' جیو نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ ''مگر تم اپنے باس کو اطلاع کس طرح دو گے؟''

''میرے پاس سیل فون ہے۔'' اس نے کہا تو جیو نے جوزیو کو گھورا۔

جوزیو ہکلایا۔ ''مجھے نہیں معلوم، میں نے اس کی مکمل تلاشی لی تھی۔''

''یہ غلط ہے، میرے پاس سیل فون ہے۔'' اس نے اپنی کلائی سے بندھے سیل فون کو نکال کر دکھایا۔ ''ورنہ تم سوچو میں باس سے کیسے بات کرتا۔''

جیو نے اس سے سیل فون لے لیا۔ ''تم جا کر دیکھ لو۔''

ماروٹ کے نمائندے نے جا کر ٹرک میں رکھے ایک باکس کو کھولا۔ اس میں سے اس نے مخصوص پیکنگ میں رکھی چپس چیک کیں۔ پھر دوسرا باکس کھولا۔ چند باکس دیکھنے کے بعد اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

''مجھے اطمینان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا میں باس سے بات کر سکتا ہوں؟''

بریٹ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ ''تم باس سے بات کر سکتے ہو مگر اس فون سے نہیں۔'' بریٹ نے اسے ایک اور سیل فون دیا۔ ''اس سے بات کرو۔''

''لیکن میں نے اپنے فون سے بات کرنی ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''کیوں... اس میں ایسی کیا بات ہے جو اس فون میں نہیں ہے؟''

''باس صرف اسی نمبر کو دیکھ کر اٹھائے گا۔'' وہ اب کچھ پریشان سا ہوگیا۔

''باس نے بات کرنی ہوگی تو اس فون کی کال بھی ریسیو کرے گا۔'' جیو بھی بولا۔ اس نے اچانک سیل فون زمین پر دے مارا اور اس کے پرزے بکھر گئے۔ اس نے ان پرزوں میں سے ایک ننھی سی چپ اٹھائی۔ ''اچھا، تو یہ بات ہے۔''

یہ چپ کسی سیل فون کے ساتھ لگ کر کال کرنے کی صورت میں جائے وقوع بھی نشر کر دیتی تھی اور ایک مخصوص



ریسیور کی مدد سے ٹھیک اس جگہ پہنچا جا سکتا تھا جہاں موبائل موجود ہوتا۔ مگر یہ چپ اسی صورت میں کام کرتی تھی جب اس موبائل سے کال کی جاتی۔ بریٹ کی عقل مندی کی وجہ سے وہ بال بال بچے تھے۔ جوزیو نے طیش میں آکر اسے عقب سے لات ماری۔ وہ شخص منہ کے بل گرا تو انہوں نے اسے رسیوں سے باندھ دیا۔ جیو فکر مند تھا۔ ''اس چپ کا مطلب ہے کہ کیرنز کے آدمی آس پاس موجود ہیں۔''

''ایسا ہی ہے۔'' ماریا بولی۔ ''اب ہم لوگوں کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔''

''اس سے اگلواؤ کہ اس کے ساتھی کہاں ہیں۔'' بریٹ نے کہا۔

کیرنز کے آدمی میں زیادہ دم خم نہیں تھا۔ اس نے جلد اگل دیا کہ اس کے ساتھی ہائی وے پر اس کے سگنل کا انتظار کر رہے تھے اور جیسے ہی ان کو سگنل ملتا، وہ چل پڑتے۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ یہ جگہ ہائی وے سے کوئی چودہ میل کے فاصلے پر تھی اور اسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے کیرنز کے آدمی کو باندھ کر ایک کونے میں ڈال دیا اور آپس میں بحث کرنے لگے۔ بریٹ بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہم کیرنز کو مزید آزمانے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ وہ بہت گھٹیا قسم کا شخص ہے۔''

''یہ تو ہے مگر ہم اس کا کیا کریں؟'' جیو نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تو ہمارے گلے پڑ گیا ہے۔''

''ایک تجویز ہے، اس کا سامان نکال کر ہم تھوڑا تھوڑا کر کے فروخت کر سکتے ہیں۔'' ماریا بولی۔

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے... مگر کیا اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے؟'' جیو نے سر ہلایا۔ ''اس جگہ زیادہ دیر رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے، اس جگہ کو تلاش کرنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔''

''ہم کوئی اور ٹرک لا کر اس کا سامان کہیں اور لے جاتے ہیں۔'' جوزیو نے بھی ایک تجویز دی۔

''تم اس کا منہ دیکھ رہے ہو۔'' جیو نے کنٹینر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا سامان کم سے کم تین ٹرکوں میں آئے گا اور پھر پیسوں کو اس کنٹینر میں ایک خاص انداز میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ہم اس انداز سے ان کو محفوظ نہیں کر سکتے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' ماریا جھنجلائی۔ ''اتنی بڑی مالیت کی چیز ہم چھوڑ بھی نہیں سکتے۔''

''تم دوسرے خریداروں سے بات کرو۔'' بریٹ نے جیو کی طرف دیکھا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور وین کی طرف چلا گیا۔ اس میں ایک وائرلیس فون تھا جو طویل فاصلوں پر کام کرتا تھا۔ ان کے نزدیک ہی بکر آنکھ پر پٹی باندھے صبر سے بیٹھا تھا۔ اس کی ہمت قابلِ داد تھی جو وہ دو دن سے مستقل ایک ہی انداز میں بیٹھا تھا اور اس نے اب تک حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس کے اچھے رویے کی وجہ سے اب انہوں نے اس کے ہاتھ عقب میں نرمی سے الگ الگ باندھ دیے تھے کہ وہ اپنی آنکھ سے پٹی نہ اتار سکے۔ ویسے کوئی نہ کوئی ہمہ وقت اس کے پاس ہوتا تھا۔ جیو کچھ دیر بعد آیا۔ اس کے چہرے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

''سب نے انکار کر دیا۔'' اس نے کہا۔ ''چپس کا سنتے ہی سب نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے کیونکہ ان کی تلاش کی جا رہی ہے اور یہ عام مارکیٹ میں بکنے والی چیز نہیں ہے۔''

''اس میں پکڑے جانے کا بھی رسک ہوتا ہے۔'' بریٹ نے اس کی تائید کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں یہ ٹرک ایسے ہی چھوڑنا پڑے گا۔'' ماریا مایوسی سے بولی۔

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' جیو نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''صرف ٹرک ہی نہیں بلکہ یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑے گی۔''

مگران میں سے کسی کا دل بھی لاکھوں ڈالرز مالیت کی اس کھیپ کو چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے جو انہوں نے سب سے زیادہ رقم حاصل کی تھی، وہ نوّے ہزار ڈالرز تھی اور یہ اس سے بہت بڑی رقم تھی، اسے وہ کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے تھے مگر بچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس سے جان چھڑاتے یا نہ چھڑاتے مگر انہیں یہ ٹھکانا تو چھوڑنا ہی تھا اور وہ بے گھر بھی ہو جاتے۔ ماروٹ کیرنز الگ ان کی راہ پر لگ گیا تھا اور وہ بہت خطرناک دشمن تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ اس صورت حال سے کس طرح نکلیں جو ان کے گلے میں ہڈی کی طرح پھنس گئی تھی۔ وہ اسے نہ اگل سکتے تھے اور نہ نگل سکتے تھے۔ وہ آپس میں بحث کرتے اور الجھتے رہے۔ ایک موقعے پر جوزیو جذباتی ہوگیا تھا اور بندھے ہوئے نوجوان کو گولی مارنے جا رہا تھا کیونکہ وہ ان کا ٹھکانا دیکھ چکا تھا اور اسے چھوڑ کر وہ بے گھر ہو جاتے۔ ماریا اور جیو نے اسے بڑی مشکل سے روکا۔

''ہم کسی کے خون سے ہاتھ نہیں رنگ سکتے۔'' جیو نے اسے سمجھایا۔

''اور ان لوگوں کو موقع دیں کہ یہ ہمیں مار ڈالیں۔'' جوزیو نے تلخی سے کہا۔ جب تک ان لوگوں نے اس کا غصہ

ٹھنڈا نہیں کر دیا نوجوان کی جان پر بنی رہی۔ اور اس سے زیادہ خراب حالت بیکر کی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید نوجوان کے بعد اس کی باری ہوگی۔ وہ پھر اپنی جگہ بیٹھ کر بحث کرنے لگے۔ رات رفتہ رفتہ گزر رہی تھی۔ طے پایا کہ ان میں سے دو پوری طرح مسلح ہو کر پہرا دیں گے اور دو آرام کریں گے۔ پہلے ماریا اور جوزیو نے پہرا دینا تھا۔ جیو اور بریٹ سونے چلے گئے۔ وہ چوکنا تھے اگرچہ امکان تو نہیں تھا مگر ہو سکتا تھا کہ ماروٹ کے آدمی یہاں آنکلتے اور وہ بے خبری میں مارے جاتے۔ ماریا نے کافی بنائی۔ وہ بیکر کے لیے بھی ایک کپ نکال لائی تھی۔ جوزیو نے اس کے ہاتھ کھول دیے تھے۔ بیکر ان کی باتیں سن رہا تھا اور اس نے ان کا مسئلہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جان گیا تھا کہ یہ ڈاکو تو تھے مگر قاتل نہیں تھے۔ اس کے ذہن میں ان کے مسئلے کا ایک حل آیا مگر اسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اس کی بات مانیں گے یا نہیں۔ ماریا اور جوزیو اسی مسئلے پر بات کر رہے تھے کہ اس نے ہمت کر کے ان کی بات کاٹی۔

"اگر تم لوگ برا نہ مانو تو میرے پاس اس مسئلے کا ایک حل ہے۔"

"تمہارے پاس!" ماریا نے شک سے کہا۔ "ہمارے مسئلے کا حل؟"

"ہاں اگر تم پسند کرو تو میں کہوں؟"

"ہاں کہو۔" ماریا نے اسے اجازت دی۔

"تم لوگ رقم چاہتے ہو اور یہ بھی کہ پولیس تمہارے پیچھے نہ آئے؟"

"ہاں... مگر یہ ممکن نہیں ہے۔" جوزیو نے مایوسی سے کہا۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔" بیکر نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم لوگ اس کمپنی سے رابطہ کرو جس کا یہ ٹرک ہے تو وہ اس کے بدلے تمہیں تاوان دے دے گی۔"

"کمپنی، ہمیں تاوان دے گی؟" جوزیو ہنسا۔ "کیوں مذاق کر رہے ہو۔"

"کمپنی کبھی کسی اغوا کار کو اپنے مال کی رہائی کے بدلے تاوان نہیں دیتی۔ یہ بات ہم سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے۔" ماریا بولی۔

"مگر یہ لوگ دیں گے۔" بیکر نے یقین سے کہا۔ "کیونکہ انہیں اس سامان کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے سان فرانسسکو والی فیکٹری میں بننے والے کمپیوٹرز کا انحصار ان چپس پر ہے اور اگر یہ چپس انہیں نہ ملیں تو کمپیوٹرز نہیں بنیں گے اور ان کا بہت بڑا آرڈر ہے جو یہ پورا نہیں کر سکیں گے۔ ان کا صرف مالی نقصان ہی کروڑوں ڈالرز میں ہوگا اور اس سے بھی زیادہ ان کی ساکھ کو نقصان ہوگا۔"

"یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔" ماریا نے جوزیو کی طرف دیکھا۔

"تم یقین کرو اگر تم ان سے ستر لاکھ ڈالرز بھی مانگو گے تو یہ دیں گے کیونکہ یہ سودا بھی انہیں اس نقصان کے مقابلے میں بہت سستا پڑے گا جو چپس کے پلانٹ پر نہ پہنچنے سے ہو سکتا ہے۔"

"واقعی!" جوزیو نے بے یقینی سے کہا۔

"تم ایک بار بات کر کے دیکھ لو کیونکہ کمپنی نے بہت مجبوری کے عالم میں یہ چپس میرے ذریعے بھیجی ہیں... صرف اس لیے کہ ان کا مقررہ تاریخ پر پلانٹ پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں جیو سے بات کرتی ہوں۔"

"کر لو مگر مجھے تو یہ بہت مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔" جوزیو ہنسا۔ "بھلا جس کا سامان ہو، وہ اس کی قیمت دینا ہے؟"

"جب ہمارے پاس کوئی اور حل نہیں ہے تو یہ کر کے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" ماریا نے سنجیدگی سے کہا۔

رات دو بجے اس نے جیو اور بریٹ کو اٹھا دیا تھا۔ اس نے ان کے سامنے بیکر کی تجویز رکھی۔ جیو نے نفی میں سر ہلایا۔ "کمپنی کبھی تاوان نہیں دے گی۔"

"بات کرنے میں کیا حرج ہے؟" ماریا نے اصرار کیا۔ "اس کا کہنا ہے، ممکن ہے اس طرح سے ہم پر کیس بھی نہ بنے کیونکہ کمپنی کبھی ظاہر نہیں کرے گی کہ اس نے کنٹینر تاوان ادا کر کے حاصل کیا ہے۔"

اب وہ اس تجویز پر بحث کر رہے تھے آخر ماریا نے جیو اور بریٹ کو قائل کر لیا کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے کمپنی والے مان جائیں۔ اگر وہ اتنے ہی ضرورت مند ہیں تو ان کا مان جانا لازمی تھا۔ صبح جیو اکیلا ہی روانہ ہوا۔ وہ بہت محتاط تھا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر ہائی وے پہنچا جہاں اس نے ایک فون بوتھ سے کمپنی کے نمبر پر کال کی اور خواہش ظاہر کی کہ اس کی کسی اعلیٰ افسر سے بات کرائی جائے۔ اس کی خواہش کچھ دیر بعد پوری ہو گئی۔ لائن پر آنے والا ایگزیکٹو آفیسر تھا۔ جب جیو نے اسے بتایا کہ کنٹینر اس کے پاس ہے تو فوری طور پر کمپنی کا صدر بھی لائن پر آ گیا۔ جیو نے ان کے سامنے مطالبہ رکھا۔

"مجھے ایک کروڑ ڈالرز درکار ہیں... اس صورت میں



نہیں تمہارا سامان مل جائے گا۔"

"تم تاوان مانگ رہے ہو؟"

"میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ کال کروں گا۔" جیو نے سوال نظر انداز کر کے کہا۔ "اس وقت مجھے صرف ہاں یا نہیں میں جواب چاہیے... اور اپنا کوئی براہِ راست نمبر دو۔"

"یہ نمبر نوٹ کر لو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اس نے نمبر نوٹ کر کے فون بند کر دیا اور اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے ایک ریستوران میں ناشتا کیا اور دوسروں کے لیے کھانے پینے کا سامان لے لیا۔ اس کے بعد وہ ایک اور فون بوتھ پہنچا جو پہلے والے سے کوئی تیس میل دور تھا۔ اس نے بتایا ہوا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی اس سے پوچھا گیا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ درست ہے۔"

"میں تمہاری اس ڈرائیور سے بات کرا سکتا ہوں جو تمہارا مال اپنے ٹرک میں لے کر نکلا تھا مگر یہ اس صورت میں ہی ممکن ہے جب تم میرا مطالبہ مان جاؤ۔"

"ایک کروڑ بہت زیادہ ہیں۔" کمپنی کے صدر نے کہا۔ "اتنی مالیت کا تو سامان بھی نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن یہ میں تم سے سامان کی نہیں بلکہ تمہاری ضرورت کی قیمت مانگ رہا ہوں۔"

کسی قدر بحث کے بعد جیو ستر لاکھ میں راضی ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد وہ فون بند کر کے روانہ ہو گیا۔ اس نے جاتے ہوئے مختلف راستہ اختیار کیا تھا۔ جب وہ گودام پہنچا تو بہت پُرجوش تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ لوگ اتنی آسانی سے مان جائیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ بیکر کا کہنا درست تھا۔ وہ لوگ سچ مچ پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس بارے میں بتایا اور پھر معاملات بہت تیزی سے طے ہوئے۔ انہوں نے بیکر کی کمپنی کے صدر سے بات کرائی تو اس نے تصدیق کی۔ بارہ گھنٹے کے بعد انہیں رقم مل گئی تھی۔ یہ رقم سو سو ڈالرز کے پرانے نوٹوں کی صورت میں تھی۔ سات سو گڈیاں دو بڑے سوٹ کیسوں میں آئی تھیں۔ رقم ملتے ہی انہوں نے روانگی کی تیاری کی اور اس سارے معاملے کو ماروٹ کے سر ماننے کا فیصلہ کیا۔ اس کا آدمی ان کے پاس موجود تھا۔ اسے انہوں نے کنٹینر میں ڈال دیا۔ انہوں نے بیکر کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اسے باندھ کر ڈال جاتے ہیں اور اسے کچھ دیر کی زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔

"اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھنا۔" ماریا نے اس سے کہا۔ "ورنہ ہم تو نکل جائیں گے اور تم پھنس جاؤ گے۔"

"میں سمجھتا ہوں... اگر میں نے بتا دیا کہ یہ ترکیب میں نے تمہیں بتائی ہے تو میں مارا جاؤں گا۔" بیکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں پر ابھی تک پٹی بندھی تھی۔ انہوں نے کچھ رقم اسے دینا چاہی مگر اس نے انکار کر دیا۔ "مجھے دولت کی اتنی خواہش نہیں ہے... اور میں محنت کر کے جو کماتا ہوں، اس سے مطمئن ہوں۔"

وہ چاروں شرمندہ ہو گئے۔ رخصت ہوتے ہوئے سب نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا کیونکہ وہ ان کا محسن تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس جنجال سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ انہوں نے رقم وین کے ایک خفیہ خانے میں چھپا دی اور طے کیا کہ وہ شمال کی طرف نکل جائیں گے جہاں وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔

☆☆☆

پولیس نے ایک گمنام کال پر کارروائی کر کے اس ویران گودام سے اغوا کیے جانے والے ٹرک، اس کے ڈرائیور اور ایک اجنبی شخص کو گرفتار کر لیا تھا۔ ڈرائیور کا کہنا تھا کہ اغوا کے بعد سے وہ مستقل ایک ہی جگہ پڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اس لیے وہ کسی کو نہیں دیکھ سکا۔ اس شخص کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پولیس نے اندازہ لگایا کہ وہ اغوا کاروں کا ساتھی تھا اس لیے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ دو دن بعد اس نے بوکھلا کر جان اور ماروٹ کیریز کا نام لے دیے اور وہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔

بیکر ایک دن بعد گھر پہنچا تھا۔ اس کی رہائی کی اطلاع فیرن کو مل چکی تھی اور وہ بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ لپک کر اس کے گلے لگ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" بیکر نے اسے بھینچ لیا۔

"اس لیے میں نے سوچا ہے کہ تم یہ کام کرتے رہو۔"

"اس کے برعکس میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب یہ کام نہیں کروں گا۔" بیکر نے کہا تو فیرن مارے خوشی کے چیخ مار کر اس سے دوبارہ لپٹ گئی۔ بیکر سوچ رہا تھا کہ اس کی اصل محبت تو یہ عورت ہے نا کہ وہ ٹرک جو محض ایک بے جان مشین ہے۔

☆

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

اسما قادری

# گرداب

دوسری قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ..... اُس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

حویلی کے سب سے شان دار کمرے میں موجود دونوں نفوس دو مختلف انتہاؤں پر کھڑے تھے۔ ماہ بانو کے لیے یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔

سترہ سال کی عمر میں وہ ایک بھیانک ترین تجربے سے گزرنے جارہی تھی۔ خوف کی شدت نے اسے کچھ اس طرح مفلوج کر دیا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے ذرا سی حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنے بچ جانے کے لیے اس کے پاس اگر کوئی امید تھی تو وہ صرف یہ کہ کوئی بیرونی امداد

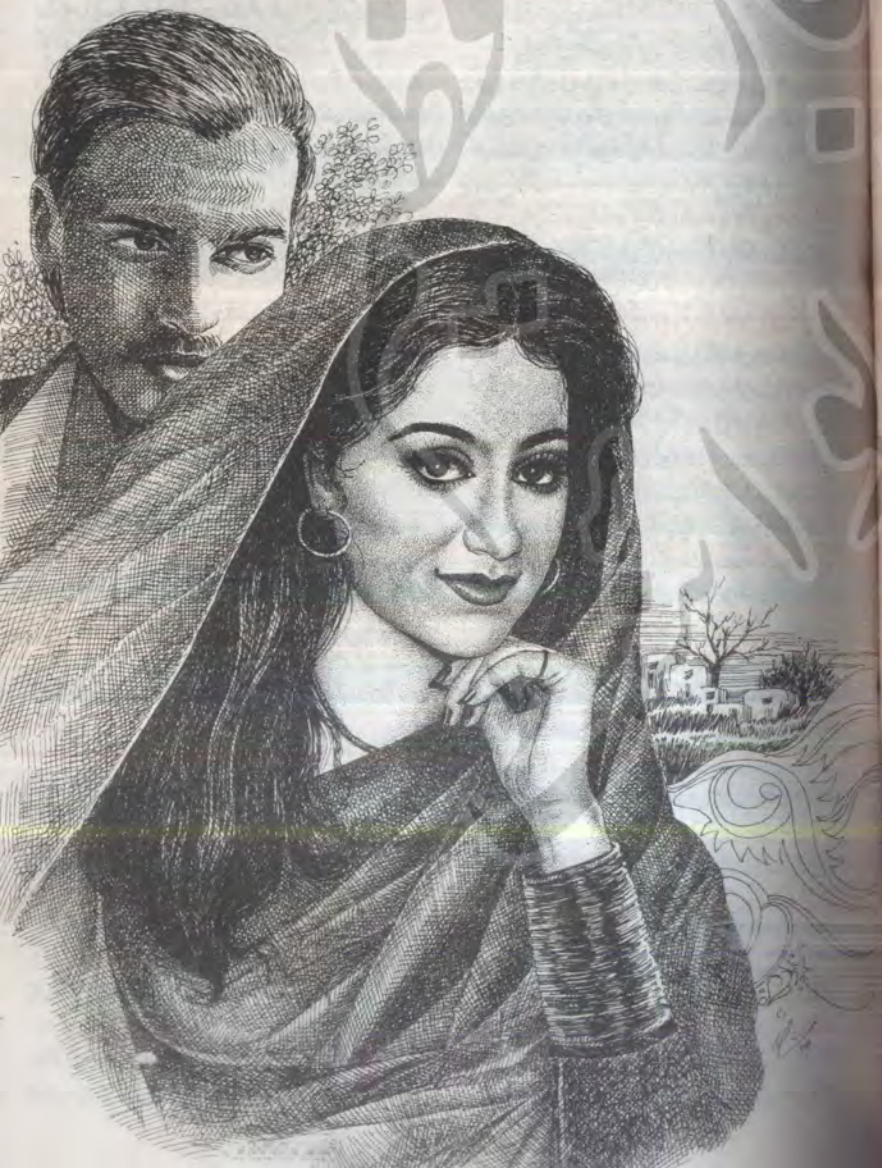

آجائے لیکن چودھری افتخار کی اس راج دھانی میں قدم رکھنے کی جرأت کس میں ہو سکتی تھی؟ خود چودھری افتخار کا حال اس سپاہ سالار کا سا تھا جو اپنی فتح کے یقینی ہونے کے خیال سے کسی شہر کی فصیل کے باہر کھڑا ہو اور جانتا ہو کہ بس ایک زوردار حملہ حفاظتی دروازے کو توڑ ڈالے گا اور وہ لمحہ بھر کے بعد ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ رہا ہوگا۔ شراب کی ترنگ اور طاقت کے نشے نے اسے بالکل مدہوش کر ڈالا تھا۔ اس کی سماعتیں اس شور کو سننے سے عاری تھیں جو اس کی حویلی کے کسی گوشے میں سے اٹھ رہا تھا۔ اس کی اس مدہوشی کو دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے توڑا۔ چودھری اس دخل اندازی پر تھوڑا سا ڈسٹرب ہوا لیکن ماہ بانو کو آزاد کرنے پر بہرحال وہ راضی نہیں تھا۔ ماہ بانو جو بالکل سن پڑ چکی تھی، اس دستک کو سن کر چونکی۔ اس کے اندر نئے سرے سے توانائی پیدا ہوئی کہ وہ چودھری افتخار کے خلاف مزاحمت کر سکے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پوری قوت سے چودھری کے منہ پر مارا۔ چودھری نے جواب میں ایک گالی دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بری طرح موڑا۔ ماہ بانو تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ دستک پہلے سے زیادہ زوردار اور مسلسل تھی۔

''اس وقت کس کی موت آئی ہے جو مجھے پریشان کرنے چلا آیا ہے۔'' چودھری جو دستک اور ماہ بانو کی مزاحمت کی وجہ سے اچھا خاصا بدمزہ ہو چکا تھا، بری طرح دہاڑا اور ڈولتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

''چودھری صاحب! باہر آئیں۔ غضب ہو گیا ہے۔'' باہر سے بڑی چودھرائن کی پریشان اور خوف زدہ سی آواز سنائی دی۔

''بڑھیا کو چین نہیں ہے۔ اس پہر بھی تنگ کرنے آگئی ہے۔'' چودھری افتخار بڑبڑایا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنا حلیہ بھی جلدی جلدی ٹھیک کر لیا تھا۔

''چودھری صاحب! غضب ہو گیا ہے، حویلی کے مہمان خانے میں ایک کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بڑی زوردار لگی ہے۔ نوکر اسے بجھانے کی کوشش میں لگے ہیں لیکن ابھی تک بجھا نہیں سکے ہیں۔ منشی نے مجھے کہلوایا ہے کہ آپ کو اطلاع کر دوں۔ مہمان بڑا ہی خاص بندہ ہے، کسی موتی والا کے بیٹے کا نام لے رہی تھی نچھی۔'' چودھرائن جانتی تھی کہ چودھری اپنے آرام میں اس طرح بے وقت مخل ہونے پر سخت ناراض ہوگا اس لیے دروازہ کھلتے ہی جلدی جلدی تفصیل بتانے لگی۔ کمرے کا دروازہ کچھ ایسے رخ پر تھا کہ وہاں سے چودھری کا بیڈ نظر نہیں آتا تھا۔ ماہ بانو ابھی تک اسی بیڈ پر تھی اس لیے چودھرائن کو خبر بھی نہیں ہو سکی کہ اس کا شوہر اپنے بند کمرے میں کون سا کھیل کھیل رہا ہے۔

''یہ تو واقعی غضب ہو گیا۔ میں خود چل کر دیکھتا ہوں۔'' بڑی چودھرائن کی دی ہوئی اطلاع نے چودھری افتخار کا سارا نشہ ہرن کر دیا اور وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اپنے کمرے میں موجود ماہ بانو کی طرف سے اس کا دھیان مکمل طور پر ہٹ چکا تھا۔ موتی والا سے اس کے بہترین کاروباری مراسم تھے۔ اگر اس کے بیٹے کو حویلی میں کچھ ہو جاتا تو چودھری افتخار کو بڑی مشکل پڑ جاتی۔ یوں بھی ماہ بانو کا کیا تھا، اسے تو وہ پھر کسی وقت دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ چودھری اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو ماہ بانو کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ چودھری کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ پھرتی سے کھڑی ہوئی۔ چودھری اپنی منہ زوری میں اس کے لباس کو تار تار کر چکا تھا۔ ماہ بانو نے بستر پر بچھی بڑی سی چادر گھسیٹ کر اپنے پورے وجود کو اس میں لپیٹا اور کمرے سے باہر نکلی۔ کمرے میں دھیما دھیما سنائی دینے والا شور اب بہت واضح سنائی دے رہا تھا۔ ماہ بانو نے چپکے سے بیرونی حصے کا رخ کیا۔ حویلی کے مکینوں کے رہائشی حصے سے قدرے ہٹ کر بنائے گئے مہمان خانے میں اس وقت کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آگ کے شعلے اور دھواں دور سے بھی نظر آ رہے تھے۔ ملازمین پانی کی بالٹیوں اور پائپوں کی مدد سے آگ بجھانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ متاثرہ کمرے کے علاوہ دوسرے کمروں میں موجود مہمان بھی باہر نکل چکے تھے اور ہراساں سے کھڑے کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ عمدہ سوٹوں میں ملبوس تک سک سے تیار رہنے والے ان معزز مہمانانِ گرامی کو اس وقت اپنے حلیوں کا ہوش نہیں تھا۔ وہ شب خوابی کے آدھے ادھورے کپڑوں میں اپنی جان بچانے کے خیال سے اپنے کمروں سے نکل بھاگے تھے کہ کہیں ایک کمرے میں لگی ہوئی آگ ان کے کمروں تک بھی رسائی حاصل نہ کر لے۔ ان کی یہ تشویش اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ براہِ راست آگ کی زد میں موجود کمرے کے دائیں بائیں موجود دونوں کمرے بھی اب جزوی طور پر آگ سے متاثر ہونے لگے تھے۔ ماہ بانو نے اس سارے منظر پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور حویلی سے باہر کی راہ لی۔ لوگوں کے ہجوم میں اس نے چودھری افتخار عالم



شاہ کو بھی دیکھا تھا جو چیخ چیخ کر اپنے کارندوں کو آگ بجھانے کے سلسلے میں ہدایات دے رہا تھا۔ مہمان خانے میں لگی آگ کے مقابلے میں ماہ بانو کے لیے چودھری افتخار کا وجود زیادہ خطرناک تھا۔ اگر حویلی میں یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو چودھری افتخار، ماہ بانو کو برباد کر چکا ہوتا۔ ماہ بانو کی بربادی، حویلی کے اس مہمان خانے کی بربادی سے زیادہ بڑی بات ہوتی۔ حویلی کے مہمان خانے کو اس تباہی کے بعد دوبارہ سے استعمال کے قابل بنایا جا سکتا تھا۔ ماہ بانو برباد ہوتی تو اس نقصان کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ اپنے بچ جانے کی خوشی کو تو فی الحال ماہ بانو پوری طرح محسوس نہیں کر سکتی تھی لیکن بہرحال اسے اس بات کا احساس تھا کہ دستِ قدرت نے بالکل عین موقع پر اس کی مدد فرمائی ہے۔ وہ وحشت زدہ سی حویلی سے اپنے گھر کی طرف جانے والے ٹیڑھے میڑھے، اونچے نیچے اور اندھیرے راستوں پر دوڑتی جا رہی تھی۔ یہ رات کا بالکل آخری پہر تھا۔ عام حالات میں وہ اس وقت گھر سے باہر قدم رکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اب اسے اندھیرے اور راستے میں جگہ جگہ بھونکتے کتوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ دونوں چیزیں چودھری افتخار سے کم خطرناک تھیں۔

☆☆☆

نوراں اور زہرہ بستروں میں دبکی بے خبر سو رہی تھیں۔ تھکن اور سردی کے باعث ان کی نیند بہت گہری تھی مگر دروازے پر ابھرنے والی دستک اتنی زوردار تھی کہ ان دونوں ہی کی آنکھ کھل گئی۔ حقیقتاً دستک دینے والے نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں بلکہ دھڑ دھڑایا تھا۔

''تیرا ابا آ گیا ہے شاید۔'' نوراں نے زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا اور بہ مشکل بستر سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ غیاث محمد کو بھی اور بہت سے مزارعوں کی طرح عرس کے خاتمے کے بعد درگاہ کے کاموں کے لیے روک لیا گیا تھا۔ دن بھر موجود رہنے والے لوگوں کے جم غفیر کی وجہ سے وہاں اچھا خاصا پھیلاوا ہو گیا تھا۔ وہاں ہونے والے اس پھیلاوے اور کوڑے کرکٹ کو رات ہی میں سمیٹ کر درگاہ کو پہلے والی صاف ستھری حالت میں لانے کی ذمے داری ان مزارعوں کے سر تھی۔ برسوں سے یہی معمول تھا کہ عرس کے خاتمے کے بعد درگاہ کی صفائی کے لیے اگلے دن کا سورج نکلنے کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ رات ہی رات میں کئی مزارعے مل کر یہ کام انجام دے دیتے تھے۔ اگلے روز دور دراز کے گاؤں سے آنے والے ان

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

معتقدین کی بھی روانگی ہو جاتی تھی جو رات ہو جانے کے باعث فوری طور پر روانہ ہونے کے بجائے درگاہ کے احاطے میں ہی رک جاتے تھے۔ ان معتقدین کی روانگی کے بعد درگاہ کی ایک بار پھر تفصیلی صفائی کی جاتی تھی جس کے لیے مزارعوں کی دوسری کھیپ کام کرتی تھی۔ دروازہ بجنے کی آواز پر نوراں نے یہی خیال کیا تھا کہ غیاث کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس گھر آ گیا ہے لیکن دروازہ کھولتے ہی اسے احساس ہوا کہ آنے والا غیاث نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھا، چادر میں لپٹا ایک ڈھیر کی صورت دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ نوراں نے جھک کر اس ڈھیر کا جائزہ لیا۔ اسے چادر میں سے ماہ بانو کا چہرہ نظر آیا۔ ماہ بانو بے ہوش نہیں تھی لیکن نیچے گری کچھ اس انداز میں سانسیں لے رہی تھی جیسے اس میں ہلنے جلنے کی بھی سکت باقی نہ رہی ہو۔

''زہرہ! جلدی سے بھاگ کر ادھر آ۔'' نوراں نے پہلے تو خود ماہ بانو کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑا ہوا تھا اس لیے اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی اور گھبرا کر زہرہ کو آواز دی۔ زہرہ ماں کی آواز میں موجود گھبراہٹ کو محسوس کر کے تیزی سے اٹھ کر آئی۔ ماہ بانو کو اس وقت دروازے پر گرے دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''چھیتی کر۔ ادھر آ کر اسے میرے ساتھ اٹھوا۔'' نوراں نے زہرہ کو ٹوکا تو وہ آگے بڑھی اور نوراں کے ساتھ مل کر اسے اٹھانے لگی۔ دونوں نے مل کر ماہ بانو کو کمرے تک پہنچایا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ دروازے سے بستر تک منتقلی کے اس عمل میں ماہ بانو کے جسم پر لپٹی چادر گر گئی اور اس کا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا لباس عیاں ہو گیا۔

''یہ کیا؟'' نوراں نے گھبرا کر ماہ بانو کا جسم ٹٹولنا شروع کر دیا اور پھر کسی نقصان کو محسوس نہ کر کے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اس کے جسم پر لحاف ڈھانپ دیا۔ ماہ بانو جو سردی اور خوف کے باعث کپکپا رہی تھی، گرم بستر کی فرحت اور گھر

کے تحفظ کا احساس ہونے پر کچھ مطمئن سی ہو کر غشی میں چلی گئی۔ نوراں اور زہرہ البتہ پریشان سی اس کے قریب ہی بیٹھی رہیں۔ ماہ بانو حویلی میں تھی اور اب جس حال میں گھر واپس آئی تھی، اس کا ذمے دار حویلی سے وابستہ کوئی فرد ہی ہو سکتا تھا۔ وہ فرد کون تھا؟ اس کا جواب صرف ماہ بانو ہی دے سکتی تھی لیکن وہ اس وقت تقریباً بے ہوش تھی۔ اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ نوراں کی توقع کے خلاف غیاث محمد صبح بہت دیر سے گھر واپس آیا۔ اس دوران زہرہ الیاس کو ناشتا کروا کر مسجد کے لیے روانہ کر چکی تھی۔ الیاس کو اسکول میں داخل کروانے کے بجائے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ غیاث محمد کے خیال کے مطابق الیاس کو بھی اس کی طرح کھیتوں میں ہل چلانے اور حویلی کی خدمت کے کام سرانجام دینے تھے اور ان کاموں کے لیے اسکول کی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں تھی، البتہ مولوی صاحب کے پاس جانے کا معاملہ الگ تھا۔ الیاس کے وہاں جانے سے انہیں اس کی اور اپنی آخرت سنورنے کی امید تھی۔ پھر وہاں جانے میں چودھری افتخار کی ناراضی کا بھی کوئی خدشہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو چودھری افتخار کی حمایت حاصل تھی۔ اسکول کی مخالفت بھی وہ بہت کھل کر نہیں کرتا تھا لیکن اس کے وہ سرسری سے اقوال مزارعوں کے کان میں پڑتے رہتے تھے جن کا لبِ لباب یہی تھا کہ اسکول کی تعلیم گاؤں کے ان بچوں کی دنیا اور آخرت سنوارنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھی۔ کھیتوں میں ہل چلانے کا کام وہ بغیر تعلیم کے بھی بہ خیر و خوبی انجام دے سکتے تھے جبکہ آخرت سنوارنے کے لیے مولوی صاحب کے پاس جانا مناسب تھا چنانچہ الیاس کو اسکول میں داخل نہیں کروایا گیا تھا۔

"رات حویلی میں بڑا ہنگامہ رہا۔ جانے کیسے ایک مہمان کے کمرے میں آگ لگ گئی۔ سنا ہے وہ مہمان شہر کے ایک بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔ بے چارہ آگ میں جھلس کر خاک ہو گیا۔ صبح سے پولیس کے بڑے بڑے افسر حویلی پہنچے ہوئے ہیں۔ لڑکے کی لاش کو لوگوں نے شہر بھجوا دیا ہے۔ چودھری صاحب بڑے پریشان اور غصے میں ہیں۔ میں تو خیر دوسرے لوگوں کے ساتھ درگاہ پر ہی تھا لیکن حویلی سے خبر لے کر آنے والے نے بتایا کہ مہمان خانے کے تین چار کمرے جل گئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے ملازموں نے بڑی کوشش کی تھی آگ بجھانے کی۔ دو تو خود اس کوشش میں اچھے خاصے جل گئے ہیں لیکن پھر بھی اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے۔ سب سے بڑی بات بندہ جان سے چلا گیا ہے۔ چودھری صاحب کا پریشان ہونا تو بنتا ہے کہ ان کی حویلی میں ان کا مہمان جان سے گزر گیا۔" غیاث نے گھر آتے ہی نوراں کو حویلی میں ہونے والے حادثے کے بارے میں خبر دی۔

"پر آگ لگی کیسے؟" نوراں نے حیرت سے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم؟ پولیس والے آئے ہوئے ہیں، وہی چھان بین کر کے کچھ بتائیں گے۔ ابھی تو تو بس یہ کر کہ مجھے جلدی سے ناشتا پانی دے۔ رات بھی منت مانگنے کے چکر میں، میں لنگر سے اپنا حصہ نہیں لے سکا تھا۔ اب بھی بڑی مشکلوں سے نظر بچا کر وہاں سے نکلا ہوں کہ پیٹ کی آگ بجھا کر دوبارہ ادھر جاؤں۔ آج تو سارا دن ادھر ہی خدمت میں حاضر رہنا پڑے گا ورنہ چودھری صاحب کا غصہ تو کسی پر بھی نکل سکتا ہے۔" پچھلے پورے دن کی تھکن اور رات کی جگار نے غیاث کا حال بھی برا کر رکھا تھا لیکن ان نازک لمحات میں وہ گھر بیٹھ کر آرام کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ نوراں نے جلدی جلدی اسے ناشتا بنا کر دیا اور اس کے گھر سے نکلنے سے پہلے زہرہ کو ماہ بانو کے متعلق چند ہدایات دے کر خود بھی حویلی کے لیے روانہ ہو گئی۔ اسے آج معمول سے بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے اس دیر کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے لیکن حویلی کی ساری کرتا دھرتا خواتین خود اتنی شدید پریشانی میں تھیں کہ انہیں نوراں کے دیر سے آنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ نوراں خاموشی سے اپنے حصے کا کام نمٹا کر واپس گھر آ گئی۔ ماہ بانو ابھی تک بستر پر ہی تھی البتہ زہرہ نے اس کا لباس تبدیل کروا دیا تھا۔ ماہ بانو کا پورا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ نوراں، زہرہ کو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کر کے خود حکیم سے دوا لینے چلی گئی۔ دوا لا کر اس نے ماہ بانو کو کھلائی۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیوں اور دوا کے اثر سے ماہ بانو کے بخار کی شدت کم ہو گئی۔ اگلے دن اتوار تھا۔ ماہ بانو سے طے شدہ معاہدے کے مطابق صفدر علی الصباح اسے واپس لے جانے کے لیے گاؤں پہنچ گیا۔ ماہ بانو کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر اسے سخت تشویش ہوئی۔ نوراں نے ماہ بانو کی بیماری کا بہانہ بنا کر صفدر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو البتہ خاموش رہی اور اسی خاموشی کے عالم میں صفدر کے ساتھ فیصل آباد جانے کے لیے روانہ ہو گئی۔ نوراں کو موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ ماہ بانو سے اس کے ساتھ بیتے حادثے کے بارے میں تفصیلات پوچھ سکے۔

☆☆☆

"ایکسپرٹس نے حادثے سے متعلق اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق آگ لگنا



ایک اتفاقی حادثہ تھا جو مرنے والے کی اپنی غفلت سے پیش آیا۔ حادثے سے پہلے اس نے شراب نوشی کرتے ہوئے شاید شراب اپنے بستر پر بھی گرا دی تھی پھر مدہوشی کے عالم میں اس نے سگریٹ کا ٹوٹا یا جلتی ہوئی دیا سلائی بھی بستر پر ہی پھینک دی، نتیجتاً آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ نے تیزی سے بستر سے کارپٹ اور پردوں تک کا سفر طے کر لیا۔ تحقیقاتی ٹیم کی اس رائے کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی تقویت مل رہی ہے۔ میڈیکل ایکسپرٹ کے مطابق لڑکے نے بے تحاشا شراب پی رکھی تھی۔ اس کے معدے میں الکحل کی بڑی مقدار موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایکسپرٹ نے یہ بھی بتایا ہے کہ لڑکے نے شراب کے ساتھ ساتھ چرس کا استعمال بھی کیا تھا۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شخص جو بہ یک وقت شراب اور چرس کے نشے میں مدہوش ہو، ذہنی طور پر کس حال میں ہو گا۔ ایسے شخص کے ساتھ کسی حادثے کا پیش آ جانا قطعی منطقی سی بات ہے۔" چودھری افتخار عالم شاہ کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھا شہریار اسے حادثے کے بارے میں ماہرین کی رائے سے آگاہ کر رہا تھا جبکہ چودھری کے چہرے پر پچھلے تین دن سے چھایا تناؤ اب بھی موجود تھا۔ شہریار کی فراہم کردہ معلومات کو سن کر اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ غصے سے بولا۔

"کرتوت دیکھو لڑکے کے۔ کم بخت عادی نشے باز تھا اور موتی والا مجھ سے یوں اکھڑا ہوا ہے جیسے میں نے اس کے پتر کی جان لی ہو۔ ٹھیک ہے، مجھے بھی حادثے کا افسوس ہے۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ اس کا پتر میری حویلی میں اپنی جان سے گیا لیکن اس کی جان جانے میں میری تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ میرے نوکروں نے اپنی جان پر کھیل کر آگ بجھائی۔ میں نے خود فون کر کے شہر سے فائر بریگیڈ والوں کو بلایا لیکن لڑکے کی موت آ گئی تھی تو اسے کون بچا سکتا تھا۔ کسی کے مرنے جینے پر تو میرا اختیار نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی کہ موتی والا کا غم بانٹ سکوں۔ میں خود میت کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ افسوس بھی کیا کہ میری حویلی میں اس کے پتر کو ایسا جان لیوا حادثہ پیش آ گیا لیکن اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ پھر میں نے لڑکے کے سوئم پر اپنی طرف سے کھانے کی دیگیں بنوا کر بھیجیں تو اس نے وہ بھی واپس کرا دیں۔ اتنا شان دار کھانا تھا، لاکھ سے اوپر روپیا خرچ کیا تھا میں نے اس پر۔ سارا کا سارا یتیم خانوں میں بھجوانا پڑا۔" چودھری افتخار کو اپنی رقم ضائع ہونے کا شدید دکھ تھا۔ وہ رقم جو اس نے اپنے کاروباری مراسم کو مضبوط بنائے رکھنے کے لیے موتی والا کے بیٹے کے سوئم پر خرچ کی تھی، یتیم خانے میں لگ گئی تھی تو یہ اس جیسی ذہنیت رکھنے والے بندے کے حساب سے تو اچھا خاصا نقصان تھا۔ موتی والا اس کا بزنس پارٹنر تھا، وہ اس کے بھجوائے ہوئے کھانے کو بیٹے کے سوئم میں آئے ہوئے لوگوں کو کھلاتا تو چودھری کو تسلی ہو جاتی کہ موتی والا سے اس حادثے کے بعد بھی اس کے مراسم بگڑے نہیں ہیں۔ دوسرے سوئم میں آنے والے معززین کو بھی جب یہ علم ہوتا کہ سوئم کا اتنا شان دار کھانا چودھری افتخار کی طرف سے آیا ہے تو وہ اس کی دریا دلی سے متاثر ہوتے لیکن موتی والا کے ٹیڑھے پن کی وجہ سے کھانا پہنچ گیا تھا یتیم خانے۔ اب یتیم خانے میں موجود بھوکے ننگے بچوں کے اس دعوت شیراز سے فائدہ اٹھانے سے چودھری افتخار کو کیا مل سکتا تھا۔ وہ بے چارے بچے اس کھانے کو کھانے کے بعد زیادہ سے زیادہ چودھری افتخار کو دعائیں ہی دے سکتے تھے اور ان کی دعاؤں کی انتہا یہی ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعد از مرگ چودھری افتخار کو جنت الفردوس میں جگہ دے... تو بھلا چودھری کو جنت کی کیا آرزو ہو گی، وہ تو دنیا میں بھی جنت میں ہی رہ رہا تھا۔

"جانے دیں چودھری صاحب! آپ نے جو اپنا فرض سمجھا وہ ادا کیا۔ اب موتی والا پر ہے کہ وہ حقائق کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں تو ابھی اسے صدمے سے نکل کر حقائق کا تجزیہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ آخر اس کا اکلوتا بیٹا مرا ہے۔ وہ اپنے اس غم کی وجہ سے تقریباً پاگل ہو رہا ہے۔ غم میں اسے سجھائی نہیں دے رہا کہ کس کس کو اس حادثے کا ذمے دار ٹھہرائے۔ مجھ سے اور ماموں جان سے بھی کافی شکوے شکایات کر رہا تھا۔ اب وہ بے چارہ جس کیفیت میں تھا، ہم اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جناب آپ کا بیٹا خود اپنی موت کا ذمے دار ہے۔ اگر نشے نے اس کی مت نہ ماری ہوتی تو وہ اس حادثے کا شکار ہی کیوں ہوتا۔ نہ ہی ہم اس سے یہ کہہ سکتے تھے کہ آپ نے اکلوتے بیٹے کو دنیا جہاں کی آسائشیں فراہم کر کے اسے عیاشی کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔ ٹھیک ہے اکلوتا بیٹا تھا، آدمی کا بس نہیں چلتا کہ اکلوتی اولاد کے لیے کیا کچھ کر ڈالے مگر اولاد پر چیک تو رکھنا چاہیے۔ وہ جس لت میں مبتلا تھا اس کا انجام تو کسی نہ کسی حادثے کی شکل میں ہی سامنے آنا تھا۔ وہ یہاں حویلی میں آگ لگنے سے نہیں مرتا تو شہر میں کسی زیادہ رش والی سڑک پر ایکسیڈنٹ سے مر جاتا۔ مگر ظاہر ہے، میں اور ماموں جان موتی والا سے اس کے دکھ پر تعزیت کرنے گئے تھے، ہم اس سے یہ سب نہیں کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ صرف افسوس کر کے

واپس آگئے۔" شہریار، چودھری افتخار کے اندازِ فکر کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر اس پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس انداز میں بات کرنے لگا جیسے وہ خود چودھری افتخار کا حمایتی ہو۔ ویسے اس نے موتی والا کے بیٹے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل حقیقی تھے۔

"اصل بات یہ ہے اے سی صاحب کہ یہ موتی والا جیسے نودولتیے پیسا کمانا تو جانتے ہیں لیکن ان میں اور ان کی اولادوں میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ اس پیسے کو سہار سکیں، ورنہ پُتر تو میرا بھی اکلوتا ہی ہے۔ ہم نے اس کے لاڈ بھی بہت اٹھائے ہیں لیکن بگڑنے نہیں دیا۔ آج دیکھیں، امریکا میں بیٹھا ہوا ہے۔ تعلیم کا بڑا شوق ہے اسے۔ اس شوق کی وجہ سے واپس یہاں نہیں آتا۔ مگر فرماں بردار اتنا ہے کہ میں نے کہا پُتر! بیاہ اپنے خاندان میں ہی کرنا ہے تو اس نے میرے حکم پر ذرا سی چوں نہیں کی اور یہاں آکر خاندان کی لڑکی بیاہ کر ساتھ لے گیا۔ ایک بار نہیں کہا کہ اباجی میں امریکا کا پڑھا لکھا بندہ گاؤں کی ان پڑھ لڑکی کے ساتھ کیسے گزارہ کروں گا؟ اور تو اور اگر وہ چاہتا تو میری بات رکھنے کو صرف بیاہ کر لیتا اور ووہٹی کو یہیں چھوڑ کر خود امریکا میں اپنی پسند کی کسی لڑکی سے بیاہ کر لیتا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بیوی اپنے معیار اور مزاج سے الگ ہے پھر بھی اسے پوری عزت سے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بچے اس کے وہاں امریکا کے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میں یہاں سے خرچہ پانی بھیجتا رہتا ہوں لیکن خود بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا۔ وہاں کی ایک بہت بڑی فرم میں اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ تو بات یہ ہے اے سی صاحب کہ خاندانی لوگ الگ ہی پتا چلتے ہیں۔ یہ موتی والا جیسے نودولتیے تو اپنی اولادوں کا حشر خراب کر دیتے ہیں۔ موتی والا کی حیثیت ہی کیا تھی؟ چھوٹی سی فرنیچر کی دکان لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ تھاما تو شہر میں یہ بڑے بڑے شوروم کھول ڈالے۔ اب اس کے کارخانے میں اتنا کام ہوتا ہے کہ آئے دن نئے کاریگر بھرتی کرنے پڑتے ہیں لیکن یہ سب میری وجہ سے ہی ہے نا؟ مجھے اکڑ دکھاتے ہوئے یہ نہیں سوچ رہا کہ میں ہاتھ کھینچ لوں گا تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ میں فی الحال اس لیے برداشت سے کام لے رہا ہوں کہ جوان پُتر گیا ہے بے چارے کا۔ تھوڑا اسے سنبھلنے کا موقع دے دوں۔ دماغ ٹھکانے پر آئے گا تو اسے خود اپنے سلوک کا احساس ہوگا۔ اگر احساس نہیں ہوا تو میں خود اس کا دماغ ٹھکانے لے آؤں گا۔ مجھ سے اڑی لگا کر وہ اپنے کاروبار کو چلا نہیں سکے گا۔" چودھری افتخار کے انداز میں جہاں اپنے خاندانی ہونے کا غرور اور بیٹے کی قابلیت و فرماں برداری کا فخر تھا، وہاں اس فرعونیت کا بھی اظہار تھا کہ جس نے میرے سامنے سر نہ جھکایا میں اسے نیست و نابود کر ڈالوں گا۔

"آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں خود بیچ میں پڑ کر اس معاملے کو سیٹل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اصل میں موتی والا کو آپ سے شکایت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کے خیال میں آپ نے اپنے علاقے کا حکمراں ہونے کے باوجود یہاں ترقی کے کام بہت کم کیے ہیں۔ اگر آپ کوشش کرتے تو یہاں کوئی فائر اسٹیشن نہ سہی مگر پکی سڑکیں تو ہوتیں کہ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بروقت پہنچ کر آگ بجھانے کا کام کر سکتیں۔ ایک تو آگ لگنے کے بہت دیر بعد آپ کا فون گیا پھر جو دو گاڑیاں آگ بجھانے کے لیے آئیں ان میں سے بھی ایک کچے میں پھنس کر ناکارہ ہو گئی۔" شہریار بہ ظاہر دوست اور ہمدرد بن کر چودھری افتخار کو رگڑنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس نے موتی والا کے نام سے چودھری افتخار کو جتا دیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کا حکمراں اور سیاسی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے موثر کردار ادا کرنے میں ناکام ہے اور اس کا علاقہ نہایت غیر ترقی یافتہ ہے مگر چودھری افتخار بھی کوئی اتنی آسانی سے رگڑائی میں آنے والا بندہ نہیں تھا، اپنی کوتاہی کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے غصے سے بولا۔

"فضول بکواس کرتا ہے سالا! اگر فائر بریگیڈ والے جلدی بھی پہنچ جاتے تو اس کا پُتر تو کسی حال میں نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ تو بستر کے ساتھ پہلے ہی جل کر بھسم ہو گیا ہوگا۔ نوکروں کو تو بہت بعد میں آگ لگنے کا معلوم ہوا۔ اگر دیر ہونے سے کسی کا نقصان ہوا ہے تو وہ میں ہوں۔ میرا مہمان خانہ اس مردود نشے باز کی بے احتیاطی کی وجہ سے برباد ہو کر رہ گیا۔ میرے مہمان الگ بے آرام اور خوف زدہ ہوئے۔ میرے اپنے دو بندے اچھے خاصے جل گئے آگ بجھانے کے چکر میں لیکن میرے ان سارے نقصانات کو نظر انداز کر کے وہ موتی والا صرف اپنے پُتر کو روئے جا رہا ہے۔ مجھے تو چاہیے کہ موتی والا پر ہرجانے کا دعویٰ کروں کہ اس کے پتر کی وجہ سے میرا جو اتنا مالی نقصان ہوا ہے، وہ پورا کرے۔ لاکھوں روپے لگے تھے مہمان خانے پر۔ آگ میں سب کچھ جل کر برباد ہو گیا۔ اب نئے سرے سے وہاں پر کام کروانا پڑے گا۔ حویلی میں تو آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں۔ مہمان خانہ تو مجھے فوری طور پر درست کروانا پڑے گا۔ ٹھیکے دار سے میری بات بھی ہو گئی ہے لیکن کام اس لیے شروع نہیں کروایا کہ پولیس والے اپنی کارروائی پوری کر کے کلیئرنس دے دیں۔"



"مجھے اندازہ ہے چودھری صاحب کہ آپ کا ٹھیک ٹھاک نقصان ہوا ہے۔ میں نے خود ایس پی کے ساتھ آپ کے مہمان خانے کا جائزہ لیا ہے مگر دیکھیں سامنے والے کے پاس آپ کی کچھ کمزوریاں ہیں نا جن کو دلیل بنا کر وہ آپ پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ آپ کوشش کریں کہ ان چھوٹے موٹے مسائل کو حل کر دیں تاکہ لوگوں کے پاس انگلیاں اٹھانے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اب تو ویسے ہی میڈیا نے اچھی خاصی ترقی کر لی ہے۔ پہلے الیکٹرانک میڈیا پر صرف پی ٹی وی کا راج تھا اب نئے نئے چینل کھل گئے ہیں۔ آنے والے دو چار سالوں میں یہ چینلز ملک میں طوفان برپا کر دیں گے۔ چوبیس گھنٹے کی نشریات جاری رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے ہوتا ہے۔ جب انہیں کچھ نہیں ملے گا تو اس طرح کے ایشوز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ میڈیا کے اس طوفان کی زد میں آنے سے پہلے کچھ پیش بندیاں کر لی جائیں تو بہتر ہوگا۔ ہم سرکاری ملازموں کا کیا ہے، آج یہاں کام کر رہے ہیں کل کسی دوسرے علاقے میں ہوں گے لیکن آپ کو تو اپنے علاقے میں ہی رہنا بسنا ہے۔ اس سے قبل کہ آپ پر میڈیا کا حملہ ہو، مستقبل کی منصوبہ بندی کر لیں۔"

شہریار نے لیاقت رانا کے مشوروں پر کافی غور کیا تھا چنانچہ اب وہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے چودھری افتخار سے براہِ راست متصادم ہونے کے بجائے دوست بن کر اسے خوف زدہ کرنے اور اپنی مرضی کی راہ پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کی بات غلط نہیں ہے۔ میں خود بھی یہ ساری باتیں محسوس کر رہا ہوں۔ فی الحال تو میرے علاقے میں میڈیا کا اتنا اثر نہیں ہے۔ اکثر لوگ ان پڑھ ہیں اس لیے اخبار وغیرہ یہاں بہت کم آتا ہے۔ ٹی وی بھی فی الحال اکا دکا گھروں میں ہی ہے اور اس پر بھی ابھی صرف پی ٹی وی کی نشریات ہی دیکھی جا سکتی ہے لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اگلے چند سالوں میں یہ بولنے والا تصویری ڈبا سب کے گھروں میں پہنچ جائے گا اور ان پڑھ مزارعوں کے دماغ خراب ہو جائیں گے۔ مگر بہرحال، ابھی تو وہ وقت دور ہے... جب آئے گا تو پھر میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گا۔ آپ کے خلوص اور مشورے کے لیے البتہ بہت بہت شکریہ۔" چودھری افتخار نے جس طرح شہریار سے اتفاق کرتے ہوئے گفتگو شروع کی تھی، شہریار خوش ہو گیا تھا کہ وہ چودھری کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن چودھری تو ایک بار پھر چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

"ٹھیک ہے چودھری صاحب! جو آپ مناسب سمجھیں، میرا کام تو آپ کو مشورہ دینا ہی تھا۔ آپ بہرحال مجھ سے زیادہ تجربہ اور سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ بہتر ہی ہوگا۔ فی الحال مجھے اجازت دیں۔ کافی دیر ہو گئی مجھے یہاں آئے ہوئے۔ کئی دوسرے کام بھی میری توجہ کے انتظار میں ہیں، مجھے انہیں دیکھنا ہے۔" اپنی اتنی لمبی میٹنگ کے بعد بھی چودھری افتخار کو راہ پر نہ آتے دیکھ کر شہریار نے میٹنگ کو ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ ویسے وہ اس معاملے میں قطعی ناامید نہیں تھا۔ چودھری کو قائل کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ اور طریقے بھی موجود تھے۔ وقت آنے پر وہ اپنی چال چل کر چودھری کو کسی حد تک تو سدھار ہی سکتا تھا۔

☆☆☆

"آج میری چودھری افتخار عالم شاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ موتی والا کے بیٹے کی موت پر بہت ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ شاید کاروباری نقصان کا خدشہ ہے انہیں۔ موتی والا اپنے بیٹے کی موت پر ان سے سخت ناراض ہے۔ لگتا ہے چودھری افتخار اور اس کے درمیان پارٹنرشپ مزید چل نہیں سکے گی۔" شہریار نے ملاقات کے لیے آئے ہوئے ایس پی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"میرے خیال میں موتی والا پارٹنرشپ ختم کر کے اپنے ہی حق میں برا کرے گا۔ چودھری افتخار کو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ان کے پاس بے تحاشا دولت ہے۔ ایک جگہ سے معاملہ خراب ہوا تو وہ دوسری جگہ انویسٹمنٹ کر دیں گے۔ وہ ڈسٹرب صرف اس لیے ہیں کہ موتی والا کے بیٹے کی موت ان کی حویلی میں ہوئی ہے۔ چودھری افتخار کا جو بیک گراؤنڈ ہے اس میں مہمان کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ مہمان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔ اب جو لڑکے کی ان کی حویلی میں موت ہو گئی ہے تو انہیں لگتا ہے کہ ان کی ساکھ اس حادثے سے متاثر ہوئی ہے۔ موتی والا کے نخرے بھی وہ اپنی اسی روایت کی پاسداری کی خاطر اٹھا رہے ہیں ورنہ اس کے واویلا کرنے یا چودھری افتخار پر الزام دھرنے سے چودھری افتخار کا کچھ بگڑنے والا تو ہے نہیں۔ میں نے تو موتی والا کے بیٹے کے بارے میں مکمل معلومات کروائی ہیں۔ لڑکا بے حد بگڑا ہوا اور بری صحبت کا شکار تھا۔ شراب اور چرس کے نشے میں مبتلا ہونے کی تصدیق تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی ہوئی ہے۔ معلومات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صاحب زادے تعلیم کے میدان میں بھی سخت ناکامی کا شکار تھے۔ موتی والا پیسے کے زور پر اپنے بیٹے کو زبردستی آگے بڑھا رہا تھا۔ لڑکے کی ریڈ لائٹ ایریا میں بھی

مستقل آمد و رفت تھی۔ موتی والا اگر چودھری افتخار کے خلاف زبان کھولے گا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے بھی سارے کچے چٹھے کھل جائیں گے۔ ابھی تو سب نے اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی ہے کہ بے چارہ موتی والا صدمے کا شکار ہے، ابھی اسے چھوڑ دو۔'' ایس پی کے اندازِ گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چودھری افتخار کے حق میں ہے۔

''آپ کی بات میں وزن ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے اس کیس پر بڑی تیزی اور چابک دستی سے کام کیا ورنہ لوگ پولیس کے محکمے سے ہمیشہ یہی شکایت کرتے ہیں کہ یہاں کام یا تو ہوتا نہیں یا بہت سست روی سے ہوتا ہے۔'' شہریار نے تعریف کی آڑ میں ایس پی کی کھنچائی کی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر! میرا اسٹاف بہت محنتی اور دیانت دار ہے اور آپ یہ مت سمجھیے گا کہ کارکردگی کا یہ مظاہرہ دو بڑی شخصیات کے انوالو ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس وقت میری آمد کا مقصد آپ کو ایک دوسرے کیس کے سلسلے میں بریف کرنا تھا۔ ابھی کچھ دن قبل آپ نے اپنی نگرانی میں دین محمد نام کے ایک شخص کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ اس شخص نے الزام لگایا تھا کہ وہ آپ کے پاس آنے سے پہلے تھانے گیا تھا لیکن تھانے دار نے رشوت طلب کی اور نہ دینے پر رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔ بے چارے تھانے دار نے اس وقت بھی آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کی تھی لیکن اسے خدشہ ہے کہ آپ نے اس کی پیش کی گئی صفائی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بہرحال، آپ کے حکم کے مطابق اس نے معاملے کی تحقیق کر کے رپورٹ بھجوا دی ہے۔ آپ ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ یہ رپورٹ خود آپ تک پہنچا دوں۔'' ایس پی نے ایک بند لفافہ شہریار کے سامنے رکھا۔ شہریار لفافہ کھول کر اس میں موجود رپورٹ پڑھنے لگا۔

اس رپورٹ کے مندرجات کے مطابق درخواست گزار دین محمد کا بیان قطعی جھوٹ پر مبنی تھا۔ اس رات اس کے گھر پر کوئی ڈاکا نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اس کی بیٹی اغوا کی گئی تھی۔ دین محمد نے بیٹی کے اغوا ہونے کی صرف کہانی بنائی تھی تاکہ گاؤں والوں کے سامنے بیٹی کے شادی سے پہلے اچانک غائب ہو جانے کا بہانہ بنا سکے۔ حقیقت میں اس کی بیٹی اپنے ماں باپ کے طے کردہ رشتے سے خوش نہیں تھی اور اس جگہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لڑکی کے کسی دوسرے گاؤں کے لڑکے سے مراسم تھے۔ لڑکا چونکہ دین محمد کی ذات برادری کا نہیں تھا اس لیے دین محمد اس لڑکے سے بیٹی کا رشتہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لڑکی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس نے زبردستی اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر دیا لیکن شادی ہونے سے پہلے ہی لڑکی اسے جل دے گئی۔ اس نے اپنے آشنا لڑکے کو گھر میں بلایا۔ لڑکے کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے۔ ان لوگوں نے مل کر لڑکی کے بھائیوں کو ایک کمرے میں بند کیا اور دین محمد اور اس کی بیوی کے سامنے جہیز کے سامان اور روپوں سمیت لڑکی کو لے کر فرار ہو گئے۔ بعد میں دین محمد اور اس کی بیوی نے واویلا مچایا کہ ان کے گھر ڈاکو گھس آئے تھے اور لڑکی سمیت سب کچھ لوٹ کر لے گئے مگر اس بیان میں بالکل بھی سچائی نہیں ہے۔ خود درخواست گزار دین محمد کا کردار ماضی میں کافی مشکوک رہا ہے۔ دین محمد کی موجودہ بیوی اس کی دوسری بیوی ہے جو پہلی بیوی کی حقیقی بہن ہے۔ بیس بائیس سال پہلے اس کی دوسری بیوی جو کہ اس وقت اس کی سالی تھی، اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد اکیلی رہ جانے کے باعث اپنی بڑی بہن کے گھر رہنے آ گئی تھی۔ دین محمد اور اس کی بہن کی شادی کو کئی سال گزر جانے کے باوجود ان کے گھر اولاد نہیں تھی۔ دین محمد جو اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے بیوی سے اچھا خاصا بے زار ہو چکا تھا، جوان العمر سالی کو دیکھ کر پھسل گیا۔ اس نے جانے اپنی بیوی کو کیا کھلایا پلایا کہ اچھی خاصی ہٹی کٹی صحت مند عورت چند مہینوں میں ہی چٹ پٹ ہو گئی۔ دین محمد نے اپنی اور اپنی سالی کی تنہائی کا بہانہ کر کے فوراً ہی اس سے نکاح کر لیا۔ اب وہ اپنے سے کئی برس چھوٹی بیوی کے ساتھ مزے سے رہتا ہے۔ اس کے بچے بھی ہیں لیکن ظاہر ہے، بچوں میں باپ کی خصلت تو آنی ہی تھی۔ چنانچہ بیٹی نے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مقصد برآری کے لیے دھوکا دہی سے کام لیا اور سب کچھ سمیٹ کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب دین محمد حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹی کہانی بنا رہا ہے۔

رپورٹ میں ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کے بجائے ذاتی خیالات اور تجزیے بھی پیش کیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ شہریار نے رپورٹ پڑھنے کے بعد اسے واپس لفافے میں رکھا اور ایس پی کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو بہت ہی حیرت انگیز انکشافات ہیں۔ میں خود دین محمد کے ساتھ اس کے گاؤں گیا تھا۔ گاؤں کے دیگر لوگوں نے بھی تصدیق کی تھی کہ دین محمد کے گھر ڈاکا پڑا ہے لیکن اب یہ رپورٹ تو ان ساری باتوں کی قطعی نفی کر رہی ہے۔''

"آپ گاؤں والوں کی سادہ لوحی کو نہیں جانتے سر! اصل میں وہ بے چارے تو دین محمد کے بیان پر یقین کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ دین محمد ان سے جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، ان میں سے کسی نے بھی آپ سے یہ نہیں کہا ہوگا کہ اس نے ڈاکوؤں کو دیکھا تھا یا ان کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ سب تو دین محمد اور اس کی بیوی کے شور مچانے پر اس کے گھر پہنچے تھے اور جو کچھ انہوں نے کہا، اس پر یقین بھی کر لیا تھا۔" ایس پی کی دی ہوئی دلیل میں جان تھی۔ واقعی دین محمد کے پڑوسیوں میں سے کسی نے بھی ڈاکوؤں کو دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ دین محمد کے اپنے کردار کے بارے میں جن شکوک کا اظہار کیا گیا تھا وہ بھی غلط محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ دین محمد کی بیوی واقعی اس سے عمر میں کافی چھوٹی تھی۔ شہریار کو خود بھی دین محمد کے بچوں کی عمریں دیکھ کر تھوڑا سا تعجب ہوا تھا۔ دین محمد عمر کے جس حصے میں تھا، اس کے اعتبار سے اس کے بچے کافی چھوٹے تھے لیکن اب باپ اور بچوں کی عمروں میں اس قدر تفاوت کی وجہ سمجھ آ رہی تھی۔

"میں تو خود گاؤں کے لوگوں کی سادہ لوحی پر بہت یقین رکھتا ہوں تارڑ صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ مرد تو مرد یہاں کی کم عمر لڑکیاں بھی اتنی چالبازی سے کام لے سکتی ہیں کہ سگے ماں باپ کو ہی لوٹ لیں۔" شہریار کے لہجے میں حیرت اور افسوس دونوں شامل تھے۔

"آج کے دور میں ہر جگہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ دین محمد کی بیٹی تو صرف روپے اور زیور وغیرہ لے کر فرار ہوئی ہے لیکن لاہور اور کراچی کے اخباروں میں کئی بار آپ نے ایسی خبریں پڑھی ہوں گی جن کے مطابق لڑکیاں اپنے آشناؤں کے ساتھ مل کر ماں باپ سمیت پورے پورے گھرانے کو ہلاک کرنے کے بعد سارا مال و دولت سمیٹ کر فرار ہو گئیں... تو بات یہ ہے جناب کہ اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کی اس نوکری میں رہتے ہوئے میں نے جتنے انوکھے واقعات دیکھے ہیں اس کے بعد کچھ بھی ناممکن نہیں لگتا۔ ان دیہی علاقوں میں تو اس طرح کے جرائم کی شرح کافی زیادہ ہے۔ بس یہ ہے کہ میڈیا کی پہنچ نہ ہونے کے باعث ان معاملات کی تشہیر نہیں ہو پاتی۔ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جو پولیس کے علم میں ہی نہیں لائے جاتے اور پنچایت فیصلے کر دیتی ہے۔" شہریار کی حیرت کے جواب میں ایس پی نے دلائل دیے۔ شہریار ان دلائل کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایس پی معظم تارڑ عہدے کے اعتبار سے بھلے اس سے نیچے تھا لیکن اس کی عمر اور ملازمت کا تجربہ زیادہ تھا مگر ابھی اس کے شکوک و شبہات پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔

"میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں تارڑ صاحب... لیکن میرے ذہن میں ایک خیال یہ آ رہا ہے کہ دین محمد نے ڈاکوؤں والی کہانی کیوں بنائی؟ اس علاقے میں ڈاکو اپنی سرگرمیاں دکھاتے رہتے ہوں گے جب ہی تو دین محمد کے ذہن میں خیال آیا کہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو ڈاکوؤں کے ساتھ نتھی کر دے۔"

"ڈاکو کہاں نہیں ہوتے سر! کیرتھر کی پہاڑیاں مشہور ہیں ڈاکوؤں کو پناہ گاہ فراہم کرنے کے معاملے میں۔ شمالی اور مغربی کوہستانی سلسلوں میں بھی جرائم پیشہ افراد پناہ لیتے ہیں۔ چن جی، لال سوہانرا سب جگہ ڈاکوؤں کی خبریں ملتی ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں کا کیا حال ہے؟ سرِعام لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ آئے دن بینکوں اور بازاروں میں ڈاکے پڑتے رہتے ہیں۔ ڈاکو بیچ شہر میں رہتے ہیں اور کوئی انہیں نہیں پکڑ پاتا۔ پھر اس علاقے میں ڈاکوؤں کا ہونا کون سی انہونی بات ہے... یہاں تو بڑی سہولت ہے انہیں... اتنا بڑا جنگل موجود ہے جس میں وہ پناہ لے سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک بات ہے ان کے اس علاقے میں سرگرم ہونے کی تو ڈاکو یہاں اتنے ایکٹیو نہیں ہیں۔ یہاں عام آدمی کے پاس اتنا زیادہ مال و دولت نہیں ہے کہ ڈاکو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کسی گاؤں، دیہات پر حملہ کریں تو ریٹرن میں انہیں بہت زیادہ فائدہ مل سکے۔ وڈیروں کے پاس دولت ہے لیکن اول تو وہ اتنے بے وقوف نہیں کہ سب کچھ اپنی حویلیوں میں رکھ کر بیٹھے رہیں کہ ڈاکو آئیں اور انہیں کنگال کر ڈالیں، دوم وڈیروں کے پاس اپنی حفاظت کا معقول انتظام ہے۔ مسلح اور غیر مسلح دونوں طرح کے افراد ان کی حویلیوں کی حفاظت پر مامور رہتے ہیں۔ ڈاکو ان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں تو فائدہ کم اور نقصان زیادہ اٹھانا پڑے گا۔ اب جہاں تک دین محمد کے ذہن میں آنے والی کہانی کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہانی اس نے ان اکا دکا واقعات کی بنیاد پر بنائی ہے جن میں ڈاکوؤں کی انوالمنٹ کا ذکر آتا ہے۔ ایک دفعہ ایک چھوٹے زمیندار کے بیٹوں کی برات پر اس وقت حملہ ہوا تھا جب وہ لوگ دلہنیں لے کر واپس آ رہے تھے۔ اس موقعے پر دونوں دلہنوں کے علاوہ دیگر خواتین کے زیورات وغیرہ لوٹ لیے گئے تھے۔ مردوں سے بھی ان کی نقدی، گھڑیاں اور گلے کی چینیں وغیرہ اتروا لی گئی تھیں۔ پولیس کافی تحقیقات کے



باوجود اس واردات کے مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ دوسرا واقعہ ایک دیہات میں پیش آیا تھا۔ ایک دیہاتی کی نو بیاہتا بیوی کو رات کے وقت کچھ لوگ زبردستی اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے عورت کے ساتھ گھر کا مال اسباب بھی سمیٹ لیا تھا اور جاتے جاتے دیہاتی کو جان سے مار گئے تھے۔ پولیس نے جب اس معاملے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اغوا شدہ عورت کے بیاہ سے پہلے اس کے گاؤں کا ایک آوارہ مزاج شخص اس پر فریفتہ تھا۔ اس نے شادی کے لیے پیام بھی بھیجا تھا لیکن ظاہر ہے اسے انکار کر دیا گیا۔ گھر والوں نے اپنی بیٹی کی شادی ایک مناسب جگہ کر دی۔ اس شادی کے بعد اس کا عاشق غائب ہو گیا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنا انتقام اس طرح لیا کہ عورت کو اغوا کر لیا اور اس کے شوہر کی جان لے لی۔ وقوعہ کے چوتھے روز ہی اس اغوا شدہ عورت کی کٹی پھٹی لاش گاؤں کے باہر پڑی مل گئی تھی لیکن دین محمد کی بیٹی کے معاملے میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ابھی تک نہیں سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی ہے۔ حالات و واقعات بھی یہی بتاتے ہیں کہ لڑکی خود اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس کیس میں انتقام یا لالچ دونوں ہی نظر نہیں آتے۔ دین محمد کی کسی سے دشمنی نہیں اور اپنی طرف سے چاہے اس نے بیٹی کا جتنا بھی اچھا جہیز جوڑا ہو لیکن بہرحال، وہ اتنا نہیں ہو سکتا کہ اس کے لالچ میں ڈاکوؤں کا کوئی گروہ اپنی سرگرمی دکھائے۔" ایس پی نے شہریار کو مطمئن کرنے کے لیے جواب میں ایک لمبی تقریر جھاڑ دی جس سے شہریار کچھ متاثر بھی ہوا۔

"اوکے تارڑ صاحب! بہت بہت شکریہ اس معاملے میں بریف کرنے کا۔ میں واقعی دین محمد کے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکا تھا لیکن بہرحال، آپ اس ڈاکوؤں والے معاملے پر نظر رکھیں۔ اگر ہماری حدود میں اس طرح کے مجرم موجود ہیں تو ہمیں ان کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ ہم یہ کہہ کر کہ ڈاکو سب جگہ ہوتے ہیں، بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔"

"آپ فکر مت کریں سر! ہمارا ضلع بالکل محفوظ ہے۔ یہاں ڈاکوؤں کی ایکٹویٹیز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کبھی وہ ایکٹو ہوئے تو میرا محکمہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔" شہریار کی بات کے جواب میں ایس پی نے اسے یقین دہانی کروائی۔ فی الحال شہریار اس یقین دہانی پر یقین کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

"آپ کو چودھری اشرف شاہ نے اپنی حویلی میں یاد فرمایا ہے۔" اپنے دروازے پر کھڑے شخص کے اس پیغام نے ماسٹر آفتاب کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ چودھری اشرف شاہ، چودھری افتخار کے سالے کا بیٹا اور اس کا بڑا داماد ہے۔ یہ بات آفتاب کے علم میں تھی لیکن چودھری افتخار سمیت اس کے اہلِ خانہ میں سے کبھی بھی کسی نے براہِ راست اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ براہِ راست تو وہ اس کے اسکول کی بھی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ اسکول کو غیر مؤثر بنانے کے لیے وہ دوسری طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے جن میں سے اول اسکول کی عمارت کی توسیع میں رکاوٹ ڈالنا اور دوسرے اپنے مزارعوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا تھا کہ اسکول کی تعلیم ان لوگوں کے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔ ان حالات میں چودھری اشرف کی طرف سے بلاوا آنے پر آفتاب احمد کا ذہن سب سے پہلے نئے اے سی کو بھجوائی گئی اپنی درخواست کی طرف گیا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں کسی ذریعے سے چودھری اشرف کو اس درخواست کی اطلاع مل گئی ہے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ نئے اے سی نے اس درخواست کی منظوری کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے وہ اسے ڈرا دھمکا کر اپنی درخواست واپس لینے کی کوشش کرے گا۔ ویسے تو اس معاملے کا تعلق براہِ راست چودھری افتخار سے بنتا تھا لیکن آفتاب کے علم میں تھا کہ آج کل چودھری اپنی حویلی میں پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے الجھا ہوا ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ آفتاب احمد جیسے معمولی اسکول ماسٹر سے براہِ راست بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہو اس لیے بھی اس نے اپنے داماد کو یہ ذمے داری سونپی ہو کہ ذرا اس اسکول ماسٹر کا دماغ تو درست کر دو... اور داماد صاحب نے دماغ درست کرنے کے لیے اسے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم بھیج ڈالا ہو۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ماسٹر صاحب! میں نے آپ سے کچھ عرض کیا ہے۔" چودھری اشرف کے پیامبر نے آفتاب احمد کو سوچوں میں گم دیکھ کر اسے ٹوکا۔

"نہیں، بس میں یہی سوچ رہا تھا کہ آج چودھری صاحب کو میری یاد کیسے آ گئی؟"

"یہ تو آپ ان سے ملیں گے تو ہی پتا چلے گا۔" ملازم نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کس ٹائم بلوایا ہے چودھری صاحب نے؟" ملازم سے اتفاق کرتے ہوئے آفتاب نے پوچھا۔

"نیم ویم کی کوئی بات نہیں۔ میں گڈی لے کر آیا ہوں آپ کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔" ملازم نے جواب دیا تو

آفتاب کو احساس ہوا کہ معاملہ یقیناً سیریس ہے ورنہ چودھری اشرف اسے یوں ایمرجنسی میں کال نہیں کرتا۔

"اچھا تم ٹھہرو... میں ابھی پانچ منٹ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" آفتاب نے ملازم سے کہہ کر اپنے رہائشی کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا، اسکول کی چھٹی ہوچکی تھی۔ اس کا ساتھی ماسٹر کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، یعنی صورت حال یہ تھی کہ اگر وہ چودھری اشرف کے بھیجے کارندے کے ساتھ اس کی حویلی چلا جاتا اور وہاں کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس پر چودھری اشرف برہم ہوکر اسے جان سے ماردیتا یا قید میں ڈال دیتا تو کسی کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ ماسٹر آفتاب احمد کہاں چلا گیا۔ ذہن میں گردش کرتے ان خیالات کے ساتھ آفتاب احمد نے تیزی سے لباس بدلا اور پھر کمرے میں موجود اپنی بوسیدہ سی رائٹنگ ٹیبل کے قریب آیا۔ رائٹنگ ٹیبل پر اس کا وہ کالم جو چودھری اشرف کے نمائندے کی آمد سے قبل وہ لکھ رہا تھا، ادھورا پڑا ہوا تھا۔ آفتاب احمد نے ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر مارکر سے بڑا بڑا "میں چودھری اشرف سے ملنے اس کی حویلی جارہا ہوں" لکھا اور کاغذ کو کلپ بورڈ میں پھنسا کر خود بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب اسے کم از کم یہ تسلی تھی کہ اگر وہ غائب بھی ہوا تو ڈھونڈھنے والوں کو اس کا سراغ تو مل سکے گا۔ باہر چودھری اشرف کا نمائندہ گاڑی میں بیٹھا منتظر نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ آفتاب احمد کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گاڑی چلادی۔ گاڑی چودھری اشرف کی رہائش گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ چودھری اشرف کی رہائش، چودھری افتخار کی حویلی سے کافی فاصلے پر تھی۔ پیرآباد کی بیشتر زمین چودھری افتخار کی ملکیت تھی۔ ان زمینوں کے ساتھ ہی اس کے سالے اور سمدھی کی زمینیں تھیں۔ اپنی زمینوں کی حدود میں ہی اس کی رہائش گاہ بھی تھی جہاں وہ اپنے دونوں بیٹوں اشرف، اختر ان کی بیویوں اور دیگر اہلِ خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ چودھری اشرف کا نمائندہ ماسٹر آفتاب کو اسی جانب لے جارہا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد اسے لے جانے والے نے ماسٹر آفتاب کی آمد کی اطلاع اندر بھجوائی۔ فوراً ہی ایک ملازم اسے اپنے ساتھ اندر ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ملازم کے انداز میں احترام تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک نے آفتاب کے اس خدشے کو کم کردیا کہ وہاں اسے دماغ درست کرنے کی نیت سے بلایا گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چودھری اشرف ایک تقریباً چار سالہ بچے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو آفتاب کے باقی ماندہ خدشات بھی ختم ہوگئے۔

"یہ میرا بیٹا منور ہے۔ بہت ذہین بچہ ہے۔ اللہ نے تین بیٹیوں کے بعد مجھے یہ بیٹا دیا ہے۔ اس لیے اس میں ہم سب کی جان اٹکی رہتی ہے۔ بچے کی ماں اسے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتی اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ابتدائی چند سال اسے گھر پر ہی تعلیم دی جائے۔ میں چاہتا تو اس مقصد کے لیے شہر سے کسی استاد کو بلوا سکتا تھا لیکن سننے میں آیا ہے کہ تم بھی اچھے خاصے لائق آدمی ہو، اس لیے سوچا پہلے تمہیں ہی آزما کر دیکھ لیں۔ کل سے بچے کو پڑھانے آجانا۔ میرا ڈرائیور تمہیں لینے اور چھوڑنے چلا جائے گا۔ اگر ہم تم سے مطمئن ہوگئے تو تمہاری ملازمت پکی ورنہ پھر شہر سے کسی دوسرے استاد کو بلوا لیں گے۔" چودھری اشرف نے ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتے ہوئے آفتاب کو حکم سنا ڈالا۔ اس کا یہ تحکمانہ انداز آفتاب کو بہت برا لگا۔ اول تو وہ گھروں پر جا کر بچوں کو ٹیوشن دینا پسند نہیں کرتا تھا، دوسرے بہ حیثیت استاد اس کی نظر میں اس کا اپنا ایک مقام تھا۔ اس مقام اور عزت کو خاطر میں لائے بغیر چودھری اشرف اس پر یوں حکم چلائے، اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ غصے اور جوش کی کیفیت میں اس کے ہونٹ اس حکم پر انکار کرنے کے لیے کھلے لیکن پھر اچانک ہی اسے ہوش آگیا۔ اسے یاد آیا کہ نئے اے سی شہریار نے چودھری افتخار سے براہِ راست تصادم کے بجائے مصالحانہ حکمتِ عملی سے کام لینے کی بات کی تھی۔ چودھری اشرف، چودھری افتخار کا داماد تھا۔ اس سے تصادم کا مطلب چودھری افتخار سے تصادم تھا۔ چنانچہ مصلحت پسندی کا تقاضا یہ تھا کہ آفتاب، چودھری اشرف کو انکار نہ کرے۔ چودھری اشرف کی بات مان لینے سے اس کی حویلی تک رسائی ہوجاتی۔ ممکن تھا کہ وہ چودھری اشرف کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوجاتا اور کچھ نہیں ہوتا تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ اسے منور نام کے اس پیارے سے بچے کی تعلیم و تربیت کا موقع مل جاتا۔ آفتاب احمد استاد کے کردار کی اہمیت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ اپنی کوشش سے اس کچے ذہن کے معصوم بچے کی سوچوں کا رخ اس طرح موڑ سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں وہ اپنے باپ دادا اور نانا کی روش سے ہٹ کر چل سکے۔ اس چھوٹی سی امید کے سہارے اس نے انکار کے لفظ کو اپنے ہونٹوں پر نہ آنے دیا اور چودھری اشرف سے ہامی بھرلی۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ ڈرائیور کے ساتھ واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو اس کا ساتھی استاد اس کا لکھا ہوا کاغذ ہاتھ میں



پکڑے حیران پریشان کھڑا تھا۔

"یہ کیا ہے آفتاب؟" آفتاب احمد کو دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ میں خوامخواہ وہم کا شکار ہوگیا تھا۔" آفتاب احمد نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور توڑ موڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے بعد ہنسنے لگا۔

"اچھا، وہم تھا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اگر تم اس وقت نہیں آتے تو میں تھوڑی دیر میں کہیں پر مدد مانگنے نکل کھڑا ہوتا۔" اس کا ساتھی خفا ہوا۔

"جانے دو یار! کیا کروں، میں بھی ایک عام سا آدمی ہوں اس لیے کبھی کبھی ڈر جاتا ہوں۔" آفتاب احمد نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر قلم سنبھال لیا۔ اسے اپنا ادھورا کالم آج ہی مکمل کرنا تھا۔

☆☆☆

"چودھری صاحب! صنوبر کے دن قریب آرہے ہیں۔ لاہور والی کوٹھی میں اس کے رہنے کا بندوبست کروادیں۔" چودھری افتخار کو فارغ دیکھ کر بڑی چودھرائن اس کے پاس چلی آئی اور مدعا بیان کیا۔ چودھری افتخار کے خاندان میں رواج تھا کہ جس عورت کی ڈیلیوری کے دن قریب آتے اسے لاہور میں واقع چودھری افتخار کی کوٹھی میں منتقل کردیا جاتا تاکہ بروقت اسپتال پہنچ کر بہترین طبی سہولتوں سے فیض یاب ہوا جاسکے۔ اس طرح حویلی کے مکینوں کو کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے لیے یہ بندوبست کرنے کے بعد وہ لوگ اس فرض سے غافل ہوگئے تھے کہ گاؤں میں مناسب طبی سہولیات فراہم کی جائیں۔ اسکول کی طرح اسپتال کی تعمیر میں بھی کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے برسوں پہلے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کی گئی تھی لیکن اس ڈسپنسری میں نزلے زکام اور بخار کی چند گولیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ کئی سالوں سے کسی کوالیفائیڈ ڈاکٹر نے اس ڈسپنسری میں قدم نہیں رکھا تھا۔ ایک کمپاؤنڈر تھا جو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ضرورت پڑنے پر لوگوں کو یہ دوائیں دے دیتا تھا۔ کچھ گاؤں کے لوگوں میں ڈاکٹری علاج کے لیے اتنی زیادہ پسندیدگی بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے مقابلے میں وہ حکیم سے علاج کروانا زیادہ پسند کرتے تھے لیکن بعض نازک معاملات میں، ڈسپنسری کا کمپاؤنڈر اور گاؤں کا مقبول حکیم دونوں ہی کوئی مدد نہیں کرپاتے تھے۔ خصوصاً عورتوں کے کیسز میں گاؤں میں موجود دو عدد دائیاں ہی سارے معاملات سنبھالتی تھیں لیکن جہاں معاملہ ایسا ہوتا کہ آپریشن ضروری ہوتا، وہاں یہ دائیاں بے بس ہوجاتیں اور انجام عورت کی بے کس و دردناک موت پر ہوتا جسے ان کے ورثا تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیتے۔ گاؤں کی تقدیر بدلنا جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس سلسلے میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کے گھر کی عورتیں اور ان کی ہونے والی اولادیں محفوظ ہیں۔ گاؤں ضروری سہولیات سے عاری تھا تو کیا تھا، وہ خود اپنے لیے تو ہر طرح کی سہولت حاصل کرنے پر قادر تھے... جیسے اس وقت بڑی چودھرائن نے صنوبر کے سلسلے میں بات کی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں کوٹھی فون کردوں گا۔ وہاں ملازم سارا بندوبست کردیں گے۔ یہاں سے کون جائے گا صنوبر کے ساتھ؟"

"ابھی تو میں رانی اور اس کی ماں کو بھجوا رہی ہوں۔ دونوں ماں بیٹی بڑی خدمت گزار ہیں۔ صنوبر کا اچھی طرح خیال رکھیں گی۔ میں اور ناہید ایک آدھ دن پہلے چلے جائیں گے۔ یہاں حویلی کو چھوڑ کر زیادہ دن تک باہر بھی تو نہیں رہا جاسکتا۔ ان کمی کمینوں کے سر پر سوار نہ رہو تو ریڑھا پیٹ ڈالتے ہیں ذرا سے دنوں میں۔" بڑی چودھرائن نے جواب دیا۔

"ہوں... اچھی بات ہے۔ تم لوگوں کو واقعی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ عرس والی رات دیکھا نہیں تھا کہ ذرا سی بے خبری نے کتنی تباہی مچادی۔ مجھے علم ہوتا کہ وہ لڑکا اس خصلت کا ہے تو نوکروں کو منع کردیتا کہ اسے شراب وراب نہ پہنچائیں۔ ذرا سی بات تھی لیکن اس کی وجہ سے اچھی خاصی مشکل پڑگئی۔" چودھری افتخار کو رہ رہ کر حویلی میں ہونے والا حادثہ یاد آتا تھا۔

"بس جی چودھری صاحب! اس دن کسی کی نظر ہی لگ گئی حویلی کو۔ سارے کام اتنی اچھی طریقے سے ہوئے تھے کہ حاسدوں کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کا یہ حسد ہی کھا گیا موتی والا کے بیٹے کو... بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں کسی نے جان بوجھ کر آپ کو مشکل میں ڈالنے کے لیے ہی تو اس لڑکے کے کمرے میں آگ نہیں لگوادی؟ کچھ معلوم تھوڑی ہوتا ہے کسی کا۔ بجن بن کر پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے ہیں لوگ۔" چودھری کی بات سن کر بڑی چودھرائن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"منہ بند رکھو بے وقوف عورت! ابھی تک جو بات کہنے کی کسی کی ہمت نہیں ہوئی، وہ تم لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دوگی۔ حادثے کا الزام لڑکے کے سر رہے اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ اگر موتی والا کو یہ خیال آگیا کہ اس کا بیٹا میری

کسی دشمنی کی بھینٹ چڑھا ہے تو وہ اور بھی زیادہ بد کے گا۔'' چودھری افتخار نے بڑی چودھرائن کو جھاڑا۔

''برا نہ مانیں چودھری صاحب! میں تو بس بے خیالی میں ہی ایسی بات کہہ گئی تھی۔'' بڑی چودھرائن نے چودھری افتخار کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر فوراً معذرت کی۔

''جب کھوپڑی کے اندر بھیجا نہیں ہے تو کیوں ہر معاملے میں دخل دیتی ہو۔ منہ بند کر کے کیوں نہیں بیٹھا جاتا تم سے۔ ویسے بھی عورت ذات کو کیا ضرورت ہے مردوں کے ان معاملات میں بولنے کی؟ تم بس بیٹھ کر حویلی کے اندر کے معاملات دیکھا کرو۔ تم سے یہ معاملات ہی سنبھل جائیں بہت ہے۔ باقی سب دیکھنے کے لیے میں آپ موجود ہوں۔'' بڑی چودھرائن کی معذرت کے باوجود چودھری افتخار نے اس کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کر دی۔

''غلطی ہو گئی چودھری صاحب! آئندہ دھیان رکھوں گی۔'' بڑی چودھرائن نے ایک بار پھر معذرتی الفاظ ادا کیے۔

''ٹھیک ہے۔ آئندہ زبان کو قابو میں رکھنا۔ اب جاؤ یہاں سے۔''

چودھری افتخار نے پُررعونت انداز میں بڑی چودھرائن کی معذرت قبول کرتے ہوئے اس کو حکم دیا۔ بڑی چودھرائن اس حکم کو سن کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی لیکن وہاں سے گئی نہیں۔

''اب کیا ہے؟'' چودھری افتخار نے اس کے وہاں رکے رہنے پر غصے سے پوچھا۔

''ایک بات اور کرنی تھی چودھری صاحب۔'' بڑی چودھرائن منمنائی۔

''کیا بات کرنی تھی؟'' چودھری تھوڑا دھیما ہوا۔

''ناہید نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے کشور کے بھی لاہور جانے کی اجازت لے لوں۔ بے چاری بچی کے لیے زندگی میں اور تو کوئی رونق نہیں۔ ذرا حویلی سے نکل کر کچھ دنوں کے لیے لاہور چلی جائے گی تو اس کا دل بہل جائے گا۔ پھر صنوبر کو بھی بہن کا سہارا ہو جائے گا۔ ملازمائیں لاکھ خیال رکھیں پر بہن کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ دونوں بہنیں ایک جگہ رہیں گی تو دونوں کا ہی دل بہلا رہے گا۔'' بڑی چودھرائن نے مسئلہ پیش کیا۔

''دل بہلانے کا کیا مسئلہ ہے۔ حویلی کوئی چھوٹی ہے جو اسے دیکھ دیکھ کر بندے کا دل اوب جائے۔ ضرورت کی کسی چیز کی بھی کمی نہیں۔ کبھی تم لوگ خواہش کرو تو تمہاری مرضی کی خریداری کے لیے تم لوگوں کو شہر بھی بھجوا دیتا ہوں لیکن پھر بھی شکوے ختم نہیں ہوتے تم لوگوں کے۔ ویسے بھی کشور سے کہو کہ حویلی میں ہی دل لگانے کی عادت ڈالے۔ اسے ساری حیاتی، اپنی آخری سانس تک اسی حویلی میں ہی رہنا ہے۔ یہاں دل نہیں لگائے گی تو بہت پچھتائے گی۔'' چودھری افتخار نے بڑی چودھرائن کی درخواست کے جواب میں تقریر جھاڑی۔

''وہ سب سمجھتی ہے چودھری صاحب! اس کا ایسی ویسی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ بڑے فقیروں والے مزاج کی لڑکی ہے۔ کپڑے لتے، زیور مہندی کسی چیز کا شوق نہیں ہے۔ بس اپنی کتابوں میں مگن رہتی ہے۔ یہ جو اس کے لاہور جانے کا قصہ میں نے آپ کے سامنے چھیڑا ہے، اس کی فرمائش بھی صنوبر نے ناہید سے کی تھی۔ اصل میں اتنے دن اکیلی رہنے کے خیال سے گھبرا رہی ہے۔ پچھلی بار بھی جب بچے کی پیدائش پر لاہور گئی تھی تو یہی شکوہ کر رہی تھی کہ گاؤں سے اتنی دور، اَن جان جگہ پر رہنے میں طبیعت گھبراتی ہے۔ اب اگر کشور ساتھ چلی گئی تو اس کی یہ پریشانی دور ہو جائے گی۔ ویسے ہی اس بار اس کے دل کو گھبراہٹ زیادہ ہے۔ کچھ کم ہمت سی ہو رہی ہے۔'' بڑی چودھرائن کو سوتن کی بیٹیوں سے محبت اتنی نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے یہ کام اس کے ذمے لگایا تھا تو اس کے پورا ہونے میں ہی اس کی عزت تھی۔ اگر وہ چودھری افتخار سے یہ فرمائش نہ منواپاتی تو اس کی اپنی سوکن اور اس کی بیٹیوں کے سامنے ناک نیچی ہو جاتی اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح چودھری افتخار قائل ہو جائے۔

''ٹھیک ہے اگر صنوبر کی طبیعت کا معاملہ ہے تو بھجوا دو کشور کو ساتھ... لیکن دھیان سے سمجھا بجھا کر بھیجنا۔ یہ نہ ہو کہ شہر جا کر خود کو بالکل آزاد سمجھنے لگیں۔'' چودھری افتخار نے آخر کار ہامی بھر لی۔

''آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں سب سمجھا دوں گی لڑکیوں کو۔'' بڑی چودھرائن، چودھری افتخار کا جواب سن کر جوش سے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس کا انداز فاتحانہ تھا۔ وہ ایک بار پھر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ حویلی اور چودھری دونوں پر اس کا راج سب سے مستحکم ہے۔ بند کمرے کے اندر جو بے عزتی ہوئی تھی اس کی کسے بھنک پڑ سکتی تھی۔ موجودہ فیصلے کی روشنی میں تو وہ فاتح تھی۔

☆☆☆

''سر! پیر آباد سے ماسٹر آفتاب آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' شہریار اپنے دفتر میں بیٹھا کسی فائل کا مطالعہ



کر رہا تھا کہ عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے انہیں اندر بھیج دو۔'' شہریار نے جواب دیا۔

''السلام علیکم۔'' ایک منٹ کے وقفے کے بعد ماسٹر آفتاب اس کے کمرے میں تھا۔

''وعلیکم السلام۔ تشریف رکھیے۔'' شہریار نے خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''بغیر ٹائم لیے آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں میرے پاس فون کی سہولت نہیں ہے ورنہ آنے سے پہلے فون پر آپ سے اجازت لے لیتا۔ آج لاہور کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو سوچا آپ سے بھی ملاقات کرتا ہوا چلا جاؤں۔ ویسے مجھے اندازہ ہے کہ اس طرح بے وقت آنے سے آپ ڈسٹرب ہوئے ہوں گے۔'' آفتاب نے مہذبانہ انداز میں شہریار سے بغیر وقت لیے آنے پر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے آفتاب صاحب! میں اس سیٹ پر افسری دکھانے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی خدمت کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔ یوں بھی بے وقت کے ملاقاتیوں سے نمٹنے کی اب عادت سی ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ بلا مقصد صرف اپنے علاقے کے اے سی سے تعلقات بڑھانے کے لیے بھی یہاں چلے آتے ہیں۔ آپ کی آمد کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ یہ بے مقصد نہیں۔ آپ جس مسئلے کے حل کے لیے اتنے عرصے سے درخواستوں پر درخواستیں بھیجتے رہے ہیں، اب اس کے حل کی کچھ امید نہیں ہے تو آپ کا یہاں آنا اور اس بارے میں پوچھنا بالکل جائز ہے۔'' شہریار نے مسکراتے ہوئے ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا۔

''آپ نے میری آمد کے بارے میں کافی درست اندازہ لگایا ہے۔ اصل میں اسکول کو ترقی دینا اور علاقے کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا میرا خواب ہے۔ ہمارے ملک کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی دیہاتوں میں آباد ہے اور بے شمار دیہاتوں میں تعلیم کا کوئی معقول بندوبست ہی نہیں۔ جب بچے پڑھیں گے نہیں تو ملک کا مستقبل کیسے سنورے گا۔ یہ علم سے دوری ہی تو ہے کہ ہم پاکستان کے قیام کے اتنے عرصے بعد بھی اتنی ترقی نہیں کر پائے جتنی ہمیں کرنی چاہیے تھی۔ بہ حیثیت ایک پاکستانی کے، میری خواہش ہے کہ کم از کم اس ایک علاقے میں تو علم کی روشنی پھیلا دوں۔ چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ خود ہی شروع ہو جائے گا۔'' ماسٹر آفتاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''مجھے آپ کا طرزِ فکر بہت پسند آیا۔ آپ کی اس اسپرٹ کا میں نے پہلی ملاقات میں ہی اندازہ لگا لیا تھا لیکن بات وہی ہے کہ میں چاہتا ہوں براہِ راست تصادم کے بغیر بات بن جائے۔ سرکاری حکم جاری کرنا اتنا مشکل نہیں لیکن میرے ڈائریکٹ ایکشن لینے کو چودھری افتخار طبلِ جنگ سمجھے گا۔ فی الحال تو میں نے اس معاملے میں انہیں اس لیے بھی زیادہ نہیں چھیڑا کہ ابھی وہ اپنی حویلی میں موتی والا کے بیٹے کی موت کی وجہ سے پریشان ہے لیکن آپ فکر نہیں کریں، آپ کا اسکول ضرور ترقی کر کے رہے گا۔'' شہریار نے ماسٹر آفتاب کو تسلی دی۔

''بس یہ کام ہو جائے تو مجھے سکون مل جائے گا۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں، مجھے آپ کی پالیسی پر کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ میں خود بھی اس پر عمل پیرا ہو گیا ہوں۔ چودھری افتخار کے داماد چودھری اشرف نے مجھ سے اپنے بیٹے کو پڑھانے کا کہا ہے۔ ذاتی طور پر گھر جا کر ٹیوشن دینے کو ناپسند کرنے کے باوجود میں نے چودھری اشرف کی بات اس لیے مان لی کہ میرے انکار کو بغاوت سمجھتے ہوئے وہ مجھ سے دشمنی نہ پال لے۔ اپنی ذات کے نقصان کے لیے مجھے کوئی پروا نہیں لیکن اسکول کی مجھے بہت فکر ہے۔ میں درمیان سے ہٹ گیا تو دوسرا کوئی یہاں ٹکنے والا مشکل سے ہی آئے گا۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ فی الحال، ہمیں اسی طرح کی مصلحت پسندی سے کام لینا ہوگا۔'' ماسٹر آفتاب کی بات سن کر شہریار نے اس کے فیصلے کی حمایت کی پھر پُرسوچ انداز میں پوچھا۔ ''آپ صحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں... صحافتی حلقے میں آپ کی دوستیاں وغیرہ تو ہوں گی؟''

''بہت زیادہ تو نہیں ہیں۔ اصل میں، میں ذرا الگ تھلگ رہ کر خاموشی سے کام کرنے والا بندہ ہوں۔ لوگوں سے ملتا ہوں لیکن بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا۔ صحافیوں کی گروپ بندیاں اور خاص افراد، اداروں اور جماعتوں سے ہمدردیاں مجھے پسند نہیں آتیں۔ لوگ صحافت کے مقدس پیشے میں رہ کر بھی منافقانہ رویوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اس لیے میرے بس گنے چنے چند ایک افراد سے ہی قریبی تعلقات ہیں۔'' ماسٹر آفتاب نے جواب دیا۔

''ان چند ایک افراد میں سے کوئی ایک تو ایسا ہو گا جو آپ کے کہنے پر پیر آباد کی صورتِ حال پر قلم اٹھا سکے؟'' ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہریار نے دوسرا سوال اٹھایا۔

''بالکل، میرا ایک دوست ایسا ہے جو میرے کہنے پر یہ کام کر دے گا لیکن میں کسی اور سے کیوں کہوں؟ میں خود بھی یہ کام کر سکتا ہوں۔ پہلے بھی ڈھکے چھپے انداز میں یہاں کے

مسائل کی نشان دہی کرتا رہا ہوں۔''

''آپ کے پچھلے کالمز میں نے دیکھے ہیں لیکن میں چاہ رہا ہوں کہ اب آپ یہ کام نہ کریں۔ آپ کو صحافت کے ساتھ ساتھ یہاں رہ کر بھی کام کرنا ہے۔ بار بار اگر آپ ہی اس سلسلے میں لکھتے رہے تو چودھری افتخار آپ کی کھوج میں لگ جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ اتنے قیمتی شخص کا نقصان برداشت کروں۔ آپ بے شک لکھنے کے لیے قلمی نام استعمال کرتے ہیں لیکن جب کوئی کھوج لگانے پر اتر آئے تو اس کے لیے اصل بندے تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا۔ اب تو یوں بھی آپ کی کتاب چھپنے والی ہے۔ کتاب کے بعد آپ لوگوں کے لیے اور بھی زیادہ فیمیلر ہو جائیں گے۔'' ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہریار نے اپنی کہی بات کی وضاحت دی۔

''اگر آپ کی یہی رائے ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اپنے صحافی دوست سے بات کرلوں گا۔ وہ کافی مقبول صحافی ہے اور سچ لکھنے سے گھبراتا نہیں ہے۔ اپنے سچ کی وجہ سے بے چارے کو اکثر دھمکیوں اور کبھی کبھی پابندیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ میں پیر آباد کے سلسلے میں کالم لکھنے کی فرمائش کروں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ بس آپ یہ بتا دیں کہ کالم کس نوعیت کا ہونا چاہیے اور اس میں کن نکات پر زیادہ زور دینا ہے تاکہ میں اپنے دوست کو بریف کردوں۔'' ماسٹر آفتاب کے پوچھنے پر شہریار دھیمی آواز میں اسے اپنے ذہن میں موجود تجاویز کے متعلق سمجھانے لگا۔ شہریار کی ہر ہر بات کو غور سے سنتے ماسٹر آفتاب کا سر جواباً مسلسل اثباتی انداز میں حرکت کرتا رہا۔

☆☆☆

''سلام چودھری صاحب!'' غیاث محمد اور نوراں نے ہاتھ جوڑ کر چودھری افتخار کو سلام کیا جس کا جواب دینے کے بجائے چودھری افتخار بے نیازی سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ شہر کی محفلوں میں اور سفر کے دوران وہ زیادہ تر سگار کا استعمال کرتا تھا لیکن حویلی میں ہونے کی صورت میں اسے حقہ ہی سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس وقت بھی اپنے محبوب حقے کے ساتھ مصروف وہ نوراں اور غیاث محمد کو باریابی کی اجازت دینے کے باوجود بالکل فراموش کیے بیٹھا تھا۔ نوراں اور غیاث محمد جو پہلے ہی بہت ڈرتے ڈرتے وہاں آئے تھے، چودھری کے اس انداز کو دیکھ کر سلام کے بعد زبان سے ایک لفظ بھی مزید ادا نہیں کرسکے۔ وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے اس کو بیان کرنے میں ویسے ہی ان کی زبانیں تالو کے ساتھ لگی جارہی تھیں مگر ضرورت ایسی تھی کہ یہاں آکر بیان کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں بنتا تھا۔ زہرہ کے سسرال والوں نے بتا دیا تھا کہ رب نواز دس پندرہ دن بعد گاؤں پہنچنے والا ہے۔ رب نواز بہت کم دن کی چھٹیوں پر آرہا تھا اس لیے اس کے آتے ہی شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جانا چاہیے تھا۔ ادھر نوراں اور غیاث محمد کے پاس تیاری کے لیے کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ان کا سارا انحصار چودھری افتخار کی طرف سے قرض کی فراہمی پر تھا۔ رب نواز کے گاؤں پہنچنے کی تاریخوں کا انہیں پہلے بھی اندازہ تھا اور وہ ارادہ رکھتے تھے کہ عرس کے فوراً بعد چودھری افتخار کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے قرض طلب کریں گے۔ عرس کے بعد کے عرصے میں چودھری افتخار کا مزاج خاصا خوش گوار ہو جاتا تھا۔ پھر نوراں اور غیاث محمد کے پاس اپنی حویلی کے لیے انجام دی گئی خدمات کا حوالہ بھی موجود ہوتا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ چودھری افتخار کو اس کے مرحوم دادا کا واسطہ دے کر اس سے قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن عرس کے بعد تو صورتِ حال ہی بدل گئی تھی۔ حویلی میں ہونے والے حادثے نے چودھری افتخار کا مزاج اتنا برہم کردیا تھا کہ نوراں اور غیاث محمد اس کے پاس آنے کی ہمت ہی نہیں کرسکے لیکن اب تو شادی بالکل ان کے سر پر آکھڑی ہوئی تھی اور حویلی میں ہوئے حادثے کو بھی کافی دن گزر گئے تھے اس لیے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، وہ چودھری افتخار کے سامنے آنے کی ہمت کر بیٹھے تھے۔ لیکن اب جیسے ساری ہمت سلب ہوگئی تھی اور وہ دونوں بس ہاتھ جوڑے اور نظریں جھکائے چودھری افتخار کی نظرِ التفات کے منتظر بیٹھے تھے۔

''ہاں بھئی غیاث محمد! بول کیا بات ہے؟'' آخر چودھری نے حقے کی نے ہونٹوں سے جدا کرکے بائیں جانب ہاتھ باندھ کر، حکم کے منتظر کھڑے مؤدب ملازم کو تھامی اور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کی رعایا ہوں سرکار! مشکل میں ہوں اس لیے مدد مانگنے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' غیاث محمد نے نہایت عاجزی سے اپنی بات شروع کی۔ چودھری افتخار بنا کچھ بولے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میری دھی کا بیاہ سر پر کھڑا ہے سرکار! دھی بیاہنے کے لیے چار پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں۔ میں تو اس لائق بھی نہیں کہ دھی کو جہیز میں دو جوڑے دے سکوں۔ دھی کی برات دروازے پر آئے گی تو براتیوں کی خاطر مدارات کیسے کروں گا؟ اب آپ ہی کا آسرا ہے۔ آپ اپنا ہاتھ رکھ دیں میرے سر پر تو میں عزت سے دھی



بیاہ دوں گا۔'' غیاث محمد نے ہاتھ جوڑے جوڑے ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

''مجھے کیا کمی ہے غیاث محمد! تیرا بھتیجا تو آپ دبئی سے کمائیاں کر کے بھجوا رہا ہے۔ اس کے ماں پیو نے گھر میں تین ٹی وی اور فریج بھی لا رکھا ہے۔ تیرے بھائی کا گھر تو بھرا پڑا ہے چیزوں سے۔ تجھے کیا ضرورت پڑی ہے بیٹی کو جہیز دینے کی۔ خالی ہاتھ بھی بھیجے گا تو وہاں جا کر عیش کرے گی۔'' چودھری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''وہ الگ بات ہے سرکار! پر ہمیں تو زمانے کی ریت نبھانی ہے۔ دھی کو بالکل خالی ہاتھ تو بھیج کر میں اس کا سسرال میں نہیں جھکا سکتا۔ بھلے وہ میرے سگے بھرا کا گھر ہے لیکن میری دھی کے لیے تو اس کا سسرال ہی ہوگا۔ بہت نہ سہی پر دو چار چیزیں تو میں نے اسے جہیز کے نام پر دینی ہی ہوں گی پھر برات پر پروہنوں کی خاطر مدارات کے لیے بھی تو کچھ چاہیے۔ آپ ہم پر کرم کریں سرکار! آپ تھوڑی رقم مجھے قرض دے دیں تاکہ میں عزت سے اپنی دھی بیاہ سکوں۔'' غیاث محمد گڑگڑایا۔

''تھوڑی سی رقم قرض دے دوں؟ میرے پاس کوئی نوٹوں کے درخت لگے ہوئے ہیں جن سے نوٹ توڑ توڑ کر میں تمہاری ہر وقت پھیلی ہوئی جھولیوں میں ڈالتا جاؤں؟ بڑی بیٹی کے بیاہ پر بھی تم نے اسی طرح رو دھو کر قرض لیا تھا۔ دو سال ہو گئے، ابھی تک آدھا قرض بھی ادا نہیں کیا اور اب دوبارہ مزید قرض مانگنے میرے سامنے آکھڑے ہوئے ہو۔ تم بے غیرتوں کی آنکھ کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے پچھلے حساب کتاب کو دیکھ کر شرم کرو، منہ اٹھا کر مزید مانگنے کے لیے چلے آتے ہو۔ جاؤ یہاں سے... پہلے پچھلا حساب بے باق کرو پھر اور قرضے کی بات کرنا۔'' چودھری نے رعونت سے غیاث محمد کو پھٹکارتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

''مجھ پر رحم کریں مائی باپ! میں آپ کی پائی پائی اتار دوں گا۔ میں اس قرضے کے بدلے ساری حیاتی آپ کی غلامی کروں گا، بس ابھی آپ میری مدد کریں۔'' غیاث محمد نے چودھری افتخار کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

''پرے ہٹ۔ میرے پاس تیری یہ نوسر بازیاں دیکھنے کا وقت نہیں۔'' چودھری افتخار نے غیاث محمد کے سر پر اپنے پیر سے ٹھوکر لگاتے ہوئے اسے دور ہٹایا۔

''آپ کو پیر سرکار کا واسطہ چودھری صاحب! آپ ہم غریبوں کو خالی ہاتھ واپس نہ لوٹائیں۔ میں نے عرس والے دن اپنا چلّا پیر سرکار کی قبر پر چڑھا کر منت مانی تھی کہ پیر سرکار میری دھی کے بیاہ کے لیے بندوبست کروا دیں۔ آپ تو پیر سرکار کا خون ہیں چودھری صاحب! آپ ان کے نام کی لاج رکھ لیں۔ ہم نے تو سنا ہے کہ پیر سرکار کی درگاہ پر مانی گئی منت کبھی رد نہیں ہوتی۔ ان کے دربار سے سب کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ وہاں سے سب اپنی جھولیاں بھر کر اٹھتے ہیں۔ پھر ہم پیر سرکار کے ماننے والے اور آپ کی رعایا ہو کر کیسے نامراد رہ سکتے ہیں۔'' نوراں جو اب تک خاموش بیٹھی رہی تھی، دہائیاں دینے لگی۔ اس کی ان دہائیوں کو سن کر چودھری افتخار کے کان کھڑے ہو گئے۔ نوراں کا دیا حوالہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ یہ عقیدت مندی کے استحکام کا معاملہ تھا۔ اگر نوراں اور غیاث محمد نے ایسی کوئی منت مانگی تھی تو اب اس کا پورا ہونا ضروری تھا ورنہ ان کی عقیدت مندی میں کمی آسکتی تھی۔ ویسے بھی چودھری افتخار، غیاث محمد کی درخواست کو رد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ بس اسے اپنے دباؤ میں لے رہا تھا۔ منہ کھولتے ہی مزارعوں کی حاجت پوری کردینے میں اس کی چودھراہٹ کا رعب قائم نہیں ہوتا تھا۔ حکمرانی کا لطف تو اسی وقت آتا تھا جب اپنے زیرنگیں افراد کو پوری طرح خاک میں ملا دیا جائے اور ان کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کی لاش پر سینہ تان کر چہل قدمی کی جائے۔

''ٹھیک ہے، تم نے پیر دادا کا واسطہ دیا ہے تو اب ہم تمہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹا سکتے۔ کل آکر منشی سے رقم لے جانا۔ وہ کاغذ پر تمہارا انگوٹھا لگوا لے گا۔'' آخر چودھری افتخار نے نوراں اور غیاث محمد کو مژدہ سنایا۔

''مہربانی سرکار! بڑی مہربانی۔ اللہ پاک آپ کی نسلوں پر اپنا کرم کرے۔ پیر سرکار کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے۔ پیر سرکار کی چھاؤں میں آپ سدا پھلتے پھولتے رہیں۔'' درخواست کی منظوری کی خوش خبری سنتے ہی نوراں نے دعاؤں کی بوچھاڑ کردی۔ غیاث محمد جو چودھری کی ٹھوکر سے فرش پر گر گیا تھا، دوبارہ اٹھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔

''بس بس ٹھیک ہے، زیادہ چاپلوسی نہ کرو۔ پیر دادا کے نام پر قرض مل رہا ہے لیکن تم لوگوں کو اس کی پائی پائی چکانی ہو گی۔ یہ نہ ہو کہ اس قرض کی ادائیگی سے پہلے تیسری بیٹی کے لیے دامن پھیلا کر میرے سامنے آبیٹھو۔'' چودھری افتخار نے بے زاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہانے سے ماہ بانو کا ذکر نکالا۔ اس رات ماہ بانو کے بچ نکلنے کا اسے بڑا ملال تھا۔ اچھا خاصا وہ اسے قابو میں کر چکا تھا کہ حادثے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔ جلدی میں اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ماہ بانو کو

مسائل کی نشان دہی کرتا رہا ہوں۔"

"آپ کے پچھلے کالمز میں نے دیکھے ہیں لیکن میں چاہ رہا ہوں کہ اب آپ یہ کام نہ کریں۔ آپ کو صحافت کے ساتھ ساتھ یہاں رہ کر بھی کام کرنا ہے۔ بار بار اگر آپ ہی اس سلسلے میں لکھتے رہے تو چودھری افتخار آپ کی کھوج میں لگ جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ اتنے قیمتی شخص کا نقصان برداشت کروں۔ آپ بے شک لکھنے کے لیے قلمی نام استعمال کرتے ہیں لیکن جب کوئی کھوج لگانے پر اتر آئے تو اس کے لیے اصل بندے تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا۔ اب تو یوں بھی آپ کی کتاب چھپنے والی ہے۔ کتاب کے بعد آپ لوگوں کے لیے اور بھی زیادہ ٹیسیلر ہو جائیں گے۔" ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہریار نے اپنی کہی بات کی وضاحت دی۔

"اگر آپ کی یہی رائے ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اپنے صحافی دوست سے بات کرلوں گا۔ وہ کافی مقبول صحافی ہے اور سچ لکھنے سے گھبراتا نہیں ہے۔ اپنے سچ کی وجہ سے بے چارے کو اکثر دھمکیوں اور کبھی کبھی پابندیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ میں پیر آباد کے سلسلے میں کالم لکھنے کی فرمائش کروں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ بس آپ یہ بتا دیں کہ کالم کس نوعیت کا ہونا چاہیے اور اس میں کن نکات پر زیادہ زور دینا ہے تاکہ میں اپنے دوست کو بریف کردوں۔" ماسٹر آفتاب کے پوچھنے پر شہریار دھیمی آواز میں اسے اپنے ذہن میں موجود تجاویز کے متعلق سمجھانے لگا۔ شہریار کی ہر ہر بات کو غور سے سنتے ماسٹر آفتاب کا سر جواباً مسلسل اثباتی انداز میں حرکت کرتا رہا۔

☆☆☆

"سلام چودھری صاحب!" غیاث محمد اور نوراں نے ہاتھ جوڑ کر چودھری افتخار کو سلام کیا جس کا جواب دینے کے بجائے چودھری افتخار بے نیازی سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ شہر کی محفلوں میں اور سفر کے دوران وہ زیادہ تر سگار کا استعمال کرتا تھا لیکن حویلی میں ہونے کی صورت میں اسے حقہ ہی سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس وقت بھی اپنے محبوب حقے کے ساتھ مصروف وہ نوراں اور غیاث محمد کو باریابی کی اجازت دینے کے باوجود بالکل فراموش کیے بیٹھا تھا۔ نوراں اور غیاث محمد جو پہلے ہی بہت ڈرتے ڈرتے وہاں آئے تھے، چودھری کے اس انداز کو دیکھ کر سلام کے بعد زبان سے ایک لفظ بھی مزید ادا نہیں کرسکے۔ وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے اس کو بیان کرنے میں ویسے ہی ان کی زبانیں تالو کے ساتھ لگی جارہی تھیں مگر ضرورت ایسی تھی کہ یہاں آکر بیان کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں بنتا تھا۔ زہرہ کے سسرال والوں نے بتا دیا تھا کہ رب نواز دس پندرہ دن بعد گاؤں پہنچنے والا ہے۔ رب نواز بہت کم دن کی چھٹیوں پر آرہا تھا اس لیے اس کے آتے ہی شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جانا چاہیے تھا۔ ادھر نوراں اور غیاث محمد کے پاس تیاری کے لیے کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ان کا سارا انحصار چودھری افتخار کی طرف سے قرض کی فراہمی پر تھا۔ رب نواز کے گاؤں پہنچنے کی تاریخوں کا انہیں پہلے بھی اندازہ تھا اور وہ ارادہ رکھتے تھے کہ عرس کے فوراً بعد چودھری افتخار کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے قرض طلب کریں گے۔ عرس کے بعد کے عرصے میں چودھری افتخار کا مزاج خاصا خوش گوار ہو جاتا تھا۔ پھر نوراں اور غیاث محمد کے پاس اپنی حویلی کے لیے انجام دی گئی خدمات کا حوالہ بھی موجود ہوتا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ چودھری افتخار کو اس کے مرحوم دادا کا واسطہ دے کر اس سے قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن عرس کے بعد تو صورتِ حال ہی بدل گئی تھی۔ حویلی میں ہونے والے حادثے نے چودھری افتخار کا مزاج اتنا برہم کردیا تھا کہ نوراں اور غیاث محمد اس کے پاس آنے کی ہمت ہی نہیں کرسکے لیکن اب تو شادی بالکل ان کے سر پر آکھڑی ہوئی تھی اور حویلی میں ہوئے حادثے کو بھی کافی دن گزر گئے تھے اس لیے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، وہ چودھری افتخار کے سامنے آنے کی ہمت کر بیٹھے تھے۔ لیکن اب جیسے ساری ہمت سلب ہوگئی تھی اور وہ دونوں بس ہاتھ جوڑے اور نظریں جھکائے چودھری افتخار کی نظرِ التفات کے منتظر بیٹھے تھے۔

"ہاں بھئی غیاث محمد! بول کیا بات ہے؟" آخر چودھری نے حقے کی نے ہونٹوں سے جدا کر کے بائیں جانب ہاتھ باندھ کر، حکم کے منتظر کھڑے مؤدب ملازم کو تھمائی اور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کی رعایا ہوں سرکار! مشکل میں ہوں اس لیے مدد مانگنے آپ کے پاس آیا ہوں۔" غیاث محمد نے نہایت عاجزی سے اپنی بات شروع کی۔ چودھری افتخار بنا کچھ بولے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"میری دھی کا بیاہ سر پر کھڑا ہے سرکار! دھی بیاہنے کے لیے چار پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں۔ میں تو اس لائق بھی نہیں کہ دھی کو جہیز میں دو جوڑے دے سکوں۔ دھی کی برات دروازے پر آئے گی تو براتیوں کی خاطر مدارات کیسے کروں گا؟ اب آپ ہی کا آسرا ہے۔ آپ اپنا ہاتھ رکھ دیں میرے سر پر تو میں عزت سے دھی



بیاہ دوں گا۔" غیاث محمد نے ہاتھ جوڑے جوڑے ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

"تجھے کیا کمی ہے غیاث محمد! تیرا بھتیجا تو آپ دبئی سے کمائیاں کر کے بھجوا رہا ہے۔ اس کے ماں پیو نے گھر میں رنگین ٹی وی اور فریج بھی لا رکھا ہے۔ تیرے بھائی کا گھر تو بھرا پڑا ہے چیزوں سے۔ تجھے کیا ضرورت پڑی ہے بیٹی کو جہیز دینے کی۔ خالی ہاتھ بھی بھیجے گا تو وہاں جا کر عیش کرے گی۔" چودھری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"وہ الگ بات ہے سرکار! پر ہمیں تو زمانے کی ریت نبھانی ہے۔ دھی کو بالکل خالی ہاتھ بھیج کر میں اس کا سسرال میں نہیں جھکا سکتا۔ بھلے وہ میرے سگے بھرا کا گھر ہے لیکن میری دھی کے لیے تو اس کا سسرال ہی ہوگا۔ بہت نہ سہی پر دو چار چیزیں تو میں نے اسے جہیز کے نام پر دینی ہی ہوں گی پھر برات پر پروہنوں کی خاطر مدارات کے لیے بھی تو کچھ چاہیے۔ آپ ہم پر کرم کریں سرکار! آپ تھوڑی رقم مجھے قرض دے دیں تاکہ میں عزت سے اپنی دھی بیاہ سکوں۔" غیاث محمد گڑگڑایا۔

"تھوڑی سی رقم قرض دے دوں؟ میرے پاس کوئی نوٹوں کے درخت لگے ہوئے ہیں جن سے نوٹ توڑ توڑ کر میں تمہاری ہر وقت پھیلی ہوئی جھولیوں میں ڈالتا جاؤں؟ بڑی بیٹی کے بیاہ پر بھی تم نے اسی طرح رو دھو کر قرض لیا تھا۔ دو سال ہو گئے، ابھی تک آدھا قرض بھی ادا نہیں کیا اور اب دوبارہ مزید قرض مانگنے میرے سامنے آکھڑے ہوئے ہو۔ تم بے غیرتوں کی آنکھ کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے پچھلے حساب کتاب کو دیکھ کر شرم کرو، منہ اٹھا کر مزید مانگنے کے لیے چلے آتے ہو۔ جاؤ یہاں سے.... پہلے پچھلا حساب بے باق کرو پھر اور قرضے کی بات کرنا۔" چودھری نے رعونت سے غیاث محمد کو پھٹکارتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

"مجھ پر رحم کریں مائی باپ! میں آپ کی پائی پائی اتار دوں گا۔ میں اس قرضے کے بدلے ساری حیاتی آپ کی غلامی کروں گا، بس ابھی آپ میری مدد کریں۔" غیاث محمد نے چودھری افتخار کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

"پرے ہٹ۔ میرے پاس تیری یہ نوسر بازیاں دیکھنے کا وقت نہیں۔" چودھری افتخار نے غیاث محمد کے سر پر اپنے پیر سے ٹھوکر لگاتے ہوئے اسے دور ہٹایا۔

"آپ کو پیر سرکار کا واسطہ چودھری صاحب! آپ ہم غریبوں کو خالی ہاتھ واپس نہ لوٹائیں۔ میں نے عرس والے دن اپنا چھلا پیر سرکار کی قبر پر چڑھا کر منت مانی تھی کہ پیر سرکار میری دھی کے بیاہ کے لیے بندوبست کروا دیں۔ آپ تو پیر سرکار کا خون ہیں چودھری صاحب! آپ ان کے نام کی لاج رکھ لیں۔ ہم نے تو سنا ہے کہ پیر سرکار کی درگاہ پر مانی گئی منت کبھی رد نہیں ہوتی۔ ان کے دربار سے سب کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ وہاں سے سب اپنی جھولیاں بھر کر اٹھتے ہیں۔ پھر ہم پیر سرکار کے ماننے والے اور آپ کی رعایا ہو کر کیسے نامراد رہ سکتے ہیں۔" نوراں جو اب تک خاموش بیٹھی رہی تھی، دہائیاں دینے لگی۔ اس کی ان دہائیوں کو سن کر چودھری افتخار کے کان کھڑے ہو گئے۔ نوراں کا دیا حوالہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ یہ عقیدت مندی کے استحکام کا معاملہ تھا۔ اگر نوراں اور غیاث محمد نے ایسی کوئی منت مانگی تھی تو اب اس کا پورا ہونا ضروری تھا ورنہ ان کی عقیدت مندی میں کمی آسکتی تھی۔ ویسے بھی چودھری افتخار، غیاث محمد کی درخواست کو رد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ بس اسے اپنے دباؤ میں لے رہا تھا۔ منہ کھولتے ہی مزارعوں کی حاجت پوری کر دینے میں اس کی چودھراہٹ کا رعب قائم نہیں ہوتا تھا۔ حکمرانی کا لطف تو اسی وقت آتا تھا جب اپنے زیرنگیں افراد کو پوری طرح خاک میں ملا دیا جائے اور ان کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کی لاش پر سینہ تان کر چہل قدمی کی جائے۔

"ٹھیک ہے، تم نے پیر دادا کا واسطہ دیا ہے تو اب ہم تمہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹا سکتے۔ کل آکر منشی سے رقم لے جانا۔ وہ کاغذ پر تمہارا انگوٹھا لگوا لے گا۔" آخر چودھری افتخار نے نوراں اور غیاث محمد کو مژدہ سنایا۔

"مہربانی سرکار! بڑی مہربانی۔ اللہ پاک آپ کی نسلوں پر اپنا کرم کرے۔ پیر سرکار کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے۔ پیر سرکار کی چھاؤں میں آپ سدا پھلتے پھولتے رہیں۔" درخواست کی منظوری کی خوش خبری سنتے ہی نوراں نے دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔ غیاث محمد جو چودھری کی ٹھوکر سے فرش پر گر گیا تھا، دوبارہ اٹھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔

"بس بس ٹھیک ہے، زیادہ چاپلوسی نہ کرو۔ پیر دادا کے نام پر قرض مل رہا ہے لیکن تم لوگوں کو اس کی پائی پائی چکانی ہو گی۔ یہ نہ ہو کہ اس قرض کی ادائیگی سے پہلے تیسری بیٹی کے لیے دامن پھیلا کر میرے سامنے آبیٹھو۔" چودھری افتخار نے بے زاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہانے سے ماہ بانو کا ذکر نکالا۔ اس رات ماہ بانو کے بچ نکلنے کا اسے بڑا ملال تھا۔ اچھا خاصا وہ اسے قابو میں کر چکا تھا کہ حادثے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔ جلدی میں اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ماہ بانو کو

اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنے کا بندوبست کر کے جاتا۔ اس کی اس غفلت کا فائدہ اٹھا کر ماہ بانو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ بعد میں بھی وہ دو تین دن تو شہر میں ہی مصروف رہا اور اس مصروفیت میں اسے ماہ بانو کا دھیان نہیں آسکا۔ ذرا فرصت ملی تو ماہ بانو گاؤں سے جا چکی تھی۔ چودھری افتخار ہاتھ ملتا رہ گیا لیکن اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو کا حصول اتنا مشکل نہیں۔ وہ چاہتا تو اسے فیصل آباد سے بھی اٹھوا سکتا تھا مگر ابھی دوسرے معاملات زیادہ توجہ طلب تھے اس لیے اس نے وقتی طور پر ماہ بانو کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اس وقت نوراں اور غیاث محمد کو اپنے سامنے پا کر اسے ماہ بانو ایک بار پھر یاد آ گئی اور وہ اس کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔

''تیسری کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کو اس کے خالہ خالو نے پالا ہے، وہی اس کے بیاہ کی فکر کریں گے۔ میرے ذمے تو بس ان دو بیٹیوں کا ہی بوجھ تھا۔ ایک کو آپ کی مہربانی سے پہلے ہی نمٹا چکا ہوں، اب دوسری بھی آپ کے ہی کرم سے اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو بس بیٹا ہے، وہ اپنے زورِ بازو پر آپ کی خدمت کر کے اپنے لیے خود بندوبست کر لے گا۔'' غیاث محمد نے عاجزی سے جواب دیا۔

''تیری سالی اور اس کا شوہر تو شہر میں رہتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیری کڑی کو کسی شہری لڑکے سے بیاہ دیں۔'' چودھری افتخار نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ہم نے اپنی دھی انہیں دے دی چودھری صاحب! اب چاہے وہ اس کے لیے جو بھی فیصلہ کریں۔'' نوراں نے چودھری افتخار کی بات کا مبہم سا جواب دیا۔

''ایسے کیسے کوئی بھی فیصلہ کر لیں گے وہ لوگ؟ اس گاؤں کی کڑی واپس یہیں آنی چاہیے۔'' چودھری افتخار نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

''اگر یہ آپ کا حکم ہے سرکار تو سمجھ لیں ماہ بانو واپس یہیں آئے گی۔ ہم آپ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہونے دیں گے۔'' چودھری افتخار کا موڈ دیکھ کر غیاث محمد نے فوراً خوشامدانہ رویہ اپنایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چودھری ایک بار پھر بھتے سے اکھڑ جائے۔

''تم ہماری مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔ ماہ بانو گاؤں واپس آنا ہوگا۔ وہ خود سے نہ آئی تو ہم اسے زبردستی لے آئیں گے۔'' چودھری افتخار ماہ بانو کے معاملے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے، غیاث محمد اور نوراں کی سمجھ میں نہیں آسکا لیکن جب نوراں نے چودھری افتخار کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نظر آتی شیطانی چمک کو دیکھ کر دھک سی رہ گئی۔ اسے یک دم ہی ماہ بانو کا عرس والی رات ابتر حالت میں آخری پہر گھر لوٹنا یاد آیا۔ بہت دنوں سے جو سوال اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا، اس کا جواب اس نے چودھری افتخار کی آنکھوں میں پالیا۔ اس جواب کو پا کر وہ کانپ اٹھی۔ چودھری کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک بار ہاتھ سے نکل جانے والے شکار کو دوبارہ اپنے پنجوں میں دبوچنے کے لیے بے تاب ہے۔

☆☆☆

''آپا! مجھے بازار جانا ہے۔'' نجمی کی بچی سے میں نے کہا تھا کہ میری کتابیں خیال سے گاڑی میں رکھوا دینا لیکن اس کام چور نے کتابیں رکھی ہی نہیں۔ کتابوں کے بغیر تو میرا گزارہ ہونا مشکل ہے۔ ویسے ہی یہاں اتنی بوریت ہے۔'' ریموٹ ہاتھ میں لیے، بستر پر دراز ٹی وی کے چینل پر چینل بدلتی صنوبر کے قریب بیٹھتے ہوئے کشور نے اسے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''چھوڑو کتابوں کو۔ ہر وقت فضول کتابیں چاٹنے میں وقت برباد کرتی رہتی ہو۔ ٹی وی دیکھو، اتنے مزے مزے کے پروگرام آتے ہیں ٹی وی پر۔ ادھر گاؤں میں تو اس سوتے ہوئے پی ٹی وی کے علاوہ کچھ دیکھنے کو ہی نہیں ملتا۔ یہاں دیکھو کتنے ڈھیر سارے چینل آتے ہیں۔ ہمیں کوئی فلم دیکھنی ہو تو وی سی آر پر کیسٹ لگا کر دیکھنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک وقت میں چھ چھ جگہ سے فلمیں آرہی ہوتی ہیں۔ ڈرامے بھی اتنے مزے مزے کے ہیں۔ میں تو ان ڈراموں کی عورتوں کے کپڑے اور زیورات اچھی طرح ذہن میں بٹھا رہی ہوں۔ ذرا فارغ ہو جاؤں تو بعد میں یہاں آ کر اپنی پسند کی ساری چیزیں خریدوں گی۔ تم بھی ذرا میرے ساتھ بیٹھ کر کپڑوں کے ڈیزائن وغیرہ اچھی طرح دیکھ لو تاکہ اگر میں کچھ بھول بھی جاؤں تو تم یاد دلا دو۔'' کشور کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے صنوبر نے اس سے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے آپا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ مجھے کپڑوں اور زیور کا شوق ہے اور نہ ہی مجھے یہ ڈرامے اور فلمیں کچھ خاص اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔'' صنوبر کے مشورے پر کشور نے بے زاری کا اظہار کیا۔

''تمہارے نزدیک تو تمہاری کتابوں کے سوا دنیا میں سب کچھ بے کار ہے۔ اباجی کی شہری بیوی مرتے مرتے کہیں اچھا مرض لگا گئی ہے۔'' صنوبر اس کی بے زاری پر چڑی۔

''مرض نہیں لگایا انہوں نے مجھے۔ وہ تو مجھے پاگل

ہونے سے بچانے کا انتظام کر کے گئی ہیں۔ میں تو اللہ سے بہت دعائیں کرتی ہوں ان کی بخشش کے لیے۔ اگر آج میرے پاس ان کتابوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟''

''اچھا چل، زیادہ اداس نہ ہو۔ ڈرائیور کو بھیج کر بازار سے نئی کتابیں منگوالے۔'' کشور کی بات سن کر صنوبر کو فوراً ہی بہن کی محرومی کا خیال آیا اور وہ نرم پڑ گئی۔

''ڈرائیور کو نہیں بھیجنا۔ میں خود جا کر اپنی پسند سے کتابیں خریدوں گی۔'' کشور نے ضد کی۔

''پر کہیں اباجی کو برا نہ لگے۔ آنے سے پہلے انہوں نے سخت تاکید کی تھی سنبھل کر رہنے کی۔'' صنوبر ہچکچائی۔

''اباجی پسند کے کپڑے لتے لینے کے لیے بھی تو ہم لوگوں کو بازار جانے کی اجازت دے دیتے ہیں... تو پھر میں اپنی پسند کی کتابیں خرید نے کیوں نہیں جاسکتی؟ اس سے پہلے بھی تو میں جب بھی آپ لوگوں کے ساتھ بازار گئی ہوں، ہمیشہ کتابیں خرید کر لائی ہوں۔ اباجی نے کبھی کوئی اعتراض تو نہیں کیا اور ویسے بھی مجھے کون سا دور جانا ہے۔ یہاں سے لبرٹی مارکیٹ دور ہی کتنی ہے؟'' کشور نے فوراً ہی دلیل دی تو صنوبر کو قائل ہونا پڑا۔

''اچھا چلی جا۔ ساتھ میں رانی کو بھی لے لینا... اور ہاں، جلدی آنا۔''

''ٹھیک ہے آپا! آپ فکر ہی نہ کریں۔'' کشور خوش خوش باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رانی کے ساتھ ایک بڑی سی کتابوں کی دکان پر تھی۔ شیلف میں لگی کتابوں کو منتخب کر کے وہ رانی کو تھماتی رہی۔ اچھا خاصا ڈھیر جمع ہونے کے بعد اس نے کاؤنٹر پر کتابوں کی قیمت ادا کی اور باہر نکل گئی۔

''بی بی! اس میں سے جو کتابیں آسان الفاظ میں لکھی ہوں، آپ وہ مجھے پڑھنے کے لیے ضرور دیجیے گا۔ مجھے بڑا شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔'' کتابوں کا ڈھیر اٹھا کر اس کے پیچھے آنے والی رانی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرمائش کی۔

''تمہارا جو دل چاہے، وہ کتاب پڑھ لینا۔ آخر میں بھی تو پڑھتی ہوں۔ میں نے کون سا کالج یونیورسٹی سے پڑھا ہوا ہے۔ بس مسلسل پڑھتے پڑھتے خود ہی بہت کچھ سمجھ آنے لگا ہے۔'' کشور فراخ دلی سے رانی کو اجازت دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رانی نے بھی ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ ڈرائیور اس دوران گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی آگے بڑھاتا، کشور کی نظر ایک شناسا چہرے پر پڑی۔ جینز کی پینٹ اور کھدر کا کرتہ پہنے اپنے مخصوص حلیے میں وہ یقیناً ماسٹر آفتاب ہی تھا۔

''نذیر! یہ سامنے ماسٹر آفتاب ہی کھڑا ہے نا؟'' پہچان لینے کے باوجود کشور نے ڈرائیور سے تصدیق چاہی۔

''جی بی بی! یہ تو اپنے گاؤں والا ماسٹر آفتاب ہی ہے۔ شاید یہاں کسی کام سے آیا ہوا ہے۔''

''جاؤ، اسے یہاں بلا کر لے آؤ۔ کہنا جہاں جانا ہے وہاں چھوڑ دوں گی۔'' کشور نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

''لیکن بی بی... آپ کے ساتھ؟'' ڈرائیور کشور کا حکم سن کر گڑبڑایا۔

''جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ اور ہاں، ماسٹر صاحب کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاڑی میں حویلی کا کوئی فرد موجود ہے۔'' کشور، ڈرائیور کی جھجک کا سبب سمجھ چکی تھی چنانچہ ذرا رعب سے اسے حکم دیا۔ ساتھ ہی دوسری ہدایت بھی دے دی ورنہ اسے خدشہ تھا کہ ماسٹر آفتاب لفٹ کی اس پیشکش کو قبول نہیں کرے گا۔

''تم پیچھے آجاؤ رانی!'' اگلی نشست پر بیٹھی رانی کو حکم دے کر کشور، ڈرائیور کو ماسٹر آفتاب سے بات کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ماسٹر آفتاب نے ذرا سی پس و پیش کے بعد ڈرائیور کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اب اس کے ساتھ گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ گاڑی کے نزدیک آکر اس نے جیسے ہی اگلی نشست پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا، عقبی نشست پر موجود کشور اور رانی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ یک دم ٹھٹک گیا۔

''معاف کیجیے گا... مجھے معلوم نہیں تھا کہ گاڑی میں خواتین موجود ہیں ورنہ میں یہ آفر قبول نہیں کرتا۔'' کشور جانتی تھی کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ گاڑی کے سیاہ شیشوں کی وجہ سے وہ دور سے ان لوگوں کی گاڑی میں موجودگی کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اور ڈرائیور کو خود کشور نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے سے منع کر دیا تھا۔

''بیٹھ جائیے ماسٹر صاحب! آپ کو ہماری موجودگی کا علم نہیں تھا لیکن میں نے خود ڈرائیور کو بھیج کر آپ کو لفٹ دینے کی آفر کی تھی۔ یہ بے چارہ اپنی مرضی سے تو آپ کو آفر نہیں کر سکتا تھا۔''

''آپ کی پیشکش کے لیے شکریہ... لیکن کچھ مناسب نہیں لگتا۔ آپ لوگوں کو نہ جانے کہاں جانا ہے، میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوگی۔'' ماسٹر آفتاب نے شائستگی سے انکار کیا۔

''زحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ہمارے بھانجے کے استاد ہیں۔ آپ کا ایک مقام ہے اس لیے تھوڑی بہت زحمت ہوئی بھی تو ہمیں ناگوار نہیں گزرے گی۔'' کشور کو



ماسٹر آفتاب سے گفتگو کرنا اچھا لگ رہا تھا اس لیے وہ مسلسل اصرار کر رہی تھی۔

''عزت افزائی کے لیے شکریہ... لیکن پلیز! آپ لوگ جائیں، میں کسی رکشے وغیرہ سے چلا جاؤں گا۔'' ماسٹر آفتاب نے اس بار بھی انکار ہی کیا۔

''دیکھیں ماسٹر صاحب! ہمارے ہاں پیشکش کر کے پیچھے ہٹنے کا رواج نہیں۔ آپ کے انکار کرتے رہنے سے ہمیں یہاں زیادہ دیر ہو جائے گی لیکن بہر حال، آپ کو یہاں چھوڑ کر جانے کا قطعی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہمیں لیٹ کرواتے ہیں یا ہماری پیشکش قبول کرنے کا شرف بخشتے ہیں۔'' کشور کے اٹل انداز پر ماسٹر آفتاب نے پہلی بار نظر اٹھا کر براہ راست اس کی طرف دیکھا۔ چادر نے اس کے چہرے کے بیشتر حصے کو ڈھانپ رکھا تھا لیکن دو سیاہ آنکھیں بالکل نمایاں تھیں۔ ان آنکھوں میں اصرار اور ضد دونوں تھے۔ ماسٹر آفتاب کو اندازہ ہوا کہ حویلی والوں میں شمار ہونے والی یہ لڑکی بھی اپنے خاندانی مزاج کے مطابق اچھی خاصی ہٹ دھرم ہے جو بغیر اپنی بات منوائے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس ضد سے ہار مانتے ہوئے بالآخر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''مجھے بس کے اڈے پر چھوڑ دو۔ مجھے واپس پیر آباد جانا ہے۔'' نشست سنبھالنے کے بعد ماسٹر آفتاب نے ڈرائیور کو بتایا اور پھر اس طرح چپ سادھ کر بیٹھا کہ گردن کو ذرا سی جنبش بھی نہ دی کہ مبادا کوئی خیال کرے کہ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی حویلی کی ایک خاتون کی طرف دیکھنے کی جرأت کر رہا ہے۔ خود کشور نے بھی پورے راستے اسے دوبارہ مخاطب نہیں کیا۔ اس کی یہ خاموشی ماسٹر آفتاب کے لیے باعث سکون تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کشور کے اندر جو طوفان کروٹیں لے رہا ہے، وہ زیادہ عرصے اس کے اس سکون کو برقرار نہیں رہنے دے گا۔

☆☆☆

''سر! چودھری افتخار لائن پر ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بات کرواؤ۔'' شہریار نے عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع کے جواب میں کہا۔

''کیا حال ہے شہریار صاحب... آپ کو تو فرصت ہی نہیں ملتی، ہم نے سوچا ہم ہی آپ کی خیر خبر لے لیں۔'' لمحے بھر بعد ہی چودھری افتخار کی آواز شہریار کو سنائی دی۔

''آپ کی مہربانی ہے چودھری صاحب کہ آپ میرا اتنا خیال کرتے ہیں۔ آپ کا شکوہ بھی سر آنکھوں پر ہے لیکن بس کیا کروں، کئی معاملات میں اتنا الجھا ہوا ہوں کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ جیسے ہی فرصت ملی، ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔'' شہریار نے اپنی طے کردہ حکمتِ عملی کے مطابق چودھری افتخار کے شکوے کا بہت خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

''فرصت ملنے کا انتظار چھوڑیں اے سی صاحب! اے سی کی کرسی پر بیٹھنے والے کو کبھی بھی فرصت نہیں ملتی۔ ایسے بندوں کو اپنی مصروفیت میں سے زبردستی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اور اس وقت میں نے آپ کو زحمت دی ہی اس لیے ہے کہ آپ کے بے حد مصروف وقت میں سے کچھ وقت مانگ سکوں۔''

''وہ کس سلسلے میں؟'' چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار کا تجسس جاگا۔

''شکار پر جانے کا پروگرام ہے۔ ایس پی معظم تارڑ اور فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کے علاوہ ایک آدھ اور دوست بھی ہوں گا۔ آپ چلیں ہمارے ساتھ شکار پر، بہت لطف آئے گا۔''

''پروگرام تو واقعی دلچسپ ہے مگر بڑا اچانک بنالیا آپ نے۔ آپ پچھلے دنوں جتنے ٹینس رہے ہیں، اس کے بعد ایسی کسی ایکٹیویٹی کو ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔'' چودھری افتخار کا پروگرام سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرانے والے نہیں۔ ایسے مسائل تو آتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے گھبرا کر زندگی کے لطف کو تھوڑا ہی گنوایا جاسکتا ہے۔ اور سچ کہوں، زندگی کا جو لطف شکار میں ہے وہ اور کسی شے میں نہیں۔'' چودھری افتخار بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کہنے کو وہ ایک وڈیرا، سجادہ نشین اور کاروباری فرد تھا لیکن اس کے ہر روپ کے پیچھے ایک شکاری چھپا بیٹھا تھا جو صرف جنگلی جانوروں کا شکار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے شکار کی فہرست میں انسانی جان، مال و دولت اور لوگوں کی عزت سمیت سب کچھ شامل تھا۔ اپنے ہر شکار کے لیے وہ بھرپور منصوبہ بندی کرتا تھا اور اسے کبھی اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

''چلیں، میں کوشش کروں گا کہ زندگی کے اس سب سے بڑے لطف میں آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہو سکوں۔ آپ دن اور وقت وغیرہ بتا دیں تاکہ میں اپنا شیڈول چیک کر کے آپ کو کوئی حتمی جواب دے سکوں۔''

''دن ہم نے ہفتے کا طے کیا ہے۔ ہفتے کی شام کو نکلیں گے۔ رات جنگل میں ہی قیام ہوگا پھر اگلے روز اتوار کو شام تک واپسی... لیکن آپ یہ مشروط قسم کی ہامی نہ بھریں۔ اگر

آپ کو اس روز آنے میں مشکل پیش آئے تو ہم اپنے پروگرام میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اصل میں تو یہ پروگرام آپ کے لیے ہی ترتیب دیا گیا ہے، باقی افراد تو کئی بار پہلے بھی میرے ساتھ شکار پر جا چکے ہیں۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کی اس قدر خیال داری کے بعد تو انکار کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔'' چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار نے فوراً اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔

''بس تو پھر آپ ہفتے کی دوپہر کو ہی پیر آباد پہنچ جایئے گا۔ دوپہر کا کھانا حویلی میں ساتھ کھائیں گے اور پھر شام تک نکل پڑیں گے۔ آپ کو صرف وہاں پہنچنا ہے، باقی کے انتظامات ہماری طرف سے ہوں گے۔'' شہریار کے ہاں کرتے ہی چودھری افتخار کا مزاج اور بھی خوش گوار ہو گیا۔

''آپ فکر نہ کریں میں بالکل صحیح وقت پر پہنچ جاؤں گا۔'' شہریار نے اسے تسلی دی۔

''بس تو پھر ہمیں انتظار رہے گا۔'' چودھری افتخار اب گفتگو سمیٹنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ شہریار نے ذرا سا گلا کھنکھارا اور آواز میں گہری سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی چودھری صاحب! پہلے ارادہ تھا کہ بہ نفسِ نفیس آ کر اس موضوع پر بات کروں گا لیکن اب جبکہ ہماری ایک بہت خوش گوار سی ملاقات طے ہو گئی ہے تو اچھا نہیں لگتا کہ میں اس موقعے پر کوئی بہت سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ چھیڑوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اس وقت فون پر ہی آپ سے بات کر لوں۔''

''بہت شوق سے اے سی صاحب! ویسے مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیا معاملہ ہے جس پر آپ اتنے سنجیدہ محسوس ہو رہے ہیں؟'' چودھری افتخار چونکا۔

''بہ ظاہر ابھی معاملہ اتنا سنجیدہ نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ معاملہ کافی گمبھیر ہو سکتا ہے۔ اصل میں کل کے اخبار میں ایک کالم چھپا ہے۔ کالم نگار نے براہِ راست تو کسی گاؤں یا اس کے کسی نمائندہ شخص کا نام نہیں لکھا لیکن اس نے دیہی علاقوں کی ابتر حالت پر کافی تنقید کی ہے۔ اور اس تنقیدی تبصرے میں اس نے کئی ایسے جملے لکھے ہیں جو براہِ راست پیر آباد سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ کئی دیہی آبادیوں میں بنیادی سہولیات کا فقدان ہے اور اگر کوئی سہولت موجود ہے تو بھی اس کے ثمرات صرف بڑے لوگوں تک محدود ہیں۔ بڑے وڈیروں اور زمینداروں نے مزارعوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ان غریب مزارعوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ ایک طرف باقاعدہ جسمانی تشدد کیا جاتا ہے تو دوسری طرف مزارعوں کو انتہائی کم اجرت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ شادی بیاہ، بیماری آزاری کے موقعے پر غریب مزارعے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے وڈیروں اور زمینداروں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان غریب اور اَن پڑھ لوگوں کو یہ قرض اتنی زیادہ سودی شرح پر دیا جاتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔''

''جانے دیں اے سی صاحب! یہ کون سی نئی باتیں ہیں۔ ایسا تو اکثر ہی لکھا جاتا رہتا ہے۔ میں اس کے سچ جھوٹ ہونے پر تبصرہ نہیں کرتا۔ اگر یہ سچ ہے بھی تو اس سے مجھ اکیلے کی ذات پر ضرب نہیں پڑتی۔ میرے ساتھ سارے ہی اس الزام کی زد پر آتے ہیں۔'' چودھری افتخار نے درمیان سے شہریار کی بات کاٹ کر کان پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا۔

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے چودھری صاحب لیکن میں نے کہا نا کہ کالم نگار نے اپنا کالم یوں تو دیہی علاقوں کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں لکھا ہے لیکن کچھ پوائنٹس ایسے آتے ہیں جن سے واضح طور پر پیر آباد کی طرف اشارہ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔''

''اچھا، وہ کون سے پوائنٹ ہیں؟ کچھ ہم بھی سنیں۔'' چودھری افتخار کے انداز میں اب بھی بے نیازی تھی۔

''کالم نگار نے لکھا ہے کہ کچھ وڈیرے تو ایسے بھی ہیں جو اپنے علاقے کے حکمراں کے علاوہ مذہبی پیشوا بھی بن بیٹھے ہیں۔ ان وڈیروں نے پیری مریدی کی آڑ میں سادہ لوح عوام کے ذہنوں کو ماؤف کر رکھا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ ان وڈیروں کی مرضی کے خلاف کچھ کریں گے تو ان پر کوئی آسمانی مصیبت آ پڑے گی۔ یہ وڈیرے اس جاہلانہ سوچ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے علاقے میں تعلیم کو عام نہیں ہونے دیتے کیونکہ جانتے ہیں کہ اگر مزارع پڑھ لکھ کر سمجھ دار ہو گیا تو ان کی غلامی کے شکنجے سے نکل جائے گا۔ انہوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے اپنے علاقوں میں تعلیم کا راستہ روک رکھا ہے۔ پھر سب سے اہم اور کاری ضرب جو کالم نگار نے لگائی ہے، وہ آپ کے دادا صاحب کے عرس کے حوالے سے ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ نام نہاد سجادہ نشین اور گدی پر مزارعوں کے خون پسینے کی کمائی ہڑپ کر کے اس سے اپنے بزرگوں کا شان دار عرس منعقد کرتے ہیں۔ ایک علاقے کے



بارے میں تو یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ وہاں چھوٹے زمینداروں سے زبردستی ہر سال عرس کے موقعے پر سونے کے تاروں سے نقش چادر وصول کی جاتی ہے۔ اس چادر کو مُردہ پیر کی قبر پر چڑھایا جاتا ہے اور بعد میں زندہ پیر اس کے سونے کو بیچ باچ کر دام کھرے کر لیتا ہے۔ کالم نگار نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک بار چھوٹے زمینداروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ یہ زبردستی کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے۔ بھینٹ لینے والے کو پہلے سے ان کے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے ان زمینداروں کا دماغ ٹھیک کرنے کا انتظام کر دیا۔ اتفاق سے جس نہر کے پانی سے اردگرد کے چھوٹے گاؤں، دیہاتوں کو فصل کے لیے پانی سپلائی کیا جاتا ہے، اس نہر کی لوکیشن کچھ ایسی ہے کہ سجادہ نشین زمیندار کا اس پر تسلط ہے۔ پھر محکمہ انہار و آبپاشی میں بھی اس کا اثر و رسوخ ہے، اس لیے چھوٹے زمینداروں کی سرکشی کا جواب اس طرح دیا گیا کہ ان کے علاقے میں پانی کی سپلائی بند ہو گئی۔ پانی نہ ملے تو کیسی فصلیں اور کہاں کے کھیت! چھوٹے زمینداروں نے سمجھ لیا کہ پانی روک کر انہیں کیا پیغام دیا گیا ہے۔ بس پھر وہ لائن پر آ گئے اور آئندہ کبھی سرتابی حکم کی جرأت نہیں کی۔'' یہ ساری وہ معلومات تھیں جو شہریار کو اتنے عرصے میں مختلف لوگوں سے ملاقاتوں میں حاصل ہوئی تھیں۔ معلومات فراہم کرنے والوں میں متاثرہ زمیندار بھی شامل تھے اور کچھ سرکاری افسران بھی۔ شہریار نے اپنے طور پر تحقیق کر کے ان معلومات کی تصدیق بھی کر لی تھی اور پھر یہی معلومات ماسٹر آفتاب کے ذریعے اس کے صحافی دوست تک پہنچا کر کالم کی شکل میں چھپ گئی تھیں۔

''کون اُلّو کا پٹھا ہے جس نے یہ ساری بکواس لکھی ہے؟ میں دماغ درست کروا دوں گا اس کا۔'' چودھری افتخار جواب تک بزارِ یلیکس تھا، براہِ راست خود پر چوٹ پڑی تو پھٹ پڑا۔

''کہنے والا کوئی بھی ہو چودھری صاحب! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کچھ اس طرح سے جواب دیں کہ بولنے والے کا اعتراض ختم ہو جائے۔ کسی ایک کو ڈرا دھمکا کر اس کا منہ بند کروا دینے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ آپ ایک کا منہ بند کریں گے تو دوسرا بول پڑے گا۔ آج کے دور میں صحافی اتنا کمزور نہیں رہا ہے۔ آپ تو شکر کریں کہ یہ سب صرف ایک اخبار میں چھپا ہے۔ کل کو اگر کسی پرائیویٹ چینل کی ٹیم اپنے کیمرے لے کر پہنچ گئی تو آپ کیا کریں گے۔ وہ تو سب کچھ دکھائیں گے دنیا کو... اسپتال، اسکول، سڑکیں سارے ہی تو مسئلے ہیں پیر آباد میں۔'' شہریار نے چودھری افتخار کی رگ دبائی کی۔

''آ کر تو دیکھیں یہ ٹی وی والے میرے علاقے میں۔ قدم بھی نہیں رکھنے دوں گا میں انہیں یہاں۔ اپنا اور اپنے کیمروں کا نقصان ہی کر کے جائیں گے وہ یہاں سے۔'' چودھری افتخار مزید طیش میں آیا۔

''وہ اس بات کو اور بھی زیادہ ایشو بنائیں گے۔ آپ کا نام بدنام ہو کر رہ جائے گا۔ ابھی جو آپ کے حمایتی ہیں، وہ بھی عوام میں اپنی مقبولیت قائم رکھنے کے لیے ٹی وی کے نمائندوں کے سامنے آپ کی مخالفت کریں گے، آپ کے فعل کو قابلِ مذمت قرار دیں گے۔ اگر آپ میری بات مانیں تو ذرا تحمل اور مصلحت پسندی سے کام لیں۔ ایک دو ایسے کام کروا دیں اپنے علاقے میں جن سے میڈیا میں آپ کی نیک نامی ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ اگر آپ ایسا کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو ٹی وی کوریج کا انتظام میں خود کرواؤں گا۔'' شہریار کی کوشش تھی کہ کسی طرح چودھری افتخار کو قائل کر لے۔

''آپ فرمایئے کہ میں کیا کروں؟'' چودھری افتخار نے ہنکارا بھرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک معاملہ تو پکی سڑک کا ہے۔ آپ چاہیں تو حکومت سے اس کے لیے منظوری اور فنڈز حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرا معاملہ اسکول کی توسیع کا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ریکارڈ میں کئی درخواستیں موجود ہیں۔ آپ اگر اسکول کی ساتھ والی زمین پر اپنی ملکیت کے دعوے سے دست بردار ہو جائیں تو ہم وہاں اسکول کے لیے چند مزید کمرے تعمیر کر سکتے ہیں۔ ویسے آپ چاہیں تو میرے پاس ایک دوسرا آئیڈیا یہ ہے کہ آپ خود اپنی طرف سے وہ زمین اسکول کے لیے وقف کر دینے کا اعلان کر دیں۔ بنجر سی زمین ہے، آپ کے کسی کام کی نہیں... لیکن آپ نے اگر اس کام کے لیے دے دی تو آپ کی نیک نامی کی شہرت ہو جائے گی اور آپ پر سے یہ الزام بھی ہٹ جائے گا کہ آپ خود اپنے علاقے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔'' شہریار بہت دھیرے دھیرے، بڑے سمجھاؤ سے چودھری افتخار کو اس موضوع کی طرف لایا تھا اور اب کسی خاطر خواہ نتیجے کا منتظر تھا۔

''میں آپ کے ان مشوروں پر غور کروں گا۔ ویسے اتنی ہمدردی سے میرے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے شکریہ۔'' چودھری افتخار نے جس لہجے میں یہ جملے کہہ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا، شہریار فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ سچ مچ اس کے مشوروں پر غور کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یا پھر اصل بات کو

پاکراس پر طنز کر گیا ہے۔

☆☆☆

شام کے وقت جنگل میں داخل ہونے کا خیال بہ ظاہر احمقانہ لگتا تھا لیکن وہ لوگ جن انتظامات کے ساتھ وہاں گئے تھے، ان کی موجودگی میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں تھا بلکہ اچھا خاصا تھرل محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لوگ جیپوں کی مدد سے وہاں پہنچے تھے۔ شکار میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کے علاوہ شب بسری کا بھی بے حد معقول انتظام تھا۔ کئی ملازم بھی خدمت کے لیے موجود تھے جنہوں نے جنگل میں ایک مناسب جگہ پر پہنچتے ہی خیموں کی تنصیب کا کام شروع کر دیا تھا۔ طاقتور بیٹری لائٹس نے جنگل کی تاریکی کو اچھا خاصا بے معنی کر دیا تھا اور وہاں پر ہر کام بے حد سہولت سے انجام دیا جا رہا تھا۔ روشنی کے لیے ایک دوسرا انتظام ایک بڑے الاؤ کی صورت میں بھی کیا جا رہا تھا۔ چودھری افتخار کے کارندے پھرتی سے لکڑیاں اکٹھی کر کے اس الاؤ کو روشن کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ جنگل میں اس الاؤ کی موجودگی، روشنی کے علاوہ دوسری دو اہم ضروریات کی وجہ سے بھی لازمی تھی۔ الاؤ روشن ہوتا تو جنگلی جانور ان کے پڑاؤ کے قریب آنے سے پرہیز کرتے۔ پھر موسم کی خنکی کو شکست دینے کے لیے بھی اس الاؤ کی ضرورت تھی۔ الاؤ روشن ہو گیا تو ملازمین نے ساتھ لائی ہوئی کم وزن کی فولڈنگ چیئرز اس کے گرد رکھ کر معزز مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا۔ اس قدرتی ماحول میں ایک روشن الاؤ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ تاپنا شہریار کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ تکلفات ضرورت سے کچھ زیادہ تھے۔ جیسے ان فولڈنگ چیئرز کی موجودگی ہی تھی جو شہری زندگی کی علامت بنی اسے جنگل کے ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہونے دے رہی تھی۔ پھر ٹن بند مشروبات کی فراہمی تھی جو احساس دلاتی تھی کہ وہ جدید معاشرے کے نمائندے ہیں اور اس جنگل کے لیے اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''کیسا لگ رہا ہے شہریار صاحب؟'' چودھری افتخار جو اب تک فاریسٹ آفیسر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا، کچھ الگ تھلگ اور خاموش بیٹھے شہریار کے قریب آ کر پوچھنے لگا۔

''بہت شان دار... اگر میں آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیتا تو ایک بہت ہی خوب صورت منظر سے محروم رہ جاتا۔'' شہریار نے بے ساختہ جواب دیا۔

''ہاہا...'' چودھری نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور پھر بڑے تفاخر سے بولا۔ ''ہماری بات ماننے والے ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں۔ ہم تو اپنے علاقے میں آنے والے ہر نئے افسر کو اپنا دوست بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دوستی کے لیے ایک دوسرے کی بات ماننا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ جو ہماری بات مان لیتے ہیں، ان کی ہماری دوستی بھی خوب چلتی ہے اور ساتھ ہی افسری بھی قائم رہتی ہے۔ جو ہمارا دوست نہ بنے، وہ خود اپنے آپ سے دشمنی مول لینے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔'' چودھری افتخار کی یہ پُر رعونت باتیں جن میں ایک چھپی ہوئی دھمکی بھی تھی، شہریار کو سخت ناگوار گزر رہی تھیں لیکن وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر چودھری کے کارندوں کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک سالم بکرے کو آگ پر بھوننے کی تیاری کر رہے تھے۔

''بہت خوب چودھری صاحب! آپ تو خود اپنے ساتھ بکرا اٹھا لائے۔ اس بکرے کے ہوتے ہوئے ہمارا جنگل آپ کی میزبانی کا حق کیسے ادا کرے گا؟'' فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ جو ذرا دیر کے لیے خیمے کے اندر گیا تھا، باہر آ کر چودھری افتخار سے مخاطب ہوا۔

''آپ فکر نہ کریں باجوہ صاحب! کل ہم آپ کے جنگل کو میزبانی کا پورا پورا موقع دیں گے۔ ابھی تو یہ انتظام اس لیے کیا ہے کہ ہمارے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔'' چودھری افتخار نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے اقبال باجوہ کو جواب دیا۔

''آپ کن سوچوں میں گم ہیں اے سی صاحب؟'' اس بار اقبال باجوہ خاموش بیٹھے شہریار سے مخاطب ہوا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ بے چارے بکرے کی کھال اتار کر اسے آگ پر بھوننے کے لیے لٹکا دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ شیر ہوتا تو کوئی اس پر ہاتھ ڈالنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔ شیر کو شکار کرنے سے پہلے بڑے سے بڑا گھاگ شکاری بھی دس بار سوچتا ہے کہ کہیں خود اپنی ذات کو ہی نقصان نہ پہنچ جائے۔'' شہریار نے بہت سلیقے سے چودھری افتخار کی تھوڑی دیر پہلے کہی بات کا جواب دیا۔

''اوہو... لگتا ہے اپنے اے سی صاحب پر جنگل کے ماحول کا اثر ہو گیا ہے اس لیے جنگل کا بادشاہ یاد آ رہا ہے۔ لیکن بے فکر رہیں... یہاں شیر نہیں پایا جاتا، یعنی یہ جنگل بغیر بادشاہ کے ہی چل رہا ہے۔ یہاں اگر کوئی بادشاہ ہے بھی تو وہ میں ہوں۔ اس جنگل پر میرا حکم چلتا ہے۔''

اقبال باجوہ چونکہ گفتگو کی ابتدا میں یہاں موجود نہیں تھا اس لیے شہریار کے جملوں کا پس منظر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے شہریار کی بات کو ایک عام بات کے طور پر لیتے ہوئے اپنا



تبصرہ پیش کیا۔ اقبال باجوہ کی بات سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ وہاں ایک چودھری افتخار ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی دماغوں میں بھی حکمرانی کا خناس بھرا ہوا ہے لیکن ان لوگوں پر اپنے اس خیال کو ظاہر کیے بغیر وہ مسکرایا اور شگفتگی سے بولا۔

''اس کا مطلب ہے باجوہ صاحب... کل جب ہم شکار کے لیے نکلیں گے تو آپ سارے جانوروں کو کان سے پکڑ کر لائن حاضر کر دیں گے کہ جناب جس کو دل چاہے شکار کر لیجیے۔''

''یہ کان پکڑ کر لائن حاضر کرنا اور بندے کی کھال گرا دینا تو دراصل تارڑ صاحب کے محکمے کا کام ہے۔ دیکھیں، اس وقت بھی کس قدر اشتیاق سے بے چارے بکرے کے لٹکنے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔'' اقبال باجوہ پہلے شہریار کی بات پر ہنسا اور پھر ایس پی معظم تارڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ معظم تارڑ واقعی ان لوگوں سے ہٹ کر بیٹھا بہت شوق سے بکرے کو بھنتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اقبال باجوہ نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آیا۔

''کیا بات ہے تارڑ صاحب! کیا زیادہ بھوک لگ رہی ہے؟'' اقبال باجوہ نے ایس پی کو قریب پا کر اسے چھیڑا۔

''زیادہ سے بھی کہیں بہت زیادہ۔ مجھے تو ڈر ہے کہ یہ بکرا تو اکیلا میں ہی کھا لوں گا، آپ حضرات کو جانے کچھ ملے بھی یا نہ ملے۔'' اقبال باجوہ کے مذاق کو محسوس کرتے ہوئے معظم تارڑ نے بھی مذاق کیا۔

''سچ کہتے ہیں بھئی، پولیس والوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ اب کوئی بتائے کہ اس جنگل میں یہ اکیلے سارا بکرا ہضم کر لیں گے اور ہم بے چارے کہیں انصاف کے لیے دہائی بھی نہیں دے سکیں گے۔'' اقبال باجوہ نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

''چودھری صاحب کا مہمان ہوتے ہوئے کیسا ڈر باجوہ

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 300/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا "ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں"۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 225/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

قیصر و کسریٰ 300/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی حالات اور دور عروج اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

پاکستان سے دیارِ حرم تک 125/-
جو تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

گمشدہ قافلے 300/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 200/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 275/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلۂ حجاز 300/-
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون 300/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی 275/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ 150/-
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ 225/-
فرڈی ننڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی 125/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم 225/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش 100/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان 275/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی 300/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

شاہین 275/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد 125/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا 225/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین 225/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس
• لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدرآباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

صاحب! چودھری صاحب کی میزبانی کا تو سب ہی دم بھرتے ہیں۔ اگر آپ خواہش کریں گے تو ہر ایک کے لیے الگ الگ سالم بکرا بھی حاضر ہو جائے گا۔'' ایس پی نے خوشامدانہ لہجے میں یہ جملے کہے تو چودھری افتخار جو شہریار کی بات سننے کے بعد ایک پُرتفکر سی خاموشی میں مبتلا ہو گیا تھا، خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ اس کے بعد وہاں ماحول مسلسل بے حد خوش گوار رہا۔ زیادہ تر گفتگو چودھری افتخار اور اقبال باجوہ ہی کر رہے تھے۔ ایس پی معظم تارڑ بھی کبھی کبھی گفتگو میں حصہ لے لیتا تھا۔ اصل میں وہ شہریار کی موجودگی کے باعث کچھ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اپنی عمر اور تجربے کی زیادتی کے باوجود اسے شہریار کے بڑے عہدے اور حیثیت کا احساس تھا۔ شہریار خود اس لیے زیادہ نہیں بول رہا تھا کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دے کر ان کے مزاج کو اچھی طرح پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران انہیں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور ملازموں نے ان کے سامنے کھانا چن دیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ وہ سب ہی شوق سے کھانے لگے۔ ابھی کھانا اختتام پذیر نہیں ہوا تھا کہ ایک بند جیپ ان کے پڑاؤ کے قریب آ کر رکی۔ وہ سب اس جیپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جیپ سے نکلنے والے چہروں نے انہیں مبہوت کر دیا۔ وہ دو انتہائی حسین اور طرح دار لڑکیاں تھیں جنہوں نے چمک دار مہین کپڑے سے بنا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ یہ لباس ان لڑکیوں کے حسن کی تجلیوں کو چھپانے کے بجائے اسے کچھ اور نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

''دیکھیے چودھری صاحب! آپ کے حکم پر ہم یہاں بھی چلے آئے۔ اب تو ہماری وفاداری پر کسی شک کی گنجائش نہیں نکلتی۔ آخر ہم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے اس وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے۔'' ان میں سے ایک جو عمر میں نسبتاً بڑی لگتی تھی، چودھری افتخار کے قریب آ کر بڑی ادا سے بولی۔ اس کی چال اور بولنے کے انداز میں جو ناز و ادا تھی، وہ صاف بتاتی تھی کہ اس کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ اور اس قبیل کی عورتوں کی وفاداری جس شے کے ساتھ مشروط تھی، اس کی چودھری افتخار کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ اگر اس جنگل میں چودھری افتخار کی دعوت پر آئی تھیں تو بھی خوب جانتی تھیں کہ یہاں حفاظت کا اتنا معقول انتظام ہوگا کہ ان کے لیے خطرے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور واپسی پر وہ جو جھولی بھر کر نوٹ اپنے ساتھ لے جاتیں، ان کی تو بات ہی الگ تھی۔ چودھری افتخار نے ان دونوں لڑکیوں کو بھی کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دے دی جو انہوں نے قبول ضرور کی لیکن بہت کم مقدار میں بس سونگھنے جتنا ہی کھایا۔ خوش خوراکی اور شکم سیری ان کی پرفارمنس پر برا اثر ڈال سکتی تھی۔ کھانے کے بعد دونوں لڑکیاں فارم میں آ گئیں۔ ان کے جسم الاؤ کے گرد تھرکنا شروع ہوئے تو گویا جنگل میں منگل کا سماں طاری ہو گیا۔ لڑکیاں ہر طرح کے رقص میں ماہر تھیں۔ پہلے انہوں نے کلاسیکل ڈانس پیش کیا پھر کسی ڈسکو ڈانسر کی طرح پرفارمنس دینے لگیں۔ اس پرفارمنس سے لطف اندوز ہوتے حضرات کے لطف میں مزید اضافہ کرنے کے لیے چودھری افتخار کے ملازمین نے شیمپین اور وہسکی کی سپلائی شروع کر دی۔ ایک ملازم شہریار کے قریب بھی آیا لیکن شہریار نے انکار کر دیا۔

''کیا بات ہے اے سی صاحب! کسی مولوی کے وعظ سے ڈر کر تو اس سے پرہیز نہیں فرما رہے؟ ورنہ آپ کے ماموں لیاقت رانا بہت شوق سے نوش کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے کو بھی ہم نے کئی محفلوں میں شغل کرتے دیکھا ہے۔ یہ آپ کیسے انگور کی بیٹی سے پرہیز کرنے والے نکل آئے؟'' اس کے انکار کرتے ہی چودھری افتخار نے تفتیش شروع کر دی۔

''بات ڈرنے یا پرہیزگاری کی نہیں... بس میں ان چیزوں سے دور رہتا ہوں جو مجھ پر حاوی ہو کر مجھے بے بس کر دیں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے چودھری افتخار کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنستے ہوئے ایک بار پھر محوِ رقص لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب وہ لڑکیاں بیلے ڈانس کر رہی تھیں۔ اس ڈانس میں پیٹ کو مخصوص انداز میں دی جانے والی حرکات نے اس کی ہوش ربائیوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ رقص کے لیے موسیقی کی تال ضروری ہوتی ہے۔ یہاں موسیقی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے آڈیو ریکارڈرز کا معقول بندوبست تھا... لیکن موسیقی سے وہاں کسی کو غرض تھی تو صرف ان دونوں ناچتی ہوئی لڑکیوں کو... تاکہ تال میل کے ساتھ ایک ردھم میں ناچ سکیں اور ان کے جسموں کی حرکات بے ترتیب نہ ہونے پائیں۔ باقی لوگوں کے لیے موسیقی اور لفظی شاعری بے معنی ہو چکی تھی اور وہ صرف اور صرف اعضا کی شاعری سے لطف اندوز ہونے میں دلچسپی لے رہے تھے مگر پھر ماحول پر چھایا یہ سحر ٹوٹ گیا۔ دونوں لڑکیوں نے رقص کرنا بند کیا اور کرسیوں پر بیٹھ کر سستانے لگیں۔ حاضرین کا خیال تھا



کہ وہ سستانے کے بعد دوبارہ اپنے فن کے مظاہرے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی لیکن پھر ان کی وہاں سے روانگی کے آثار نظر آنے لگے۔

''معذرت چاہتا ہوں دوستو! مجھے معلوم ہے کہ ابھی آپ لوگ مزید لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں گے لیکن چونکہ ہماری یہاں آمد کا اصل مقصد شکار کرنا ہے اس لیے اس پروگرام کو ذرا محدود رکھا گیا ہے۔ رات اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ ہم لوگوں کو اب آرام کرنا چاہیے تاکہ صبح تازہ دم ہو کر شکار کیا جا سکے۔'' چودھری افتخار نے چہروں پر چھائی مایوسی دیکھی تو کھڑے ہو کر معذرت خواہانہ وضاحت پیش کی۔ لڑکیاں اس دوران سب کو اپنی مسکراہٹ سے نوازتی اور بائے بائے کرتی واپس گاڑی میں جا بیٹھی تھیں۔

''اگر آپ کہیں تو ان میں سے کسی ایک کو جو آپ کو پسند ہو، آپ کے لیے روک لیا جائے۔ ہم چار بندے ہیں، اگر آپ کل کچھ سست بھی رہے تو کام چل جائے گا۔'' شہریار بھی سب کی طرح لڑکیوں والی جیپ کی طرف دیکھتا اس کی روانگی کا منتظر تھا کہ چودھری افتخار نے جھک کر سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''بہت شکریہ چودھری صاحب لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے ناکہ میں ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں جو مجھ پر حاوی ہو کر مجھے بے بس کر سکیں۔ مجھے زاہد خشک ہونے کا دعویٰ نہیں لیکن اس طرح کی چیزیں بس دور سے ہی اچھی لگتی ہیں۔'' شہریار چودھری کی سرگوشی پر ذرا سا چونکا اور پھر مسکراتے ہوئے اسے جواب دے کر دوبارہ جیپ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب چل پڑی تھی اور لحظہ بہ لحظہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

''چلیں جناب! اب چل کر سونے کے سوا کیا چارہ رہ گیا ہے؟'' جیپ نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی تو اقبال باجوہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ سب لوگ اس کی بات پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور پھر سچ مچ آرام کے لیے خیموں میں چلے گئے۔

☆☆☆

''پھر گاؤں... میں ہرگز نہیں جانے والی وہاں۔ ابھی تھوڑے عرصے پہلے ہی تو گئی تھی۔'' حوراں کی زبانی گاؤں چلنے کا ذکر سن کر ماہ بانو بدکی۔

''پاگلے! اس جانے کی بات الگ تھی اور اس جانے کی بات الگ ہے۔ اب کی بار تو ہمیں زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے جانا ہے۔ اس موقعے کو تھوڑی ٹالا جا سکتا ہے۔'' حوراں نے اسے سمجھایا۔

''جب ابھی بیاہ رکھنا تھا تو پہلے کیا ضرورت تھی مجھے بلوانے کی۔ میرے پاس کیا فالتو وقت ہے کہ ہر تھوڑے دن بعد دوڑ دوڑ کر گاؤں جاتی رہوں۔'' ماہ بانو نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ ایک تو اس کا پہلے ہی گاؤں میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا، اوپر سے اپنے وہاں آخری قیام میں اسے جس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کی وجہ سے وہ اچھی خاصی خوف زدہ بھی تھی۔

''تب میں نے نوراں کے خیال سے تجھے وہاں بھجوایا تھا۔ بے چاری تجھے یاد کر رہی تھی لیکن اب تو بیاہ کا معاملہ ہے۔ زہرہ میری بھانجی ہے تو رب نواز بھی کوئی غیر نہیں، برادری ہی کا لڑکا ہے۔ ویسے ہی سب کہتے ہیں کہ حوراں شہر میں رہ کر برادری سے کٹ گئی ہے۔ اب بیاہ میں شرکت کے لیے نہیں جاؤں گی تو برادری والے سو سو نام دھریں گے۔''

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربے و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک نسخہ آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جوہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پہ سرخی ہاتھوں پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جنکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنٹر

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

''تو ٹھیک ہے بے بے! تم چلی جاؤ اپنی برادری والوں سے رشتے ناتے نبھانے... میں تو اِدھر ہی رہ کر اپنی پڑھائی کروں گی۔'' حوراں کی بات سن کر ماہ بانو نے روٹھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''پگلی ہوئی ہے کیا؟ یہاں اکیلی کیسے رہے گی؟ میں اور تیرے ابا دونوں ہی جائیں گے بیاہ میں شرکت کے لیے۔ ویسے تو زیادہ فکر نہ کر، ہمارا کوئی لمبا چوڑا رکنے کا ارادہ نہیں ہے وہاں۔ جمعے کو نماز کے بعد نکلیں گے، اس دن زہرہ کا مایوں ہے۔ ہفتے کو مہندی ہوگی اور اتوار کو برات۔ پیر کے دن دوپہر کو ولیمے کا کھانا کھا کر شام سے پہلے ہی واپس آجائیں گے۔ تو جمعے کی صبح اپنے کالج ہو آنا۔ اتوار کو تو ویسے ہی چھٹی ہوتی ہے، بس ایک ہفتہ اور پیر کے دن ہی تجھے کالج سے ناغہ کرنا پڑے گا۔ اب سگی بہن کی شادی پر اتنی قربانی تو دینی ہی پڑے گی تجھے اپنی پڑھائی کی۔'' حوراں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''بڑے آئے کہیں سے سگے۔ اگر مجھے سگا سمجھتے تو یوں خود سے الگ کرتے؟'' ماہ بانو نے خفگی دکھائی۔

''اچھا چل، اپنی بہن کا نہیں میری بھانجی کا بیاہ سمجھ کر شرکت کر لے۔ ان سے نہیں مجھ سے تو اپنا رشتہ مانتی ہے نا تو؟'' حوراں نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا، اس لیے اسے منانے کے سارے گُر جانتی تھی۔ ماہ بانو کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ بے دلی سے ہی سہی لیکن راضی ہو چکی ہے۔

''اچھا یہ دیکھ! جب تو گاؤں گئی ہوئی تھی تو میں نے تیرے لیے گہنے بنوائے تھے۔ وہ جو میں نے شیخ صاحب کے ہاں ایک لاکھ کی کمیٹی ڈالی تھی، وہ نکل آئی تھی پچھلے مہینے۔ میں نے تھوڑے روپے اور ملا کر تیرے گہنے بنوا لیے۔ زہرہ کے بیاہ پر جائے گی تو یہ گہنے ساتھ لے چلنا۔ ان میں سے جو تیرا من کرے وہ بیاہ پر پہن لینا۔'' اب حوراں اسے بہلانے کے لیے دوسری تدبیریں کر رہی تھی۔

''گہنے بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے ابا سے کہا تھا کہ میرے میڈیکل میں داخلے کے لیے روپے سنبھال کر رکھیں۔'' ماہ بانو نے خوش ہونے کے بجائے اعتراض کیا۔

''اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ وہ تیرا اور تیرے ابا کا معاملہ ہے۔ میں تو ماں ہوں، مجھے تیری پڑھائیوں سے زیادہ تیرے بیاہ کے لیے جہیز جوڑنے کی فکر ہے۔'' حوراں نے جواب دیا اور زیورات زبردستی ماہ بانو کو پکڑا دیے۔ ''لے... انہیں سنبھال کر اپنے بیگ میں رکھ لے۔ اور ہاں، یاد سے بیگ میں تالا بھی لگا لینا۔ راستے کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کوئی چور اچکا ہاتھ صاف کر جائے۔'' ان آخری ہدایات کے بعد واضح تھا کہ ماہ بانو کو ہر حال میں زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے پیر آباد جانا ہے۔

پیر آباد جانا اس بار اسے ہمیشہ سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا کہ وہاں چودھری افتخار کا راج تھا۔ وہ تو یہاں فیصل آباد میں رہتے ہوئے بھی چودھری سے اچھی خاصی خوف زدہ تھی۔ پیر آباد سے واپس آنے کے بعد اس نے اکیلے کالج آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا کہ کہیں چودھری کوئی وار نہ کر جائے۔ اس جیسی پہنچ رکھنے والے بندے کے لیے فیصل آباد کوئی ایسا دور بھی نہیں تھا لیکن شاید ماہ بانو اس کے ذہن سے اتر گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ پیر آباد جاتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ چودھری کو دوبارہ اس کا دھیان نہیں آتا؟ مگر وہ یہ سب باتیں حوراں کو نہیں سمجھا سکتی تھی اس لیے مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق وہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

جنگل کی صبح، رات سے بہت مختلف تھی۔ رات کی تاریکی اور جانوروں کی آوازیں مل کر ماحول کو ہولناک بناتی تھیں لیکن صبح بہت خوب صورت تھی۔ صبح کا آغاز پرندوں کی چہچہاہٹ پر آنکھ کھلنے سے ہوا تھا۔ شہریار نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا تو سورج کی کرنوں کے گھنے درختوں سے چھن کر آنے کے باعث جنگل کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ مصنوعی روشنیوں کے مقابلے میں اس قدرتی روشنی میں وہاں موجود گل بوٹے الگ ہی رنگ دکھا رہے تھے۔ پھر جنگل کی ایک مخصوص مہک تھی جو صبح کی تازہ ہوا کے ساتھ شامل ہو کر نتھنوں میں داخل ہوتی تو اندر تک فرحت اور سرشاری کا احساس ہوتا۔

''گڈ مارننگ!'' اقبال باجوہ نے قریب آ کر کہا تو شہریار چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' شہریار کے متوجہ ہونے پر اقبال نے پوچھا۔

''شاید اپنی زندگی کی سب سے خوب صورت صبح!'' شہریار نے بہت سچائی سے جواب دیا۔

''ہاں، یہاں صبح بہت خوب صورت لگتی ہے۔ خاص طور پر ساری زندگی شہروں میں گزارنے والوں کو تو یہاں آ کر الگ ہی مزہ آتا ہے۔'' اقبال باجوہ شہریار کی زبان سے تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ وہ یہاں فاریسٹ آفیسر تھا اور جنگل کی تعریف اسے اپنی ہی تعریف لگی تھی چنانچہ وہ شہریار کو جنگل کے بارے میں مزید معلومات بھی فراہم کرنے لگا۔

''یہ جنگل اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد ہے۔ یہاں صحرائی علاقے بھی ہیں، گھنے جنگل بھی اور آبی ذخائر بھی۔ فیصل آباد سے جو نہر گزرتی ہے وہ یہیں سے تو ہو کر جاتی ہے۔ ماحول کے اس تنوع کی وجہ سے یہاں کا حیوانیہ اور نباتیہ بھی بڑا متنوع ہے۔ یہاں بے شمار قسم کے درخت، پودے اور جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ جانوروں میں چنکارہ، غزال، پاڑہ، نیل گائے، جنگلی سور، جنگلی بلی، ریتیلی بلی، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، نیولا، چیتل سب ملتے ہیں۔ آبی ذخائر میں مچھلیوں کی بہت سی اقسام موجود ہیں۔ ساتھ کئی قسم کی بطخیں، HERONS, EGRETS، تیتر، تکور، شاہین، شکرے، گدھ، ہدہد، مرغ زرین، عقاب، چیل اور کنگ فشر بھی پائے جاتے ہیں۔ ابھی ہم شکار شروع کریں گے تو آپ کو مزہ آجائے گا۔ تیتر تو یہاں بہت ہے اور ہم زیادہ تر اسی کا شکار کرتے ہیں۔ بڑے جانوروں جیسے چنکارہ، غزال اور پاڑہ کی آبادی ذرا کم ہے اس لیے ان کے شکار پر پابندی عائد کر رکھی ہے حکومت نے۔ سال میں ایک بار مشکل سے پرمٹ دیتے ہیں اس کے لیے۔ ویسے میں اس جنگل پر مزید ریسرچ کروانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ یہاں جو چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ ہے اس میں HOMONOIDS جیسے چمپنزی اور APES وغیرہ کے فاسلز مل سکتے ہیں۔''

''اچھا، پھر تو اس جنگل کو نیشنل پارک کا درجہ ملنا چاہیے۔'' شہریار کو اندازہ تھا کہ اقبال باجوہ جنگل کی خصوصیات بیان کرنے میں کچھ حد سے تجاوز کر گیا ہے خصوصاً یہ فاسلز ریکارڈ والی بات تو کہیں سے صحیح نہیں لگتی تھی۔ اس سلسلے میں چھانگا مانگا نیشنل پارک کا نام سامنے آتا تھا اور اس کی ان خصوصیات کے پیشِ نظر 1989ء میں اسے نیشنل پارک کا درجہ دیا جا چکا تھا۔

''ملنا تو چاہیے مگر اقوام متحدہ کی کچھ شرائط ایسی ہیں جن کے مطابق یہ جنگل نیشنل پارک کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ رقبے وغیرہ کا مسئلہ ہے۔'' اقبال باجوہ نے بات کو ٹالا۔ اسی وقت ان لوگوں کو ناشتے کے لیے پکارا جانے لگا تو وہ دونوں ناشتے کے لیے چلے گئے۔ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد وہ لوگ شکار کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے جنگل کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اقبال باجوہ کے مطابق تیتروں کی بہتات تھی۔ شہریار کو تیتر شکار کرنے کے مقابلے میں فشنگ میں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے وہ ایک فشنگ راڈ لے کر نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ چودھری افتخار کا ایک ملازم اس کے ساتھ تھا۔ جنگل میں خطرناک جانوروں کی بہتات نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ فکر مند نہیں تھے لیکن پھر بھی اردگرد کے ماحول سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ نہر میں اقبال باجوہ کی دی گئی اطلاع جتنی تو مچھلیوں کی بہتات نہیں تھی لیکن پھر بھی وقفے وقفے سے کوئی مچھلی کانٹے میں پھنس ہی جاتی تھی۔

''سر جی! اِدھر دیکھیں۔'' شہریار بہت دیر سے کوئی مچھلی نہ پھنسنے کے باعث کچھ بے چین ہونے لگا تھا، تب اس کے ساتھ موجود چودھری افتخار کے ملازم نے تقریباً سرگوشی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ شہریار نے اس کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ ان لوگوں سے کافی فاصلے پر نہر کے پانی میں پھولے ہوئے بھاری جسم کا، بھوری رنگت والا جانور تیرتا ہوا کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ جانور کے سینگوں کی لمبائی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن وہ شاخ دار اور مضبوط نظر آتے تھے۔ شہریار مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔

''یہ پاڑہ ہے۔ عموماً شام کے بعد یا بہت صبح سویرے غذا کی تلاش میں اپنی پناہ گاہ سے نکلتا ہے۔ پتا نہیں یہ کیسے اس وقت نکل آیا؟'' ملازم نے ایک بار پھر سرگوشی میں شہریار کی معلومات میں اضافہ کیا۔ شہریار اسے کوئی جواب دیے بغیر پاڑہ کو دیکھتا رہا جو اب نہر کے پانی سے نکل کر کنارے پر اگی لمبی گھاس کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ گھاس میں چھپے ہونے کے باعث اب شہریار اسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی موجودگی بہرحال محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت کہیں قریب ہی سے دھائیں کی آواز گونجی اور گھاس میں چھپا بیٹھا پاڑہ بری طرح اچھلا۔ شہریار نے دیکھا کہ اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ بے ساختہ ہی فشنگ راڈ ہاتھ سے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگا۔ دوسری طرف سے چودھری افتخار کا ایک ملازم بھی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار کی چھری تھی جو اس نے تڑپتے ہوئے پاڑہ کے قریب پہنچ کر اس کی گردن پر پھیر دی۔ شہریار صدمے کی سی حالت میں اس خوب صورت جانور کے ذبح ہونے کا منظر دیکھتا رہ گیا۔

''شان دار چودھری صاحب! بہت ہی پرفیکٹ نشانہ لگایا آپ نے۔'' ایس پی معظم تارڑ کی آواز شہریار کے کانوں میں پہنچی تو وہ اپنی گم صم کیفیت سے باہر آیا۔ چودھری افتخار بندوق ہاتھ میں لیے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ معظم تارڑ، اقبال باجوہ اور ملازمین بھی تھے۔ ملازمین مل کر ذبح شدہ جانور کو سنبھالنے لگے۔

''کیوں شہریار صاحب! کیسا لگا آپ کو ہمارا نشانہ؟'' شہریار کو متوجہ ہوتے دیکھ کر چودھری افتخار نے اس سے پوچھا۔

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہاں چنکارہ اور پاڑہ کے شکار پر ان دنوں پابندی ہے۔'' چودھری افتخار کو نظر انداز کر کے شہریار، اقبال باجوہ سے مخاطب ہوا۔

''جی ہاں پابندی تو ہے لیکن چودھری صاحب دور سے اندازہ نہیں کر پائے کہ یہ پاڑہ ہے۔ بس انہوں نے گھاس میں اس کی جھلک دیکھ کر فائر کر دیا۔'' اقبال باجوہ فاریسٹ آفیسر ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے جانور کی ہلاکت پر جس کے شکار پر پابندی عائد تھی، بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' شہریار کو سخت تاسف تھا۔

''آپ فکر مت کریں شہریار صاحب! پاڑہ کوئی اتنی نایاب نسل کا جانور نہیں ہے۔ پاکستان کے تقریباً چاروں صوبوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہاں پابندی اس لیے ہے کہ یہاں یہ ذرا کم تعداد میں ہے۔ لیکن بہرحال، ایک جانور کی ہلاکت سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔'' اقبال باجوہ مکمل طور پر مطمئن تھا۔

''فرق کیسے نہیں پڑتا باجوہ صاحب؟ آپ فاریسٹ آفیسر ہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے کہ اس ''فرق نہیں پڑتا'' کی گردان نے ہمیں ماضی میں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ بلیک بک (کالا غزال) کے قصے سے کون واقف نہیں۔ کسی زمانے میں چولستان کے علاقے میں ان کی کثرت تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ہم لوگوں نے انہیں اتنی کثرت سے شکار کیا کہ ہمارے ہاں سے ہرنوں کی یہ نسل ہی معدوم ہو گئی۔ وہ تو نواب آف بہاولپور کے امریکا کو تحفے میں دیے گئے 35 کالے ہرنوں کی وجہ سے بات بچی۔ ہم نے اپنے جس قیمتی جانور کو ختم کر ڈالا تھا، اس کی امریکیوں نے اتنی اچھی طرح افزائش کی کہ بعد میں ہمیں ہی دس ہرن بھجوا دیے۔ اب ہم انہیں سنبھالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ جانے ہمارا یہ غیر سنجیدہ رویہ کیوں ختم نہیں ہوتا کہ ہم پہلے اپنی چیزوں کی قدر نہیں کرتے، بعد میں ان کے حصول کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔'' شہریار کو پاڑہ کی ہلاکت اور اقبال باجوہ کے بے پروا انداز پر اتنا افسوس ہوا کہ وہ اچھی خاصی تقریر کر گیا۔

''اب جو ہو گیا سو ہو گیا اے سی صاحب! میں اپنی اس غلطی کے لیے حکومت کو جرمانہ ادا کر دوں گا۔'' شہریار خاموش ہوا تو چودھری افتخار نے رعونت سے کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔ اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے شہریار کی یہ تقریر بہت بری لگی ہے۔ شہریار نے زیادہ پروا نہیں کی اور ان لوگوں کے ساتھ واپس اپنے پڑاؤ پر آ گیا۔ یہاں ملازمین نے پاڑہ کی کھال اتار کر اسے بھوننے کے انتظامات شروع کر دیے۔ دو چار تیتر اور شہریار کی شکار کی گئی مچھلیاں بھی دوپہر کے کھانے کے مینو میں شامل تھیں۔ کھانا تیار ہونے کے بعد لگایا گیا تو شہریار نے بھنے ہوئے پاڑہ پر نگاہِ غلط تک نہیں ڈالی۔ اگرچہ معظم تارڑ اور اقبال باجوہ کوشش کر رہے تھے کہ فضا خوش گوار رہے لیکن شہریار اور چودھری افتخار کے آف موڈ کی وجہ سے فضا مکدر ہی تھی۔ شام سے قبل ان لوگوں نے اپنا سامان سمیٹ کر واپسی کی تیاری کر لی۔ شہریار جس جیپ میں بیٹھا تھا اس میں چودھری افتخار بھی موجود تھا۔

''آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے اے سی صاحب! میں نے آپ کے مشورے پر غور کرتے ہوئے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے کچھ اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری ایک موبائل کمپنی والوں سے بات ہوئی ہے۔ دو چار دن میں وہ ہمارے علاقے میں اپنا ٹاور بنانا شروع کر دیں گے۔ آپ دیکھیں نا، یہاں اردگرد کے کسی علاقے میں ابھی تک موبائل سروس شروع نہیں ہوئی ہے۔ میں یہ کام کروانے والا پہلا بندہ ہوں گا۔'' جیپ جنگل کی حدود سے نکلنے والی تھی جب چودھری افتخار نے شہریار کو یہ اطلاع دی۔ شہریار اس اطلاع پر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ اسکول، اسپتال اور سڑک جیسی بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر چودھری افتخار کو ترقی کے نام پر اگر کچھ کرنے کا خیال آیا بھی تھا تو اپنے علاقے میں موبائل سروس شروع کروانے کا...! وہ واقعی ایک بے حد ہوشیار شخص تھا جو اپنے دامن پر لگے الزامات کے داغ ایک ایسے طریقے سے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے محکوم افراد اس کی گرفت سے ہرگز نہ نکلنے پائیں اور کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہوا بھی نظر آئے۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے زہرہ کی شادی نمٹ گئی۔ ماہ بانو نے بہت ڈرتے ڈرتے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ سارا وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ حویلی سے بلاوا نہ آ جائے۔ مگر خیر گزری تھی کہ اس موقعے پر بڑی چودھرائن کو اپنی حکمرانی جتانے کے لیے ماہ بانو کو بلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ شاید شادی والے گھر کا سوچ کر کچھ لحاظ کر گئی تھی۔ ماہ بانو ڈرتی تھی کہ بڑی چودھرائن نے اگر بلایا تو حویلی جانا پڑے گا اور حویلی میں چودھری افتخار بھی ہوتا جو موقع دیکھتے ہی دوبارہ ماہ بانو کو شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ شادی والے دن ماہ بانو کو اطلاع



ملی کہ چودھری افتخار شکار پر گیا ہوا ہے۔ اس اطلاع کو سن کر اس کا دل پُرسکون ہو گیا۔ اس نے آرام سے شادی اور ولیمے کی تقریبات میں شرکت کی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ولیمے کی دعوت سے واپس آنے کے بعد واپسی کے لیے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

''دھیے! ادھر آ ذرا... میری ایک بات تو سن۔'' حوراں نے اس کی مصروفیات دیکھ کر گلا کھنکھارتے ہوئے اسے آواز دی۔

''آتی ہوں بے بے! بس یہ آخری دو جوڑے بھی بیگ میں رکھ لوں۔'' ماہ بانو نے مصروف سے انداز میں جواب دیا اور جلدی جلدی کپڑوں کی تہ لگا کر انہیں بیگ میں رکھ کر زپ بند کرنے کے بعد اس میں وہ چھوٹا سا تالا بھی لگا دیا جو وہ گاؤں آتے وقت حوراں کی ہدایت پر سامان کی حفاظت کے خیال سے لگا کر لائی تھی۔

''ہاں بے بے! اب بولو کیا بات ہے؟ ابا نے کیا بتایا ہے، کب تک نکلنا ہے؟ اب تو ویسے بھی شام سر پر آ گئی ہے۔ زیادہ دیر ہو گئی تو پھر ہمیں کل تک رکنا پڑے گا۔'' ماہ بانو حوراں کے قریب آ بیٹھی۔ اس وقت کمرے میں وہ دونوں ہی موجود تھیں۔ نوراں باہر آنگن میں ولیمے میں شرکت کرنے کے بعد ساتھ گھر آ جانے والے مہمانوں کے ساتھ مصروف تھی۔ حوراں اور صفدر کے سوا وہاں گاؤں سے باہر کا تو کوئی فرد نہیں آیا ہوا تھا اس لیے کسی کے وہاں شب بسری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بس گاؤں میں ہی رہنے والے برادری کے کچھ لوگ تھے جو اس وقت ساتھ آ گئے تھے اور آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔

''بات یہ ہے دھیے کہ میں اور تیرے ابا تو ابھی تھوڑی دیر بعد فیصل آباد کے لیے نکلنے والے ہیں لیکن تیرے ابا نے کہا ہے کہ ماہ بانو سے کہو دو چار دن یہیں ٹھہر جائے۔ تیرے کالج میں وہ تیری چھٹی کی درخواست پہنچا دیں گے۔''

''مگر کیوں؟ میں کس لیے رکوں یہاں؟ میں تو نہیں رکوں گی۔ مجھے واپس جانا ہے آج اور ابھی۔'' ماہ بانو کا ردِعمل حوراں کی توقع کے مطابق تھا۔

''خدمت کر میری اچھی دھی! بھاغیاث نے خود تیرے لیے کہا ہے کہ ماہ بانو کو دو چار دن کے لیے گاؤں چھوڑ جاؤ۔ دو چار دنوں کے بعد بھاغیاث خود تجھے واپس فیصل آباد لا کر چھوڑ دے گا۔ ابھی اصل میں ادھر کسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ سارا گھر پھیلا ہوا ہے۔ اکیلی نوراں بے چاری یہ سب کیسے سنبھالے گی؟ اسے حویلی کے کام سے بھی جانا ہوتا ہے۔ بیاہ کے دنوں میں یہ تین دن کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے منت سماجت کے بعد ملی تھی۔ کل سے اسے کام پر جانا ہو گا۔ ایسے میں تیرا فرض بنتا ہے نا کہ ماں کا ساتھ دے۔ اگر نگار کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ ہی رک جاتی دو چار دن میکے میں لیکن اس کا جی اچھا نہیں ہے۔ بڑی مرادوں کے بعد تو اسے یہ وقت دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اللہ خیر سے اس کا یہ وقت نکالے۔ اس کی ساس تو ایک دن بھی اسے یہاں رکنے کے لیے نہیں بھیجے گی۔ دیکھا نہیں کہ شادی کی تقریبات میں بھی اپنے ساتھ لاتی لے جاتی رہی ہے۔ اب لے دے کر ایک تو ہی ہے جو نوراں کا ساتھ دے سکتی ہے۔'' حوراں ماہ بانو کو سمجھانے لگی۔

''مگر بے بے! میرا یہاں اکیلے دل نہیں لگتا۔ تم بھی رک جاؤ نا یہاں میرے ساتھ۔'' ماہ بانو نے فرمائش کی۔

''میرا اپنا دل چاہتا ہے کہ رک جاؤں لیکن تیرے ابا کو مشکل ہو جائے گی۔ وہ وہاں اکیلا ہو گا تو کون اس کے کھانے پینے کا خیال کرے گا۔ اور تو جانتی ہے کہ تیرا ابا اب مزید یہاں نہیں رک سکتا۔ جتنے دن کا ناغہ ہو گیا ہے اس سے ہی کاروبار کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ناغے سے اچھے بھلے بندھے ہوئے گاہک ٹوٹ جاتے ہیں۔'' حوراں بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ صفدر بازار میں جہاں پھلوں کی ریڑھی لگاتا تھا وہاں دوسرے بھی کئی پھل فروشوں کی ریڑھیاں ہوتی تھیں۔ صفدر ان سب میں سب سے زیادہ صاف ستھرا اور اچھا مال رکھتا تھا اور قیمت بھی مناسب لگاتا تھا اس لیے اس کا کام زیادہ اچھا چلتا تھا۔ بڑی بڑی کاروں میں آنے والے بھی صفدر کے ٹھیلے پر سے پھل خریدنا پسند کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، یہ سارے لوگ صفدر کے انتظار میں پھل خریدنا اور کھانا تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ صفدر نہ ہوتا تو وہ کسی اور ٹھیلے یا دکان سے خریداری کر لیتے۔ نقصان تو صفدر ہی کا تھا اس لیے وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا۔

''تم نے اور ابا نے مجھے دھوکا دیا ہے بے بے! تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ولیمے والے دن مجھے اپنے ساتھ ہی واپس لے جاؤ گے اور اب مجھے زبردستی یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔'' ماہ بانو کا کچھ اور بس نہ چلا تو حوراں سے شکوہ کرتے ہوئے رونے لگی۔

''میری مجبوری کو سمجھ میری جھلی دھی! میں اور تیرا ابا بھاغیاث کو انکار نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے اس کی بات نہیں مانی تو اس کا کچھ بھروسا نہیں کہ صاف بول دے کہ ماہ بانو میری بیٹی ہے، اسے میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جانے دیتا۔

اب یہ ہمیشہ یہیں رہے گی۔ ذرا سوچ اگر بھا غیاث نے ایسی کوئی بات کردی تو ہم کیا کریں گے؟'' حوراں اسی خوف میں مبتلا تھی جس میں لے پالک بچوں کے ماں باپ سدا مبتلا رہتے ہیں۔

''ایسے کوئی کیسے زبردستی روک سکتا ہے مجھے؟ میں تو نہیں رکوں گی۔'' ماہ بانو رونا چھوڑ کر چمک کر بولی۔

''تو ابھی نادان ہے۔ تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں۔ پھر تو نے بھا غیاث کو صحیح سے دیکھا بھی کہاں ہے۔ غصے میں اس کی آنکھ سے ساری مروت اور لحاظ ختم ہو جاتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔'' حوراں نے ماہ بانو کو جواب دیا۔ ماہ بانو نے مزید کچھ بولنے کے لیے لب کھولے لیکن حوراں نے اسے بولنے نہیں دیا۔

''بس میری دھی! اب کچھ نہیں بولنا۔ بس جو میں نے کہہ دیا اسے مان لے۔'' اب ماہ بانو بالکل مجبور تھی۔ تھوڑی دیر بعد حوراں اور صفدر اسے پیار کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ گھر میں پھیلا بکھرا وا سمیٹنے لگی۔ مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی تھی لیکن چند افراد ابھی تک بیٹھے گپیں لڑا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر حرکت کرتی ماہ بانو کے کانوں میں بھی ان کی آواز پڑ رہی تھی۔

''پیر سرکار کی برکت سے ہماری تو ساری مشکلیں دور ہو گئیں۔ نگار کی طرف سے فکر تھی، پیر سرکار کی قبر پر منت مانتے ہی اس کی طرف سے خوش خبری مل گئی۔ اِدھر اپنی زہرہ کے بیاہ کے لیے کون سی تیاری تھی لیکن اس کے لیے بھی وسیلہ بن گیا۔ چودھری صاحب نے پچھلا قرض باقی ہونے کے باوجود زہرہ کے بیاہ کے لیے قرض دے دیا۔ میرا تو ایمان پکا ہو گیا ہے پیر سرکار کی کرامت پر۔ اگلے برس عرس ہو گا تو خوب نذر چڑھاؤں گی ان کی درگاہ پر جا کر۔'' ماہ بانو باورچی خانے میں برتنوں کے ڈھیر سے الجھ رہی تھی جب اس نے حوراں کو نہایت عقیدت سے کہتے سنا۔ ماہ بانو کو اپنی جنم دینے والی ماں کی ضعیف العقیدی پر افسوس ہونے لگا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی مشکلات حل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتی... بیٹھی پیر سرکار کے گن گا رہی تھی۔ اس کی یہ عقیدت مندی باقی سننے والوں کا ایمان مزید کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔

''پیر سرکار کی تو کیا ہی بات ہے۔ وہ مہربان ہو جائیں تو کالا چور بھی آدمی کا ہمدرد بن جائے۔ وہ قصہ سنا ہے تم لوگوں نے کہ ایک کمہار بے چارے کا ہاتھ کسی حادثے میں ٹوٹ گیا۔ اب ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے بے چارہ کیا کام کرتا اور کیسے کماتا۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔ اس پر سے الگ بیٹی کا بیاہ سر پر آ کھڑا ہوا۔ کمہار کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ پیر سرکار کی درگاہ پر آ کر ان کے سامنے گڑگڑایا اور رو رو کر کہا کہ اب آپ ہی مجھ غریب کی مدد کریں۔ خدا کا کرنا دیکھو، اسی رات کمہار کے گھر پر ایک مسافر آ کر رکا۔ اس بے چارے کے پاس اپنے اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہیں تھا، مسافر کو کیا کھلاتا لیکن ظاہر ہے مہمان کو بھوکا بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کمہار جس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا، مہمان کی خاطر آس پڑوس والوں کے پاس گیا اور تھوڑا تھوڑا کھانا مانگ لیا۔ رنگ برنگا کھانا دیکھ کر مسافر کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ اس نے کمہار سے تفصیل پوچھی۔ اس نے سارا سچ بتا دیا۔ اس وقت تو مسافر خاموش ہو گیا لیکن صبح اذانوں سے بھی پہلے کمہار کو جگا کر بتایا کہ وہ جا رہا ہے۔ جاتے جاتے وہ کمہار کو ایک چھوٹی سی پوٹلی تھما گیا۔ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ ایک نامی گرامی ڈاکو ہے۔ اس کے جانے کے بعد کمہار نے پوٹلی کھول کر دیکھی تو اس میں گہنے اور روپے تھے۔ بس اس کے تو دن ہی پھر گئے۔ بیٹی کا بیاہ بھی خوب اچھی طرح ہوا اور آگے کی پریشانی بھی دور ہو گئی۔ کمہار نے سمجھ لیا کہ یہ ساری پیر سرکار کی کرامت ہے جنہوں نے دوسروں کو لوٹنے والے کے ہاتھ اس کا دامن بھر دیا۔'' نوراں کے عقیدت مندی کا اظہار کرنے کی دیر تھی، فوراً ہی وہاں موجود ایک بزرگ نے ایک قصہ پیر سرکار کی کرامت کے بارے میں سنا دیا۔ ایسے اور بھی کئی قصے تھے جو لوگ سناتے رہتے تھے۔ ماہ بانو کو کبھی ان واقعات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ قصے جان بوجھ کر اپنی طرف سے گھڑ کر پھیلائے گئے ہیں... لیکن عقیدت مندی کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو یہ بات سمجھانا بہت مشکل تھا۔

''اپنے چودھری صاحب پر بھی ان کے دادا حضور کی بڑی نظرِ کرم ہے۔ دیکھا نہیں ہے کہ کیسے پھل پھول رہے ہیں۔ خیر، کمی تو پہلے بھی کوئی نہیں تھی لیکن پیر سرکار کے کرم سے ان کا نصیب اتنا بلند ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں فائدہ ہی پاتے ہیں۔ اب شکار کا ہی قصہ سنو۔ چودھری صاحب اپنے دوستوں کو لے کر شکار پر گئے تھے۔ گھر سے نکلے تھے کہ بس ذرا جنگل میں گھومنے پھرنے کی تفریح رہے گی اور تیتروں وغیرہ کا شکار کر کے واپس آجائیں گے لیکن اُدھر تو ان کے ہاتھ پاڑہ لگ گیا۔ اب بتاؤ... پاڑہ دن کی روشنی میں بھی باہر نکلتا ہے لیکن چودھری صاحب کے ساتھ جانے والوں نے بتایا کہ ایک موٹا تازہ پاڑہ دن دیہاڑے



چودھری صاحب کے سامنے ایسے آگیا جیسے کسی نے اسے ان کی خدمت میں بھیجا ہو... کہ لو اس سے اپنے مہمانوں کی دعوت کرو۔ کل رات ہی وہ لوگ واپس آئے ہیں شکار سے۔ ساتھ جانور کی کھال اور اس کی مُنڈی بھی ہے۔ چودھری صاحب دونوں چیزوں کو محفوظ کروا کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' یہ سارا قصہ سنانے والا تو عقیدت مندی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ماہ بانو کے ہاتھ پاؤں سن پڑنے لگے۔ وہ جو ایک اطمینان تھا کہ چودھری افتخار گاؤں میں موجود نہیں، اس قصے کو سن کر رخصت ہو گیا اور وہ اپنے اردگرد منڈلاتے خطرے کو محسوس کرنے لگی۔ چودھری افتخار شکاری تھا اور شکاری کبھی بھی اپنے شکار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ دبے قدموں سے اس کے تعاقب میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک اسے شکار نہ کر لے۔ ماہ بانو سمجھ سکتی تھی کہ چودھری افتخار چپکے سے گھات لگائے اسے شکار کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد حتی الامکان کام سمیٹنے کے بعد جب سب گھر والے بستر پر لیٹے تو ماہ بانو نے رات کی خاموشی اور اندھیرے میں ہونے والی وہ آواز سنی۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی دیوار پھلانگ کر اندر کودا ہو۔ ماہ بانو کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ خدشوں اور اندیشوں نے اس کی نیند پہلے ہی اڑا رکھی تھی۔ شدید تھکن کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اب جو اس نے دھمک سنی تو پوری جان سے کانپ گئی لیکن وہ پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ چودھری کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہو گی۔ سنائی دینے والی آواز واقعی کسی انسان کے کودنے کی ہے یا کسی بلی وغیرہ نے چھلانگ لگائی ہے، پہلے یہ تصدیق کرنا ضروری تھا۔ ماہ بانو چپکے سے اپنے بستر سے نیچے رینگ گئی۔ بستر چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنے گرد بڑی سی سیاہ چادر لپیٹ لی تھی۔ وہ رینگتی ہوئی بنا آہٹ کیے کمرے کے دروازے تک گئی اور اندھیرے میں ڈوبے آنگن کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پہلی نظر میں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا مگر پھر اس نے قدموں کی آہٹ سے دیوار پھلانگنے والے کو پالیا۔ وہ دبے قدموں سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ماہ بانو سمجھ گئی کہ باہر کچھ اور افراد بھی موجود ہیں جنہیں وہ دروازہ کھول کر اندر بلانا چاہتا ہے۔ وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور کمرے کے دروازے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ سیاہ چادر کی وجہ سے اس کا وجود اندھیرے کا جزو بنا ہوا تھا اور یوں بھی دیوار پھلانگ کر آنے والے کا رخ اس کے بجائے دروازے کی طرف تھا اس لیے اسے باورچی خانے تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ بغیر دروازے کا یہ باورچی خانہ اسے ہرگز پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ وہاں پناہ لینے آئی بھی نہیں تھی۔ چودھری افتخار کے گاؤں میں موجود ہونے کا سن کر اس نے اس قسم کی صورتِ حال میں گھرنے کی صورت میں پہلے ہی اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل طے کر لیا تھا اور اب وہ بہت خاموشی سے اس پر عمل پیرا تھی۔ اپنی اس مصروفیت کے دوران اس کے کان باہر کی طرف بھی لگے ہوئے تھے۔ آنے والے اندر آچکے تھے اور ان کے قدموں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تین چار سے کم نہیں۔ ذرا دیر میں ماہ بانو نے نوراں، غیاث اور اپنے چھوٹے بھائی الیاس کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں۔ پھر ان آوازوں میں اس نے کچھ اجنبی آوازیں بھی سنیں۔ یقیناً وہ لوگ اسی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ ماہ بانو جانتی تھی کہ انہیں اس تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اسے اب پروا بھی نہیں تھی۔ جو کچھ کرنا تھا، وہ کر چکی تھی اور اب اطمینان سے باورچی خانے کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آخر ان میں سے ایک وہاں پہنچ گیا۔

''یہ رہی... یہاں چھپی ہوئی ہے۔'' ماہ بانو کو دیکھتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔ دو بندے بھاگتے ہوئے تیزی سے وہاں آئے۔ ان سب نے اپنے چہروں کو ڈھاٹوں سے چھپا رکھا تھا۔ ''اٹھا لو اسے اور جیپ میں ڈالو۔'' آنے والوں میں سے ایک نے حکم دیا اور دو بندے ماہ بانو کی طرف بڑھے۔

''وہیں رک جاؤ... خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔ میں خود تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔'' ماہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ آنے والے اس کے اس انداز پر حیران رہ گئے۔ مگر پھر وہ بھی چل پڑے۔ آنگن میں نوراں، غیاث اور دس سالہ الیاس ہراساں کھڑے تھے۔ بندوق تانے ایک شخص ان کے سروں پر سوار تھا۔

''خبردار! اگر اپنی بیٹی کی زندگی چاہتے ہو تو منہ بند رکھنا۔ صبح تمہیں تمہاری بیٹی زندہ مل جائے گی۔ اگر زبان کھولی تو پھر اس کی لاش ہی پا سکو گے۔'' جس شخص نے ماہ بانو کو اٹھانے کا حکم دیا تھا، اس نے ہی بارعب لہجے میں ان تینوں کو دھمکی دی اور وہ لوگ باہر نکل آئے۔ ماہ بانو کو انہوں نے جیپ کی اگلی سیٹ پر بٹھایا تھا اور اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک لڑکی کو اغوا کیا جا رہا

تھا اور وہ بغیر کوئی واویلا کیے ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگئی تھی۔

''شاید پیٹرول کی بوتل کا ڈھکن ڈھیلا ہو کر اس سے پیٹرول گر گیا ہے۔ مجھے جیپ میں پیٹرول جیسی بو آرہی ہے۔'' تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی جیپ ڈرائیو کرنے والے نے خیال ظاہر کیا۔

''بُو تو ہمیں بھی آرہی ہے لیکن ابھی رکے بغیر چلتے رہو۔ بعد میں آرام سے دیکھیں گے۔'' پچھلی نشست سے جواب دیا گیا۔ ماہ بانو ان سے بے نیاز بنی باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ باہر اندھیرا تھا لیکن پھر بھی اسے اندازہ ہوگیا کہ جیپ کا رخ حویلی کی طرف نہیں۔ وہ حویلی کے راستے سے ہٹ کر نہر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ یعنی اسے اغوا کروانے والا چودھری افتخار کے سوا بھی کوئی اور ہوسکتا تھا۔

ماہ بانو کے ذہن میں یہ خیال آیا اور پھر اس نے خود ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ چودھری افتخار کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا جس کی اس پر نظر ہوئی۔ اس رات تو اتفاقاً اسے حویلی کے اندر ہی ماہ بانو سے دست درازی کا موقع مل گیا تھا لیکن یقیناً عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حویلی میں اپنی بیویوں اور دیگر اہلِ خانہ کی موجودگی میں ایک لڑکی کو اغوا کروا کر اس کے ساتھ داد عیش دیتا۔ اپنے اس قسم کے مذموم مقاصد کے لیے یقیناً اس نے کوئی دوسرا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچے تو ماہ بانو کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ ڈھانا پوشوں نے اسے جس کمرے میں پہنچایا، وہاں چودھری افتخار اس کا منتظر تھا۔ ماہ بانو کو سامنے پا کر وہ کھل اٹھا۔

''بہت تڑپایا تو نے ہمیں۔ اس رات پکنی مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسل گئی لیکن دیکھ ہم پھر تجھے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔'' اپنے ہاتھ میں موجود شراب کا جام لہراتے ہوئے اس نے ایک خوشی بھرا قہقہہ لگایا۔ ماہ بانو کوئی جواب دیے بغیر خاموش کھڑی رہی۔ اس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی اور بے پروائی تھی۔ چودھری افتخار ٹھٹکا اور غور سے اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے؟ آج بڑی چپ ہے۔ نہ کوئی شور نہ گالی گلوچ۔ میں تو سمجھا تھا، میرے بندے تیرے ہاتھ پیر باندھ کر تجھے میرے سامنے لا کر پھینکیں گے لیکن تو تو خود اپنے قدموں پر چل کر آئی ہے۔''

ماہ بانو اس بار بھی خاموش رہی۔

''چل اچھی بات ہے کہ تجھے خود ہی عقل آگئی۔ خاموشی سے میری بات مان لینے میں ہی تیرا فائدہ ہے۔ پر یہ تو بتا کہ اب اس چادر میں لپٹی ہمارے ضبط کو کیوں آزما رہی ہے۔ دور پھینک اس چادر کو اور یہاں میرے پاس آ۔'' چودھری افتخار کی اس فرمائش پر ماہ بانو نے اپنے گرد مضبوطی سے لپٹی چادر کو سرکایا۔ سامنے سے چادر ہٹی تو اس کی گریبان سے دامن تک کچھ نم نم سی قمیص ظاہر ہوگئی لیکن چودھری افتخار کی نظر اس کی قمیص کے بجائے اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کو ٹٹول رہی تھی۔ چادر سرکانے کے بعد ماہ بانو نے چودھری افتخار کے دوسرے حکم کی پیروی نہیں کی تھی۔

''اب آجا نا... کیوں تڑپاتی ہے؟'' چودھری نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ ماہ بانو بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی۔

''چل اگر تو نہیں آتی تو ہم خود تیرے پاس آجاتے ہیں۔ اتنا نخرا دکھانا تو تیرا حق بنتا ہے۔'' چودھری افتخار لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔

''وہی رک جاؤ چودھری!'' ماہ بانو نے کڑکتی ہوئی آواز میں اسے تنبیہ کی اور اپنی بند مٹھی کھولی۔ اس بند مٹھی میں ماچس کی ایک ڈبیا صاف نظر آرہی تھی۔

''اگر شراب نے تمہارے اندر کوئی حس باقی چھوڑی ہے تو وہیں رک جاؤ اور اس بو کو سونگھو جو میرے بدن سے آرہی ہے۔ میں اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کر یہاں آئی ہوں۔ اگر تم نے مجھے انگلی بھی لگانے کی کوشش کی تو میں اس ماچس سے خود کو آگ لگا لوں گی۔ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر زبردستی میرے قریب آنے کی کوشش کرو گے تو خود بھی جل کر مرو گے۔'' ماہ بانو کا لہجہ اتنا بھیانک تھا کہ چودھری کا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر جم سا گیا۔ جس بُو کی طرف ماہ بانو نے اس کی توجہ دلائی تھی، وہ اس نے اس کی آمد کے ساتھ ہی محسوس کی تھی لیکن شراب کے نشے اور ماہ بانو کو پانے کی ترنگ میں نظر انداز کر گیا تھا مگر اب اس بُو کی حقیقت اسے سمجھ آرہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ماہ بانو کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ اپنے ارادے میں نہایت غیر متزلزل نظر آتی تھی۔ اس کا اور چودھری افتخار کا درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ وہ جب تک اس کے قریب پہنچ کر ماچس کی ڈبیا چھیننے کی کوشش کرتا، وہ خود کو آگ لگا چکی ہوتی۔ ماچس کی ڈبیا اور اس سے نکالی ہوئی ایک تیلی اس کے ہاتھوں میں بالکل تیار تھی۔

چودھری افتخار نشے میں ہونے کے باوجود جانتا تھا کہ اگر یہ تیلی جل گئی تو ماہ بانو کا مٹی کے تیل میں ڈوبا وجود اتنی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آئے گا کہ وہ لمحوں میں جل کر بھسم ہو

جائے گی۔ وہ شکست خوردہ سا پیچھے ہٹا۔

''ٹھیک ہے، اس روز بھی ایک آگ نے بھڑک کر تجھے بچالیا تھا اور آج بھی تو نے ایک آگ کی دھمکی کو درمیان میں لاکر ہمارے قدموں کو روک دیا ہے... لیکن تو نہیں جانتی کہ ایک آگ ہمارے اندر بھی بھڑک رہی ہے جو تجھے حاصل کیے بغیر نہیں بجھے گی۔ ابھی تو تو واپس چلی جا لیکن یاد رکھ کہ تجھے صرف اور صرف چودھری افتخار کا ہی بننا ہے۔ اس بار میں اس راستے سے آؤں گا کہ تو مجھے روک نہیں سکے گی۔'' کچھ دیر خاموشی سے بیٹھنے کے بعد اس نے ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے کسی ملازم کو آواز دے کر بلایا۔

''اسے واپس اس کے گھر چھوڑ آ۔'' ملازم کے حاضر ہونے پر چودھری افتخار نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی ماہ بانو کو بھی ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ ماہ بانو غیر یقینی کی کیفیت میں اپنے گرد دوبارہ چادر لپیٹتی باہر کی طرف بڑھی لیکن اس کا انداز اس ہراساں ہرنی کا سا تھا جو ذرا سی آہٹ پر بھی چونک اٹھتی ہے کہ جانے شکاری اب کہاں سے حملہ کرے گا۔

☆☆☆

غیاث محمد اور نوراں حیرت کی تصویر بنے ایک ٹک اپنے گھر کے آنگن میں بکھرے اس سامان کو دیکھ رہے تھے جس کی وجہ سے ان کے لیے اپنے آنگن کا منظر اجنبی ہو گیا تھا۔ رات سے مسلسل وہ اسی طرح کی حیرتوں کی زد میں تھے۔ پہلے ماہ بانو اغوا کی گئی۔ نوراں نے پچھلی بار ماہ بانو کے ابتر حالت میں حویلی سے واپس آنے والے واقعے کی روشنی میں بھانپ لیا کہ یہ کارروائی کس نے کی ہے۔ اس نے غیاث محمد کو بھی اپنے خیال میں شریک کرلیا۔ غیاث محمد پوری بات سن کر اس پر بے حد خفا ہوا تھا کہ نوراں نے اسے اس واقعے سے بے خبر کیوں رکھا؟ اگر وہ اسے بتا دیتی تو وہ ماہ بانو کو کبھی یہاں نہ روکتا۔ ابھی ان لوگوں میں اس موضوع پر بحث چل رہی تھی کہ ماہ بانو صحیح سلامت واپس لوٹ آئی۔ نوراں اور غیاث محمد کے سوالوں کے جواب میں کچھ بتانے کے بجائے اس نے صرف ایک بات کہی کہ صبح اسے فیصل آباد واپس بھجوا دیا جائے لیکن صبح ان کے لیے ایک اور حیرت منتظر تھی۔ چودھری افتخار کا منشی اللہ رکھا پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ صبح صبح ہی وہاں آدھمکا تھا اور اس نے ماہ بانو کے لیے چودھری افتخار کے رشتے کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ خود ہی یہ بھی طے کر دیا تھا کہ آنے والے جمعے کو عصر کے بعد چودھری افتخار اور ماہ بانو کا نکاح ہوگا۔ پے در پے پیش آنے والے ان واقعات نے نوراں اور غیاث محمد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کرلی تھیں اور وہ ایک ٹک آنگن میں رکھے پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکروں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اتنی ڈھیر ساری نعمتیں ایک ساتھ پہلے کبھی ان کے آنگن میں نہیں اتری تھیں۔

''کیسے وہ یاہ دوں اپنی اتنی سوہنڑی کڑی کو اس کے باپ سے بھی زیادہ عمر کے چودھری سے۔ چودھری تو پہلے ہی تین تین بیاہ پھڑ کا کر بیٹھا ہے۔ ایک تو چلو اللہ کو پیاری ہو گئی... پر وہ جو دو بیٹھی ہیں وہ تو ایک سے بڑھ کر ایک ظالم اور دماغ دار ہیں۔ وہ تو کھا ہی جائیں گی میری معصوم دھی کو۔'' آخر نوراں کی ممتا ہی بلبلائی تو اس نے لب کھولے۔

''ہمت ہے تو انکار کہلا دے۔ دو جا ساہ بھی نہیں لینے دے گا چودھری ہم ساروں کو۔'' غیاث محمد اس پر الٹا۔ نوراں خود بھی یہ بات سمجھتی تھی سو جواب دیے بنا اوڑھنی کا پلو آنکھوں پر رکھ سسکنے لگی۔ غیاث محمد کچھ دیر خاموش بیٹھا اسے آنسو بہاتا دیکھتا رہا پھر کھسک کر اس کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ایک بات سن نوراں!'' نوراں اس کے اس انداز پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے متوجہ دیکھ کر غیاث محمد اسی سابقہ انداز میں بولا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ چودھری کی بات تو ہمیں ماننی ہی پڑے گی، کیوں نہ خوشی سے مان لیں۔ چودھری سے اپنی دھی بیاہ کر ہم نقصان میں نہیں رہیں گے۔ ہماری تو شان ہی الگ ہو جائے گی۔ چودھری کا رشتے دار جان کر سارے ہماری عزت کریں گے۔'' غیاث محمد کی آنکھوں میں حرص تھی، اس عزت اور مقام کے لیے جو ساری زندگی اسے کبھی میسر نہیں آئے تھے۔ نوراں نے اس پر ایک ملامتی نظر ڈالی۔

''شرم کر غیاث محمد! جسے کبھی باپ بن کر پالا نہیں، آج اس کے ارمانوں کا خون کر کے اپنی عزت کمانے کا سوچ رہا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ماہ بانو کے بارے میں فیصلہ کرنے والا؟ اس کے ماں پیو حوراں اور صفدر ہیں۔ پہلے ان سے پوچھ کہ وہ چودھری سے اپنی دھی بیاہنے کو راضی بھی ہیں یا نہیں پھر گاؤں میں اپنی ٹور بنانے کی سوچنا۔'' نوراں جو اس سے پہلے اپنی مجبوریوں کے قصے سنا کر ماہ بانو کو حویلی میں چاکری پر مجبور کرتی رہی تھی، غیاث محمد کو لعن طعن کرنے لگی لیکن غیاث محمد بھی دبنے والا نہیں تھا۔ نوراں کی بات سن کر فوراً بھڑک اٹھا۔

''بالا کسی نے بھی ہو، دھی تو وہ میری ہی ہے۔ تیرے بہن بہنوئی کون ہوتے ہیں میری دھی کے بارے میں فیصلہ کرنے والے؟ میں نے احسان کیا تھا جوان کی سونی گود دیکھ کر اپنی دھی دے دی تھی۔ اب مرضی کہ میں جہاں چاہوں اپنی دھی کو بیاہوں۔ ویسے بھی چودھری کو انکار کرنے کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ چاہے تو کھڑے کھڑے ہمیں گاؤں سے نکلوا دے۔ پھر سوچ کہاں جائیں گے ہم سارے۔ ہمارا تو بیٹا بھی ابھی کسی لائق نہیں ہے۔ کہاں رُلتے پھریں گے ہم اپنی مٹی کو چھوڑ کر۔'' غیاث محمد جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ مبنی بر حقیقت تھا۔ اس حقیقت کو نوراں بھی سمجھتی تھی چنانچہ ایک بار پھر اوڑھنی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔

''کیوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کرتی ہے۔ شکر کر کہ ہمارے منہ پر کالک ملنے سے رہ گئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب سرکار کی کرامت سے ہوا ہے۔ انہوں نے پہلے بھی ہماری بگڑی بنائی ہے۔ اب بھی ان کا ہی کرم ہوا ہوگا کہ ماہ بانو خیریت سے گھر آگئی اور چودھری نے بیاہ کا پیام بھیج دیا... ورنہ ہماری حیثیت ہی کیا ہے چودھری کے آگے۔ میری مان، منشی مت کرا اور ہنسی خوشی راضی ہو جا۔ منشی اللہ رکھا جاتے جاتے اشارہ دے گیا ہے کہ اس بیاہ کے بعد ہم پر چڑھا قرض بھی معاف ہو سکتا ہے۔'' غیاث محمد نوراں کو سمجھانے لگا۔ پیر سرکار کی کرامت، عزت کا محفوظ رہنا اور قرض سے نجات وہ حوالے تھے جنہیں سن کر نوراں بھی قائل ہو گئی اور جھٹ آنسو پونچھ ڈالے۔

''بات تو تیری جی کو لگتی ہے غیاث محمد... پر دیکھ، حوراں اور صفدر کو بھی اس بیاہ پر بلا لینا۔ انہوں نے اتنی چاہ سے ماہ بانو کو پالا ہے، ان کے دل میں بھی سو ارمان ہوں گے اس کے بیاہ کے لیے۔''

''ہاں ہاں، ان کو بھی بلائیں گے... تو فکر ہی نہ کر۔ میں ایک دن پہلے کسی کو بھیج کر ان دونوں کو بلوا لوں گا۔ تو بس اب ماہ بانو کو سمجھانے کی فکر کر۔ اس کا مزاج ذرا ٹیڑھا ہے، آسانی سے نہیں مانے گی۔'' نوراں کے راضی ہوتے ہی غیاث محمد نے پُرجوش انداز میں اسے یقین دہانی کروانے کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ سب سے اہم مسئلے کی طرف مبذول کروائی۔

''فکر نہ کر، میں اسے راضی کرلوں گی۔'' نوراں نے اطمینان سے جواب دیا جبکہ کمرے کے دروازے پر کھڑی ماہ بانو اپنے سگے ماں باپ کے کیے اس بے رحمانہ فیصلے کو سن کر ساکت سی رہ گئی۔ اپنے مفادات پر اسے بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کرنے والوں نے ایک بار بھی اس سے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ اس قربانی پر راضی بھی ہے یا نہیں۔

☆☆☆

شہریار کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچانک ہی پیر آباد کے دورے کا فیصلہ کرلیا۔ اصل میں اب تک اس کا جتنی بار بھی پیر آباد جانا ہوا تھا، وہ وہاں چودھری افتخار کے مہمان کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس حیثیت میں اسے ایک بار بھی موقع نہیں ملا تھا کہ وہ گاؤں کے حالات اور مسائل کا جائزہ لے پاتا۔ آج کے اس دورے کا مقصد گاؤں کا جائزہ لینا اور وہاں کے مسائل کو سمجھنا تھا۔ پھر وہ اسکول والے معاملے کو بھی اب حتمی طور پر نمٹا دینا چاہتا تھا۔ چودھری افتخار کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دلائل سے قائل ہونے والا بندہ نہیں۔ اس کے سامنے اپنے اختیارات کا استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ اب وہ پیر آباد کی حدود میں تھا۔ اس کے ساتھ حسب معمول صرف ڈرائیور مشابرم خان اور عبدالمنان ہی موجود تھے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی شہریار نے سب سے پہلے اسکول کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک کسان سے اسکول کی لوکیشن معلوم کر کے مشابرم خان نے گاڑی اسکول جانے والے راستے پر ڈال دی۔ اسکول کیا تھا، بس ساتھ ساتھ بنے دو کمرے تھے جن پر پرائمری اسکول پیر آباد کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے گاڑی روکی تو شہریار اور عبدالمنان اس کمرے کی طرف بڑھ گئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازے سے تختہ سیاہ پر کچھ لکھتا ماسٹر آفتاب صاف نظر آرہا تھا۔ گاڑی کی آواز پر ماسٹر آفتاب بھی متوجہ ہو گیا تھا چنانچہ جیسے ہی اس نے شہریار اور عبدالمنان کو دیکھا، لپک کر باہر آیا۔

''السلام علیکم سر! آپ یوں اچانک؟'' وہ شہریار کی آمد پر حیرت کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے شہریار کو وہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔

''اچانک آنا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ آدمی کو وہ کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے جو اطلاع دے کر آنے کی صورت میں چھپا لیے جانے کا خدشہ ہو۔'' شہریار نے ماسٹر آفتاب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''موسٹ ویلکم سر... لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اسکول کی صورت حال ہر دو صورتوں میں آپ کو ایک جیسی ہی نظر آئے گی۔'' ماسٹر آفتاب کے پُراعتماد جواب پر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ماسٹر آفتاب ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ کوئی زبردستی نوکری بھگتانے والا بندہ تو تھا نہیں کہ دوسروں کو دکھانے کے لیے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ورنہ تساہل برتتا۔ وہ تو مشنری جذبے کے ساتھ

پیر آباد کے اس برائے نام اسکول میں نوکری کر رہا تھا... بلکہ نوکری بھی کیا پیر آباد کے بے شعور لوگوں میں آگہی کے دیے روشن کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ شہریار ماسٹر آفتاب کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوگیا۔ بچے اسے نہیں پہچانتے تھے لیکن انہوں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔ بچوں کے سلام کا جواب دے کر شہریار کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اکھڑے ہوئے فرش، چٹخی ہوئی دیواروں اور اڑے ہوئے رنگ والا یہ کمرا اپنی ٹین کی چھت کے ساتھ بے حد سرد ہو رہا تھا۔ دو دیواروں پر مخالف سمتوں میں تختۂ سیاہ موجود تھے جبکہ کچھ ہاتھ سے بنے چارٹس وغیرہ بھی نظر آرہے تھے۔ بچے نیچے دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دریوں پر بیٹھ کر پڑھتے مختلف عمر کے ان بچوں کی تعداد گاؤں کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھی لیکن پورے اسکول کے ایک کمرے میں سمانے کی وجہ سے جگہ کے اعتبار سے وہ تعداد زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

ماسٹر آفتاب کے کہنے پر دو ذرا بڑی عمر کے بچے برابر کے کمرے سے ایک کرسی اٹھا لائے۔ دو کرسیاں پہلے ہی وہاں موجود تھیں جو ماسٹر آفتاب نے شہریار اور عبدالمنان کے بیٹھنے کے لیے پیش کیں اور خود تیسری کرسی آنے پر اس پر براجمان ہوگیا۔

''ابھی ہمارا اسکول صرف تیسری جماعت تک ہے۔ تمام بچے اس ایک کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ سردی میں تو پھر بھی گزارہ ہو جاتا ہے لیکن گرمی میں یوں جڑ جڑ کر ساتھ ساتھ بیٹھنے میں بچوں کو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اسی لیے میں بار بار درخواست دیتا ہوں کہ اسکول کی عمارت میں اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک دو کمروں کا اضافہ اور کر دیا جائے تاکہ ہم کلاس آگے بڑھنے پر نئے بچوں کے بیٹھنے کے لیے گنجائش نکال سکیں۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ نہ یہاں مزید بچوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی پہلے سے موجود بچے ڈھنگ سے پڑھ پاتے ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ الگ الگ سبق پڑھنے والے بچوں کے ایک ہی جگہ مل کر پڑھنے سے کیا صورتِ حال پیش آتی ہوگی۔ اکثر ان کے اسباق آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں مگر بہرحال، فی الحال تو میں اور میرا ساتھی ٹیچر مل کر یہ سب مینج کر لیتے ہیں لیکن آگے کی مجھے بہت فکر ہے۔ اچھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے الگ الگ بیٹھنے کا انتظام کیا جائے اور ایک آدھ نئے استاد کا بھی تقرر ہو تاکہ بچے کو مناسب توجہ مل سکے۔'' شہریار کو سامنے پا کر ماسٹر آفتاب نے فوراً اسکول کے مسائل بیان کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس سے اس کے اسکول کے لیے خلوص کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ واقعی اسکول کی ترقی کا دل سے خواہش مند تھا۔

''آپ کے ساتھی استاد نظر نہیں آرہے؟'' اساتذہ کے ذکر پر شہریار کو خیال آیا تو ماسٹر آفتاب سے اس کے ساتھی ٹیچر کے بارے میں پوچھا۔

''اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے، وہ انہیں دیکھنے گیا ہوا ہے۔ وہ ہوتا ہے تو ہم دونوں مل کر آدھے آدھے بچوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہ جو برابر والا کمرا ہے، وہ ہم دونوں کے ہی زیرِ استعمال ہے۔ ہم مل کر وہاں رہتے ہیں۔'' ماسٹر آفتاب نے شہریار کے پوچھنے پر بتایا۔

''گاؤں میں اسکول کے بارے میں کیا رائے ہے؟ لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھوانے کا رجحان ہے یا نہیں؟''

''ابھی یہاں کے لوگوں کے ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسکول کی تعلیم کو اپنے بچوں کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں... خصوصاً لڑکیاں تو بہت ہی کم داخل ہوتی ہیں یہاں۔ پھر بھی ہم لوگوں نے کوشش کر کے والدین کو راضی کیا ہے کہ بچوں کو اسکول بھیجیں۔ بچوں کو کاپیاں، کتابیں اور دیگر چیزیں میں اپنی طرف سے فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ والدین کم از کم اخراجات کے بوجھ سے گھبرا کر بچے کو اسکول بھیجنے سے نہ کترائیں۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ایک دن ہمارا اسکول بہت ترقی کرے گا اور گاؤں کے سارے بچے یہاں پڑھنے آئیں گے۔'' ماسٹر آفتاب پُرعزم تھا۔

''حکومت نے تو بہت عرصہ ہوا تعلیم مفت کر دی ہے اور اسکولوں میں بچوں کے لیے مفت کورس اور وظائف وغیرہ بھی بھیجے جاتے ہیں۔ کیا آپ کے اسکول کو یہ سب نہیں ملتا؟'' شہریار، ماسٹر آفتاب کی کاپیاں، کتابیں فراہم کرنے والی بات پر چونکا۔

''ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں بھی ایک دو درخواستیں بھیجی تھیں، شاید وہ آپ کی نظر سے نہیں گزریں۔'' ماسٹر آفتاب نے جواب دیا تو شہریار نے عبدالمنان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بعض درخواستیں درمیان سے بھی غائب کر لی جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے ماسٹر صاحب کی ان درخواستوں کے ساتھ یہی ہوا ہو۔'' عبدالمنان نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''آپ اپنے پاس نوٹ کر لیجیے۔ ہمیں یہ معاملہ بھی دیکھنا ہوگا۔'' شہریار نے عبدالمنان کو حکم دیا اور پھر دوبارہ ماسٹر آفتاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔



''گاؤں میں پہلے بھی تو اسکول چلتا تھا۔ اس وقت جن طلبا نے یہاں سے پڑھا تھا، کیا ہمیں اسکول کے اسٹاف کے لیے ان کی مدد نہیں مل سکتی؟''

''اس وقت تو صورتِ حال کون سی اچھی تھی۔ دو چار لڑکے ہی ان میں سے ایسے تھے جنہوں نے پانچویں جماعت پاس کی۔ ان میں سے ایک اپنے کسی رشتے دار کے پاس شہر چلا گیا تھا اور وہاں رہ کر میٹرک کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوگیا۔ باقی یہیں کھیتی باڑی میں لگ گئے۔ میں نے کوشش کر کے ان میں سے دو کو مشکل سے اس بات پر راضی کیا ہے کہ وہ مڈل کا امتحان دے دیں۔ اب وہ دو لڑکے شام میں میرے پاس الگ سے پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ انشاء اللہ مڈل کا امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے پھر میں انہیں میٹرک پر راضی کروں گا لیکن فی الحال تو ہمیں باہر سے ہی کوئی ٹیچر بھرتی کرنا پڑے گا۔'' ماسٹر آفتاب نے تفصیل بتائی تو شہریار نے اس کے لیے اپنے دل میں پہلے سے زیادہ عزت محسوس کی۔ اس شخص کی بے لوث خدمتوں کا کوئی صلہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ شہریار کا دل چاہا کہ باہر جا کر گاؤں کے ان سارے لوگوں کو پکارے جو عرس والے روز چودھری افتخار کے دادا کی قبر پر اپنی حاجتیں پوری کروانے کے لیے جمع ہوئے تھے اور جو چودھری افتخار کے ہاتھ کو بوسا دینے کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ تم چومٹی کے ڈھیر کو پوجتے ہو اور اپنا استحصال کرنے والے کے ہاتھ پر بوسا دیتے ہو، اس شخص کے عقیدت مند بن جاؤ جو تمہارا سچا ہمدرد و خیر خواہ ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ باتیں جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والی اندھی عقیدت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اپنی اس خواہش کو دبا کر وہ ماسٹر آفتاب سے پورے خلوص سے بولا۔

''میں نے آپ کی ہر بات اچھی طرح سن لی ہے۔ اب عمل کا وقت آچکا ہے۔ آئندہ دو تین دنوں میں یہاں کنسٹرکشن شروع ہو جائے گی۔ نئے اساتذہ کا بھی میں جلد انتظام کرا دوں گا۔ بس آپ اسی لگن سے اپنا کام کرتے رہیے۔''

''تھینک یو... تھینک یو ویری مچ سر! یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔'' ماسٹر آفتاب اس خبر کو سن کر خوش ہوگیا۔

''احسان کی کوئی بات نہیں۔ یہ میرا فرض ہے جسے میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا اور پھر عبدالمنان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''عبدالمنان! مشابرم خان کہاں ہے؟ اس سے کہو کہ مسجد سے میری گاؤں میں آمد کا اعلان کروا دے تاکہ لوگ ملاقات کے لیے آسکیں۔''

''مشابرم خان لوکیشن دیکھ رہا ہے سر تاکہ آپ کے بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ کا انتظام ہو سکے۔'' عبدالمنان نے شہریار کو بتایا۔

''کوئی اور جگہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسکول کی چھٹی ہونے والی ہے۔ آپ لوگ یہاں بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔'' ماسٹر آفتاب نے عبدالمنان کی بات سن کر فوراً ہی پیشکش کی جو شہریار کو پسند آئی۔ اس نے عبدالمنان کو باہر بھیج دیا کہ مشابرم خان کو جگہ تلاش کرنے سے روک کر شہریار کی اسکول میں موجودگی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ لوگ براہِ راست اپنے علاقے کے اے سی سے مل کر اپنے مسائل پیش کر سکیں۔ عبدالمنان حکم کی پیروی کے لیے باہر نکل گیا جبکہ شہریار وہیں بیٹھ کر ماسٹر آفتاب کو دیکھنے لگا۔ وہ اتنی دیر سے سکون سے بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف بچوں کے بیگ بند کروانے کے بعد انہیں مشترکہ طور پر چند دعائیں زبانی پڑھوا رہا تھا۔ پانچ چھ منٹ کی اس کارروائی کے بعد اس نے چھٹی کا باقاعدہ اعلان کیا اور بچے قطار بنا کر بہ آوازِ بلند سلام کرتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔ بچوں کی ان آوازوں کے درمیان شہریار نے مسجد سے اے سی کی آمد کے سلسلے میں ہونے والا اعلان بھی سنا۔ اعلان ہونے کے تھوڑی دیر بعد عبدالمنان اور مشابرم خان واپس لوٹ آئے۔ ماسٹر آفتاب جو شہریار سے اجازت لے کر بچوں کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل گیا تھا، ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے بھی جس میں چائے کی پیالیاں اور بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' شہریار نے اسے ٹوکا۔

''آپ نے یہاں آنے کی جو تکلیف کی ہے اس کے مقابلے میں یہ تکلف کچھ بھی نہیں۔''

''میں ایک بار پھر آپ کو یہی جواب دوں گا کہ یہ میرے فرائض کا حصہ ہے۔'' ماسٹر آفتاب کی بات کے جواب میں شہریار نے کہا اور پھر چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی۔ عبدالمنان نوٹ کر رہا تھا کہ شہریار کا انداز ماسٹر آفتاب کے ساتھ قدرے مختلف ہے۔ وہ جو ایک اکڑی سی اس کے اندر نظر آتی تھی، اس کا یہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا اور وہ بہت نرم خو نظر آتا تھا۔ عبدالمنان شہریار کے اس انداز کو پہچاننے لگا

تھا۔ وہ لوگ جو اسے پسند آتے تھے، ان کے ساتھ اُن کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا۔

''چائے بہت اچھی بنائی ہے آپ نے۔''

''شکریہ سر!'' شہریار کی تعریف پر ماسٹر آفتاب یہی کہہ سکا۔ ابھی ان لوگوں نے مشکل سے آدھی پیالی چائے ہی پی تھی کہ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ایک لڑکی دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ لڑکی کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور وہ گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے بی بی! آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' عبدالمنان فوراً الرٹ ہوا اور لڑکی سے پوچھا۔

''مجھے اے سی صاحب سے ملنا ہے۔'' لڑکی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''فرمائیے محترمہ! میں ہوں اے سی شہریار عادل۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' شہریار فوراً لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ لڑکی کسی مشکل میں مبتلا نظر آتی تھی اور یقیناً شہریار کی آمد کا اعلان سن کر وہاں آئی تھی۔

''مم... میں بہت مشکل میں ہوں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے لیکن میں اکیلے میں آپ کو اپنا مسئلہ بتاؤں گی۔'' لڑکی نے جواب دیا اور اپنی نقاب سے جھانکتی بڑی بڑی آنکھوں میں امید لیے شہریار کی طرف دیکھنے لگی۔ شہریار نے دیکھا کہ عبدالمنان اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شہریار نے اپنے سر کی جنبش سے اشارہ کیا جسے سمجھتے ہوئے عبدالمنان نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مشابرم خان اور ماسٹر آفتاب نے بھی اس کی پیروی کی اور سب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی لڑکی نے جھٹ کمرے کا دروازہ برابر کیا اور شہریار کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''تشریف رکھیں۔'' شہریار نے اس سے کہا تو وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب وہ قدرے مطمئن لگ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر سے چادر کا نقاب ہٹا دیا تھا۔ نقاب کے پیچھے سے نمودار ہونے والا اس کا بھولا بھالا شفاف چہرہ چند پل کے لیے اے سی شہریار عادل کو مبہوت کر گیا۔ وہ اس چہرے کو اس سے قبل چودھری افتخار کی حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس وقت اس نے اسے صرف ایک نظر ہی دیکھا تھا لیکن پھر بھی اس کی یادداشت میں وہ چہرہ محفوظ تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس چہرے میں کشش محسوس کی تھی اور آج بھی وہ چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ میل ملاقات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس نے تعلیم بھی زیادہ تر مخلوط تعلیمی اداروں میں حاصل کی تھی جہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور طرح دار لڑکی نظر آتی تھی۔ شہریار کبھی کسی چہرے کو دیکھ کر یوں ساکت نہیں ہوا تھا لیکن اس کم عمر اور سادہ سی لڑکی کے حسن میں کچھ الگ سی بات تھی جس نے شہریار کی نظر کو باندھ لیا تھا۔ لڑکی اس کو خود پر یوں نظریں جمائے دیکھ کر ذرا سا کسمسائی تو شہریار کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔

''جی فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ لیکن پلیز پہلے آپ مجھے اپنا نام بتا دیں۔'' وہ فوراً ہی اپنے فرض کی طرف پلٹ آیا۔

''میرا نام ماہ بانو ہے اور مجھے چودھری افتخار عالم شاہ کے چنگل سے بچنے کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔'' لڑکی کی بات سن کر شہریار بری طرح چونکا۔ ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کر سکا تھا کہ دروازہ زور سے کھلا اور ماسٹر آفتاب تیزی سے اندر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

''چودھری افتخار کی جیپ اسی طرف آ رہی ہے۔ یقیناً مسجد سے ہونے والے اعلان کی اطلاع ان تک پہنچ گئی ہے اور اب وہ آپ سے ملنے یہاں آ رہے ہیں۔'' ماسٹر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع نے کسی خون آشام بلا کی طرح ماہ بانو کے چہرے کا سارا خون چوس کر پل میں اسے زرد کر ڈالا۔ وہ جس سے بچنے کے لیے یہاں آئی تھی وہ خود یہاں آ رہا تھا۔ چند کرسیوں کے سوا ہر طرح کے فرنیچر سے عاری اس خالی کمرے میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اوپر دیوار میں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا لیکن اس میں بھی سلاخیں موجود تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی تو چودھری سے سامنا لازمی تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اب کہاں جائے؟ خود شہریار بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس لڑکی ماہ بانو کی یہاں آمد کا مقصد سن چکا تھا۔ پوری بات تو اس کے علم میں نہیں آئی تھی لیکن یہ طے تھا کہ اسے چودھری سے کوئی شدید قسم کا خطرہ درپیش ہے اور اس صورتِ حال میں چودھری افتخار کا ماہ بانو کو یہاں دیکھنا اور بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اسے یہاں دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ وہ اس کے خلاف مدد مانگنے شہریار کے پاس آئی ہے۔ یعنی ماہ بانو اس وقت پوری طرح خطرے میں گھری ہوئی تھی لیکن شہریار بھی کیا کر سکتا تھا؟ نہ تو ماہ بانو کو چھپانے کی کوئی صورت تھی اور نہ ہی چودھری افتخار کو اندر آنے سے روکا جا سکتا تھا۔

جاری ہے





# کھیل

احمد صغیر صدیقی

رشتے نازک ... مگر دیر پا ہوتے ہیں ... کبھی کبھی رشتوں کے کچے دھاگے ایسا نظارہ دکھاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کچھ ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی الجھی کہانی۔

**ایک انوکھے کھیل کے آغاز اور دلچسپ انجام کی پراثر کتھا**

...کے آسمانوں میں چلتا ہوا سرخ نارنجی سورج اب ...اُفق پر پہنچ کر جیسے ٹھہر گیا تھا۔ سہ پہر تقریباً ختم ہو چکی ...سائے لمبے ہو رہے تھے۔ عمارتوں پر ایک ہلکا سا سرمئی ...لگا تھا۔ مونٹی گو کی خلیج پر بنے پرتعیش ہوٹل ڈورینڈو ...ہوئی سفید دیواریں بھی سرمئی غبار میں دھندلا رہی ...ایسے خوب صورت منظر والے ماحول کا حسن البتہ اس ...طرح مسخ ہو گیا جب جارج فرنہام کا جسم، وحشیانہ ...ہاتھ پیر چلاتا ہوا، پام کے اونچے درختوں کو چیرتا نیچے ...زمین پر گرا تھا۔

...منٹ بعد، اس گیارہویں فلور پر واقع سوئٹ میں جس ...فرنہام نے نیچے گرنے کا عمل شروع کیا تھا اس کی بیوہ ...پر خاموش بیٹھی غم و اندوہ کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ...کے مقابل، ہوٹل ڈورینڈو کا اسسٹنٹ منیجر مسٹر رٹبل ایک کرسی کی نگر پر کسی متوحش پرندے کی طرح بیٹھا تھا۔ وہ ایک دبلے پتلے بدن والا گنجا ہوتا ہوا آدمی تھا۔ وہ بہت ہمدرد نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ وہ پچھلے پندرہ منٹ سے جب وہ مسز فرنہام کی بیوہ کے پاس آیا تھا، اندر ہی اندر بے حد بے چین تھا۔

رٹبل نے اپنا سر ہلایا۔ ''ہولناک۔'' اس نے مسز جارج کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک بے حد ہولناک حادثہ تھا۔''

مسز جارج نے اپنا سر اٹھا کر غم زدہ نظروں سے اسسٹنٹ منیجر کی سمت دیکھا اور پہلے کی طرح سر جھکا لیا۔

ایک حادثہ... اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے شوہر جارج کی موت کو ایک حادثہ سمجھا جائے گا۔ ٹیرس پر اس لمحے میں اسے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ اب پولیس آئے گی۔ عدالت لگے گی۔ مقدمہ چلے گا مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ اب پچھلے پندرہ منٹ

سے مسٹر رٹبل اس واقعے کو بار بار ایک حادثہ قرار دے رہا تھا۔
اس سے پہلے بھی جب وہ لفٹ کے ذریعے جس قدر عجلت سے نیچے پہنچ سکتی تھی، پہنچی تھی تو وہاں بھی اس نے موجود لوگوں کو کسی حادثے کے بارے میں ہی بولتے سنا تھا۔ نہایت دل دوز... خوف ناک حادثہ... بے چاری... اس کے دو بچے بھی ہیں۔

تو کیا کسی نے بھی وہ کچھ نہیں دیکھا تھا جو کچھ ٹیرس پر ہوا تھا؟

پرسیلا فرنہام خاصے گداز جسم کی نرم سی عورت تھی۔ عمر کے باوجود اس کے اندر ابھی لڑکیوں جیسی کشش موجود تھی۔ اس نے خود کو کبھی بہت مضبوط عورت نہیں سمجھا تھا مگر ان پندرہ منٹ میں اس پر پہلی بار منکشف ہوا تھا کہ وہ اندر سے کتنی مضبوط ہے۔ بے شک اس وقت وہ بہ ظاہر ایک بے حد غم زدہ اور دکھی عورت کی طرح نظر آرہی تھی تاہم اس کے اندر کوئی ہلچل نہ تھی۔

جارج کے لیے اس کے دل میں اچھے خیالات کب کے ختم ہو چکے تھے۔ جب اس نے ٹیرس سے نیچے دیکھا تھا اور اسے جارج کی لاش نیچے فرش پر پڑی نظر آئی تھی تو اس کے دل میں کہیں ایک ہلکا سا پشیمانی کا جذبہ ابھرا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کی سوچوں کو منقطع کر دیا۔ رٹبل عجلت سے اٹھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا، اپنا نام بتایا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور پرسیلا سے مخاطب ہوا۔ ''کانسٹیبل ایڈمنڈ کا فون ہے۔ وہ کہہ رہا ہے ایک سی آئی ڈی آفیسر لابی میں آچکا ہے۔ وہ تم سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔ تم کہو تو اسے یہاں بلالوں۔'' رٹبل مسکرایا۔ ''یہ معمول کی کارروائی ہے بس۔ تم اس جزیرے پر باہر سے آئی ہو۔ کانسٹیبل نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی آفیسر آنے والا ہے۔'' رک کر اس نے پرسیلا کو دیکھا اور شاید اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر ابھرا تھا کہ اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں کوئی ضروری نہیں اگر تم نہیں چاہتیں ابھی تو...''

''بلالو اسے۔'' پرسیلا نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

رٹبل نے فون پر اس کی بات دہرا دی۔ ''مگر صرف پانچ منٹ کے لیے؟'' اس نے پرسیلا کی سمت دیکھا۔

پرسیلا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پانچ منٹ کافی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اور کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔''

''ہاں، میں چاہتی ہوں تم ذرا بچوں کو دیکھ لو۔''

اسسٹنٹ منیجر نے نکلنے کا موقع پا کر سکون کا سانس لیا اور بیڈ روم کی طرف چل دیا۔

بچے... اس وقت اسے سب سے زیادہ انہی کی فکر تھی۔ اس کے بغیر بچوں کا کیا بنے گا؟ اس نے مارک کا تصور کیا جس کے بال سیاہ اور گھنگریالے تھے۔ وہ ابھی نو سال کا تھا مگر اس کی اٹھان بتا رہی تھی کہ جوان ہو کر وہ ایک شان دار نظر آئے گا۔ اور ایمی... وہ خود اس سے بہت مشابہ تھی۔ اسی کی طرح گداز جسم اور پُرکشش بھی۔ بچوں سے جدائی کا تصور بھی اس کے لیے ہولناک تھا۔ اس خیال کے ساتھ اس کے اندر جو مضبوطی ابھری تھی یکدم کمزور سی پڑ گئی۔

پانچ منٹ... اس کے پاس صرف پانچ منٹ تھے جن میں وہ اپنے دفاع کے لیے کچھ کر سکتی تھی... مگر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ گفتگو محض رسمی خانہ پُری جیسی ہو۔ حادثات میں بھی تفتیش تو ہوتی ہی تھی۔ اس صورت میں کسی قسم کی تیاری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ سی آئی ڈی آفیسر گہرائی میں چلا جاتا۔ ایسے میں اگر سچائی کی کوئی ایک ہلکی سی جھلک بھی دیکھتا تو اس کی ساری تفتیش ہی دوسرا رخ اختیار کر سکتی تھی۔

پھر یہ حادثہ... حادثہ نہ رہتا۔ یہ ایک قتل کا کیس بھی بن سکتا تھا۔

قتل...!

وہ اس لفظ کو سوچ کر کپکپا گئی مگر پھر اسے اور کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔ بے شک جارج کی موت کو قانونی اصطلاح میں ''طے شدہ'' نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس معاملے میں یقیناً پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا پھر بھی... دس بارہ منٹ ایسے ضرور تھے جو اس کے عقب میں موجود تھے۔ اسے MAN-SLAUGHTER (غلطی سے قتل کرنا) کہتے تھے۔ اس کی خانہ بندی تھی۔ مگر سب کی تشریحات کے ساتھ سزائیں بہرحال موجود تھیں۔ ضرورت تھی کہ اس کی درستی ثابت کی جاتی۔ مگر قانوناً یہ بھی ممکن نہ تھا۔ ایک طرح سے جو کچھ ہوا تھا یہ عین انصاف تھا۔ بالکل درست کیونکہ یہ خود جارج کی اپنی غلطی سے ہوا تھا۔ اپنی موت کو خود اسی نے آواز دی تھی۔

رٹبل کی واپسی نے اس کی سوچوں کو منقطع کر دیا۔ اس نے بتایا ''بچے ٹھیک ہیں۔ اس نے پہلے ہی یہاں ہوٹل کی ایک ہاؤس کیپر کو ان کے پاس روانہ کر دیا تھا۔

''انہیں صرف تمہاری فکر ہے۔'' رٹبل نے مزید کہا۔ ''میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ بس تھوڑی دیر میں تمہارے پاس آجائیں گی۔''

پرسیلا نے کہا۔ ''ہاں، وہ مجھ سے بہت قریب ہیں۔''



رٹبل نے پھر اپنی کرسی سنبھال لی۔

ایک بار پھر پرسیلا اپنے خیالات میں کھو گئی۔ اسے قتل کے الزام سے خود کو کسی طور بچانا تھا۔

پولیس والا کیا پوچھے گا؟ یقیناً وہ سب سے پہلے یہ جاننا چاہے گا کہ قتل کا مقصد کیا ہو سکتا ہے... دولت؟ نہیں اس معاملے میں یہ خیال دور کا ہے۔ تو پھر حسد؟ یہ بھی فضول بات تھی۔ نفرت، ہاں اس بات میں کچھ وزن تھا۔ مگر یہ تو اکثر خاندانوں میں پائی جانے والی چیز تھی۔

اور پھر فرنہام گھرانہ اس وقت ایک بالکل اجنبی ملک میں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ساری تفتیش ان خطوط پر ہوتی کہ جمیکا میں ان کے درمیان کس طرح کے تعلقات تھے؟

اس کی امیدیں ایک دم سے ٹوٹ گئیں۔ یہاں ان کے درمیان ایک بار خاصی تکرار ہوئی تھی۔ کافی تلخ تکرار۔ اور اسے یہ یاد تھا کہ وہ غصے میں جارج کے پاس سے پلٹی تھی اور اس نے بچوں کو وہاں موجود پایا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف مترشح تھا... اس نے جارج کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بے حد مشتعل تھا اور اس نے چیخنا بند نہیں کیا تھا۔ پھر وہ پیر پٹختا ہوا ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ اور بچے دوڑ کر اس سے آلپٹے تھے۔

اسے دس پندرہ منٹ درکار تھے تاکہ وہ جارج کو اس حرکت سے روک سکے جو وہ کرنے والا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک ''کھیل'' کی تجویز دی تھی۔ بچے کھیل کے بارے میں سن کر ایک دم سے خوش ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر چھایا ہوا خوف دور ہو گیا تھا اور وہ بیڈ روم میں جا گھسے تھے تاکہ کھیل کا آغاز کیا جا سکے۔

کتنی عجیب بات تھی۔ اس نے سوچا۔ اگر جارج نے بھی اس کھیل میں ان کے ساتھ شریک ہونا پسند کر لیا ہوتا تو حالات کس قدر مختلف ہو سکتے تھے۔ اگر جارج نے محبت اور شراکت میں حصہ لے لیا ہوتا تو وہ ...... گیارہ منزل نیچے ہوٹل کے صحن کے فرش پر اس طرح کبھی نہ گرتا۔

وہ حالات جو بالآخر جارج کو ٹیرس والے منظر تک لے گئے تھے، کبھی پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔ اس وقت جب اس میں تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ اس زمانے میں جب وہ اس سے ملا کرتا تھا جارج بہت خوش مزاج اور ہمدرد آدمی تھا۔ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تو اس کے باپ نے جو کچھ ترکے میں چھوڑا تھا اس کا انتظام جارج نے سنبھال لیا تھا۔ بس اس کے بعد سے جارج کے اندر تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ جارج مکمل طور سے ایک کاروباری آدمی بن گیا تھا۔ اس کے پاس گھر کے

## عطاءالحق قاسمی کی تصنیف ''وصیت نامے'' سے انتخاب

## اقتدار حسین لوٹا کا وصیت نامہ

تم جانتے ہو کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم و مغفور کے علاوہ میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی پی پی پی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا ممبر رہا ہوں۔ اس دور میں میرا خیال تھا کہ بھٹو سے بڑا لیڈر ایشیا میں کوئی نہیں ہے مگر اس کے خلاف تحریک چلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا برا آدمی تھا چنانچہ جنرل ضیاء الحق مرحوم و مغفور نے حکومت سنبھالی تو میں نے ان کے ہاتھ مضبوط کیے۔ میں گیارہ سال ان کے ساتھ رہا۔ جہاز کے سانحے میں ان کا انتقال ہوا تو میں پی پی پی کے ٹکٹ پر ایک بار پھر اسمبلی کا رکن منتخب ہوا کیونکہ میرا خیال تھا کہ باپ کے اعمال کا ذمے دار اس کی بیٹی کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے بے نظیر کے ہاتھ بھی مضبوط کیے لیکن افسوس وہ قوم کی توقعات پر پورا نہ اتریں چنانچہ میں نے میاں نواز شریف کی قیادت میں ملک و قوم کی خدمات کا بیڑا اٹھایا مگر انہوں نے بھی مایوس کیا لیکن میں ان لوگوں میں سے ہوں جو قومی معاملات پر جلد بازی کے قائل نہیں ہیں چنانچہ ان دونوں لیڈروں سے ایک دفعہ مایوس ہونے کے بعد بھی میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا چنانچہ ان کے دوسرے ادوار میں بھی ان کا ساتھ دیا۔ ''چاروں صوبوں کی زنجیر بے نظیر بے نظیر'' اور ''قدم بڑھاؤ نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' والے بینر میں نے ہر اس راستے پر آویزاں کیے جدھر سے ان رہنماؤں کا گزر ہوتا تھا مگر میرے بیٹے! کس سے گلہ کریں کہ ان دونوں رہنماؤں نے میرے سمیت تمام قوم کو ایک دفعہ پھر مایوس کیا وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے قوم کی ڈوبتی ناؤ کو کنارے پر لگایا ورنہ ہم تو برباد ہو گئے تھے۔

لیے وقت نہیں رہا تھا... اس نے تحائف لانے بند کر دیے تھے۔ بچوں کے لیے بھی کچھ نہیں لاتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اپنے گھر میں دلچسپی لے اور اس کھیل میں شرکت کرے جو انہوں نے دریافت کیا تھا۔ ہاں ایک بار بے دلی کے ساتھ جارج نے حصہ لینے کی کوشش کی تھی۔

''اندازہ لگاؤ... کیا؟'' اس نے جارج سے سوال کیا تھا اور پھر جارج نے کھیل کے اصولوں کے مطابق پوچھا تھا۔

''کیا؟''

اس نے کہا تھا۔ ''اندازہ لگاؤ آج میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے؟''

اس کے بعد اصول کے مطابق جارج کو کوئی معصومانہ اندازہ لگانا تھا مثلاً... ''تم نے لاکھوں روپے کا سونا خریدا ہے۔'' یا ''تم نے ٹوپی میں سے خرگوش نکالا ہے۔'' اسی طرح

کے اور کئی اندازے لگانے تھے حتیٰ کہ وہ صحیح صورتِ حال تک پہنچ جاتا یا پھر وہ دست بردار ہو کر پرسیلا سے کہتا۔ ''اچھا... میں ہارا اب تم ہی بتا دو۔''

مگر ہوا یہ تھا کہ جارج نے درمیان ہی میں کھیل سے منہ موڑ لیا تھا اور شانے اچکاتے ہوئے بولا تھا۔ ''چھوڑو یہ احمقانہ باتیں۔''

بے شک یہ ایک احمقانہ کھیل تھا مگر اس میں لطف تھا۔ اس میں محبت، خجالت اور تجسس تھا اور رومان بھی۔

پھر پرسیلا اور جارج میں دوریاں پیدا ہونے لگی تھیں۔ ان کی شادی جو باقی رہ گئی تھی اس کی وجہ صرف بچے تھے۔ مارک اور ایمی دونوں نے زندگی کا جوش و خروش اسی سے لیا تھا۔ دونوں بچوں کو اس کا یہ ایجاد کردہ کھیل بہت پسند تھا۔ وہ ایک معنی میں اپنی ماں کے بچے تھے۔

اور پھر اس کے ذہن میں ایک بات اور ابھری تھی... شاید بچوں میں مصروف ہو کر اس نے شوہر پر سے توجہ ہٹالی تھی۔ پھر بھی اس نے خود کو الزام نہیں دیا... قصور جارج کا ہی تھا۔ اس نے سوچا۔ اسے گھر سے اس قدر لاتعلق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

پرسیلا زیادہ نہ سوچ سکی کیونکہ اس کے سوئٹ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ رٹبل جو خود بھی خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، جلدی سے اٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر کانسٹیبل ایڈمنڈ کے ساتھ ایک اور آدمی کھڑا تھا جو خاصا دراز قامت تھا۔

پولیس وردی میں ملبوس کانسٹیبل نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔ پھر وہ مڑا۔ دروازے سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے راہ داری میں چل دیا۔

سی آئی ڈی کے سارجنٹ وارنگ کی آنکھیں نیلی اور نکیلی تھیں۔ اس کے سر کے بال ہلکے ہو رہے تھے۔ وہ اس علاقے میں سراغ رساں آفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔

''مسز فرنہام... معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے برطانوی لہجے میں کہا۔ ''تاہم اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تو میں چند باتیں پوچھنا چاہوں گا۔''

''پوچھو۔'' پرسیلا نے کہا۔

سارجنٹ، رٹبل کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی جس میں ایک پنسل بھی رکھی تھی۔ اس نے نوٹ بک کے چند صفحے الٹے پلٹے... اور پھر پرسیلا سے مخاطب ہوا۔

''یہ بتائیں اس واقعے سے ذرا پہلے کیا کچھ ہوا تھا؟''

''مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ میں یہاں ایک صوفے پر دراز تھی۔ کچھ غنودگی میں تھی۔ معلوم نہیں میں کسی چیخ کو سن کر جاگی تھی یا بچوں کی وجہ سے۔ مجھے بس یہ یاد ہے کہ بچے ہلا رہے تھے پھر میں اٹھ گئی۔ ہم سب ساتھ ہی ٹیرس پر گئے۔ میں نے نیچے دیکھا تھا...'' اس کا لہجہ ڈگمگایا۔ ''پھر مجھے نیچے شوہر نظر آیا تھا۔''

سارجنٹ وارنگ اٹھا اور ٹیرس کی طرف گیا۔ اس نے چند لمحوں تک دیکھا پھر واپس کرسی پر آ گیا۔ ''کیا تمہارا شوہر کوئی غیر معمولی طور پر ڈپریشن کا شکار تھا؟ میرا مطلب ہے کیا کسی طرح اس نے تم پر ظاہر کیا تھا کہ وہ خودکشی کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''خودکشی؟ نہیں۔'' پرسیلا نے جلدی سے کہا اور پھر اسے افسوس ہوا کہ اس نے جواب میں اتنی جلدی کیوں کی۔ یہ ایک اچھی بات ہوتی... مگر اب تو وہ موقع کھو چکی تھی۔

وارنگ نے پوچھا۔ ''اس کی طبیعت ٹھیک تھی؟''

پرسیلا نے الجھن سے سارجنٹ کو دیکھا۔

''میرا مطلب ہے اس کی صحت ٹھیک تھی؟'' سارجنٹ نے وضاحت کی۔ ''اسے چکر وغیرہ کی شکایت تو نہ تھی؟''

''ہاں۔'' پرسیلا نے کہا۔ ''ہاں تم نے کہا تو خیال آیا۔ ہم لوگوں نے یہ تفریحی سفر اسی لیے اختیار کیا تھا۔ جارج بہت زیادہ کام کی وجہ سے آرام چاہتا تھا۔ اسے سر چکرانے کی شکایت ہو گئی تھی۔ پھر میں نے کہا تھا کہ اسے آرام کی ضرورت ہے اور ہم نے جمیکا کا پروگرام بنایا تھا۔''

اگر حالات گمبھیر ہوں تو آدمی کس مزے سے جھوٹ بول سکتا ہے یہ بات اس پر اس وقت عیاں ہو رہی تھی... یہ سب باتیں جھوٹ تھیں مگر اس نے اس طرح بتایا تھا جیسے یہ سب کچھ سچ تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تم کیسا محسوس کر رہی ہو۔'' ہمدردانہ لہجے میں پولیس سارجنٹ نے کہا۔ ''لیکن اگر تم میرے ساتھ کچھ تعاون کرو تو یہ معاملہ اسی وقت صاف ہو سکتا ہے۔ دراصل حادثات کی صورت میں ہونے والی اموات کی کچھ نہ کچھ تفتیش ضرور کی جاتی ہے۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے کہ ٹیرس پر جو ریلنگ ہے اس کی اونچائی کوئی تین فٹ ہے۔ اس قدر بلند ریلنگ سے کوئی آدمی آسانی سے نہیں گر سکتا۔''

پرسیلا کو اپنے پیٹ میں کوئی گولا سا بنتا محسوس ہوا۔

''البتہ چکر آنے کے باعث ایسا ناممکن بھی نہیں۔ مسز فرنہام! یہاں کے ایک ویٹر نے...'' اس نے اپنی نوٹ بک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بتایا ہے کہ وہ صحن میں ایک ٹیبل صاف



کر رہا تھا کہ اس کی نظریں اوپر اٹھی تھیں... یا شاید اس نے چیخ سنی تھی... اس نے تمہارے شوہر کو ریلنگ پر سے گرتے دیکھا تھا... مگر ویٹر کا دعویٰ ہے کہ وہ... سمجھتا ہے کہ وہ حادثاتی طور سے نہیں گرا تھا۔''

پرسیلا نروس ہونے لگی۔ یعنی کسی نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ ''ظاہر ہے کہ ہم نے ویٹر سے اس تاثر کا سبب پوچھا تھا لیکن اس نے تمہارے شوہر کے آس پاس کسی اور کو نہیں دیکھا تھا۔''

''تو کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ...''

''نہیں۔'' بات کاٹتے ہوئے آفیسر مسکرایا۔

''تاہم ہمیں تفتیش تو کرنی ہوتی ہے۔ دراصل یہ ویٹر ٹیرس کے بالکل نیچے سیدھ میں تھا اور اوپر دیکھ رہا تھا۔ اسے ٹیرس کا منظر صاف نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اس کا دعویٰ صرف اس وجہ سے تھا کہ مسٹر فرنہام گرتے وقت اس طرح ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے وہ خود کو بچانے کے لیے کچھ پکڑنا چاہتا ہو...''

پرسیلا کو ایک بار پھر امید پیدا ہو گئی۔

''...اور تمہارے اس بیان کے بعد کہ اس پر کبھی کبھی سر درد کا دورہ پڑتا تھا... یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ وہ ریلنگ سے نیچے کس طرح گرا ہو گا۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔ آفیسر نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر کانسٹیبل ایڈمنڈ کھڑا تھا۔ اس نے نیچی آواز میں سارجنٹ سے کچھ کہا۔ وارنگ نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔ کچھ کہنے سے پہلے اس نے پرسیلا کو غور سے دیکھا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ابھی آیا... ایک گواہ اور ظاہر ہوا ہے۔''

پرسیلا کا اعتماد پھر ڈگمگانے لگا۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دماغ میں بہت سے سوالات کلبلانے لگے تھے۔

ان کے جوابات وارنگ کے کمرے میں داخلے سے ملے۔ اندر آتے ہی اس نے پرسیلا پر اپنی نیلی آنکھیں مرکوز کر دیں۔ وہ ایک دم سے بہت وزنی سا ہو گیا تھا۔

''مسز فرنہام!'' اس نے کہا۔ ''تمہارے شوہر کی موت سے قبل اس کے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا... یا تکرار ہوئی تھی؟''

''ہاں۔'' کمزور آواز میں پرسیلا نے کہا۔

''تمہارے ساتھ والے سوئٹ میں رائل ہارٹ خاندان ٹھہرا ہوا ہے۔ انہوں نے تم دونوں کو لڑتے سنا تھا۔ تمہاری آواز اس سے بھی اونچی تھی اور... ان کا کہنا ہے کہ تمہارے شوہر سے مرنے کے بارے میں اس کے منہ سے کوئی بات سنی تھی۔''

''وہ... وہ ایک فضول سی تکرار تھی...''

سارجنٹ نے اسے گھورا۔

''فضول سے میرا مطلب ہے کہ وہ کہہ رہا تھا ہم اب یہ سفر ختم کر کے واپس چل دیں، میں اور بچے ابھی رکنا چاہتے تھے۔ پروگرام کے مطابق یہاں ہم ابھی دو ہفتے رک سکتے تھے۔ پھر بحث بڑھ گئی تھی اور ہمارے درمیان گرماگرمی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے کہا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد ہی میں جو چاہے کر سکتی ہوں اور چونکہ وہ ابھی زندہ ہے لہٰذا ہم سب کو اس کے ساتھ فوراً واپس چلنا ہو گا۔'' رک کر وہ زبردستی مسکرائی۔ ''اور مرنے جینے والی بات تو ہمیشہ اس کے منہ پر رہتی تھی۔'' اس نے وارنگ کی طرف دیکھا۔

تھوڑے توقف کے بعد آفیسر نے کہا۔ ''تمہارے بیان سے دوسروں کے بیان کی تصدیق ہو رہی ہے۔'' اس نے اپنی نوٹ بک دیکھی۔

''ایک بات اور ہے مسز فرنہام!'' آفیسر نے کہا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا تم صوفے پر لیٹی ہوئی تھیں۔''

پرسیلا نے سر ہلایا۔

''اور تم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہیں تمہارے بچوں نے ہلا کر جگایا تھا جب تم نے شوہر کی چیخ سنی تھی۔''

پرسیلا نے پھر سر ہلایا۔

''اگر تم محسوس نہ کرو تو میں تمہارے بچوں کو بلا کر پوچھ لوں، تم اس وقت کہاں تھیں جب انہوں نے تمہیں مطلع کیا تھا؟ یہ صرف ایک رسمی کارروائی ہے، اس سے مجھے رپورٹ لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔'' پرسیلا نے آہستہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

وارنگ نے اسسٹنٹ منیجر کو دیکھا۔ وہ اٹھا اور ذرا دیر بعد ایمی اور مارک کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

پرسیلا نے اپنے بچوں کی سمت نہیں دیکھا۔

پھر جب وہ نزدیک ہوئے تو اس نے سر اٹھایا اور انہیں دیکھ کر آہستہ سے مسکرائی۔

وارنگ نے خود کو تھوڑا سا جھکا لیا تاکہ بچوں کو سامنے سے دیکھ سکے۔

''تمہیں معلوم ہوا ہے آج کیا ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

دونوں بچوں نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں... جواب دو گے؟''

دونوں نے اپنی ماں کی سمت دیکھا۔

''جو کچھ پوچھیں بتا دینا۔'' ماں نے کہا۔ اس نے دیکھا

کہ آفیسر اسے گھور رہا ہے۔

پھر وہ بچوں کی سمت متوجہ ہوا۔

''تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے فادر کی چیخ سنی تھی... یاد ہے تمہیں؟''

بچوں نے صرف اسے گھور کر دیکھا اور چپ رہے۔

وارنگ نے کہا۔ ''تم اس کی چیخ سن کر چلائے تھے... تم نے اپنی مدر کو جھنجھوڑا تھا، کیوں؟''

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس وقت تمہاری مدر کہاں تھیں؟''

''وہ اسی جگہ تھیں جہاں اس وقت ہیں۔'' مارک نے جواب دیا۔

''واقعی؟''

''ہاں۔'' ایمی نے کہا۔ ''ہم لوگ ''کھیل'' کھیل رہے تھے۔''

''کھیل؟''

پرسیلا نے وضاحت کرنی چاہی۔ ''یہ ہمارا اپنا ایجاد کردہ ہے...''

سارجنٹ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

پرسیلا اسی لمحے سے خائف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سچی بات تک صرف ''کھیل'' ہی کے ذریعے پہنچا جا سکتا تھا۔

''یہ کھیل کیا تھا؟'' وارنگ نے پوچھا۔

مارک نے جواب دیا۔ ''یہ کھیل ہم ممی کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ بہت مزے کا ہے۔ ہم سرپرائز بناتے ہیں۔ ہم کوئی چیز خریدتے ہیں... یا کچھ کرتے ہیں... پھر ہم پوچھتے ہیں... بتاؤ ہم نے کیا کیا ہے؟''

''اچھا...'' سارجنٹ نے دلچسپی سے کہا۔

''ہاں۔'' اس بار ایمی بولی۔ ''ہم پوچھتے ہیں بتاؤ ہم نے تمہارے لیے کیا کیا ہے... پھر ہم اندازہ لگاتے ہیں۔''

''اچھا۔''

''ہاں... پھر جب ممی اور ڈیڈی...'' تو وہ چپ ہو گیا۔ ذرا توقف سے اس نے کہا۔ ''جب ان میں لڑائی ہوئی اور ممی نے ہم سے کہا چلو ہم اپنا کھیل کھیلتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر چپ ہوا۔ اس نے اپنی بہن کی سمت دیکھا اور بولا۔ ''ہم وہاں کمرے میں گئے تاکہ وہاں ممی کے لیے کوئی سرپرائز طے کر سکیں۔ ممی اسی جگہ رکی رہی تھیں۔''

''پھر جب تم نے اپنے فادر کی چیخ سنی تو تم سیدھے اپنی مدر کے پاس آئے تھے اور وہ تمہیں اسی صوفے پر بیٹھی ملی تھیں؟''

''ہاں۔'' ایمی نے کہا۔ ''وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ ہم انہیں اپنا سرپرائز بتانے آئے تھے۔ کیا ہم بتائیں وہ سرپرائز کیا تھا؟''

''نہیں۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''اسے راز ہی رہنے دو۔ میں بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ تمہیں اپنی ممی کہاں ملی تھیں۔''

وہ پرسیلا سے مخاطب ہوا۔ ''بات صاف ہو گئی ہے۔ اب پوسٹ مارٹم کے بعد ایک کارروائی اور ہو گی مگر یہ رسمی ہے۔''

''کیا بچوں کو پھر بلایا جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید نہیں۔''

وارنگ نے دونوں بچوں سے ہاتھ ملایا۔

پھر اس نے پرسیلا سے کہا۔ ''میں معذرت خواہ ہوں کہ ان حالات میں، میں نے تمہارا بہت وقت لیا مگر یہ تو میری مجبوری تھی۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' پرسیلا نے کہا۔ ''تم نے میرے بچوں کے ساتھ بہت اچھا طریقہ اختیار کیا۔''

''میں خود بھی ایک باپ ہوں۔'' سارجنٹ نے کہا۔

پھر وہ اٹھا اس نے اپنے ساتھ رٹیل کو بھی آنے کا اشارہ کیا۔ اپنے پیچھے انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔

ان کے جانے کے بعد پرسیلا نے اپنے بچوں کی سمت دیکھا اور مسکرائی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ معاملہ اس طرح ختم ہو جائے گا۔

بچے اس کے پاس خاموشی سے کھڑے تھے۔ پھر ایمی نے خاموشی توڑی۔

''ممی!'' اس نے کہا۔ ''تم نے ہمیں اپنا سرپرائز نہیں بتایا۔''

مارک نے مزید اضافہ کیا۔ ''تم نے ہمیں نہیں بتایا کہ تم نے کیا کیا تھا... تم بھول گئی تھیں۔''

''نہیں... میں بھولی نہیں۔'' پرسیلا نے غمگین سی آواز میں کہا۔

وہ انہیں جلد بتانے والی تھی کہ اس نے کیا کیا تھا مگر اس وقت جب انہیں مل بیٹھنے کا وقت ملتا تبھی وہ انہیں بتا سکتی تھی کہ اس روز یہ کھیل کس طرح غلط انداز سے کھیلا گیا تھا۔

وہ بھولی نہیں تھی۔ اور وہ تو اس لمحے کو کبھی بھی نہیں بھول سکتی تھی جب مارک اور ایمی اسے جھنجوڑ کر چیخے تھے...

''بتاؤ...؟''

اور پھر چکرائے ہوئے انداز سے اس نے پوچھا تھا۔

''کیا؟'' پھر بچوں نے چمکتے چہروں اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے کھینچا تھا اور اسے لے کر ٹیرس پر گئے تھے... تو پھر اس سے انہوں نے ریلنگ سے نیچے دیکھنے کے لیے کہا تھا اور ایک ساتھ گنگنائے تھے... ''تو دیکھو ہم نے آج تمہارے لیے کیا کیا ہے!''



**ایک مجرم کی آپ بیتی جو اپنی مجرمانہ زندگی سے فرار چاہتا تھا**

کبھی کبھی راہ چلتے کوئی ایسی چیز مل جاتی جو بظاہر معمولی سہی لیکن بعد میں نہایت قیمتی ثابت ہوتی۔ ایک ایسے ہی مجرم کی زندگی کے نشیب و فراز اچانک ہی اس کی زندگی میں کوئی داخل ہو جاتا ہے ...مگر وقت نے دھاگے اس کے تمام عزائم کو تلپٹ کر دیتے ہیں

# ہم پیشہ

ثمر عباس

جیک ہال بروا اس وقت وہاں نہیں تھا جہاں اسے ہونا چاہیے تھا، یعنی جیل میں۔ اس کی سادہ سی وجہ تھی، وہ اس وقت لندن سے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا جب پولیس اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے والی تھی۔ جیک ہیروں کا چور تھا اور اس کی وجہ شہرت یہی تھی۔ لندن کے ایک لارڈ کے گھر ہونے والی چوری میں اس کا نام لیا گیا تھا اور اس کے خلاف کچھ ثبوت بھی ملے تھے۔ سب سے اہم ثبوت تو لارڈ کی ہمشیرہ تھی جس کے جیک سے تعلقات تھے اور اسی کی مدد سے جیک نے ہیرے چرائے تھے۔ اس نے خود جیک کا راز فاش کر دیا تھا۔ جیک کی بدقسمتی کہ وہ نہ صرف اس کے اصل نام سے بلکہ اس کی رہائش گاہ سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ اس لیے پولیس سیدھی اس کے گھر کی طرف آئی تھی۔ اگر جیک کا ایک دوست جو پہلے پولیس میں کام کر چکا تھا، اسے بروقت خبردار نہ کرتا تو وہ پکڑا جاتا۔ اس نے سب کچھ چھوڑا اور صرف اپنی جمع پونجی لے کر فرار ہو گیا۔ اگر وہ اور چیزوں کی فکر کرتا تو یقیناً اس وقت حوالات میں پڑا اپنی قسمت کو رو رہا ہوتا۔ اسے معلوم تھا

کہ ایک بار وہ پولیس کے ہاتھ آجاتا تو اس کی باقی عمر جیل میں گزرتی اور کچھ بعید نہیں تھا اسے سزائے موت ہو جاتی۔ 1860ء کا انگلستان مجرموں کے لیے بڑی خوفناک جگہ تھی اور یہاں بعض اوقات صرف معمولی چوری پر سزائے موت دے دی جاتی تھی۔

جیک ہال لندن سے باہر جانے والے اولین بحری جہاز پر سوار ہو گیا اور جب جہاز نے ردبار انگلستان کو عبور کیا تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا، اگرچہ اسے ابھی اطمینان نہیں تھا کیونکہ اگر لندن پولیس کو پتا چل جاتا کہ وہ بحری راستے سے فرار ہوا ہے تو وہ اس کا تعاقب کرتے اور اسے گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ جہاز افریقہ کے اولین جزیرے کینری تک جا رہا تھا۔ یہ زیادہ بڑا بحری جہاز نہیں تھا۔ اس میں مشکل سے دو درجن مسافروں کی گنجائش تھی اور اس میں سفر کرنے والوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ جیک نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا اور اس کا کیبن نچلے عرشے پر تھا۔ یہاں سے سمندر کا بپھرا روپ صاف دکھائی دیتا تھا مگر یہاں جہاز میں تلاطم بھی کم تھا اور اسے زیادہ جھٹکے محسوس نہیں ہوتے تھے۔

ماریانا نامی اس جہاز پر جیک کو اتفاق سے ہی جگہ ملی تھی۔ جہاز بندرگاہ سے نکل چکا تھا اور اس پر بعض ضروری سامان بار کرنے کے لیے ایک بڑی کشتی سامان لے کر جا رہی تھی۔ جیک کا ایک جاننے والا اس کشتی میں موجود تھا اور اس نے جیک سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اسے ماریانا پر جگہ مل سکتی ہے۔ جیک اس وقت لندن سے نکلنے کے لیے کسی ڈونگے میں سفر کرنے کو بھی تیار تھا، وہ فوراً مان گیا اور اس کا دوست اسے ماریانا تک لے آیا۔ اس نے جیک سے کہا تھا کہ اسے جگہ نہ بھی ملی تو وہ اسے واپس لے آئے گا مگر خوش قسمتی سے جہاز پر ایک فرسٹ کلاس کیبن خالی تھا۔ جیک کے پاس ایک سوٹ کیس تھا جس میں اس کے چند جوڑے اور کچھ ضروری سامان تھا۔ جس وقت اسٹیوارڈ اس کا سوٹ کیس اس کے کیبن میں رکھ رہا تھا تو جیک نے برابر والے کیبن سے ایک حسین اور نوجوان خاتون کو نکلتے دیکھا تھا۔ اس کی دلچسپی محسوس کر کے اسٹیوارڈ نے اس کے بارے میں بتایا۔

”یہ مسز برکلے ہے۔ اس کا شوہر مسٹر ریان برکلے ایک جوہری ہے۔“

یہ سن کر جیک کو مایوسی ہوئی تھی کہ خاتون شادی شدہ ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ سفر اچھا گزرے گا۔ فرسٹ کلاس میں کل چھ کیبن تھے۔ ان میں دو ڈبل بیڈ کے تھے اور چار سنگل بیڈ کے۔ جیک کو ڈبل بیڈ والا کیبن ملا تھا اور دوسرے میں مسٹر اور مسز برکلے ٹھہرے ہوئے تھے، وہ گلاسگو سے سوار ہوئے تھے اور ان کا ارادہ جنوبی افریقہ جانے کا تھا جہاں ان دنوں جواہرات کی کانوں میں کام شروع ہو گیا تھا۔ جیک افراتفری میں فرار ہوا تھا اور اسے شروع میں احساس نہیں ہوا تھا مگر اب وہ غم زدہ تھا۔ اسے اپنا بھرا پرا گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا اور اب وہ کبھی اس گھر کو نہیں دیکھ سکتا تھا جسے اس نے بڑے شوق سے بنایا اور سجایا تھا۔ شاید وہ دوبارہ لندن بھی نہ جا سکے۔ شام تک وہ سوگ مناتا رہا پھر اس کی حالتِ ذرا سنبھلی تو وہ کیبن سے باہر آگیا۔ بحری جہاز اس وقت سے کچھ ہی دور تھا۔ جہاز اگلے روز فرانس کا آخری سرا عبور کر کے بحرِ اوقیانوس کی وسعتوں میں قدم رکھتا۔ جیک نے فیصلہ کیا کہ اب وہ واپس انگلینڈ نہیں جائے گا۔ ایک تو وہاں اسے پھر سے آغاز کرنا پڑتا اور پولیس کی تلوار ہمیشہ اس کے سر پر لٹکی رہتی۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائے؟ یہی سوچتا ہوا وہ باہر عرشے پر آگیا۔ اپریل کے آغاز میں بھی لندن میں خاصی سردی تھی مگر یہاں موسم خوش گوار تھا۔ مناسب حد تک خنک ہوا چل رہی تھی اور بیشتر مسافر عرشے پر جمع تھے۔ کپتان بورن بینس نے جیک کا استقبال کیا۔

”مجھے افسوس ہے مسٹر ہال کہ تمہیں جہاز پر جگہ ملنے میں دقت ہوئی۔“

”کوئی بات نہیں... غلطی میری تھی۔ مجھے پہلے سے بکنگ کرا لینی چاہیے تھی۔“ جیک مسکرایا۔ اس نے دیکھا کہ عرشے پر ایک کسی قدر طویل قامت اور متناسب جسم کی لڑکی بھی موجود تھی۔ اس کے سیاہ بال اور آنکھوں کا سیاہ رنگ بتا رہا تھا کہ اس کے جسم میں غیر یورپی خون کی آمیزش ہے۔ کپتان بینس نے اس کی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”یہ مس جون کیڈ برگ ہے... لارڈ کیڈ برگ اس کا رشتے کا چچا ہے۔“

”اوہ... تو کیا یہ اکیلی سفر کر رہی ہے؟“

”ہاں... یہ اکیلی ہی جنوبی افریقہ جا رہی ہے۔“

”کیا اس جہاز کے بیشتر لوگ جنوبی افریقہ جا رہے ہیں؟“ جیک چونکا۔

”ہاں... پہلے ماریانا کو جنوبی افریقہ ہی جانا تھا مگر اب یہ ضروری مرمت کے لیے کینری میں رکے گا اور مسافر



دوسرے جہاز پر جنوبی افریقہ جائیں گے۔“

اچانک مس جون کپتان کی طرف آئی۔ ”معاف کرنا۔“ اس نے کپتان سے کہا۔ ”کیا تم نے میرے کیبن کا تالا ٹھیک کرا دیا ہے؟“

”مس جون! اس وقت میرا نائب اپنے آدمیوں کے ساتھ یہی کام کر رہا ہے۔ جب تم واپس جاؤ گی تو تالا ٹھیک ہو چکا ہوگا۔“

اس نے ایک اچٹتی سی نظر جیک پر ڈالی اور واپس ریلنگ کی طرف چلی گئی۔ ”اس کے کمرے کا تالا خراب ہے، اسے بہت فکر ہے۔“

”ظاہر... سی بات ہے... یہ اکیلی لڑکی ہے، فکر تو ہوگی۔“ جیک نے کہا۔

ایک طرف ایک چھوٹے مگر مضبوط جسم کا شخص بے نیازی سے کھڑا تھا مگر اس کا لومڑی نما چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں جیک کو لگا جیسے وہ بے نیازی کی آڑ میں لوگوں کی سن گن لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد سردی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا اس لیے سب ڈائننگ ہال میں آگئے۔ ویسے بھی رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ جیک نے سوچا کھانے سے پہلے اپنے کمرے کا ایک چکر لگا آئے۔ وہ کمرے میں آیا اور کچھ دیر سستانے کے بعد ڈنر کے لیے تیار ہو کر باہر نکلا۔

اسی وقت لومڑی نما چہرے والا شخص بھی اپنے کیبن سے نکلا تھا۔ وہ جیک کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور دوسری طرف چلا گیا۔ یعنی وہ باہر عرشے کی طرف چلا گیا تھا۔ جیک ڈائننگ ہال میں آیا۔ وہاں اب ایک شخص بہت اچھا پیانو بجا رہا تھا اور وہاں موجود لوگ اس سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس پر مسٹر اور مسز برکلے نے رقص کر کے دکھایا۔ ان کی دیکھا دیکھی چند لوگ اور بھی میدان میں آگئے تھے۔ اچانک جیک اپنی جگہ سے اٹھا اور مس جون کے پاس جا کر بولا۔

”کیا میں تمہارے ساتھ رقص کرنے کا اعزاز حاصل کر سکتا ہوں؟“

وہ ہچکچائی مگر پھر اٹھ گئی۔ جیک نے اس کے سبک خرام بدن کو بازوؤں میں لیا تو اندر سے ایک سنسنی سی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جون شرمانے لگی۔ شاید اس نے جیک کے احساسات کے بارے میں جان لیا تھا۔ ایک راؤنڈ کے بعد وہ ایک ہی میز پر آگئے تھے۔ جیک نے مس جون کو ڈنر کی دعوت دی تو وہ مان گئی۔ اس کا نام سینا تھا۔ اس کی ماں ایک ہندوستانی عورت تھی۔ سینا کے باپ نے جب اس سے شادی


ہر شمارہ خاص شمارہ

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

نغمہ گر

قتیل شفائی کی زندگی کے مخفی گوشے جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں

مائیکل جیکسن

دنیائے موسیقی میں انقلاب برپا کر دینے والے گائیک کی سوانح حیات

کرکٹ کرکٹ

اس ہر دل عزیز کھیل کی تاریخ، قوانین اور ابتدائی دور کے دلچسپ قصے

شجر امید

دل و دماغ میں ہلچل پیدا کر دینے والی سچ بیانی

اس کے علاوہ

آب زحمت، قطبی ریچھ، شکنتلا، دیوانی، اک ذرا سی بھول، قصور کس کا، گندا انڈا، نجات دہندہ، تقدیر اور تماشائی جیسی سچ بیانیاں، معلوماتی قصے، فلمی دنیا کی بھولی بسری داستانیں اور دلچسپ سفرنامہ ”پریوں کا دیس“ اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

شمارہ اگست 2009ء کی ایک جھلک

نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

کی تو اس کے خاندان نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور اس کے انگلینڈ آنے پر پابندی لگوا دی تھی۔

جب سینا کے ماں باپ ہندوستان میں ایک لڑائی میں مارے گئے تو اسے اس کے نچلا لارڈ کیڈبرگ کے پاس بھیج دیا گیا اور اس کی کوششوں سے خاندان والوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ اب وہ اپنے باپ کی جاگیر اور دوسری دولت کی واحد وارث تھی۔ اس کے باپ کی کچھ جاگیر جنوبی افریقہ میں بھی تھی اور وہ اسی کی دیکھ بھال کے لیے وہاں جا رہی تھی۔ جیک نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک امیر زادہ ہے اور فی الحال صرف عیش کر رہا ہے۔ اس نے اپنا اصل نام بتایا تھا اور اس کے پاس ابھی اتنا کچھ تھا کہ وہ خود کو امیر زادہ ظاہر کر سکے۔

اس نے محسوس کیا کہ سینا اسے پسند کر رہی ہے مگر یہ پسند کس حد تک تھی، اس کا اندازہ وہ نہیں کر پایا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ باہر کھلے عرشے پر نکل آئے۔ سینا نے ایک ہلکی سی شال لے رکھی تھی۔ جیک نے سردی کے پیش نظر اسے اپنا کوٹ بھی پیش کر دیا جو اس نے کسی قدر ہچکچا کر لے لیا۔

"کیا تم بھی جنوبی افریقہ جا رہے ہو؟"

"پہلے تو ارادہ نہیں تھا۔" جیک نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مگر اب سوچ رہا ہوں کہ جنوبی افریقا جاؤں۔"

"اچھا، اس تبدیلی کی وجہ؟" سینا نے سادگی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے جنوبی افریقہ کوئی اچھی جگہ ہے تب ہی بہت سارے اچھے لوگ وہاں جا رہے ہیں۔"

"میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ ان دنوں وہاں زمینیں بہت سستی مل رہی ہیں اور وہاں پر سونے اور ہیروں کی کانوں میں سرمایہ کاری بھی کی جا سکتی ہے۔"

"میں دیکھوں گا، اگرچہ مجھے کاروبار سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔"

"نہیں، تم ضرور دیکھو۔" سینا نے اصرار کیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مان گیا۔ "مگر کیا تم میری مدد کرو گی؟"

"جیسی مدد تم چاہو۔" وہ خلوص سے بولی۔ "اگر کہو تو مالی..."

"معاف کرنا... میں خود پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔" جیک نے اس کی بات کاٹی۔ "میں صرف اتنا چاہوں گا کہ تم مجھے وہاں متعارف کرا دو۔"

"میرا مقصد تمہیں بے عزت کرنا نہیں تھا۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں، میں نے برا نہیں منایا... میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ میں تم سے کس قسم کی مدد چاہتا ہوں۔"

جیک کو حیرت تھی کہ وہ اس کی بات کتنی آسانی سے مان گیا تھا اور وہ سچ مچ کاروبار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے ساری عمر ایک ہی کام کیا تھا... یعنی چوری اور وہ بھی ہیروں کی چوری! کیا وہ ایسا سینا کی وجہ سے کر رہا تھا؟ اس نے سوچا، واقعی وہ اس کی وجہ سے ایسا سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی جیک کے کئی عورتوں سے تعلقات رہے تھے۔ مگر ان کے لیے اس نے کبھی ایسے جذبات محسوس نہیں کیے... ان عورتوں کے لیے بھی نہیں جو اس کے عشق میں پاگل ہوگئی تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے شوہروں اور باپوں کی تجوریوں کے نمبر اور چابیاں حاصل کی تھیں۔

اس لڑکی میں کیا بات تھی جس نے اسے مسحور کر لیا تھا۔ اس کی سادگی یا اس کی دل کشی... مگر نہیں، اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں جیک کے پاس آئی تھیں۔ چند گھنٹوں کے اندر وہ اس کے لیے بہت زیادہ محبت محسوس کرنے لگا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب جرائم کی دنیا ترک کر کے شرافت کی زندگی گزارے گا اور ہو سکا تو سینا کے ساتھ گزارے گا۔ رات بھیگنے لگی تو وہ اندر آ گئے۔ اندر آنے کے لیے جیک نے ہی اصرار کیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ نازک سی سینا بیمار نہ پڑ جائے۔ اس کا کیبن جیک کے کیبن کے سامنے والی قطار میں دائیں طرف تھا۔ اسے دروازے پر چھوڑتے ہوئے وہ رکا اور ایک لمحے کو جھجک کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ سینا نے ذرا سی مزاحمت کی پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اچانک آہٹ ہوئی تو وہ جلدی سے الگ ہو گئے۔ لومڑی نما چہرے والا شخص اندر آ رہا تھا۔ ڈنر کے دوران جیک کو اس کا نام معلوم ہوا تھا۔ آرچر نامی یہ شخص آئرلینڈ سے تعلق رکھتا تھا اور ترکِ وطن کر کے جنوبی افریقہ جا رہا تھا۔

"شب بخیر۔" جیک نے آہستہ سے کہا تو سینا سر ہلا کر اندر چلی گئی۔ آرچر مسکرانے لگا۔ اس نے دانت نکوس کر کہا۔

"لگتا ہے میں نے تم لوگوں کو پریشان کر دیا۔"

"نہیں۔" جیک مروتاً..... بولا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے ایک ایسا گھونسا رسید کر دے اور اس کے باہر نکلے دانت اندر چلے جائیں۔ آرچر اپنے کیبن میں جانے لگا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر جانے سے پہلے بولا۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی ہے مسٹر ہال۔"

جیک رک گیا۔ اس نے سوچا کہ اس نے یہ بات کیوں کہی ہے؟ کیا وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟ پھر وہ



اپنے کیبن میں آ گیا۔ سینا کے نرم گرم ہونٹوں کا لمس ابھی بھی اس کے ہونٹوں پر تھا۔ اسے ایک بار پھر آرچر پر غصہ آنے لگا۔ کیا ضروری تھا کہ وہ ابھی آتا اور آنا بھی ضروری نہیں تھا۔ اس رات وہ سینا کے خواب دیکھتا رہا۔ دوسری صبح وہ دیر سے بیدار ہوا اور اس نے ناشتا اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا۔ ناشتا کر کے اس نے جہاز کے بار روم کا رخ کیا کیونکہ تمباکو نوشی کا کمرا بھی وہیں تھا اور اسے تمباکو کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں پر آرچر اور برکلے سمیت چار افراد موجود تھے، جیک کا ان سے تعارف ہوا۔ ایک روڈی مارگن تھا، اس کا تعلق ویلز سے تھا اور دوسرا براڈ ویسٹر تھا۔ وہ نیوی میں تھا اور چھٹیاں گزار کر افریقہ میں اپنے جہاز پر جا رہا تھا۔

"ہم سارا سال افریقہ کے جنوب مغربی ساحل کے ساتھ گشت کرتے ہیں تاکہ بحری قزاقوں کا سدباب کر سکیں۔" براڈ نے انہیں بتایا۔

جیک کو وہ پسند نہیں آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ چور تھا اور چور کبھی قانون کے محافظوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے کہا۔

"قزاقوں کا سدِ باب ناممکن ہے کیونکہ کبھی کبھی حکومت برطانیہ خود ان کی سرپرستی کرتی ہے اور انہیں افریقہ میں حملوں پر اکساتی ہے۔"

"درست ہے، یہ ہماری سیاسی مجبوری ہے۔"

"اور یہی لوگ جب برطانیہ کے جہازوں کو لوٹنے لگتے ہیں تو مجرم بن جاتے ہیں۔" جیک کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "ہمارا یہی دہرا معیار ہماری کمزوری بن گیا ہے۔"

"برطانیہ اس وقت دنیا کا طاقت ور ترین ملک ہے اس لیے ہمیں حق حاصل ہے کہ اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی کر سکیں۔" براڈ نے لاجواب ہو کر کہا۔ جیک نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہی جواز چور ڈاکو بھی رکھتے ہیں کہ وہ طاقت ور ہیں اس لیے انہیں بھی دوسروں کو لوٹنے کا حق ہے۔"

سینا کسی وقت وہاں آ گئی تھی اور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ "تمہارا مطلب ہے کہ حکومت اور ڈاکو ایک جیسے ہیں۔" براڈ نے برہمی سے کہا۔

"بالکل... جو کام ایک فرد کرتا ہے تو وہ ڈاکو اور حکومت کرے تو ٹھیک... یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"جیک درست کہہ رہا ہے۔" سینا نے اچانک مداخلت کی۔ "حکومت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کمزوروں پر دھونس جمائی جائے۔ تاج برطانیہ کے نام پر دنیا کی چھوٹی قوموں کو کچلنے کا اختیار کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"دنیا پر حکومت کرنے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔" براڈ نے کہا۔

"درست ہے مگر اس سے جرم کی نوعیت پر فرق نہیں پڑتا۔" جیک نے جواب دیا۔

براڈ شاید اس قسم کی گفتگو کے لیے تیار نہیں تھا، وہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ سینا شرارت سے مسکرائی۔ اس نے آہستہ سے جیک سے کہا۔ "تم نے اسے غصہ دلا دیا... کہیں تم قزاق تو نہیں ہو؟"

اس کے اچانک سوال پر جیک کا رنگ بدل گیا۔ سینا نے اس بات کو محسوس کر لیا۔ اس نے جلدی سے معذرت کر لی۔ "معاف کرنا، میں نے غلط بات کہہ دی۔"

"نہیں... نہیں۔" جیک جلدی سے بولا۔ "تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے تمباکو کی بو سے کچھ ہوتا ہے، ہم کہیں باہر نہ چلیں۔"

"کیوں نہیں۔" جیک اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس وقت عرشے پر تیز دھوپ تھی اور ماریانا شمال کے سرد سمندر سے نکل کر کھلے اوقیانوس میں داخل ہو گیا تھا اور یہاں موسم اتنا سرد نہیں تھا۔ سینا کو اس کے بارے میں تجسس تھا اور وہ جیک سے اس کے بارے میں ہی سوالات کر رہی تھی۔ جیک حتی الامکان جھوٹ سے گریز کرتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا ضمیر اس معصوم لڑکی سے جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب دھوپ چبھنے لگی تو وہ اندر آ گئے۔ جیک نے ہچکچاتے ہوئے اسے اپنے کیبن میں چلنے کی دعوت دی۔ خلاف توقع وہ مان گئی مگر جیک اسے اپنے کیبن میں لا کر پچھتایا تھا کیونکہ اس نے فوراً اس کے سامان کا جائزہ لے کر اس سے سوال شروع کر دیے۔

"تم بس ایک سوٹ کیس لے کر نکلے ہو؟"

"وہ... ہاں، میں زیادہ سامان لے کر سفر کرنے کا قائل نہیں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر تم تو بہت لمبے سفر پر نکلے ہو؟"

جیک نے اسے سمجھایا کہ اسے زیادہ سامان سے وحشت ہوتی ہے مگر وہ مطمئن نہیں تھی۔ اس نے متعدد چیزوں کے بارے میں سوالات کیے کہ ان کی ضرورت پڑی تو وہ کہاں سے لے گا۔ اس زمانے میں تو یہ سہولت بھی نہیں تھی کہ ہر چیز ہر جگہ سے مل جائے۔ بڑی مشکل سے جیک نے اسے چپ کرایا کہ وہ ذرا مہم جو طبیعت رکھتا ہے اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی سفر کرتا رہا ہے۔ اس کے لیے اسے اپنے دو

تین فرضی سفر کے قصے سنانے پڑے۔

سینا ایک انوکھی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ جب جیک نے اس کے ساتھ ذرا رومانی ہونے کی کوشش کی تو وہ اس طرح شرمائی کہ جیک کو رکنا پڑا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ ابھی انتظار کرے۔ جیک نے اس سے کہا کہ جب تک وہ سفر کر رہے ہیں وہ کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ سینا اس کی بات مان گئی۔ تیسرے دن ماریانا کھلے اوقیانوس میں پہنچ کر افریقہ کے جزیرے کینری کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ ایک بادبانوں والا جہاز تھا اور اسے سفر کرنے کے لیے مناسب ہواؤں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں دخانی جہاز عام نہیں تھے۔ جیک اور سینا ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے ایک ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا اور جیک خود کو خوش قسمت سمجھنے لگا تھا۔

مگر سفر کے پانچویں دن جب وہ کینری سے ایک دن کی مسافت پر تھے، صبح سویرے شور اٹھا۔ جیک جلدی سے لباس پہن کر کیبن سے باہر آیا۔ راہداری میں سب جمع تھے۔ مسز برکلے رو رہی تھی اور مسٹر برکلے جہاز کے عملے پر گرجنے برسنے میں مصروف تھا۔

''یہاں سب چور بدمعاش ہیں۔'' مسٹر برکلے نے چلا کر کہا۔ ''میں کینری پہنچ کر پورے عملے کو اندر کروادوں گا۔ وہاں کا گورنر میرا دوست ہے۔''

''مسٹر برکلے! کیا ہوا ہے؟'' جیک نے آگے آکر پوچھا۔

''ہونا کیا ہے... کسی نے رات کو ہمارے کیبن سے رونن کے زیورات چرا لیے ہیں۔ وہ سب بہت قیمتی جڑاؤ زیورات تھے۔ ان کی مالیت اس پورے جہاز سے زیادہ تھی۔''

اسی اثنا میں کپتان بینس آگیا۔ اس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسٹر اور مسز برکلے کو ان کے کمرے میں لے گیا۔ اس نے عملے کو ان کے کام پر بھیج دیا تھا۔ اس کے کوئی نصف گھنٹے بعد وہ مسٹر برکلے کمرے سے نکلا اور اس نے تمام مسافروں اور جہاز کے عملے کو عرشے پر آنے کا حکم دیا۔ ذرا سی دیر میں سب وہاں جمع تھے۔ کپتان بینس نے بتایا۔

''مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس جہاز پر ایک چور سفر کر رہا ہے اور اس نے مسز برکلے کے قیمتی زیورات چرا لیے ہیں۔ اس نے یہ کام غلطی سے نہیں کیا اس لیے وہ واپس کرنے کی اپیل پر زیورات واپس بھی نہیں کرے گا۔ اس لیے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم ایک ایک مسافر کے کیبن اور سامان کی تلاشی لیں۔ اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ ابھی میرے اور میرے نائب کے ساتھ وہ مسافر ایک ایک کرکے جائیں گے جن کے سامنے ان کے سامان کی تلاشی ہوگی اور پھر اس مسافر کو اس وقت تک عرشے پر رہنا ہوگا جب تک سب کی تلاشی مکمل نہیں ہو جاتی۔''

بعض مسافروں نے اس بات پر احتجاج کیا مگر کپتان بینس نے ان کا احتجاج نظر انداز کردیا۔ اس نے تلاشی شروع کردی۔ جیک مسٹر برکلے کے ساتھ کھڑا تھا، اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''جس وقت چوری ہوئی تم دونوں کہاں تھے؟''

''میرا خیال ہے اس وقت ہم ڈائننگ ہال میں تھے۔'' برکلے نے جواب دیا۔ ''چوری کا انکشاف صبح ہوا تھا کیونکہ رات کو رونن نے توجہ نہیں دی تھی۔''

''کوئی رات کو کیبن میں نہیں گھسا؟''

''یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ہم رات کو کیبن کا دروازہ لاک کرکے سوتے ہیں۔'' برکلے نے نفی میں سر ہلایا۔

مسافر ایک ایک کرکے کپتان بینس اور اس کے نائب کے ساتھ جا کر اپنے سامان کی تلاشی دے رہے تھے۔ پھر جیک کی باری آئی اور وہ ان کے ساتھ اپنے کیبن میں آیا۔ اس کے پاس سامان ہی کتنا تھا، وہ ایک منٹ میں کھنگال لیا گیا۔ اس کے بعد کیبن کی باری آئی۔ بینس اور اس کا نائب اس کی تلاشی لینے لگے۔ اچانک بینس کے نائب نے بیڈ کا گدا الٹا تو اس کے نیچے سے کوئی چمک دار شے نکل کر فرش پر گری اس نے اسے اٹھایا تو یہ ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ وہ اس نے بینس کو دی اور اس نے جیک سے پوچھا۔ ''مسٹر ہال! کیا یہ انگوٹھی تمہاری ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے الجھن سے کہا کیونکہ انگوٹھی سچ مچ اس کی نہیں تھی۔ ''یہ میری نہیں ہے۔''

''تب یہ تمہارے کیبن میں کہاں سے آئی؟'' کپتان بینس کے لہجے میں سرد مہری آگئی تھی۔

جیک کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے کیبن کی مکمل تلاشی لی گئی اور تمام ممکنہ کونوں کھدروں کو دیکھ لیا گیا مگر اس انگوٹھی کے سوا کچھ نہیں نکلا تھا۔ کپتان بینس نے اپنے نائب سے کہا۔ ''مسز برکلے سے پوچھو کہ ان کے زیورات میں انگوٹھیاں کتنی تھیں اور کیسی تھیں؟''

نائب نے آکر بتایا کہ یہ انگوٹھی مسز برکلے کی ہے۔

''اب تم کیا کہتے ہو مسٹر ہال؟''

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ انگوٹھی میری نہیں ہے۔''

''پھر یہ تمہارے کیبن میں کیسے آئی؟''

''میں یہ بھی نہیں جانتا۔''

وہ جیک کو باہر لائے اور جیسے ہی کپتان بینس نے انگوٹھی کے بارے میں بتایا، سینا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے جیک کو دیکھا۔ جیک اس سے نظر بھی نہیں ملا رہا تھا۔ برکلے اور دوسرے بھی حیران تھے۔ ”یہ انگوٹھی ثابت کرتی ہے کہ چور مسٹر جیک ہال ہے۔“ آرچر نے کہا۔

”تو باقی زیورات کہاں ہیں؟“ مسز برکلے نے اعتراض کیا۔

”وہ اس نے کہیں چھپا دیے ہوں گے۔“ آرچر نے جواب دیا۔ ”یہ انگوٹھی غلطی سے اس کے کمرے میں رہ گئی ہوگی۔“

”یہ جھوٹ ہے... میں نے مسز برکلے کے زیورات نہیں چرائے۔“ جیک نے احتجاج کیا۔

”تب یہ انگوٹھی تمہارے کمرے میں کہاں سے آئی؟“ مسٹر برکلے نے سوال کیا تو جیک کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ زندگی میں پہلی بار بری طرح پھنس گیا ہے۔ حالانکہ اس نے یہ چوری نہیں کی تھی مگر کسی نے اس کے خلاف سازش کی تھی اور یہ انگوٹھی اس کے کمرے میں گدے کے نیچے پہنچا دی تھی تاکہ جب تلاشی ہو تو وہ پکڑا جائے۔ اوپر سے آرچر نے اس کے خلاف بول کر سب کو اس کا مخالف کر دیا تھا۔ کیونکہ سارے زیورات برآمد نہیں ہوئے تھے اس لیے تلاشی کا عمل جاری رکھا گیا اور باقی مسافروں کے سامان اور کیبن کی تلاشی لی گئی۔ اس پر رہ جانے والے مسافروں نے احتجاج کیا تھا کہ جب چور پکڑا گیا ہے تو ان کی تلاشی کیوں لی جا رہی ہے۔ اس پر کپتان بینس نے کہا۔

”ابھی صرف ایک انگوٹھی ملی ہے اور سارے ہی زیورات باقی ہیں۔ ممکن ہے، مسٹر ہال کا کوئی اور ساتھی بھی ہو اور باقی زیورات اس کے پاس ہوں اس لیے سب کی تلاشی لینا ضروری ہے۔“

تلاشی کا عمل جاری رکھا گیا مگر تمام مسافروں کی تلاشی کے بعد بھی زیورات نہیں مل سکے۔ اس کے بعد عملے کے سامان اور کمروں کی تلاشی شروع ہوئی۔ آخر میں کپتان اور نائب کپتان کے کمروں اور سامان کی تلاشی بھی لی گئی اور نتیجہ وہی رہا۔ ماریانا بہت بڑا جہاز نہیں تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا اور اس میں کچھ چھپانے کی بہت ساری جگہیں تھیں جہاں زیورات کو چھپایا جا سکتا تھا۔ اس لیے پورے جہاز کی تلاشی لینا ناممکن تھا لہٰذا جیک پر ہی چوری کا الزام لگا۔ اسے قید تو نہیں کیا گیا تھا مگر ایک خلاصی ہمہ وقت اس کی نگرانی پر مامور ہوتا تھا کہ وہ فرار کی کوشش نہ کرے۔ دوسرے لوگ اس سے گریز کرنے لگے تھے۔ جیک اس واقعے کے بعد زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارنے لگا۔ اس نے بھی کسی سے اور خاص طور سے سینا سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس کا سامنا کرے۔ اس لیے وہ کمرے تک محدود ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے خلاف یہ کام کس نے کیا ہے۔ اس کا شبہ رہ رہ کر آرچر پر جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار جیک سے کہا بھی تھا کہ اسے جیک کو یہاں دیکھ کر تعجب ہوا ہے اور ممکن ہے وہ اس کے ماضی سے واقف ہو مگر اس صورت میں وہ فوراً اس کا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ اگر دوسروں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ ہیروں کا مشہور چور ہے تو پھر شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر آرچر اس کے بارے میں جانتا تھا اور اس نے زیورات چرائے تھے تو اسے چھپانے کے بجائے پہلی فرصت میں اس کا راز فاش کر دینا چاہیے تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا... ہاں مگر وہ اس کے خلاف پیش پیش تھا۔

کپتان بینس نے مسٹر اور مسز برکلے کے اصرار کے باوجود جیک سے پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کوئی پولیس مین یا جاسوس نہیں ہے اور اسے نہیں معلوم کہ مجرموں سے ان کے جرائم کیسے اگلوائے جاتے ہیں۔ اس لیے جب وہ کینری کے جزیرے پر پہنچیں گے تو یہ معاملہ وہاں کی انتظامیہ کے سپرد کیا جائے گا اور وہی اس سے اس کے جرم کے مطابق سلوک کرے گی۔ زیورات برآمد کروانا بھی پولیس کی ذمے داری تھی۔ مسٹر برکلے نے کپتان بینس کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے واضح کر دیا کہ ٹکٹ کے شرائط نامے میں لکھا ہے کہ مسافر اپنی چیزوں کی حفاظت کے خود ذمے دار ہوں گے اور اگر انہیں اپنی کسی چیز کے بارے میں خدشہ ہو تو وہ اسے کپتان کے سیف میں رکھوا سکتے ہیں۔ اس صورت میں کپتان اس چیز کی حفاظت کا ذمے دار ہو سکتا ہے، کسی اور صورت میں ہرگز نہیں۔ اس لیے مسز برکلے کے زیورات برآمد کروانا اس کی ذمے داری نہیں تھی۔

اس واقعے کے چالیس گھنٹے بعد ماریانا کینری کی بندرگاہ کے پاس لنگر انداز ہو گیا تھا۔ کسی مسافر کو اس وقت تک اترنے کی اجازت نہیں تھی جب تک کہ جزیرے کی انتظامیہ اس کی اجازت نہ دے دے۔ صبح نمودار ہوتے ہی جزیرے کی پولیس جہاز پر آئی اور اس نے ایک بار پھر جہاز کی مکمل طور پر تلاشی لی۔ مگر زیورات نہیں ملے۔ جب مسافر اترنے لگے تو ان کی بھی مکمل تلاشی لی گئی تھی۔ آخر میں پولیس جیک کو



رات میں لے کر روانہ ہو گئی۔ اسے جزیرے کی جیل میں بند کر دیا گیا اور مسٹر برکلے کی رپورٹ پر اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کی جانے لگی۔

جیک نے عدالت میں مؤقف اختیار کیا کہ اس کے خلاف سازش ہوئی ہے اور کسی نے اسے پھنسانے کے لیے صرف ایک انگوٹھی اس کے کمرے میں چھپا دی۔ اگر اس نے زیورات چرائے ہوتے تو وہ اس کے پاس سے برآمد ہوتے مگر نہ تو جہاز کا عملہ اور نہ ہی پولیس اس کے پاس سے زیورات برآمد کر سکی تھی اس لیے اسے باعزت بری کیا جائے۔ مگر انگوٹھی کی موجودگی اس کے خلاف فردِ جرم بن گئی اور اسے دس سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اس نے اس سزا پر احتجاج کیا مگر وہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جیک قدرت کی اس ستم ظریفی پر حیران تھا۔ جب اس نے اتنی بڑی چوریاں کیں اور لندن کی پولیس سے بچ نکلا تو قدرت نے اسے کہاں پھنسایا۔ ایک جہاز میں اس پر چوری کا الزام لگا اور اسے چند عام سے لوگوں نے پکڑ کر ایک ایسی عدالت کے حوالے کر دیا۔ جو اس کی بے گناہی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس سے چوری شدہ مال کا ایک چھوٹا سا حصہ برآمد ہوا تھا۔

اس سارے معاملے میں واحد اچھی بات یہ تھی کہ کینری کی جیل بہت اچھی اور آرام دہ تھی۔ قیدیوں کو وہاں نہ صرف کھانا اچھا ملتا تھا بلکہ ان سے جان لیوا مشقت بھی نہیں لی جاتی تھی... جیسا کہ انگلینڈ میں اس کا رواج تھا۔ جیک یہ بھی جانتا تھا کہ اسے انگلینڈ میں اس سے کہیں زیادہ سزا ہو سکتی تھی اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ اسے عمر بھر کے لیے جیل بھیج دیا جاتا۔ اس لحاظ سے اس کے ساتھ اچھا ہی ہوا تھا۔ چند مہینے میں وہ یہاں کی زندگی کا عادی ہو گیا۔ بس کبھی کبھی اسے سینا کی یاد آتی تھی تو اس کا دل بہت اداس ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا کوئی بہت اہم حصہ کھو بیٹھا ہو۔

جیل میں اسے ایک سال گزر گیا تھا اور وہ اس بات پر قانع ہو چکا تھا کہ اسے پورے دس سال گزار کر اس جیل سے چھٹکارا ملے گا۔ ایک روز وہ اپنی کوٹھری میں بیٹھا ہوا لندن کے دنوں کو یاد کر رہا تھا کہ جیل کے ایک پہرے دار شاکیہ نے آ کر اسے ایک کاغذ دیا۔ وہ حیران ہوا۔

”یہ کس نے بھیجا ہے؟“ اس نے شاکیہ سے پوچھا۔ وہ افریقی نژاد اور عربی بولنے والا پہرے دار تھا۔ جیک نے اس سے کسی حد تک عربی سیکھ لی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جیک نے تہ کیا ہوا کاغذ کھول کر دیکھا۔ اس پر کسی نے انگریزی میں تحریر کیا تھا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں ایک ناکردہ جرم میں قید کی سزا ہوئی ہے۔ اس لیے میں نے تمہیں رہا کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج سے ایک ہفتے بعد جزیرے پر ایک تہوار ہے اور پورا جزیرہ اس تہوار میں شریک ہوگا۔ تم تیار رہنا... اسی رات تمہیں یہاں سے نکال کر ایک کشتی کے ذریعے جزیرے سے نکال دیا جائے گا اور تم آزاد ہو گے۔“

کاغذ پر کسی کا نام تحریر نہیں تھا اور جیک کے لیے یہ تحریر بھی نامانوس تھی۔ وہ بالکل بھی اندازہ نہیں کر پایا کہ اس کا یہ ہمدرد کون تھا اور کیا اس نے سچ مچ جیک کو یہاں سے نکالنے کا کوئی بندوبست کر لیا تھا... یا یہ سب ایک مذاق تھا مگر اس سے ایسا مذاق کون کرتا؟ اور اس میں شاکیہ بھی شامل تھا جو بہت سنجیدہ آدمی تھا۔ جیک نے کبھی اسے ہنستے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ مذاق نہیں ہے... یا تو کوئی سچ مچ اس کا ہمدرد آ گیا ہے جسے معلوم ہے کہ وہ بے گناہ ہے... یا پھر وہ نئے سرے سے کسی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ بہرحال جو بھی تھا، آنے والا وقت بتا دیتا کہ یہ مذاق تھا یا حقیقت! اس نے کاغذ کو مشعل سے جلا کر راکھ کر دیا۔ اگر اس قسم کی چیز اس کے پاس سے برآمد ہو جاتی تو اس کی سزا میں اضافہ بھی ہو سکتا تھا۔ شاکیہ رات کا پہرے دار تھا اور وقفے وقفے سے چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ دوسری بار آیا تو جیک نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ توجہ دیے بغیر اس کے پاس سے گزر گیا اور جب جیک نے اگلی بار اسے آواز دی تو پلٹ کر آیا اور درشت لہجے میں بولا۔

”چپ کر کے بیٹھو۔“

جیک نے اشارے سے اس سے اس پیغام کے بارے میں پوچھا مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس سے جیک نے اندازہ لگایا کہ وہ یا تو پیغام سے واقف نہیں تھا یا احتیاط کی وجہ سے اس سے بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے پھر شاکیہ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آنے والے پانچ دن تک وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ کون ہو سکتا ہے جو اسے جیل سے رہا کرانا چاہتا ہے؟ اس دوران میں اسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ وہ شخص تو نہیں ہے جس نے اصل میں مسز برکلے کے ہیرے چرائے تھے اور اب اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ اس کا ذہن آرچر کی طرف گیا مگر وہ ایسا شخص تو نہیں لگتا تھا جس کا ضمیر ملامت کرے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ واقعی اس کا ضمیر جاگ گیا ہو۔

اس کے بارے میں سوچ کر جیک کو غصہ آنے لگا۔ اگر وہ واقعی آرچر تھا تو جیک نے سوچا وہ اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ سے اسے بے گناہ ہونے کے باوجود ایک سال جیل میں گزارنا پڑا تھا مگر اس سے بھی شدید نقصان یہ تھا کہ وہ سینا کی نظروں سے گر گیا تھا اور اس نے یقیناً اسے بھلا دیا تھا ورنہ وہ ایک بار پلٹ کر اسے پوچھتی۔ وہ جب سینا کا سوچتا تھا تو اسے اس شخص پر بہت غصہ آتا تھا جس کا کیا دھرا اسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اور اب اس کے پاس اس کی جمع پونجی بھی نہیں رہی تھی، کیونکہ جب اسے سزا ہوئی تھی تو عدالت نے اس کا تمام اثاثہ ضبط کر لیا تھا اور وہ جیل سے نکلتا تو بالکل خالی ہاتھ ہوتا۔

تہوار مقامی نوعیت کا تھا مگر اس میں جزیرے کے تمام لوگ شریک ہوتے تھے... وہ بھی جو باہر سے آئے ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تہوار والے دن جیل کے بیشتر ملازمین چھٹی پر تھے اور شام کے وقت تو بس چند ایک پہرے دار باقی رہ گئے تھے... اور جو تھے، وہ بھی تہوار میں شرکت کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے طے کر لیا تھا کہ نصف رات کے بعد وہ پہرے پر آجائیں گے اس طرح وہ بھی تہوار میں شریک ہو سکیں گے۔ نصف رات کے وقت دوسرے پہرے دار آئے، ان میں شاکیہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک پہرے دار تھا اور اس نے آتے ہی اسے جیل کے سامنے والے حصے میں بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد وہ جیک کی کوٹھری کی طرف آیا اور اس نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ اس لائن میں باقی کوٹھریوں میں صرف دو قیدی تھے اور وہ بھی سو رہے تھے۔

''خاموش رہنا۔'' شاکیہ نے سرگوشی میں کہا۔

وہ اسے نکال کر جیل کے عقبی حصے میں لایا اور اس سے کہا۔ ''یہاں سے نکل کر تم بندرگاہ تک جاؤ گے۔ وہاں تمہیں ایک کشتی پر سرخ رنگ کی لالٹین دکھائی دے گی۔ تم اس کشتی میں سوار ہو جانا۔''

''لیکن میرے لیے کون یہ سب کر رہا ہے؟''

''ان باتوں کا وقت نہیں ہے... میرا ساتھی یہاں آگیا تو مشکل ہو جائے گی۔'' شاکیہ نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''بس نکل جاؤ اور روشن جگہوں سے دور رہنا... اگر کوئی پاس آئے تو یہ چادر اوڑھ لینا۔''

''کشتی کتنی بڑی ہے؟'' جیک نے چادر لیتے ہوئے سوال کیا۔

''درمیانی ہے۔'' شاکیہ نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ ''اب جاؤ ورنہ میں بھی پھنس جاؤں گا۔''

جیک نے چادر اوڑھی اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس نے جزیرے کا یہ حصہ اچھی طرح دیکھا ہوا تھا اور اسے بندرگاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہاں بے شمار کشتیاں اور بحری جہاز لنگر انداز تھے مگر صرف ایک جگہ اسے سرخ لالٹین جلتی نظر آئی، وہ اس طرف بڑھا۔ کشتی بہ ظاہر خالی لگ رہی تھی مگر جیسے ہی اس نے کشتی میں قدم رکھا، کسی نے اس کا نام پکارا۔ ''جیک...'' لہجہ انگریزوں کا سا تھا۔

''ہاں...'' اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''آجاؤ اور اس کے نیچے چلے جاؤ۔'' ایک سائے نے اس کے لیے کشتی کے نچلے حصے کا خانہ کھول دیا۔ ''جب تک میں نہ بلاؤں، آواز مت نکالنا۔''

جیک کو اگرچہ کئی خدشات تھے مگر جیل سے نکل کر وہ ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھا، اس کے لیے بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اندر اتر گیا اور فوراً ہی خانہ اوپر سے بند ہو گیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی کشتی کے بادبان کھل گئے اور وہ رات کی تاریکی میں کھلے سمندر میں روانہ ہو گئی۔ نیچے مچھلیوں کی بو تھی۔ یہ جگہ مچھلیاں رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور شاید کشتی بھی کسی مچھیرے کی تھی۔ وہ ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سمندر پُرسکون تھا اور ہلکورے اس کے لیے لوری کا کام کرنے لگے، وہ سو گیا۔

اچانک سورج کی تیز روشنی منہ پر آنے سے اس کی آنکھ کھلی۔ اوپر کا خانہ کھل گیا تھا اور سورج خاصا بلند ہو گیا تھا۔ اسے تعجب ہوا، وہ بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔

''باہر آجاؤ۔'' اسی شخص نے کہا تو وہ باہر آگیا۔ تب اس نے دیکھا کہ کشتی کھلے سمندر میں تھی اور دور دور تک اس کے اور ایک درمیانے قسم کے بحری جہاز کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسے لانے والا ایک انگریز ہی تھا۔ اس نے جیک سے ہاتھ ملایا۔ ''دوست میری ذمے داری یہاں تک تھی، اب تمہیں اس جہاز پر جانا ہے۔''

''اس پر کون ہے؟''

''میں نہیں جانتا... مجھے تم کو یہاں تک لانے کا معاوضہ دیا گیا تھا اس لیے میں لے آیا۔ اب تم نے جو سوال کرنے ہیں، وہ جہاز پر جا کر کرنا۔''

اسی اثنا میں اوپر سے ایک رسی کی سیڑھی گری اور جیک اس کی مدد سے جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا۔ وہاں اسے چند افراد دکھائی دیے مگر ان میں کوئی جانی پہچانی شخصیت نہیں تھی۔ اسے لانے والے کو واپسی کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے فوراً ہی کشتی کو موڑ لیا۔ جیک نے وہاں موجود سب سے نزدیکی شخص سے پوچھا۔ ''یہ جہاز کس کا ہے اور مجھے کس کے کہنے پر سوار کیا گیا ہے؟''

''یہ ایک برٹش نیشنل جہاز ہے۔'' ملاح نے جو انگریز ہی دکھائی دیتا تھا، بتایا۔ ''اور تمہیں کپتان کے کہنے پر سوار کیا گیا ہے، ہم ایک دن سے یہاں تمہارا انتظار کر رہے تھے۔''

کپتان پر اسے کپتان بینس کا خیال آیا۔ کیا یہ نیکی اس نے کی تھی؟ اس نے ملاح سے کہا۔ ''کیا میں کپتان سے مل سکتا ہوں؟''

''ہاں، وہ خود آرہا ہے۔'' ملاح نے ایک ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔ جیک کو مایوسی ہوئی تھی، یہ کپتان بینس نہیں تھا۔ اس نے نزدیک آکر جیک سے ہاتھ ملایا۔

''مسٹر ہال! تم بہت تھکے ہوئے ہو... کیا خیال ہے کچھ آرام کر لو، اس کے بعد ہم ڈنر پر بات کریں گے۔''

خود جیک بھی اپنا حلیہ بہتر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مگر مجھے بار بر چاہیے۔ پھر میں غسل کروں گا۔ مجھے دوسرے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔''

''تم بے فکر رہو، تمہیں سب ملے گا۔''

جہاز کے باربر نے جیک کی حجامت بنائی اور اس کی ڈاڑھی صاف کی، پھر اس نے غسل کر کے نئے کپڑے پہنے۔ دوپہر کا کھانا اسے کیبن میں ملا تھا۔ کیبن کوئی بہت پُرتعیش تو نہیں تھا مگر آرام دہ تھا، کھانا کھا کر وہ سو گیا۔ شام کو اسے کپتان نے اپنے کیبن میں بلوایا۔ اس کا نام اسمتھ ریڈ وڈ تھا اور وہ اس جہاز کا مالک بھی تھا۔ ڈنر بہت اچھا تھا اور اس سے فارغ ہو کر وہ فرانسیسی شیمپین پی رہے تھے۔ جیک نے پوچھا۔

''میرے لیے یہ زحمت کس نے کی ہے؟''

''سچی بات ہے، میں خود بھی نہیں جانتا۔'' کپتان اسمتھ نے اعتراف کیا۔ ''مجھے جنوبی افریقہ سے ایک ایجنٹ نے پیغام بھیجا تھا کہ میں سمندر کے اس حصے میں تمہیں اٹھا لوں اور مجھے اس کا معاوضہ پیشگی دے دیا گیا تھا۔''

''جنوبی افریقہ!'' اس نے غور کیا۔

''ہاں اور جہاز وہیں جا رہا ہے۔''

''یعنی اس شخص نے مجھے اس طرح بلوایا ہے؟''

''شاید یہی بات ہے۔''

''کیا میں تمہارا قیدی ہوں؟''

''نہیں۔'' کپتان اسمتھ نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تم نے کیوں سوچا؟''

''یعنی میں اگر جنوبی افریقہ نہ جانا چاہوں تو اس کے لیے آزاد ہوں؟''

''کیوں نہیں، تم بالکل آزاد ہو۔'' کپتان اسمتھ نے کہا۔ ''تم راستے میں آنے والی کسی بھی بندرگاہ پر اتر سکتے ہو۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس صورت میں تمہیں ایک معقول رقم دے دی جائے۔''

جیک چکرا کر رہ گیا۔ آخر یہ کون تھا جو اس پر اتنا مہربان تھا اور اس کو آزاد کرانے کے بعد جانے کی اجازت بھی دے رہا تھا؟ کپتان اسمتھ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور اسے سچ مچ اس شخصیت کا علم نہیں ہے جس نے جیک کو رہا کرایا تھا۔ وہ سوچتا رہا پھر اس نے جنوبی افریقہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بہرصورت اس شخص سے ملنا چاہتا تھا جس نے اسے رہا کرایا تھا اور اس بھی زیادہ جس اسے یہ جاننے کا تھا کہ ہیرے اصل میں کس نے چرائے تھے؟ کیونکہ جو شخص یہ جانتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے، وہ لازماً ہیرے چرانے والے کو بھی جانتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ خود ہی چور ہو۔ جیک یہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے کپتان اسمتھ سے کہا۔

''میں جنوبی افریقہ ہی جاؤں گا۔''

''اس صورت میں مجھ سے کہا گیا ہے کہ تمہارا ہر ممکن خیال رکھوں اور راستے میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔''

''میں اس کے لیے تمہارا پیشگی شکر گزار ہوں۔'' جیک نے کہا۔

یہ ایک چھوٹا مال بردار بحری جہاز تھا جو یورپ اور افریقہ کے درمیان... سفر کرتا تھا اور سامان لاتا لے جاتا تھا۔ جزیرہ کینری کے پاس سے گزرتے ہوئے یہ مغربی اور جنوب مغربی افریقہ میں مختلف بندرگاہوں پر رکتا اور کوئی دو مہینے بعد کیپ ٹاؤن کی بندرگاہ پر پہنچتا۔ جیک زیادہ وقت کپتان اسمتھ کے ساتھ گزارتا تھا، دونوں شطرنج کے اچھے کھلاڑی تھے اس لیے اس کا وقت اچھا گزرتا۔ جب جہاز کسی بندرگاہ پر رکتا تھا تو جیک اتر کر آس پاس کے علاقوں کی سیر بھی کر لیتا۔ کیپ ٹاؤن آتے آتے اس کی کپتان اسمتھ سے اتنی اچھی دوستی ہو گئی تھی کہ اس نے جیک کو پیش کش کی کہ وہ اس کے نائب کے طور پر ملازمت کر لے۔ وہ اسے جہاز رانی کے اسرار و رموز سکھا دے گا۔ جیک نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر اس کا دل جنوبی افریقہ میں نہیں لگا تو وہ ضرور اس کے پاس ملازمت کرے گا۔

کیپ ٹاؤن میں ہربرٹ جیمس نامی شخص اس کا منتظر تھا۔ اس نے جیک کو ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا اور اسے بتایا کہ اسے ابھی جوہانسبرگ کا سفر کرنا تھا، تب ہی وہ اس

شخصیت سے مل سکتا تھا جس نے اس کے لیے یہ سب کیا تھا۔ اگر چہ جیمس نے اعتراف تو نہیں کیا تھا مگر اس کی بعض باتوں سے ظاہر تھا کہ اس نے جیک کی رہائی اور اسے یہاں تک پہنچانے کا سارا بندوبست بھاری معاوضے کے عوض کیا تھا اور یہ معاوضہ اسے اسی شخصیت نے دیا تھا۔ ہربرٹ نامی شخص نے اس شخصیت کے بارے میں بتانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔

''مجھے ایں کے بارے میں بتانے کا حکم نہیں ہے۔''

جیک کا تجس اور بھی بھڑک اٹھا۔ یہ کون تھا اور اتنی راز داری کیوں برت رہا تھا؟ بہر حال، اب چند دن کی بات تھی۔ وہ کیپ ٹاؤن آنے کے دو دن بعد جوہانسبرگ کے لیے روانہ ہوا۔ اور دو دن کے سفر کے بعد وہ جوہانسبرگ پہنچ گیا۔ اسے لینے کے لیے ایک سیاہ فام ملازم آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا آقا اپنے ولا میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ولا واقعی میں ولا ثابت ہوا... اور اس کے ایک شان دار کمرے میں جیک کو ٹھہرایا گیا۔ وہ نہا دھو کر فارغ ہوا تو اس نے بیل بجا کر ملازم کو بلایا۔

''میں تمہارے آقا سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ آپ سے کچھ دیر میں ملیں گے۔'' ملازم نے جواب دیا۔

جیک کا خیال تھا کہ اسے بلایا جائے گا مگر چند لمحے بعد کسی نے دروازہ کھولا اور بے تکلفی سے اندر آ گیا۔ جیک حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے سبینا کھڑی تھی۔ ''سبینا... تم؟''

''ہاں میں۔'' وہ اس کے پاس آئی۔

''یہ سب تم نے کیا ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''یہ سب میں نے کیا ہے؟''

''مگر کیوں.... تمہارے خیال میں میں ایک چور نہیں ہوں؟''

''نہیں، مجھے معلوم ہے کہ وہ زیورات تم نے نہیں چرائے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ زیورات میں نے نہیں چرائے تھے؟''

''اس لیے کہ وہ زیورات میں نے چرائے تھے۔'' سبینا نے اتنی سادگی سے اعتراف کیا کہ جیک دنگ رہ گیا۔

''زیورات تم نے چرائے تھے... مگر کیوں؟''

''کیونکہ میرا کام ہی یہ ہے اور میں نے تمہیں پھنسانے کے لیے تم سے راہ و رسم بڑھائی تھی۔'' سبینا نے بتایا کہ وہ کسی لارڈ کیڈ برگ کی بھتیجی نہیں تھی، یہ نام اس نے صرف اپنی شخصیت بنانے کے لیے استعمال کیا تھا... اور نہ اس کی ماں ہندوستانی تھی۔ اس کا باپ بھی چور تھا اور اس نے ہی سبینا کو چوری کی تربیت دی تھی۔ وہ مسز برکلے کے زیورات کے چکر میں ماریانا پر سوار ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک لمبا ہاتھ مار کر یہ کام چھوڑ دے۔ اگر وہ پکڑی جاتی تو اس کی جوانی جیل میں گزر جاتی۔ اس نے مسز برکلے کے زیورات چرائے اور ایک انگوٹھی جیک کے کمرے میں گدے کے نیچے چھپا دی۔ یہ کام اس نے ڈنر کے بعد کیا تھا جب سب ہی ڈائننگ ہال میں تھے۔

جیک کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے تلخی سے کہا۔ ''تب اتنی مہربانی کیوں؟''

''کیونکہ میں سچ مچ تم سے محبت کرنے لگی تھی اور اسی وجہ سے میں نے تم کو رہا کرایا۔ اب میں تمہارے سامنے ہوں، تم مجھے جو چاہو سزا دے لو۔''

جیک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں سزا نہیں دے سکتا کیونکہ میں بھی تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ میری کوئی رات تمہارے خیال سے خالی نہیں ہوتی تھی۔''

سبینا اس سے لپٹ گئی۔ ''جیک! مجھے معاف کر دو۔ میری وجہ سے تمہیں بے گناہ ایک سال جیل میں گزارنا پڑا۔''

جیک پہلی بار دل سے ہنسا تھا۔ ''خیر، اب میں اتنا بھی بے گناہ نہیں ہوں۔ میں بھی تو یہی کام کرتا تھا مگر جب میں تم سے ملا تھا تو دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ اب کبھی جرم نہیں کروں گا۔''

''میں جانتی ہوں۔ میں نے تمہارے بارے میں سب معلوم کر لیا ہے۔ میں نے بھی وہ آخری جرم کیا تھا اور ان زیورات کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے یہ جاگیر خرید لی۔ اسی وجہ سے مجھے تمہیں چھڑانے میں اتنی دیر ہوئی۔''

''تم خاصی دولت مند ہو گئی ہو۔''

''مگر یہ دولت تمہارے بغیر کچھ نہیں ہے۔ جیک! میں تمہارے بغیر ادھوری ہوں۔'' سبینا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''بولو تم مجھے سزا دے کر چھوڑ جاؤ گے یا ہمیشہ کے لیے اپنا لو گے؟''

جیک کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ اسے زندگی میں بے شمار دولت ملی تھی مگر سچی محبت پہلی بار ملی تھی۔ وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ اس نے آگے بڑھ کر سبینا کو سینے سے لگا لیا۔ سبینا نے اپنا سر جیک کے شانے پر رکھ دیا۔





۳ پہلا رنگ

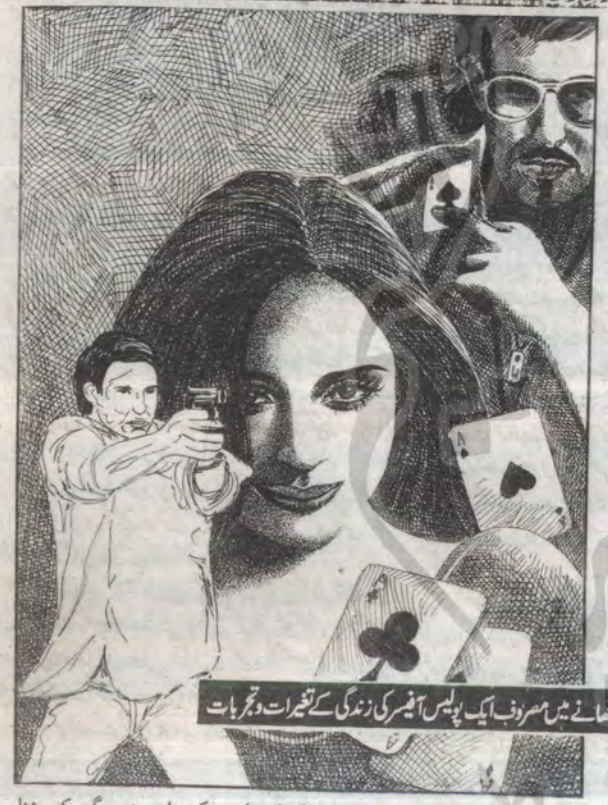



# مثلث

حسام بٹ

**محبت اور نفرت کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ایک پولیس آفیسر کی زندگی کے تغیرات و تجربات**

ہمارے ملک کے عوام و خواص محکمۂ پولیس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اس میں بے اعتمادی کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے... اپنی اس سوچ اور عمل میں وہ حق بہ جانب بھی ہیں کیونکہ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے مگر اپنی تمام تر سوچوں اور نظریات کے باوجود یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ویسے ہی زندگی کے کسی بھی شعبے کے تمام لوگ بھی، ایک جیسے نہیں ہوتے ...محکمۂ پولیس میں کچھ دیانت دار، فرض شناس اور اصول پرست افراد آج بھی موجود ہیں۔ جو کسی بھی موقع پر اپنی فرض شناسی کو بھولتے نہیں۔

زندگی زندہ چیزوں سے عبارت ہے اور زندہ رہنے کے لیے کھانا پڑتا ہے، پینا پڑتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات چاہے مثبت ہوں یا منفی، وہ بھی زندہ اشیا کے مانند کھاتے پیتے ہیں جیسے غصہ عقل کو کھا جاتا ہے، لہو کو پی جاتا ہے

اورانسان کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتا...!

عدنان بھی غصے کا بہت تیز تھا بلکہ غصے کا بہت بُرا کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ غصے کی حالت میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے۔ بس، اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اعصاب کی کشیدگی اس کے چہرے کے عضلات کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر بڑے خوفناک تاثرات اجاگر کرتی تھی۔ ان لمحات میں وہ کسی وحشی درندے کا روپ دھار لیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خونی بھیڑیا غرا رہا ہو اور اپنے شکار کو بھنبھوڑنے کے لیے جست بھرنے کو تیار ہو۔

اس وقت عدنان اپنی بیوی بشریٰ کے ساتھ بیڈروم میں موجود تھا اور غصے کی شدت نے اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ وہ زندگی کے ایک انتہائی نازک اور حساس معاملے پر بے حد برہم تھا اور بشریٰ کو کھری کھری سنا رہا تھا۔ اس کے الفاظ سے زہر ٹپکتا تھا۔

”میں نے بہت برداشت کرلیا... ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔“

بشریٰ اپنے شوہر کی عادات اور مزاج سے بہ خوبی واقف تھی۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”عدنان! تم خوامخواہ بدگمان ہو رہے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں...“

”بدگمان...؟“ عدنان نے کچا چبا جانے والی نظر سے اسے گھورا اور غصیلے انداز میں بولا۔ ”کیا تم مجھے اُلّو کا پٹھا سمجھتی ہو۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ اللہ نے مجھے دو آنکھیں دے رکھی ہیں جو تمہارے کرتوتوں پر لگی ہوئی ہیں۔“

”تم اندھے نہیں ہو، یہ بات میں جانتی ہوں۔“ وہ صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے بڑی رسان سے بولی۔ ”لیکن میں بھی غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ میرا یقین کرو...“

”ہرگز نہیں...!“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا پھر نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔ ”بشریٰ! میں تم پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ تم نے مجھے جتنا بے وقوف بنانا تھا، بنا چکیں۔ اب میں تمہاری کسی چال میں نہیں آؤں گا۔“

”عدنان...!“ بشریٰ روہانسی ہوگئی۔ ”تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے...“

”غلط فہمی کی بچی...!“ عدنان چنگھاڑا پھر اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ گھوم گیا۔

چٹاخ کی ایک زناٹے دار آواز پیدا ہوئی۔

بے ساختہ بشریٰ کا ہاتھ مضروب گال کی جانب اٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ اپارٹمنٹس بلڈنگ دو بلاکس پر مشتمل تھی۔ بلاک اے اور بلاک بی۔ مذکورہ بلڈنگ کی چھ منزلیں تھیں یعنی گراؤنڈ پلس فائیو... اور فریدہ آنٹی بلاک بی کے فلیٹ نمبر پانچ سو تین میں رہتی تھیں۔ یہ بلڈنگ کا ٹاپ فلور بھی کہلاتا تھا۔ فریدہ آنٹی اور اس کے شوہر رحیم کاکا کو وہاں رہائش اختیار کیے طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ان دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں آباد ہونے والی پہلی فیملی تھی۔

فریدہ کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہوگی۔ وہ عام سی صورت شکل کی حامل ایک فربہ عورت تھی۔ مزاجاً وہ بہت تیز اور دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والی تھی۔ رحیم الدین کی عمر کا اندازہ ساٹھ کے قریب لگایا جاسکتا تھا۔ وہ ”کاکا“ کے نام سے مشہور تھا حتیٰ کہ فریدہ بھی اسے کاکا ہی کہہ کر پکارتی تھی۔ کاکا اپنے آپ میں مگن رہنے والا انسان تھا۔

یہ جوڑا اپنے فلیٹ میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر زندگی گزار رہا تھا۔ اولاد جوان ہوئی اور شادیوں کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں بکھر گئی۔ ان کا ایک بیٹا کینیڈا میں اور دوسرا انگلینڈ میں سیٹ تھا تاہم ان ”سیٹ“ جوانوں کو اپنے بوڑھے والدین کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ بیٹوں کی بہ نسبت بیٹی بڑی سعادت مند نکلی۔ وہ امریکا میں سیٹل تھی اور ہر ماہ ایک مخصوص رقم اپنے ماں باپ کے لیے بھیجتی رہتی تھی جس سے ان کی گزر بسر ہورہی تھی۔

علاوہ ازیں فریدہ چونکہ چلتا پرزہ قسم کی عورت تھی لہٰذا اس نے جائداد کی خرید و فروخت کے بزنس میں بھی ٹانگ پھنسا رکھی تھی۔ وہ دونوں پارٹیوں کو ملا کر اپنا کمیشن کھرا کرلیتی تھی۔ وہ چونکہ فطری طور پر ایک مجسس اور دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والی عورت تھی لہٰذا اسے سب معلوم ہوتا تھا کہ کس گھر میں کیا ہورہا ہے... تاہم اس وقت وہ کمیٹی کے صدر کے ساتھ الجھی ہوئی تھی۔

فریدہ نے اپنے گھر کا کچھ فالتو سامان فلیٹ کے باہر ایک کونے میں ڈال رکھا تھا جس میں ایک ٹوٹی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل، دو کرسیاں، چند بے کار ڈبے اور اسی نوعیت کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ بلڈنگ کی چھت پر جانے والا راستہ ادھر ہی سے گزرتا تھا اور یہ سامان اس راستے میں رکاوٹ بنا تھا۔ بلڈنگ کی کمیٹی کا صدر شاکر پہلے بھی کئی مرتبہ فریدہ سے وہ کاٹھ کباڑ وہاں سے ہٹانے کے لیے کہہ چکا تھا لیکن فریدہ نے بھی جیسے اس کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس سامان کو یہاں سے اٹھالیں۔“ شاکر نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں نے پہلے



...کتنی بار...“

”ہاں... میں جانتی ہوں، کتنی بار کہا ہے۔“ وہ شاکر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”لیکن سوال وہی ہے کہ میں اس سامان کو رکھوں کہاں؟ گھر میں اتنی گنجائش ہے ...اور...“

”یہ سامان آپ کا ہے۔“ اس دفعہ شاکر نے قطع کلامی کی۔ ”اور اسے رکھنے کی جگہ کے بارے میں سوچنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔“

”ٹھیک ہے، جب سوچ میں کوئی جگہ آگئی تو میں اپنا سامان یہاں سے اٹھالوں گی۔“ فریدہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”آپ کو اندازہ نہیں، اس سامان کی وجہ سے کتنے لوگوں کو تکلیف ہے۔“ شاکر نے شاکی لہجے میں کہا۔ وہ خاصا ...کر مزاج تھا تاہم لیڈیز کا لحاظ بھی کرتا تھا۔

”مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔“ فریدہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”سب سے زیادہ تکلیف تو آپ کے چوکیدار کو ہے۔“

”میرے چوکیدار کو؟“ شاکر نے سوالیہ نظر سے فریدہ کی طرف دیکھا۔

”میں دلدار کی بات کررہی ہوں۔“

شاکر نے افسوسناک انداز میں گردن ہلائی اور قدرے ...لہجے میں بولا۔ ”دلدار صرف میرا نہیں، اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کا چوکیدار ہے۔ یہاں رہنے والے ہر فلیٹ کے ...سیوں کا چوکیدار ہے۔ آپ خوامخواہ اس سے نہ الجھا کریں۔“

”میں نہیں، ہمیشہ وہی مجھ سے الجھتا ہے۔“ فریدہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ”یہاں سے جب بھی گزرتا ہے، میرے سامان کو ٹھوکرے مارتا ہے اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا بھی رہتا ہے جیسے...“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جیسے... وہ مجھے گالیاں دے رہا ہو۔“

”یہ سب آپ کا وہم ہے آنٹی...“ شاکر نے بے زاری سے کہا۔

”آنٹی نہیں، فریدہ!“ فریدہ نے شاکر کی بات کاٹ کے ...تصحیح کردی۔

”جی... فریدہ جی!“ شاکر نے ناگواری سے اسے دیکھا ...کہا۔ ”میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ سب ...کا وہم ہے۔ آپ چونکہ دلدار کو پسند نہیں کرتیں، اسی لیے آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیرلب آپ کو گالیاں دیتا

## ”خراجِ تحسین“

ایک تقریب میں مودی صاحب کا تعارف ایک خاتون سے کرایا گیا تو خاتون بولیں۔ ”مجھے آپ کی سب کتابیں بہت پسند ہیں... خاص طور پر وہ کتاب بہت اچھی تھی... کیا نام تھا اس کا... یاد نہیں رہا... کہانی بھی یاد نہیں آرہی... ارے، بھئی وہی جس کے ٹائٹل پر ایک ایسی لڑکی کی تصویر تھی جس کی شکل ریما سے بہت ملتی تھی...“

رہتا ہے۔ اور جہاں تک چھت کی طرف جانے آنے کا تعلق ہے تو یہ اس کی مجبوری ہے...“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”پانی والی ٹنکیاں دونوں بلاکس کی، چھت کے اوپر بنی ہوئی ہیں۔ دلدار ان ٹنکیوں کے والوز کھولنے صبح و شام نہایت پابندی کے ساتھ چھت پر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کبھی کیبل والے کے ساتھ اور کبھی نیٹ والے کے ساتھ اسے چھت پر جانا پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے نا، اس بلڈنگ کی چھت پر ٹی وی کیبل اور انٹرنیٹ کیبل کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ اب یہ ہے کہ چھت کے دروازے سے گزرنے کے لیے اس کا پاؤں آپ کے سامان سے ٹکرائے گا تو ظاہر ہے، اس کے منہ سے آپ کے لیے خیر کا کلمہ تو نکلنے گا نہیں...“

”شاکر صاحب! وہ چونکہ آپ کا لایا ہوا بندہ ہے۔“ فریدہ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”اس لیے ہر اچھے برے کام میں آپ اسی کی سائیڈ لیں گے۔“

”اچھے برے کام میں!“ شاکر چونکا۔ ”کیا مطلب...؟“

”آپ تو یہی سمجھتے ہیں نا، وہ پانی کے والوز کھولنے چھت پر جاتا ہے۔“ وہ آواز کو دھیما رکھتے ہوئے پُراسرار لہجے میں بولی۔ ”یا پھر کیبل وغیرہ والوں کے ساتھ اسے اوپر جانا پڑتا ہے۔“

”تو...؟“ شاکر کی حیرت میں الجھن بھی شامل ہوگئی۔

”تو یہ جناب کہ... وہ ایک اور کام کے لیے بھی چھت کا رخ کرتا ہے۔“ وہ سنسنی خیز انداز میں بولی۔

”کس کام کے لیے؟“ شاکر نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی، آپ کو پتا ہوگا۔“ وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔ ”اور آپ دانستہ مجھ سے چھپا رہے ہیں نا!“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ شاکر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تم بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟“

”میری معلومات کے مطابق، وہ دن میں اور رات میں

ایک دو مرتبہ سُوٹا لگانے بھی چھت پر جاتا ہے۔" فریدہ آنٹی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "دلدار چرس پیتا ہے۔"

"ہوں...!" شاکر نے تشویش بھری نظر سے فریدہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، میں دلدار کو چیک کروں گا اور اگر آپ کی بات درست نکلی تو میں اسے نوکری سے بھی نکال دوں گا۔"

"دیکھوں گی، آپ اپنے الفاظ کا کتنا پاس کرتے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میں اپنے الفاظ کا کتنا پاس کرتا ہوں، یہ چند دن میں آپ کو دیکھنے کو مل جائے گا۔" شاکر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے آپ بھی ایک مہربانی کریں۔"

"کون سی مہربانی؟" وہ سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگی۔

"اس سامان کو یہاں سے ہٹانے کی مہربانی۔" شاکر نے چھت والے دروازے کے قریب ڈھیر، فریدہ کے سامان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ محض دلدار ہی کے راستے کی رکاوٹ نہیں بلکہ اس فلور کے تمام بچے بھی اس سامان کی وجہ سے خاصے اَن ایزی ہیں۔ وہ آزادانہ کھیل کود بھی نہیں سکتے۔"

فریدہ برا سامنہ بنا کر شاکر کو گھورنے لگی۔

☆☆☆

اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے دونوں بلاکس کے درمیان ہوا کی آمد و شد کے لیے ایک ڈکٹ چھوڑا گیا تھا۔ دونوں بلاکس کے چند فلیٹس کی کھڑکیاں اس ڈکٹ کی طرف کھلتی تھیں۔ بعض خبیثانہ فطرت کے حامل رہائشی اس ڈکٹ کا منفی استعمال کرتے تھے۔ جن مکینوں کے فلیٹس کی کھڑکیاں مذکورہ ڈکٹ میں کھلتی تھیں، ان میں سے بعض نامعقول لوگ کچرے کی تھیلیاں بھر بھر کر اپنی کھڑکیوں کے راستے ڈکٹ میں پھینک دیتے تھے۔ ان کی ایسی کمینی حرکتوں کا خمیازہ بے چارے گراؤنڈ فلور کے مکینوں کو بھگتنا پڑتا تھا، خصوصاً وہ مکین جن کی کھڑکیاں ڈکٹ کی جانب پڑتی تھیں۔ ڈکٹ میں جمع ہو جانے والے تعفن زدہ کچرے کے ڈھیر پر سے چوہے اور کاکروچ بڑی دیدہ دلیری سے سفر کر کے ان کے فلیٹس تک رسائی حاصل کر لیتے تھے، ناگوار بدبو اس کے علاوہ تھی۔ چھ منزلہ اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے دونوں بلاکس کی چھت اوپر سے ملی ہوئی تھی۔ چھت تک پہنچنے کے لیے تو دونوں بلاکس کے زینوں کے اختتام پر ایک ایک دروازہ لگا ہوا تھا لیکن ڈکٹ میں آمد و رفت کے لیے کوئی راستہ نہیں رکھا گیا تھا۔ سوئیپر کو جب بھی صفائی کرنا ہوتی، وہ گراؤنڈ فلور کے کسی فلیٹ کی کھڑکی میں سے کود کر وہاں پہنچ جاتا تھا اور چاہے چند دنوں کے لیے ہی سہی، گراؤنڈ فلور کے مکینوں کی اذیت اور تکلیف رفع ہو جاتی تھی۔ دونوں بلاکس کے رہائشیوں میں بڑا اتفاق اور بھائی چارہ دیکھنے کو ملتا تھا... اور بعض اوقات یہ خلوص اور محبت انتہا کو چھونے لگتی تھی۔

وہ دونوں بھی آدھی رات کو اسی خلوص اور محبت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کامران کی عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ وہ بلاک اے میں فلیٹ نمبر ایک سو سات کا باسی تھا اور اپنے بڑے بھائی عدنان کے ساتھ رہتا تھا۔ عدنان کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن ابھی تک وہ صاحب اولاد نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک شکی مزاج، غصیلا اور جھگڑالو قسم کا آدمی تھا۔ اپنی بیوی بشریٰ پر وہ اکثر گرجتا برستا رہتا تھا۔ کامران شروع ہی سے اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہ رہا تھا... جبکہ سلمٰی کا تعلق بلاک بی کے فلیٹ نمبر دو سو چھ سے تھا۔ اس کی عمر کم و بیش بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک خوب صورت، پُرکشش اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ عاشق مزاج اور تیز و طرار کامران نے بڑی ہوشیاری سے اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ سلمٰی اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے کمیٹی صدر شاکر علی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ماں صفیہ بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت یہی سلمٰی اپنے محبوب کے ساتھ بلڈنگ کی چھت پر موجود تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔ ان کی چاہت اور پسندیدگی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اس قلیل مدت میں بھی ان کا عشق افلاطونی انداز اختیار کر چکا تھا اور یہی عشق انہیں مجبور کرتا تھا کہ وہ چھپ چھپ کر بار بار ملیں۔ اس ملن کے لیے انہوں نے بلڈنگ کی چھت کو چن لیا تھا کیونکہ ملاقات کے لیے اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی لہٰذا جب بھی موقع ملتا، وہ پروگرام سیٹ کر کے آدھی رات کے وقت بلڈنگ کی چھت پر چلے آتے۔ چھت پر، پانی والی ایک ٹنکی کے قریب ایک پرانی چارپائی پڑی تھی۔ وہ اس وقت اسی چارپائی پر بیٹھے راز و نیاز کر رہے تھے۔ ماحول بڑا خوشگوار اور پُرسکون تھا۔ فضا تاریک، [illegible] اور رومینٹک... وہ دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

سلمٰی نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کامران! کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کس بات کا ڈر؟" کامران چونک کر اسے دیکھنے لگا۔



وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ "کامران! تمہاری محبت نے مجھ پر ایک جادو سا کر دیا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟" وہ گہری [illegible] سے بولا۔ "میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہارے پیار نے مجھے کیا بنا دیا ہے۔"

کامران بنیادی طور پر ایک فلرٹ تھا۔ وہ بھونرے کی [illegible] لے کر پیدا ہوا تھا، پھر اس کی چالاکی اور چرب زبانی [illegible] اس صلاحیت کو اور بھی نکھار اور سنوار دیا تھا۔ وہ ہر نئی لڑکی [illegible] اسی جوش و جذبے کے تحت ملتا تھا۔ اپنی لچھے دار باتوں [illegible] وہ فوراً سامنے والے کو شیشے میں اتار لیتا تھا۔ جب تک [illegible] کی گاڑی ہموار چلتی رہتی، وہ ڈرائیونگ جاری رکھتا لیکن [illegible] ہی کوئی پھاٹک یا سگنل بند ملتا یا گاڑی میں کوئی خرابی پیدا [illegible] جاتی یا راستے میں کوئی بھی سماجی رکاوٹ کھڑی دکھائی دیتی، [illegible] جھپکتے میں ایک گاڑی سے نکل کر دوسری گاڑی کی [illegible] سیٹ پر جا بیٹھتا تھا۔ یہی اس کا فن تھا، یہی اس کی [illegible] تھی اور یہی اس کا وتیرہ تھا۔ اس کے تجربے سے گزرنے والی لڑکیاں اسے ہرجائی کہیں یا بے وفا... اس سے کامران کی ذات پر کوئی اثر یا فرق دیکھنے کو نہیں ملتا تھا!

سلمٰی نے اس کی بات کو سنی، اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ "کامران! میں بے اختیار تمہاری جانب کھنچی چلی آتی ہوں... جیسے میں لوہے کی بنی ہوں اور تمہارے اندر کوئی طاقتور مقناطیس فٹ ہو۔"

"نہ تو میں مقناطیس کا بنا ہوا ہوں اور نہ ہی تم لوہے کا وجود رکھتی ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ "یہ دراصل محبت کی طاقت ہے جو تمہیں کھینچ کر میرے پاس لے آتی ہے۔ اس طاقت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کامران! میں محبت اور اس کی طاقت سے نہیں ڈرتی۔" سلمٰی نے کہا۔

"پھر تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟" کامران نے پوچھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے دنیا والوں کا ڈر ہے۔"

"دنیا والوں کا ڈر!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "یہ کیا پاگل پن ہے سلمٰی؟"

"اگر کسی نے مجھے تمہارے ساتھ چھت پر دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "ابو تو مجھے زندہ ہی دفن کر دیں گے..."

"کچھ نہیں ہوگا۔" کامران اس کے ہاتھوں کو تھام کر تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ "تم پریشان نہ ہو۔ کسی کو بھی ہماری ان ملاقاتوں کا پتا نہیں چل سکتا۔ میں بہت ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کا عادی ہوں اور تم بھی دیکھ بھال کر ہی چھت پر آتی ہو..."

"میں تو دیکھ بھال کر ہی اِدھر آتی ہوں۔" وہ شک بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن تم نے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کی جس عادت کا ذکر کیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے کامران؟"

"م... مطلب...!" وہ گڑبڑا گیا پھر قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میں پوری تسلی کے بعد ہی تم سے ملنے چھت پر آتا ہوں تاکہ... ہماری یہ چوری پکڑی نہ جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بدستور شک آمیز نظر سے اسے ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھی تھی کہ تم اس سے پہلے بھی محبت کے کھیل کھیلتے رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں سلمٰی!" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہو... شاید صاعقہ کی باتوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ فضول اور بے کار معاملات پر توجہ نہیں دیا کرو۔ میں صرف اور صرف تمہارا ہوں۔ تمہیں میری محبت پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"ہاں، بھروسا ہے مجھے۔" وہ کامران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"میں تو تم پر صرف یہ واضح کرنا چاہتا تھا..." وہ وضاحت جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں ایک ایک قدم پھونک کر زمین پر رکھتا ہوں اور جب تک ہر طرف سے اطمینان نہیں ہو جاتا، میں تم سے ملنے چھت پر نہیں آتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا بھیجا ہوا پرچہ مجھے مل گیا تھا اور اس وقت بھی وہ میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ کوئی نہیں جانتا، ہم چھپ چھپ کر راتوں کو بلڈنگ کی چھت پر ملتے ہیں۔"

"صاعقہ کی باتوں نے مجھے بری طرح الجھا دیا تھا۔" سلمٰی اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "کامران! تم تو جانتے ہو، وہ میری بڑی گہری دوست ہے۔ پتا نہیں، وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔"

''تم اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ سلمٰی!'' وہ بڑے دُلار سے اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''میں صاعقہ سے خود بات کرلوں گا۔''

''تم اس سے کیا بات کرو گے؟'' وہ کامران کی گرفت میں کسمساتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تم اس معاملے کو چھوڑو۔'' وہ اس کی توجہ کو صاعقہ سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''میں نپٹ کرلوں گا۔ میں اس کی پرابلم کو سمجھتا ہوں۔''

''پرابلم...!'' وہ چونکی۔ ''صاعقہ کی کیا پرابلم ہے؟''

''وہ تم سے جیلس ہے۔'' کامران نے نشانہ باندھ کر وار کیا۔

''مجھ سے جیلس... کیا مطلب؟'' اس کی حیرت الجھن میں بدل گئی۔

بات کے اختتام پر سلمٰی نے اپنی گردن اٹھا کر کامران کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو کامران نے بازوؤں کی مدد سے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ وہ اسے اپنے سینے میں مزید بھینچتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''سلمٰی! صاعقہ تمہاری دوست ہے، میں مانتا ہوں لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ ہماری محبت سے خوش نہیں۔ وہ ہم دونوں سے جیلس ہے، ہماری محبت سے حسد کرتی ہے... ہماری خوشی سے جلتی ہے وہ۔''

''پتا نہیں، یہ تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو۔'' وہ بے یقینی سے بولی۔ ''صاعقہ مجھ سے حسد کرتی ہے، ایسا تو میں غلطی سے بھی نہیں سوچ سکتی۔''

''جب حقائق کھل کر تمہارے سامنے آئیں گے تو حیران رہ جاؤ گی۔'' وہ سلمٰی کی محبت سے مستفید ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری بات پر یقین کرنے کے سوا تمہارے پاس کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔''

''تو بتاؤ نا... حقائق کیا ہیں؟'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔

جواب دینے کے بجائے کامران نے سلمٰی کے عقب میں دیکھا پھر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''سلمٰی! تمہارا اندیشہ بے بنیاد نہیں۔''

''میرا اندیشہ؟'' وہ اس کی گرفت سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''کوئی ہمیں واچ کررہا ہے سلمٰی...!'' وہ اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کٹھنی خیز لہجے میں بولا۔

سلمٰی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے، آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

زینوں کی سمت تاریکی میں ایک سایہ سا لہرایا تھا۔

''او مائی گاڈ!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

☆☆☆

کاکا بیڈروم میں، ٹی وی کے سامنے بیٹھا خون کو گرمانے والا ایک مغربی چینل دیکھ رہا تھا۔ وقت اور عمر کی بات ہوتی ہے۔ کبھی انسان خون کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جن ''چیزوں'' کا متلاشی ہوتا ہے، عمر کے آخری حصے میں وہی ''اشیا'' خون کو گرم کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مغربی چینلوز انہی اوقات میں، مشرقی ناظرین کی تفریحِ طبع کے لیے ''بی بی'' اور ''نمبر اٹھارہ'' کی فلمیں چلایا کرتے تھے۔ کاکا ایک ایسی ہی فلم دیکھنے میں مگن تھا کہ فریدہ افراتفری کے عالم میں، بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

کاکا نے ٹی وی اسکرین پر سے نگاہ ہٹا کر اپنی رفیقِ حیات کی طرف دیکھا۔ وہ جو شیلے انداز میں بولی۔

''پکڑ لیا... آج تو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔''

''کس کو پکڑ لیا اللہ کی بندی؟'' کاکا اپنی بیوی سے بھی مخاطب تھا اور چپکے چپکے سے ٹی وی اسکرین کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ ''شور تو ایسے مچا رہی ہو جیسے اسامہ بن لادن کو پکڑ لیا۔''

''یہ اسامہ بن لادن سے بھی بڑا کیس ہے کاکا!'' وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

''کیس؟'' بے ساختہ کاکا کے منہ سے نکلا اور وہ پورے حواس کے ساتھ فریدہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

فریدہ نے ریموٹ اٹھا کر پہلے ٹی وی کو آف کیا پھر کاکا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''شاکر کی لڑکی کا چکر چل رہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے سلمٰی کا؟''

''اور نہیں تو کیا شاکر کی دس لڑکیاں ہیں۔''

کاکا نے بے زاری سے کہا۔ ''پتا نہیں، تم کن الٹی سیدھی سرگرمیوں میں الجھی رہتی ہو۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ دوسروں کی کھوج میں لگے رہنا اچھا کام نہیں!''

''اور تمہارے خیال میں آدھی رات کو تین اور دو کالی والی بے ہودہ فلمیں دیکھنا بہت ہی اچھا کام ہے؟'' فریدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہیں نا...!''

''میں جو کچھ بھی کرتا ہوں، اپنے گھر کے اندر کرتا



ہوں۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''اور میرے اس فعل کا اثر کسی اور کی ذات پر نہیں پڑتا لیکن...'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''لیکن تم جس انداز میں، دوسروں کی ٹوہ میں لگی رہتی ہو وہ گناہ کا کام ہے۔''

''گناہ اور ثواب کے لیے ہر انسان نے اپنی اپنی مرضی اور سہولت کا فلسفہ بنا رکھا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں تو اتنا جانتی ہوں کہ ابھی میں نے چھت پر جو کچھ دیکھا ہے، وہ شاکر کی آنکھیں اور گردن جھکا دینے کے لیے کافی ہے۔''

''کچھ پتا تو چلے، آخر تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے۔'' کاکا نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''خوامخواہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟''

وہ اس کی سنی، اَن سنی کرتے ہوئے بڑی رعونت سے بولی۔ ''بڑا اصول پرست بنتا تھا نا...'' اس کا اشارہ یونین صدر شاکر علی کی جانب تھا۔ ''اب میں اس کا غرور توڑوں گی۔ دیکھنا کاکا... وہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرسکے گا۔ ایسا کھیل کھیلوں گی کہ اسے بھی پتا چل جائے گا، کس سے پالا پڑا ہے۔''

''تم فضول اور بے کار چکروں میں الجھ کر خوامخواہ اپنی توانائی ضائع کرتی رہتی ہو۔'' کاکا نے برہمی سے کہا پھر پوچھا۔ ''اتنا تو بتا دو، سلمٰی چھت پر کس کے ساتھ تھی؟''

''کامران کے ساتھ۔'' فریدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کامران کون؟''

''عدنان کا چھوٹا بھائی۔'' فریدہ نے بتایا۔ ''جو اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہتا ہے، بلاک اے میں... فلیٹ نمبر ایک سو سات!''

''اچھا اچھا... تم اخبار والے عدنان کی بات کررہی ہو۔'' کاکا کے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عدنان سے تو اکثر میری گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ وہ خاصا معقول آدمی ہے۔''

''عدنان جتنا معقول ہے، کامران اتنا ہی نامعقول۔'' فریدہ تلخی سے بولی۔ ''پورا دن آوارہ گردی کرتا رہتا ہے، خیر...'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اس کی یہی نامعقولیت اور آوارہ گردی اب میرے کام آئے گی۔''

''پتا نہیں، تم کیا انٹ شنٹ بولے جارہی ہو۔'' وہ بے حد الجھن زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، تم کیا کرنے جارہی ہو؟''

''میں جو کرنے والی ہوں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا اس لیے اس معاملے میں اپنے دماغ کو نہ تھکاؤ۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولی۔ ''تم وہی کرو، جو اصل سے بھی زیادہ تمہاری سمجھ میں آتا ہے۔''

''کیا؟'' بے ساختہ کاکا نے پوچھا۔

''میں نے چینل تبدیل نہیں کیا تھا۔'' جواب میں فریدہ نے ریموٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے تیکھے انداز میں کہا۔ ''تمہیں صرف آن کا بٹن دبانا ہوگا اور...!''

کاکا کھسیانے انداز میں اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

''اب کیا ہوگا کامران؟'' سلمٰی اس سے الگ ہوکر گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

کامران نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے سوچنے دو۔''

''اگر یہ ابو ہوئے تو...؟''

سلمٰی نے وحشت زدہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو کامران نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''تسلی رکھو... وہ تمہارے ابو نہیں ہوسکتے۔''

''یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' سلمٰی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''ایسے کہہ سکتا ہوں کہ...'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ تمہارا باپ ہوتا تو تمہیں یہاں میرے ساتھ بیٹھے دیکھ کر یوں خاموشی سے واپس نہ چلا جاتا۔ تمہارا باپ لڑنے بھڑنے کا ماہر ہے اور اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کا سب سے زیادہ طاقتور اور بااختیار شخص بھی ہے۔ وہ سیدھا ہمارے پاس آتا اور ایک قیامت برپا کردیتا۔''

''ہاں... یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی پھر تاریکی میں بی بلاک کے زینوں والے راستے کو گھورنے لگی۔

تھوڑی دیر پہلے کامران نے اسی جانب ایک سایہ سا لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندھیرے کے باعث یہ اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں تھا کہ وہ کوئی مرد تھا یا عورت... بہرحال، یہ بات طے تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، انہی کی سُن گُن لینے چھت کی طرف آیا تھا ورنہ آدھی رات کے وقت بلڈنگ کے کسی مکین کو

بھلا چھت پر کیا کام ہوسکتا تھا۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا لیکن کمیٹی کی جانب سے کسی کو بھی چھت پر سونے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا یہ تو سوچنا ہی بے کار تھا کہ گرمی اور مچھروں کا ستایا ہوا کوئی رہائشی چھت کی جانب نکل آیا ہوگا۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ فرض بھی کرلیا جاتا کہ ایسا ہی تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ کون تھا؟

اس تشویشناک سوال نے کامران کا سکھ چین غارت کر دیا۔ اگر کوئی شخص رازداری کے ساتھ ان کی جاسوسی کررہا تھا تو یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ کامران انہی ہنگامہ خیز سوچوں سے الجھا ہوا تھا کہ سلمٰی نے پوچھ لیا۔

''کامران! اگر وہ ابو نہیں تھے تو پھر کون ہوسکتا ہے؟''

''میرے خیال میں وہ دلدار ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے، دلدار کو ہم پر شک ہوگیا ہے کہ ہم رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ملتے ہیں؟'' سلمٰی کی پریشانی دوچند ہوگئی۔

''تم فکرمند نہ ہو میری جان۔'' کامران نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی ہوگا، میں معاملے کو سنبھال لوں گا۔ جب میں ہوں تو تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کامران۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''اپنے دل کو مضبوط رکھو سلمٰی۔'' وہ اسے شانوں سے تھامتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ بات ذہن میں نقش کرلو، وہ جو کوئی بھی تھا، ہمیں نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا ورنہ وہ یوں شرافت اور خاموشی سے واپس نہ چلا جاتا۔ مجھے تو یہ کوئی بلیک میلنگ والا معاملہ لگتا ہے۔''

''بلیک میلنگ؟'' سلمٰی نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں...'' کامران نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ وہ دلدار کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میں اسے بڑی آسانی سے ہینڈل کرلوں گا۔ اس کی ایک خاص کمزوری ہے میری مٹھی میں۔''

کامران کی تسلی بھری باتیں سن کر وہ قدرے مطمئن ہوگئی پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھے جانا چاہیے۔''

''بالکل... تمہیں جانا چاہیے۔'' کامران نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہیں بیٹھا دیکھ رہا ہوں... تم جاؤ۔''

''اگر زینے تک تم بھی میرے ساتھ چلتے تو...!''

''یہ بہت خطرناک ہوگا۔'' کامران اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''ہماری ٹوہ میں چھت کی طرف آنے والا اگر اُدھر زینے کے پاس موجود ہوا تو تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر اس کی عید ہوجائے گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم اکیلی ہی جاؤ۔ اگر راستے میں کسی سے مڈبھیڑ ہو بھی جائے اور وہ تم سے کوئی سوال کرتا ہے تو تم کسی بھی نوعیت کا بہانہ کرسکتی ہو۔ اگر ہم دونوں ساتھ ہوئے تو پھر ہمارے کیس کو رجسٹر ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔''

کامران کی بات سلمٰی کی سمجھ میں ٹھیک طور پر بیٹھ گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی تو ہو ہی چکی تھی۔ اس نے اپنے محبوب پر الوداعی نظر ڈالی اور پُراعتماد قدموں سے زینے کی سمت بڑھنے لگی۔

کامران ڈکٹ والی منڈیر پر آبیٹھا اور سلمٰی کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

کولمبس کو امریکا دریافت کرنے پر اتنی خوشی نہیں ہوئی ہوگی جتنی خوش اس وقت فریدہ تھی۔ خوشی اور غم کے سلسلے میں انسان کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اور یہ ایک انسان سے دوسرے انسان تک بدلتی رہتی ہیں۔ فریدہ نے رات کی تاریکی میں، بلڈنگ کی چھت پر جو رومان پرور نظارہ دیکھا تھا، وہ اس کی اَنا کی تسکین اور روح کی تقویت کا سامان بننے والا تھا... جبھی وہ اس قدر خوش تھی کہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

کاکا کو سنسنی خیز رپورٹ پیش کرنے کے بعد وہ دوبارہ زینے کے دروازے کی طرف آگئی تھی۔ اسے پکا یقین تھا کہ کاکا یہ دیکھنے اس کے پیچھے نہیں آئے گا کہ وہ اُدھر کیا کررہی ہے۔ وہ اپنی من پسند انگلش فلم کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا بلکہ اس نے شکر ادا کیا ہوگا کہ فریدہ ڈسٹرب کرنے کے لیے اس کے قریب موجود نہیں۔

وہ زینے کے دروازے کی اوٹ سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ ایک ایسے مقام پر چھپ کر کھڑی تھی کہ وہ دونوں اسے نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ وہ بہ آسانی انہیں تاڑ سکتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ دونوں چارپائی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے اور زینے کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کررہے تھے۔

فریدہ اتنے فاصلے سے ان کی باتوں کی آواز تو نہیں سن سکتی تھی تاہم اسے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ انہیں اپنے ''دیکھ لیے جانے'' کا پتا چل چکا تھا جبھی وہ اُلجھن کا شکار تھے۔

وہ اپنی جگہ پر جمی انہیں پریشان ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ وہ دوڑ کر ان کے سر پر پہنچ



اور انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے جی کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتی، وہاں کی صورت حال بدل گئی۔

کامران ڈکٹ والی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا اور سلمٰی نے بی بلاک کے زینے کی جانب قدم بڑھا دیے تھے جہاں دروازے کے پیچھے فریدہ نے خود کو چھپا رکھا تھا۔ وہ یک لخت دروازے کے عقب سے نکلی اور مصروفیت کے بہانے کی آڑ میں، وہاں رکھے اپنے بے کار سامان کے ساتھ ہاتھ چالاکی کرنے لگی۔

سلمٰی تیزی سے چلتے ہوئے زینے کے دروازے پر پہنچی پھر جیسے ہی اس نے زینے پر قدم رکھا، فریدہ سے اس کا سامنا ہوگیا۔ فریدہ نے چونک کر اسے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سلمٰی... تم... اس وقت چھت پر کیا کرنے گئی تھیں؟''

سلمٰی اس کے سوال پر زیادہ پریشان نہیں ہوئی کیونکہ وہ پچھلے چند لمحات میں ایسی کسی بھی پوچھ گچھ سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوچکی تھی۔ اس نے رک کر فریدہ کی طرف دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

''آنٹی... گھر میں خاصی گھٹن ہورہی تھی۔ میں تازہ ہوا کھانے ذرا چھت پر گئی تھی۔''

''اس عمر میں واقعی بڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔'' فریدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں۔''

''کیا مطلب آنٹی؟'' بے اختیار اس کی زبان سے یہ سوال پھسل گیا۔

''مطلب مجھ بوڑھی سے کیا پوچھتی ہو۔'' وہ تیکھی نظر سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں؟''

سلمٰی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کہ اسے فریدہ آنٹی سے کوئی سوال کیے بغیر چپ چاپ آگے بڑھ جانا چاہیے تھا لیکن یہ غلطی تو اب ہوچکی تھی۔ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں آتے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ خاموشی سے آگے بڑھنے لگی تو فریدہ نے اس کی سماعت میں ایک دھماکا کیا۔

''سلمٰی! تم فکر نہیں کرو۔ میں اس سلسلے میں تمہارے ابو سے بات کروں گی۔''

''کک... کیوں؟'' وہ بوکھلا گئی۔

''ارے چندا... تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے تم سے کوئی بہت سنگین جرم سرزد ہوگیا ہو۔'' فریدہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں تو تمہارے فائدہ کے لیے ہی شاکر سے بات کرنے والی تھی۔''

''میرا فائدہ...؟'' سلمٰی کے پلّے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔

فریدہ اس کو مطمئن کرنے کی خاطر بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''میں تو شاکر سے یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ گھر میں اے سی لگوا لے تاکہ تمہاری گھٹن کا مسئلہ تو حل ہو۔''

سلمٰی استعجابیہ انداز میں اسے تکنے لگی۔

فریدہ نے کہا۔ ''دیکھو نا... اگر شاکر گھر میں اے سی لگوا لے گا تو تمہیں یوں آدھی رات کو اٹھ کر چھت پر تو نہیں جانا پڑے گا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے ٹھہری، ایک پُرسکون سانس خارج کی اور سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں بولی۔

''دیکھو نا... مجھے تمہارا اور تمہارے سکھ چین کا کتنا خیال ہے۔''

''بہت بہت شکریہ آنٹی!'' سلمٰی نے اضطراری انداز میں کہا اور تیزی سے زینہ اترتے ہوئے نیچے جانے لگی۔

''شکریہ کی بچی۔'' فریدہ دانت پیستے ہوئے زیرِلب بڑبڑائی۔

☆☆☆

سلمٰی نگاہ سے اوجھل ہوگئی تھی لیکن کامران ابھی تک ڈکٹ والی اسی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وہاں مزید تھوڑی دیر رک کر یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ بی بلاک کے زینے پر سلمٰی کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ پیش آجائے۔ اس بات کا امکان بہرحال موجود تھا کہ جس پُراسرار سائے کو اس نے تاریکی میں لہراتے ہوئے دیکھا تھا، وہ ادھر ہی کہیں زینے کے آس پاس کھڑا سلمٰی کی واپسی کا انتظار کررہا ہو۔

ہنگامی نوعیت کی صورتِ حال میں کامران کا ذہن اور بھی تیزی سے کام کرنے لگتا تھا۔ اسے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ چوکیدار دلدار کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا اور... دلدار کا منہ بند کرنا وہ بہ خوبی جانتا تھا۔

سلمٰی سے باتوں کے دوران میں اس نے دلدار کی ایک کمزوری کا ذکر کیا تھا اور وہ چوکیدار کی اسی کمزوری سے بہ آسانی کھیلنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ کامران جانتا تھا کہ دلدار نشہ کرتا ہے۔ وہ چرس کا عادی تھا لیکن یہ کام وہ بہت احتیاط سے اور چھپ کر کیا کرتا تھا۔ دلدار کی اس لت کا شاکر علی کو علم نہیں تھا۔

کامران نے سوچا، اگر چھت پر نظر آنے والا سایہ واقعی چوکیدار کا تھا تو وہ یقیناً اس سے بات کرے گا۔ نشہ کرنے

والے لوگ ہمیشہ اپنے جوڑ توڑ میں رہتے ہیں۔ چوکیدار کسی اور سے ذکر کرنے کے بجائے کامران ہی سے بات کرتا اور راز کو راز رکھنے کے عوض وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ کامران اس کام کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ وہ نہ صرف چوکیدار کی مالی ''امداد'' کرتا بلکہ اسے چرس کی چند ڈلیاں بھی مہیا کر دیتا۔ اس کا ایک دوست چرس فروش تھا۔ چوکیدار کی ضرورت پوری کرنا تو کامران کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

سلمٰی کو گئے جب پانچ منٹ گزر گئے اور کوئی ناخوشگوار صورتِ حال دیکھنے کو نہ ملی تو وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اب اسے بھی اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے جیسے ہی ڈکٹ کی منڈیر سے اٹھنے کا ارادہ کیا، اس کے سر پر گویا ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ وہ اتنا بھی نہ سوچ سکا کہ آخر اس کے ساتھ ہوا کیا ہے...!

☆☆☆

ٹونی پیشے کے اعتبار سے ایک خاکروب تھا یعنی سوئیپر...

اس کی عمر بیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ کتنی...؟ اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کبھی وہ اکیس بائیس کا نظر آتا اور کبھی اٹھائیس انتیس کا دکھائی دیتا تھا۔ بہرحال، وہ پچھلے پانچ سال سے اس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں صفائی دھلائی وغیرہ کا کام کر رہا تھا۔ وہ پستہ قامت اور مضبوط بدن کا مالک تھا۔ رنگت گہری سانولی اور سر کے بال گھنگریالے۔ بلڈنگ کے مکینوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی، ایک آدھ کو چھوڑ کر۔ بلاشبہ وہ محنتی اور فرماں بردار شخص تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔

ٹونی نے کام کے لیے اپنا ایک شیڈول بنا رکھا تھا۔ وہ پہلے بی بلاک کی صفائی کرتا اور اس کے بعد اے بلاک کی۔ مہینے میں دو یا تین مرتبہ وہ گیلریز اور زینے وغیرہ بھی دھوتا تھا۔ اسی طرح ہفتے دس دن میں وہ ڈکٹ کی صفائی بھی کر دیا کرتا تھا۔

اس روز بھی وہ حسبِ معمول بلاک بی سے ''نمٹنے'' کے بعد بلاک اے کی طرف آیا تھا۔ جب وہ ٹاپ فلور سے صفائی کرتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر پہنچا تو زلیخا آپا سے اس کا سامنا ہوا۔ زلیخا اس وقت اپنے دروازے میں کھڑی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''آپا! کچرا دے دو۔'' ٹونی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''کچرا تو میں تمہیں ضرور دوں گی۔'' زلیخا نے کہا۔ ''لیکن بیٹا! آج تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

زلیخا آپا بلاک اے کے گراؤنڈ فلور پر فلیٹ نمبر زیرو زیرو دو میں رہتی تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی اور مذکورہ فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی۔ زلیخا ایک ہمدرد اور خوش اخلاق خاتون تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ذہنی طور پر تھوڑی کھسکی ہوئی بھی تھی تاہم وہ دل کی بہت اچھی تھی اور اس کا ''کھسکا پن'' کسی چھوٹے بڑے کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بنتا تھا۔ ہر معاملے میں اس کا انداز درخواست کرنے والا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بلڈنگ کے مکین اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ٹونی، زلیخا آپا کے اسٹائل سے بہ خوبی واقف تھا۔ ویسے تو ہر کام کے لیے ہی اس کا انداز اور لہجہ منت آمیز ہوا کرتا تھا لیکن جب وہ ''میرا ایک کام کر دو...'' کے الفاظ ادا کرتی تو ٹونی کو یہ سمجھنے میں قطعی کوئی دقت محسوس نہ ہوتی کہ وہ کس کام کے لیے کہہ رہی ہے۔

''سمجھ گیا آپا۔'' ٹونی نے افسردگی سے کہا۔ ''تمہیں ڈکٹ کی صفائی کرانا ہوگی۔''

''تم بڑے ذہین ہو۔'' زلیخا نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''فوراً میری بات سمجھ جاتے ہو لیکن یہ کیا...'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟ تم خاصے پریشان نظر آ رہے ہو... خیریت تو ہے نا؟''

''آپا! میرے چھوٹے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' ٹونی نے جھاڑو کا کام جاری رکھتے ہوئے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''میں ادھر سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا گھر جاؤں گا۔''

''اوہ!'' زلیخا نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تو پھر چھوڑو... بعد میں کبھی ڈکٹ کی صفائی کر دینا۔''

''نہیں آپا!'' ٹونی نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''یہ کام میں آج ہی کروں گا۔ اسی بہانے میری سو پچاس کی آمدنی ہو جائے گی۔ بچے کی دوا بھی تو لانا ہے مجھے...''

ٹونی جب بھی ڈکٹ کی صفائی کرتا تھا، زلیخا آپا اپنی خوشی سے اسے سو پچاس پکڑا دیا کرتی تھی جو اس کے کام آ جاتے۔ ڈکٹ میں تو اور بھی کئی فلیٹس کی کھڑکیاں کھلتی تھیں لیکن ٹونی کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زلیخا آپا کی کھڑکی ہی سے گزر کر ڈکٹ کی صفائی کرے کیونکہ اس طرح اس کی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ باقی فلیٹ والے سوکھا ٹرخانے کی کوشش کرتے تھے یا یہ کہتے تھے کہ ان لوگوں سے جا کر مانگو جو تھیلیوں میں کچرا بھر بھر کر ڈکٹ میں پھینکتے ہیں اور رات بھر چھوٹے بڑے



...کوں کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔

''سو پچاس تو میں تمہیں ویسے ہی دے دوں گی۔'' زلیخا آپا نے کہا۔ ''یہی سمجھ لینا کہ اس بار ڈکٹ کی صفائی کے پیسے تمہیں ایڈوانس میں مل گئے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے آپا۔'' ٹونی نے احسان مندانہ نظر سے زلیخا کو دیکھا اور بولا۔ ''تم بڑی مہربان ہو، تم نے ہمیشہ میرا خیال رکھا ہے۔ یہ دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔ آج ہی ہو جائے گا تو تم بھی بدبو سے محفوظ ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر ویسے بھی شام ہی میں کلینک کھولے گا۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔'' زلیخا نے بڑی رسان سے کہا۔

''آپ راستے میں سے سامان وغیرہ ہٹاؤ۔'' ٹونی نے کہا۔ ''میں اس چالی کی جھاڑو نکال کر آتا ہوں۔''

زلیخا نے کہا۔ ''سب سامان ہٹایا ہوا ہے۔ تمہارے کام کا راستہ صاف ہے۔ تمہیں صرف عقبی کھڑکی کھولنا ہوگی۔ تعفن سے بچنے کے لیے میں کھڑکی کو مستقل بند رکھتی ہوں تو وہ جام ہو جاتی ہے، پھر مجھ سے کھلتی نہیں۔''

''آپ بے فکر ہو جاؤ آپا۔'' ٹونی نے مخصوص انداز میں فرش پر جھاڑو چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ٹونی کچرے والی ٹوکری کو اپنی ہتھ گاڑی میں الٹ کر واپس آ گیا۔ اس کی ہتھ گاڑی بلڈنگ کے گیٹ کے نزدیک کھڑی رہتی تھی۔ وہ کچرے کو ٹوکری بلکہ ٹوکرے میں بھر بھر کر مذکورہ ہتھ گاڑی تک پہنچاتا تھا اور آخر میں ہتھ گاڑی کو چلاتے ہوئے دو گلیاں دور کچرا کنڈی تک لے جاتا تھا۔

زلیخا آپا نے داخلی دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے تاکہ ٹونی بہ آسانی اپنے ٹوکرے کو باہر لا سکے۔ ٹونی مذکورہ ٹوکرے کو فرش پر گھسیٹتے ہوئے فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ جھاڑو وغیرہ ٹوکرے کے اندر ہی رکھا ہوا تھا۔ فلیٹ کے آخری حصے میں پہنچ کر اس نے اپنے سامان کو ایک طرف رکھا اور سلائیڈنگ ونڈو کو کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

زلیخا آپا نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ مذکورہ ونڈو کسی حد تک جام تھی لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ ٹونی بھی اسے نہ کھول سکے۔ اس نے کھڑکی کو ایک دو جھٹکے دیے تو وہ بڑی شرافت سے سلائیڈنگ پر آمادہ ہو گئی۔

ٹونی نے دھکیل کر کھڑکی کو پورا کھول دیا۔ پھر اس نے ٹوکرے میں سے جھاڑو نکالی اور کھڑکی کی منڈیر پر پاؤں رکھ کر ڈکٹ کے اندر کود گیا۔ ''دھپ'' کی مخصوص آواز پیدا ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ٹونی کی دل خراش چیخ ڈکٹ میں گونجی۔

زلیخا آپا گھبرا کر کھڑکی کی جانب دوڑی، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کیا ہوا ٹونی بیٹا؟''

جواب میں ٹونی کی دہشت بھری آواز ابھری۔ ''آپا... لل... لاش!''

☆☆☆

انسپکٹر اسد اپنے کمرے میں بیٹھا روزمرہ کی فائلوں کے مطالعے میں مصروف تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے اپنے سامنے کھلی فائل پر سے دھیان ہٹا کر ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھا پھر دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو...!'' اسد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''جی، پولیس اسٹیشن؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ آواز میں الجھن موجود تھی۔

''جی ہاں۔ میں پولیس اسٹیشن سے انسپکٹر اسد بات کر رہا ہوں۔'' اس نے بتایا پھر پوچھا۔ ''آپ کون...؟''

''ڈاکٹر ریاض۔'' دوسری طرف سے بولنے والے نے جواب دیا۔

''جی ڈاکٹر صاحب...!'' اسد نے کہا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''انسپکٹر صاحب! ہماری بلڈنگ میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔'' ڈاکٹر ریاض نے اضطراری لہجے میں بتایا۔ ''پلیز... آپ فوراً پہنچیں۔''

''اپنی بلڈنگ کا نام، ایڈریس اور لوکیشن بتائیں؟'' اسد نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ریاض نے فوراً مذکورہ معلومات فراہم کر دیں۔

ضروری نوٹس لینے کے بعد انسپکٹر اسد نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ میں بیس سے پچیس منٹ تک وقوعے پر پہنچتا ہوں۔''

''اوہ... تھینک یو انسپکٹر صاحب۔'' ڈاکٹر ریاض نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

اسد نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! جب تک میں موقع پر نہ پہنچ جاؤں، آپ کو وہاں موجود رہنا ہوگا۔''

''میں فی الحال کہیں نہیں جا رہا۔'' ڈاکٹر ریاض نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''آپ جب آئیں گے تو مجھے یہیں پائیں گے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر صاحب!'' اسد نے سلسلۂ گفتگو کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ انتظار کریں۔ بس، میں تھانے

سے نکل ہی رہا ہوں...''

دوسری جانب جب ڈاکٹر ریاض اس کا شکریہ ادا کر چکا تو اسد نے ریسیور کو کریڈل کر دیا۔ پھر اس نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلا لیا۔

کانسٹیبل نے اسد کے کمرے میں پہنچ کر اسے سیلوٹ کیا اور بولا۔ ''یس سر!''

''رحمت ہے تھانے میں؟'' اسد نے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''جی دیکھتا ہوں۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے انہیں دیکھا تو تھا۔''

''جاؤ جلدی... اور رحمت کو میرے پاس بھیجو۔''

''اوکے سر!'' کانسٹیبل نے ایک مرتبہ پھر سیلوٹ مارا اور کمرے سے نکل گیا۔

رحمت اے ایس آئی تھا۔ ہٹا کٹا اور لڑائی بھڑائی کا ماہر! بہ ظاہر وہ احمق اور چغد دکھائی دیتا تھا لیکن بعض اوقات وہ بڑے پتے کی بات کہہ کر سب کو چونکا دیا کرتا تھا۔ اس کی اسی خوبی کی بنا پر انسپکٹر اسد اسے پسند کرتا تھا۔ مشکل حالات میں جو بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہ اے ایس آئی رحمت کو پلک جھپکتے میں سوجھ جاتی تھی۔ عموماً رحمت زیادہ تر احمقانہ حرکتیں کرتا رہتا تھا جس سے اسد انجوائے کیا کرتا۔ اس کے علاوہ وہ بہت ہی نڈر اور جی دار بھی تھا۔ اگر اسے کنگ کانگ سے ٹکرانے کے لیے کہا جاتا تو وہ ایک لحہ سوچے بغیر مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ اسد کو رحمت کی صرف ایک عادت بہت بری لگتی تھی کہ وہ ایک ماہر ''پیدا گیر'' بھی تھا۔ مال بنانے کا کوئی بھی موقع رحمت کی نظر سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا بلکہ وہ تو اس نوعیت کے مواقع ازخود پیدا کرتا رہتا تھا۔ رشوت کو وہ اپنا حق سمجھتا تھا لہٰذا اسد کو اس پر بڑی گہری نگاہ رکھنا پڑتی تھی کیونکہ خود اسد ہر قسم کی بدعنوانی، رشوت ستانی اور فرائض سے مجرمانہ غفلت کے سخت خلاف تھا۔ اس کے سینئرز اور جونیئرز کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ اسد کو پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا کا باسی تھا۔ خود اسد بھی اپنے آپ کو محکمۂ پولیس میں بری طرح مس فٹ محسوس کرتا تھا۔

اے ایس آئی رحمت، اسد کے کمرے میں داخل ہوا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جی، سر جی؟''

''جی، سر جی'' بھی اس کا ایک تکیہ کلام تھا۔ ''بھی'' اس لیے کہ اس کے علاوہ بھی اس کے کئی ایک تکیہ ہائے کلام تھے۔

اسد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

''رحمت! قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے... ہمیں فوراً نکلنا ہے۔''

''جی، سر جی۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''سمجھیں کر ہم نکل پڑے... میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''خالی خولی باتوں سے بات نہیں بنے گی۔'' اسد نے قدرے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''جاؤ... اور نکلنے کی تیاری کرو۔''

''ابھی کر کے دکھاتا ہوں سر!''

یہ بھی رحمت کا ایک تکیہ کلام ہی تھا۔

☆☆☆

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ بہ مشکل دن کے گیارہ بجے ہوں گے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا، فضا کی ہر شے کو تیز دھوپ اور ہولا دینے والی گرمی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔ انہی صبر آزما لمحات میں گویا اس بلڈنگ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ بلاک اے کے گراؤنڈ فلور پر اس وقت بڑی ابتری اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سویپر ٹوٹی کے انکشاف نے بلڈنگ کے رہائشیوں اور آس پاس کے لوگوں کو زلیخا آپا کے گھر کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ وہاں درجنوں مرد و زن اور بچے بوڑھے موجود تھے۔ جن میں عدنان اور اس کی بیوی بشریٰ پیش پیش تھے۔ عدنان کو اس کی بیوی نے سوتے سے جگایا تھا۔

لاش کی شناخت میں چند سیکنڈ بھی صرف نہیں ہوئے تھے۔ وہ اسی بلڈنگ بلکہ اسی بلاک کا رہائشی تھا۔ مقتول کا نام کامران تھا اور وہ اپنی موت سے پہلے تک فلیٹ نمبر اے ایک سو سات میں اپنے بڑے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہتا تھا اور اس وقت کامران کی لاش ڈکٹ کے اندر، کچرے کے تعفن زدہ ڈھیر پر پڑی تھی۔

موقع پر موجود لوگ اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق، قتل کی اس واردات کے حوالے سے اظہارِ رائے کر رہے تھے لیکن وہ تمام تر آرا قیاس اور چہ میگوئیوں سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھیں۔ ''مکھیوں'' کی سی بھنبھناہٹ کے دوران میں بلڈنگ کے چوکیدار دلدار نے ایک اہم اعلان کیا۔

''پولیس آ گئی ہے...!''

☆☆☆

انسپکٹر اسد نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر سب سے پہلے ڈاکٹر ریاض کے بارے میں استفسار کیا پھر اسے اپنے ساتھ لے کر، زلیخا آپا کے فلیٹ کے اندر سے گزرتے ہوئے ڈکٹ میں پہنچ گیا۔ اے ایس آئی رحمت بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ناخوشگوار بدبو اور کچرے کی سڑاند سے بچنے کے لیے انہوں



نے اپنی ناکوں کو رومال وغیرہ سے ڈھانپ رکھا تھا۔

جائے وقوعہ کی ابتدائی کارروائی مکمل کرنے میں اسد نے بہ مشکل بیس منٹ صرف کیے۔ کامران کی لاش کے ابتدائی معائنے سے پتا چل گیا تھا کہ سر کے عقبی حصے میں کسی آہنی وزنی شے سے ضرب لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ مضروب مقام کی حالت خاصی خراب تھی۔ کھوپڑی چٹخ گئی تھی اور وہاں سے بے تحاشا خون کے اخراج کی تصدیق ہوتی تھی۔ اس کی قمیص کا کالر اور کالر سے نیچے کا حصہ خون میں تربتر تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد آلۂ قتل بھی مل گیا۔ وہ ایک آہنی راڈ تھی جس کے ایک سرے پر انسانی بال چپکے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ کامران کے سر کے بال تھے جو خون کے اخراج کی وجہ سے مذکورہ آہنی راڈ کے ایک سرے پر چپک گئے تھے۔ قاتل نے وہ راڈ بھی کامران کی لاش کے ساتھ ہی ڈکٹ میں پھینک دی تھی۔

اسد نے آلۂ قتل یعنی مذکورہ آہنی راڈ پر سے ایف پی اٹھانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ راڈ کے کسی بھی حصے پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ قاتل کوئی ایسا عیار اور ہوشیار شخص تھا جو جانتا تھا کہ اس کے فنگر پرنٹس پولیس تک نہیں پہنچنا چاہئیں۔ اس نے یا تو ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر یہ واردات کی تھی یا پھر واردات کے بعد آہنی سلاخ کو اچھی طرح صاف کر کے ڈکٹ میں پھینک دیا تھا تاکہ پولیس الجھتی رہے۔

موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اسد نے کامران کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا۔ آلۂ قتل کو بھی لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے لاش کے ساتھ ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اسد نے بہ شمول ڈاکٹر ریاض وہاں موجود افراد کے بیانات کا سلسلہ شروع کیا لیکن تسلی بخش نتائج سامنے نہ آ سکے۔ کامران کی شناخت تو سب نے کی لیکن کوئی بھی یہ نہ بتا سکا کہ اسے کس نے قتل کیا ہو گا۔ اسد نے بلڈنگ کے چوکیدار دلدار اور آپا زلیخا کا بھی بیان لیا اور خصوصاً زلیخا سے پوچھا۔

''کامران کی لاش تمہاری کھڑکی کے سامنے پڑی ملی ہے۔ تمہیں اس بارے میں ضرور کچھ پتا ہو گا؟''

وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ''اس ڈکٹ میں تو لوگ جانے کیا الا بلا پھینکتے رہتے ہیں۔ انسان کس کس شے کا حساب رکھے۔ آپ نے خود بھی وہاں کی حالت دیکھی ہے نا...!''

اسد کی ذہانت نے اس بات کا تو اندازہ لگا لیا تھا کہ کامران کو بلڈنگ کی چھت پر سے اس ڈکٹ میں پھینکا گیا تھا اور ڈکٹ کی کیفیت بتاتی تھی کہ غیر مہذب رہائشی وہاں پتا نہیں، کیا کیا پھینکتے رہتے تھے مگر کامران کچرے سے بھری ہوئی کوئی تھیلی نہیں تھا کہ اس کے ڈکٹ میں گرنے کی کسی کو خبر نہ ہوتی۔ اسی پوائنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسد نے زلیخا آپا سے سوال کیا۔

''جب کامران کی لاش اس ڈکٹ میں گری ہو گی تو یقیناً اس کے گرنے سے کوئی زوردار آواز بھی پیدا ہوئی ہو گی۔ تم نے ایسی کوئی آواز سنی تھی؟''

''نہیں۔'' زلیخا نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ اس ڈکٹ میں موجود کچرے کی بدبو اور سڑاند سے کسی حد تک محفوظ رہنے کے لیے میں یہ کھڑکی ہمیشہ بند رکھتی ہوں۔ میں کیا، جن جن کی کھڑکیاں ڈکٹ میں پڑتی ہیں، وہ بے چارے ایسا کرنے پر مجبور ہیں اور دوسری بات...'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہاں تو رات بھر کچھ نہ کچھ گرنے کی آوازیں ابھرتی ہی رہتی ہیں، کبھی دھیمی آواز اور کبھی قدرے بلند۔ بعض اوقات کچرے کی کوئی تھیلی پھٹتی ہے تو دھماکا بھی سنائی دیتا ہے۔ میرے کان ایسی آوازوں اور دھماکوں کے عادی ہو گئے ہیں لہٰذا میں نہیں جانتی کہ کامران کی لاش کب ڈکٹ میں پہنچی تھی...''

اسد نے ان تمام لوگوں سے بھی اسی نوعیت کے سوالات کیے جن کے فلیٹس کی کھڑکیاں ڈکٹ کی جانب کھلتی تھیں لیکن کہیں سے بھی کوئی ایسا جواب نہ آیا جو اس مرڈر کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوتا۔ اس پوچھ گچھ سے اسد کے اس خیال کو بھی تقویت ملی کہ قاتل نے بلڈنگ کی چھت پر کامران کی زندگی کا خاتمہ کیا ہو گا اور پھر اس کی لاش کو اوپر سے ڈکٹ میں پھینک دیا ہو گا۔

وہ چھت کے معائنے کے لیے زینے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

عدنان ایک اخبار میں نیوز انچارج تھا!

یہ روزنامہ چونکہ صبح کا تھا لہٰذا عدنان کی ڈیوٹی رات کی ہوا کرتی تھی۔ وہ شام سات بجے سے لے کر صبح تین بجے تک اخبار کے دفتر میں موجود رہتا۔ اس کے بعد گھر آ جاتا۔ گھر پہنچنے کے بعد اس کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ بستر پر گر کر انٹا غفیل

(گہری نیند سونا) ہو جاتا تھا پھر اس کی آنکھ گیارہ بارہ یا ایک بجے سے پہلے نہیں کھلتی تھی۔ یہ اس کا معمول تھا لیکن آج اسے معمول سے آدھا گھنٹا، ایک گھنٹا پہلے ہی جگا دیا گیا تھا اور وہ بھی اس اطلاع کے ساتھ کہ اس کے چھوٹے بھائی کامران کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔

اس وقت عدنان اور اس کی بیوی بشریٰ، انسپکٹر اسد کے رُوبرُو اپنے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسد چھت کے معائنے کے بعد سیدھا یہیں آیا تھا۔ چھت کے ماہرانہ معائنے سے کوئی ایسا اہم نکتہ سامنے نہیں آیا تھا جو اسد کے لیے راہنمائی کا وسیلہ بنتا۔ وہ عدنان اور بشریٰ سے جائے وقوعہ پر اور اب یہاں بھی ابتدائی پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ دونوں کامران کی ناگہانی موت پر پریشان تو تھے لیکن یہ واقعہ کیسے ہوا، کیوں ہوا اور کامران کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے، اس بارے میں ان میاں بیوی کو کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ گویا وہ کسی بھی طور اسد کے لیے مفید و متعاون ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔

عدنان نے تو یہ کہہ کر جان چھڑالی تھی۔ ''انسپکٹر صاحب! میں جب ڈیوٹی سے لیٹ نائٹ گھر آتا ہوں تو مجھے کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ میری پہلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ بستر پر گر کر گہری نیند میں چلا جاؤں۔ مجھے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اس وقت گھر میں کون موجود ہے اور کون موجود نہیں۔''

''عدنان صاحب! آپ جب ڈیوٹی سے واپس آتے ہیں تو آپ کے لیے دروازہ کون کھولتا ہے؟'' اس نے ایک اہم سوال کیا۔

''میں نے فلیٹ کے بیرونی دروازے کی ایک چابی اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لہٰذا مجھے کسی کو ڈسٹرب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔''

عدنان کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اسد، بشریٰ کی جانب متوجہ ہو گیا لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ شوہر کی موجودگی میں کھل کر بات نہیں کر رہی۔ اسد کو ایسا لگا کہ بشریٰ اس سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے، اسے کوئی اہم نکتہ بتانا چاہتی ہے لیکن عدنان کی وجہ سے ہچکچا رہی ہے۔

اسد کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ بشریٰ کو اپنے دیور کے قتل کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہے لیکن وہ اپنے شوہر سے خوف زدہ ہے اور اس کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

اسد نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ وہ عدنان کی غیر موجودگی میں بہت جلد بشریٰ سے ایک بھرپور ملاقات کرے گا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرسری سے لہجے میں بولا۔

''عدنان صاحب! آپ ماشاء اللہ صحافی ہیں۔ ایک معروف روزنامے سے آپ کا تعلق ہے۔ آپ اس کیس کی باریکیوں اور نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آپ سے بس میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے...!''

عدنان نے سوالیہ نظر سے اسد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''جی، انسپکٹر صاحب!''

''اپنے بھائی کے قتل کے حوالے سے اگر آپ کو کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پتا چلے تو مجھ سے ضرور شیئر کیجیے گا۔''

''جی ضرور... ضرور...'' عدنان نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

اسد ان کے فلیٹ سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اسد عام پولیس والوں سے بالکل مختلف تھا۔ اگر اس کے بدن پر پولیس کی وردی نہ بجی ہوتی تو کوئی اس کی باتوں سے اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کا تعلق محکمۂ پولیس سے ہو گا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ان معدودے چند پولیس آفیسرز میں سے ایک تھا جو پولیس ڈیپارٹمنٹ کو کمائی کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ سچے دل اور صاف نیت سے عوام کی خدمت اور قانون کی بالادستی قائم کرنے کے لیے روز و شب کوشاں نظر آتے ہیں اور ایسے ہی کھرے لوگوں کے لیے یہ محکمہ مصائب و مشکلات کے سمندر سے کم نہیں ہوتا۔ ہر چھوٹا بڑا پولیس والا ایسے لوگوں کے خلاف نظر آتا ہے کیونکہ وہ نہ تو خود لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔

اسد نے پولیس کا محکمہ بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ جوائن کیا تھا۔ اس کے ذہن میں معاشرے کی اصلاح کے بہت سے منصوبے تھے۔ وہ عوام کو آسانیاں اور سہولتیں فراہم کرنے کا عزم لے کر اس فیلڈ میں آیا تھا لیکن چند سالوں ہی میں اسے اندازہ... بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے مشن میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ محکمۂ پولیس میں اس کی حیثیت ایک چھوٹی مچھلی ایسی تھی اور اس کے اردگرد مگرمچھوں کا ہجوم تھا جو خطرناک دانتوں والے دہانے کھولے عوام اور خواص حتیٰ کہ خود اپنے محکمے کو بھی کچا چبا ڈالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دل برداشتہ ہو کر اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر کوئی اور کام کرے گا... کوئی ایسا کام جو اس کے لیے باعثِ فخر ہو!

اس نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو چھوڑنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن کسی بڑے کارنامے کے بعد رخصت ہونا چاہتا تھا کہ محکمۂ پولیس بھی اسے یاد رکھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب اسے کوئی عظیم کارنامہ انجام دینا پڑے۔ وہ اپنی اننگز کو ایک زبردست سکسر پر آف کرنے کا خواہاں تھا لیکن کوئی کانٹے کا کیس اس کے ہاتھ نہیں چڑھ رہا تھا۔ کامران مرڈر کیس بھی اس کی نظر میں اس درجے کا کیس نہیں تھا جو اس نے اپنے ذہن میں نقش کر رکھا تھا لیکن اسد کو قوی امید تھی کہ بہت جلد قدرت اسے ایک ایسا چانس دے گی کہ وہ بڑے فخر کے ساتھ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ''اللہ حافظ'' کہہ سکے گا۔

اس وقت اسد، رحمت کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا کامران مرڈر کیس پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ اسے پوسٹ مارٹم اور قتل کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد ہی کوئی لائن آف ایکشن طے کیا جا سکتا تھا کیونکہ اب تک اس نے جتنی پوچھ گچھ کی تھی اس کا کوئی خاطر خواہ اور تسلی بخش نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا تھا۔

گفتگو کے دوران رحمت نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اسد جانتا تھا، رحمت کی آنکھوں میں یہ چمک اس وقت نمودار ہوتی تھی جب اس کے ذہن میں کوئی سنسنی خیز نکتہ سر اٹھاتا تھا۔

''کیا بات ہے رحمت؟'' اسد نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جی، سر جی...'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوں گے؟''

''ناراض...!'' اسد نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ ''تم نے ایسا کیا کیا ہے جو میں تم سے ناراض ہوں گا؟''

''سر جی... میں بھول گیا تھا۔'' وہ احمقانہ انداز میں بولا۔ ''مجھے بالکل بھی یاد نہیں رہا تھا...''

''لیکن کیا یاد نہیں رہا تھا... تم کون سی بات بھول گئے تھے۔'' اسد نے قدرے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''کھل کر بتاؤ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''مقتول کی جامہ تلاشی کے دوران میں اس کی جیب سے مجھے ایک پرچہ ملا تھا۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ پرچہ میں آپ کو دینا بھول گیا تھا۔''

''کہاں ہے وہ پرچہ؟'' اسد نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ رحمت کے انکشاف نے اسے بُری طرح چونکا دیا تھا۔ ''لاؤ... دکھاؤ مجھے۔''

رحمت نے ڈرتے ڈرتے مذکورہ پرچہ اپنی جیب سے نکال کر اسد کی جانب بڑھا دیا۔

اسد نے جلدی سے اس تہ شدہ پرچے کو کھولا اور پڑھنے لگا۔ مذکورہ پرچے کی تحریر نہایت ہی مختصر سی تھی... صرف ایک جملے پر مشتمل۔ لکھا تھا...

''صاعقہ کا دعویٰ ہے کہ تمہاری محبت جھوٹی ہے۔''

اس جملے کے کچھ آگے تھا اور نہ ہی کچھ پیچھے۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ جملہ کسی لڑکی کی طرف سے ہے یا کسی لڑکے کی جانب سے۔ پرچہ چونکہ مقتول کی جیب سے برآمد ہوا تھا اور وہ لڑکا تھا، اس لیے سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی سمت سے کامران کے پاس پہنچا ہو گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ پرچہ کامران کا تحریر کردہ ہو اور اس نے کسی لڑکی کو دینے کے لیے جیب میں رکھ چھوڑا ہو۔

صورتِ حال بڑی غیر یقینی اور الجھی ہوئی تھی تاہم اسد کے لیے ایک خوش آئند بات یہ تھی کہ کامران کی ذات کے ساتھ کسی لڑکی کا نام بھی جڑا ہوا نظر آنے لگا تھا... گویا یہ کیس آگے چل کر سنگین کے ساتھ رنگین بھی ثابت ہونے والا تھا۔

''ہوں...!'' اسد نے ہونٹ بھینچے اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

اسد اور بشریٰ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت عدنان گھر میں موجود نہیں تھا۔ اسد موقع تاک کر بڑی ٹائمنگ کے ساتھ بشریٰ سے ملنے آیا تھا۔ اسے صرف پندرہ بیس منٹ میں اپنا کام مکمل کر لینا تھا اور ابھی دو گھنٹے تک عدنان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔

بشریٰ بھی عدنان کی عدم موجودگی میں خاصی مطمئن اور پُرسکون تھی۔ جب اسد نے اس سے کہا کہ وہ محسوس کر چکا تھا، وہ اپنے شوہر کے سامنے زبان کھولنے سے ہچکچا رہی ہے اسی لیے وہ تنہائی میں اس کا بیان لینے آیا ہے تو وہ پھٹ پڑی۔

''انسپکٹر صاحب!'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں اس وقت عدنان کی وجہ سے بہت خوف زدہ تھی۔ وہ بہت ہی شکی اور ظالم انسان ہے۔ ذرا ذرا سی بات کے لیے مجھے روئی کے مانند دُھنک کر رکھ دیتا ہے...''

اسد نے لوہا گرم دیکھا تو ضرب لگانے میں ایک لمحے کی

تاخیر نہ کی۔ اس نے ہمدردانہ انداز میں بشریٰ سے پوچھا۔
''کیا یہ سچ ہے کہ عدنان فلیٹ کے بیرونی دروازے کی ایک چابی ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہے اور رات گئے جب وہ ڈیوٹی سے واپس آتا ہے تو تمہیں جگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آجاتا ہے؟''
''جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''بلکہ کامران کے پاس بھی ہمیشہ ایک چابی رہتی تھی۔ وہ بھی اکثر رات کو دیر ہی سے گھر آیا کرتا تھا۔''
''کیا یہ اس کی جاب کا تقاضا تھا یا...؟''
''اونہہ... جاب...!'' بشریٰ نے برا سا منہ بنایا۔ ''اسے آوارہ گردی سے فرصت ہوتی تو کوئی جاب کرتا نا۔ گریجویشن کے بعد اس نے پڑھائی کو بھی ترک کر دیا تھا اور اِدھر اُدھر اپنے ہی جیسے فارغ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ اسی لیے...'' وہ لمحے بھر کو رکی، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''اسی لیے میں نے عدنان سے کہہ کر ایک چابی کامران کو بھی دلا دی تھی۔ دراصل، میں ذرا جلدی سونے کی عادی ہوں۔ دس یا زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے رات میں سونے کے لیے بستر پر لیٹ جاتی ہوں۔ عدنان کی تو مجبوری ہے کہ وہ اخبار کے آفس ہی سے رات کے آخری پہر واپس آتا ہے لیکن یہ کامران بھی کبھی آدھی رات سے پہلے واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں کچن سمیٹنے کے بعد اپنے وقت پر سو جایا کرتی تھی۔ یہ دونوں بھائی کب گھر میں داخل ہوتے ہیں، مجھے اس کی خبر نہیں ہو پاتی تھی۔ میری نیند بہت پکی ہے... گھوڑے بیچ کر سونے والی نیند! میں اگر رات کو جلدی سو جاتی ہوں تو صبح جلدی اٹھنے کی بھی عادی ہوں لہٰذا مجھے صبح ہی پتا چلتا تھا کہ وہ دونوں اپنے اپنے کمرے میں پڑے سو رہے ہیں۔''
''ہوں!'' اسد نے ایک ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ''وقوعے کی رات جب آپ اپنی روٹین کے مطابق، سونے کے لیے لیٹیں تو اس وقت تک ان دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا تھا؟''
''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' بشریٰ نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔
''آپ صبح جلدی اٹھنے کی عادی ہیں۔'' اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وقوعے کی اگلی صبح جب آپ بیدار ہوئیں تو ظاہر ہے، آپ کا دیور گھر میں موجود نہیں تھا۔ اسے غائب پا کر آپ کو عجیب سا نہیں لگا؟''
''کچھ خاص عجیب نہیں لگا تھا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''اور اس کی بھی ایک وجہ ہے...''
اسد نے کوئی سوال نہیں کیا اور استفسار یہ نظر سے بشریٰ کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''کامران پر مختلف دور میں مختلف جنون سوار ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً مارننگ واک... جوگنگ... باڈی بلڈنگ... فٹ بال وغیرہ...'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ ''اس نوعیت کی مصروفیات کے دنوں میں وہ علی الصباح گھر سے نکل جایا کرتا تھا۔ وقوعے کی اگلی صبح جب میں بیدار ہوئی اور کامران کو گھر میں موجود نہ پایا تو یہی سمجھی تھی کہ آج سے وہ پھر کسی ورزشانہ مہم میں لگ گیا ہے لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ... یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ خاموش ہو گئی۔
اسد چند لمحوں تک اسے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''بشریٰ صاحبہ! آپ نے تھوڑی دیر پہلے اپنے شوہر کے حوالے سے بتایا تھا کہ وہ بہت ہی ظالم اور شکی انسان ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ آپ سے مار پیٹ کرتا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ آپ پر کس قسم کا شک کرتا ہے؟''
جواب دینے سے پہلے بشریٰ تذبذب کا شکار نظر آئی جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ ذہن میں موجود بات کو اسد کے سامنے بیان کرنا چاہیے یا نہیں؟ اسد خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔
تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بشریٰ نے بتایا۔ ''عدنان کو میرے کردار پر شک ہے... وہ سمجھتا ہے، میں اس سے بے وفائی کر رہی ہوں۔''
''اس کا شک کس حوالے سے ہے؟'' اسد نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ بشریٰ کے انکشاف نے اس کے وجود میں سنسنی سی پھیلا دی تھی۔ ''میرا مطلب ہے، آپ کی بے وفائی کے سلسلے میں اس کے ذہن میں کس کا نام ہے...؟''
''کامران کا...!'' بشریٰ نے ایک اور انکشاف کیا۔
''کیا مطلب؟'' اسد کی حیرت میں تعجب بھی شامل ہو گیا۔
''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں انسپکٹر صاحب!'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر عدنان کو یقین دلانے کی کوشش کر چکی ہوں کہ کامران کو میں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہوں۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں جیسا وہ سمجھ رہا



ہے لیکن اس کے ذہن کا شک دور نہیں ہو رہا تھا اور... اب تو کامران ہی باقی نہیں رہا...!'' اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور خاموش ہو گئی۔
''ویری بیڈ...!'' اسد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کا شوہر ذہنی مریض تو نہیں؟''
''اب تو مجھے بھی یہی محسوس ہونے لگا تھا...'' بشریٰ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''کامران کی موت سے پہلے تک عدنان میرے ساتھ بڑا وحشیانہ برتاؤ کرتا تھا لیکن اس واقعے کے بعد سے وہ سناٹے میں ہے۔ ایک بار بھی اس نے مجھے ذرا سا نہیں ڈانٹا۔''
''اس کے ذہن میں موجود شک کا سبب جو ختم ہو گیا ہے!'' اسد نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''انسپکٹر صاحب!'' بشریٰ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔''
''ہاں ہاں... کہیں، کیا بات ہے؟'' اسد نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔
''میں نے آپ سے اپنی فیملی کے جو معاملات ڈسکس کیے ہیں...'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو اپنے اور عدنان کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ باتیں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہئیں۔ خصوصاً عدنان کو تو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے ورنہ وہ میری کھال ادھیڑ کر رکھ دے گا۔'' بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں سراسیمگی تیرنے لگی تھی۔
''آپ بالکل مطمئن اور بے فکر ہو جائیں۔'' اسد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ اس کے بدلے میں آپ کو بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا...!''
''جی فرمائیں؟'' بشریٰ متاملانہ نظر سے اسد کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''آپ بھی ہماری اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کریں گی۔'' اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور آئندہ بھی جب میں عدنان کی عدم موجودگی میں، میں آپ سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے آؤں گا تو آپ اس سلسلے میں بھرپور تعاون کریں گی۔''
''جی وعدہ!'' بشریٰ نے جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دی۔
''تھینک یُو!'' اسد اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
بشریٰ نے کہا۔ ''آپ کو جب بھی ملاقات کے لیے آنا ہو، فون پر ٹائم طے کر لیجیے گا۔'' پھر وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور اسی حلیے میں آیئے گا۔ میں لوگوں کو اپنے گھر کی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتی۔''
اسد کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی تھی کہ وہ اسپیشل مشن وغیرہ کے سلسلے میں پولیس یونیفارم کا استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ وہ بڑے ایزی ڈریس میں رہا کرتا تھا۔ عموماً وہ جینز اور شرٹ میں سرگرمِ عمل رہتا تھا اور شرٹ کو بھی وہ اوپن ہی رکھتا تھا یعنی اسے جینز کے اندر کرنے کا تکلف نہیں کیا کرتا تھا۔ شرٹ کی آستینیں اڑس کر وہ اور بھی ایزی ہو جاتا تھا۔ اس لباس اور حلیے میں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی پولیس آفیسر ہے۔ یونہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شریف النفس شوہر صبح کا ناشتا لینے نکلا ہو۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش بھی نہیں تھی کہ اسد ایک شریف النفس انسان، خیال رکھنے والا شوہر اور محبت کرنے والا باپ تھا۔ اس کی بیوی زہرا اور اکلوتی بیٹی فاطمہ اس کے ساتھ بہت خوش تھیں۔
''میں خود بھی اس بات کا بہت خیال رکھتا ہوں۔'' اسد نے بشریٰ کی تشویش کے جواب میں تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''اسی لیے میں پولیس یونیفارم میں آپ سے ملنے نہیں آیا۔ انشاء اللہ! میری آمد و شد سے آپ کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہوگی۔''
''بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی پھر کہا۔ ''کیا میں آپ کا نام...''
''انسپکٹر اسد!'' اسد نے اس کا سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی جواب دیا۔
بشریٰ، اسد کو دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی۔ ایک فوری خیال کے تحت اسد نے پوچھا۔ ''وقوعے کے روز جب میں تفتیش کے لیے آپ کے فلیٹ میں آیا تھا تو عدنان کی موجودگی میں آپ خاصی سہمی ہوئی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ آپ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتی ہیں لیکن عدنان کی وجہ سے خوف زدہ ہیں۔ میرا یہ احساس غلط تو نہیں تھا؟''
''نن... نہیں!'' بشریٰ کے چہرے پر ایسے آثار پیدا ہوئے جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔
''کیا وہ خاص بات یہی تھی؟'' اسد نے تصدیق طلب نظر سے اسے دیکھا۔ ''عدنان کے شک والی...!''
بشریٰ نے بڑی شدت سے گردن کو نفی میں جھٹکا اور اضطراری لہجے میں بولی۔ ''وہ... وہ کوئی اور بات تھی...''
''اور کون سی بات؟'' اسد الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

"جب آپ گراؤنڈ فلور پر لوگوں کے بیانات لے رہے تھے..." بشریٰ نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "تو میں نے آپ کے ہاتھ میں ایک آہنی راڈ دیکھی تھی..."

"ہاں ہاں... وہی آہنی راڈ تو آلۂ قتل ہے۔" اسد نے کہا۔ "جس کی مدد سے آپ کے دیور کامران کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے لیکن آپ مذکورہ راڈ کا ذکر کیوں کر رہی ہیں؟"

"میں نے اس راڈ کو چند دن پہلے بھی دیکھا تھا؟" بشریٰ نے اٹل انداز میں کہا۔

اسد نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "کہاں دیکھا تھا؟"

"اپنے گھر کے کچن میں...!"

☆☆☆

اسد اور فریدہ آنٹی تھانے میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ فریدہ، اسد کو کامران مرڈر کیس کے حوالے سے کوئی اہم بات بتانے آئی تھی۔ اپنا مکمل تعارف کرانے کے بعد اس نے اسد سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! اگر آپ اس بات کا وعدہ کریں کہ میرا نام اور ذکر کہیں نہیں آئے گا تو میں آپ کو ایک سنسنی خیز راز سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں وہ سنسنی خیز راز سننے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔" اسد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "کہ مجھے آپ سے کوئی وعدہ کرنا چاہیے یا نہیں!"

فریدہ چند لمحوں تک متاملانہ نظر سے اسد کو دیکھنے کے بعد فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "جناب! پچھلے کچھ عرصے سے مقتول کامران اور سلمیٰ کا چکر چل رہا تھا۔"

"چکر!" اسد نے تصدیقی انداز میں کہا۔ "آپ کا مطلب، عاشقی معشوقی وغیرہ؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں یہی کہنا چاہ رہی ہوں۔ میں نے کافی عرصے سے ان پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر بلڈنگ کی چھت پر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ وقوعے کی رات بھی وہ چھت پر موجود تھے۔ میں نے زینے کے دروازے کے پیچھے چھپ کر انہیں راز و نیاز کرتے دیکھا تھا۔"

"کافی عرصے سے" کے الفاظ فریدہ نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے تھے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ سلمیٰ اور کامران کی محبت ابھی تازہ تازہ تھی، اتنی تازہ کہ اس میں سے جذبات کی بھاپ اڑتی ہوئی فریدہ نے بھی دیکھ لی تھی۔ اسے ان دونوں کے پیچھے پڑے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ ان کی چوری پکڑنے میں بہت جلدی کامیاب ہو گئی تھی۔

"ہوں...!" اسد نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "یہ سلمیٰ کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟"

"سلمیٰ ہماری بلڈنگ کی کمیٹی کے صدر کی اکلوتی بیٹی ہے جناب!" فریدہ نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ "شاکر علی اور سلمیٰ بلاک بی کے فلیٹ نمبر دو سو چھ میں رہتے ہیں۔ سلمیٰ کی والدہ صفیہ بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔"

"میں سوچوں گا کہ آپ کی فراہم کردہ معلومات سے اس کیس کو حل کرنے میں کس حد تک مدد مل سکتی ہے۔" اسد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

اسد کو الجھتے دیکھ کر فریدہ نے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

"وقوعے کے روز جب میں لوگوں کے بیانات لے رہا تھا تو آپ وہاں مجھے دکھائی نہیں دی تھیں۔" اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "سلمیٰ اور کامران کی محبت والا راز اس وقت آپ نے مجھ پر منکشف کیوں نہیں کیا تھا؟"

"مصلحتاً...!" فریدہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اس میں بھلا کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟"

"میں سلمیٰ کے باپ شاکر کی نگاہ میں نہیں آنا چاہتی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "شاکر ایک اکھڑ مزاج اور غنڈا فطرت شخص ہے۔ میں خوامخواہ اسے اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتی ہوں اسی لیے خاموشی سے آپ کے پاس آ کر بیان دے رہی ہوں اور آپ سے بھی میری درخواست ہے کہ..." وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس پورے کیس میں آپ مجھے کہیں اچاگر نہیں کریں گے۔ شاکر کمیٹی کا صدر ہے اور اس کے بعض جرائم پیشہ افراد کے ساتھ تعلقات بھی ہیں۔ میں خوامخواہ کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ بلاک بی ہی کے ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔ آپ میری نازک پوزیشن بلکہ مجبوری کو تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔"

"بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

"یہ صاعقہ کون ہے؟"



"صاعقہ جمیلہ کی بیٹی ہے۔" فریدہ نے بے ساختہ جواب دیا۔ "اس کا باپ اسحاق نوٹ کمانے دبئی گیا ہوا ہے۔ صاعقہ اور جمیلہ بلاک بی کے فلیٹ نمبر چار سو دو میں رہتی ہیں... مجھ سے ایک بالا نیچے۔"

"صاعقہ اور سلمیٰ میں کوئی خاص تعلق ہے؟" اسد نے دریافت کیا۔

"دونوں گہری دوست ہیں۔"

☆☆☆

بشریٰ کے انکشاف نے اسد کی نظر میں عدنان کی پوزیشن کو خاصا مشکوک بنا دیا تھا۔ ان کے کچن میں سنک کے نیچے ایک چھوٹا سا کیبنٹ بنا ہوا تھا جس کے آگے ایک پٹ کا دروازہ بھی لگا ہوا تھا۔ مذکورہ کیبنٹ میں بلیچ، سوئپ، فینائل اور واش روم کلینزر وغیرہ کی بوتلیں رکھی رہتی تھیں۔ انہی بوتلوں کے عقب میں بشریٰ نے وہ آہنی سلاخ رکھی دیکھی تھی جس سے کامران کی کھوپڑی چٹخا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بشریٰ کا دعویٰ تھا کہ وہ سلاخ اس نے کیبنٹ کے اندر نہیں رکھی تھی۔ اگر بشریٰ نے نہیں رکھی تھی تو ظاہر ہے پھر عدنان ہی نے وہ سلاخ کیبنٹ میں چھپائی ہوگی!

علاوہ ازیں عدنان اپنی بیوی کے کردار کی جانب سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ بشریٰ اور کامران میں کوئی سنگین چکر چل رہا ہے۔ اس تناظر میں یہ سوچا جا سکتا تھا کہ عدنان نے وہ سلاخ اپنی بیوی یا بھائی میں سے کسی کو مزہ چکھانے کے لیے کیبنٹ میں چھپا کر رکھی ہوگی۔ کامران کی موت اسی سلاخ کی مدد سے واقع ہوئی تھی لہٰذا عدنان کی ذات شکوک و شبہات کے حلقے میں بند دکھائی دیتی تھی۔

اسد، عدنان پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے بشریٰ کا ذکر کیے بغیر عدنان سے آہنی راڈ کے بارے میں گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن اس حوالے سے اس نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔

"میں نے اس راڈ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" اسد کے استفسار کے جواب میں عدنان نے حتمی انداز میں کہا۔ "نہ اپنے گھر میں، نہ دفتر میں اور نہ ہی کہیں اور..."

اسد نے فریدہ آنٹی کے بیان کی روشنی میں سوال کیا۔ "کیا آپ کے چھوٹے بھائی کا کسی لڑکی سے عشق وغیرہ بھی چل رہا تھا؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ خبر نہیں۔" وہ روکھے پھیکے انداز میں بولا۔

"میں نے سنا ہے، بی بلاک میں رہنے والی ایک لڑکی سلمیٰ سے کامران محبت کرتا تھا۔" اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ دونوں رات میں چھپ چھپ کر بلڈنگ کی چھت پر ملا کرتے تھے... میں شاکر علی کی بیٹی سلمیٰ کی بات کر رہا ہوں۔"

"یہ میرے لیے ایک انکشاف ہے۔" عدنان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔ کامران کیا، بلڈنگ کا کوئی بھی نوجوان شاکر کی بیٹی سے عشق لڑانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ سب اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بہت رعب داب والا بندہ ہے جناب!"

"لیکن عشق اور محبت کسی کے رعب داب میں نہیں آتے عدنان صاحب!" اسد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اتنا تو آپ کو بھی پتا ہی ہوگا؟"

"آپ اتنے وثوق سے کہہ رہے ہیں تو ہو سکتا ہے، آپ ہی کی بات درست ہو۔" عدنان نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

اسد نے اس کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی۔ وہ مربوط پلاننگ سے اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا تاکہ بشریٰ کا ذکر آئے بغیر وہ اسے اپنی گرفت میں جکڑ سکے۔

☆☆☆

اسد اور رحمت تھانے میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔

اس کیس میں ابھی تک جو پیش رفت ہوئی تھی اس ذیل میں سلمیٰ، صاعقہ، فریدہ، شاکر اور عدنان کے نام ہائی لائٹ ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں بشریٰ اور مقتول کے مبینہ تعلقات کے حوالے سے عدنان کا قوی شک اور سلمیٰ و مقتول کی محبت بھی اجاگر ہوئی تھی۔ اسی دوران میں پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ چکی تھی۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق، مقتول کامران کی موت وقوعے کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آہنی سلاخ کے خطرناک وار سے کھوپڑی چٹخا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ راڈ کے ایک سرے پر چپکے ہوئے خون آلود بال کے لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا تھا کہ وہ کامران ہی کے سر کے بال ہیں۔ آلۂ قتل یعنی آہنی راڈ پر کسی کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے تھے۔ اسد چونکہ مکمل ہوم ورک کے بعد عدنان پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے گمبھیر لہجے میں رحمت سے کہا۔

"رحمت! تمہاری صلاحیتوں کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔"

"جی، سر جی!" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"تمہیں بہت سارے کام کرنا ہوں گے۔" اسد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

رحمت بے ساختہ بولا۔ "ابھی کر کے دکھاتا ہوں۔"

"مثلاً... کیا کر کے دکھاتے ہو؟" اسد نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

"سب معلوم ہے سر!" رحمت معنی خیز انداز میں بولا۔

"سب معلوم ہے سر" بھی رحمت کا ایک تکیہ کلام تھا۔

"کچھ مجھے بھی تو پتا چلے، تمہیں کیا معلوم ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"یہی کہ... یہی کہ..." وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے اس کیس کے مختلف کرداروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حکم دیں گے مثلاً صاعقہ، سلمٰی، عدنان وغیرہ... اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کریں گے کہ اس سلسلے میں مجھے بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

"احتیاط سے کام تو تمہیں ہر صورت میں لینا ہوگا رحمت!" اسد نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "لیکن تم نے جو نام گنوائے ہیں ان میں شاکر علی اور فریدہ کا نام بھی شامل کر لو۔"

"ابھی کر کے دکھاتا ہوں..." رحمت نے بے ساختہ کہا۔

☆☆☆

اسد فون پر رابطہ کرنے کے بعد، ایک مرتبہ پھر عدنان کی غیر موجودگی میں بشریٰ سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ اس بار بھی وہ عوامی لباس میں تھا اور اس نے کوشش کی تھی کہ کوئی اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھ نہ سکے۔ اس نے احتیاط کے دامن کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے بشریٰ سے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں کامران کے قتل میں عدنان کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں اسد صاحب!" وہ اسد کو اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے اسے اپنی آنکھوں سے تو ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ویسے یہ ہے کہ..." وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر بات مکمل کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"عدنان کا غصہ بہت خطرناک ہے۔ غصے کی حالت میں اس سے کسی بھی سنگین فعل کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

اسد بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا کہ بشریٰ کو کامران کے قتل کے حوالے سے اپنے شوہر پر شک تو ہے لیکن وہ کھل کر اپنے شک کا اظہار نہیں کرنا چاہتی اور اس کی ہچکچاہٹ کا سبب بھی اسد کو معلوم تھا۔ عدنان اس سے بے دریغ مار پیٹ کرتا تھا لہٰذا وہ اس کے حوالے سے زبان کھولتے ہوئے ہمیشہ خوف زدہ رہتی تھی۔

"عدنان سے پوچھ گچھ کرنے میں اخبار کے دفتر گیا تھا۔" اسد نے کہا۔ "لیکن اس نے آلۂ قتل یعنی آہنی راڈ کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے... وہی راڈ جو تم نے سنک کے نیچے بنی کیبنٹ میں رکھی دیکھی تھی۔"

آخری جملہ اسد نے بڑے تیکھے انداز میں ادا کیا تھا۔ بشریٰ نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "اسد صاحب! میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ آپ کو بتا دیا۔ وہ آہنی راڈ میں نے وہاں نہیں رکھی تھی۔ اب کامران نے رکھی تھی یا عدنان نے، میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی ..... پھر دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس گھر میں ہم تینوں کے سوا اور تو کوئی رہتا نہیں تھا۔"

اسد نے بشریٰ سے کامران اور سلمٰی کی محبت کے بارے میں بھی استفسار کیا لیکن وہ اس حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔

مزید چند منٹ وہاں رکنے کے بعد اسد واپس آ گیا۔

☆☆☆

اسد نے پوچھ گچھ کی غرض سے فریدہ آنٹی کو تھانے بلا لیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں نے اپنے طور پر کامران اور سلمٰی کے چکر کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی ہے لیکن مجھے کہیں سے بھی تصدیق نہیں ملی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"انسپکٹر صاحب! میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی آپ کو بتایا ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "آپ چاہیں تو بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ میں نے آپ سے رتی برابر جھوٹ نہیں بولا۔"

"میں نے فرداً فرداً عدنان اور بشریٰ سے کامران اور سلمٰی کی محبت کے حوالے سے پوچھا ہے۔" اسد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "وہ دونوں اس معاملے سے مکمل طور پر ناواقف ہیں۔"

"یہ ان میاں بیوی کی نالائقی ہے انسپکٹر صاحب!" فریدہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "میں اس بارے میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہاں، البتہ ایک بات ہو سکتی ہے...!" وہ چونکنے والے انداز میں خاموش ہو گئی۔



"کون سی بات؟" اسد نے جلدی سے پوچھا۔

"سلمٰی کا باپ کسی غنڈے سے کم نہیں۔" فریدہ نے آواز دبا کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ "سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، عدنان اور بشریٰ نے بھی اس کی بیٹی سلمٰی کا ذکر کرنے سے احتیاط برتی ہو۔ اس بلڈنگ کا کوئی بھی مکین شاکر سے دشمنی کا رسک لینے کو تیار نہیں ہوگا۔"

"شاکر کتنا بڑا غنڈا ہے، یہ تو میں دیکھ ہی لوں گا لیکن ایک بات آپ بھی ذہن میں رکھنا..." اسد نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "اگر کسی موقع پر پتا چلا کہ آپ نے کامران اور سلمٰی کے چکر کے حوالے سے، مجھ سے کوئی غلط بیانی کی ہے تو بہت برا ہوگا...!"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" اسد نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

اگلے روز اسد صاعقہ کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں مقتول کامران کی تدفین ہو چکی تھی اور سوئم کے بعد بلڈنگ کے حالات تقریباً معمول پر آ گئے تھے۔ صاعقہ اپنی والدہ کے ساتھ بی بلاک کے فلیٹ نمبر چار سو دو میں رہتی تھی۔ اسد اس وقت بھی سول ڈریس میں تھا لہٰذا فلیٹ کے اندر داخل ہونے کے لیے اسے اپنا مختصر سا تعارف کرانا پڑا۔

صاعقہ کی والدہ جمیلہ اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ وہ روزمرہ کی خریداری کے لیے مارکیٹ گئی ہوئی تھی تاہم صاعقہ نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسد کو اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا۔ اسد کو صاعقہ کا یہ عمل حیرت انگیز لگا تھا۔ اصولی طور پر ایک اکیلی لڑکی کو کسی غیر شخص کو گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دینا چاہیے تھی۔ صاعقہ کے اسٹائل سے اسد کو یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایک بولڈ اور اسمارٹ لڑکی تھی۔

اسد ڈرائنگ روم میں براجمان ہونے کے بعد چند لمحوں تک صاعقہ کا بہ غور جائزہ لیتا رہا۔ اس کی عمر پچیس کے اریب قریب تھی۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک دلکش اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس پر صاعقہ کی بے باکی اور جرأت نے اس کی اسمارٹ نیس میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ زیرلب مسکراتی رہتی تھی اور اس مسکراہٹ سے ایک عیاری اور مکاری جھلکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے ذہن میں کچھ اور، زبان پر کچھ اور ہو۔ صاعقہ کا ہیئر اسٹائل کچھ اس قسم کا تھا کہ بالوں نے اس کے چہرے کے ایک حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اسد کو اس کی صرف ڈیڑھ آنکھ نظر آ رہی تھی جس میں شوخی اور شرارت کھیلتی دکھائی دیتی تھی۔

اسد کو اس سے اپنی مرضی کی بات اگلوانے کے لیے ذرا محنت نہیں کرنا پڑی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ پہلے ہی سے اس بات کے لیے تیار بیٹھی تھی کہ کوئی آئے اور اس سے پوچھے۔ جب اسد نے کامران اور سلمٰی کی محبت کے بارے میں اس سے پوچھا تو وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

"میں اسے محبت نہیں سمجھتی۔ کامران ایک فلرٹ تھا۔ وہ اسی طرح اپنی محبت کا یقین دلا کر لڑکیوں کو بے وقوف بناتا رہتا تھا۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے تو ایسے کہہ رہی ہو کہ جیسے..." اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ذاتی طور پر ایسا کوئی تلخ تجربہ ہو چکا ہو...؟"

"میں انکار نہیں کروں گی۔" وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر گہری سنجیدگی سے بولی۔ "سلمٰی سے پہلے کامران مجھے بھی محبت کا فریب دیتا رہا تھا لیکن جیسے ہی مجھے اس کے ہرجائی پن کا احساس ہوا، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بلاشبہ ایک بے وفا لڑکا تھا۔ مرنے والے کی برائی کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن آپ نے پوچھا ہے تو میں کامران کی حقیقت بتانے پر مجبور ہوں۔"

اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اسد کا ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا لیکن صاعقہ ایسی نڈر، خود اعتماد اور بے باک لڑکی سے وہ آج پہلی مرتبہ مل رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں چونکہ کامران کی اصلیت کا علم تھا اسی لیے تم سلمٰی کو اس سے ملنے سے روکا کرتی تھیں؟"

"ظاہر ہے، سلمٰی میری بیسٹ فرینڈ ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔ "اس کو سیاہ و سفید کی پہچان کرانا میرا فرض بنتا تھا۔"

صاعقہ کے جواب سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ مقتول کامران کی جامہ تلاشی سے برآمد ہونے والا ایک سطری پرچہ سلمٰی کا تحریر کردہ تھا جس میں اس نے اپنی دوست صاعقہ کا ذکر کیا تھا۔

اسد نے سوال کیا۔ "کیا تمہارے روکنے سے سلمٰی کو عقل آ گئی تھی؟"

"اگر میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہوتی تو وہ فوراً کامران سے قطع تعلق کر لیتی۔" صاعقہ نے شکست خوردہ انداز میں جواب دیا۔ "لیکن ایسا کچھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، کامران نے سلمٰی کو پوری طرح اپنی محبت کی گرفت میں لے رکھا تھا؟"

”محبت کی گرفت نہیں، فریب کا جال کہیں جناب...!“

”چلو یہی سمجھ لو...“

”ہاں!“ اس نے بڑی شدت سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”کامران کی جھوٹی محبت نے سلمٰی کی مت ماردی تھی۔“

اسد نے اچانک سوال کیا۔ ”تمہارے خیال میں کامران کا مرڈر کس نے کیا ہوگا؟“

اس سوال نے صاعقہ کو ذہنی طور پر الجھا دیا۔ وہ متذبذب نظر سے اسد کو دیکھنے لگی۔ اسد نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ کام سلمٰی کا باپ شاکر علی بھی تو کرسکتا ہے...؟“

صاعقہ کی آنکھوں میں حیرت آمیز سنسنی کے آثار نمودار ہوئے اور بے ساختہ اس کی زبان سے پھسل گیا۔

”ہاں...ایسا ہوسکتا ہے!“

☆☆☆

قاتل کی تلاش کے حوالے سے اسد کی تحقیق دو ٹریک پر دوڑ رہی تھی۔ نمبر ایک، عدنان ٹریک۔ نمبر دو، شاکر ٹریک۔ اب تک کی تفتیش اور شواہد کے مطابق، انہی میں سے کسی ایک شخص نے کامران کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ عدنان پر تو اسد نے نہایت ہی خفیہ انداز میں کام جاری رکھا ہوا تھا، شاکر کو بھی پوچھ گچھ کے لیے اس نے پولیس اسٹیشن بلالیا۔

شاکر اپنی وضع قطع اور حلیے سے کسی ایکشن فلم کا ولن دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نجو بابا کے انداز میں سر کے بال بڑھا رکھے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ جس کے شیشے نیلگوں تھے۔ مونچھیں ہلکی اور ”آٹھ بیس“ کے اسٹائل والی۔ ڈاڑھی کے نام پہ اس کی ٹھوڑی پر، ہونٹوں کے نیچے بالوں کی ایک دھاری سی نظر آتی تھی جیسے سر کے بالوں کی قلم نکلی ہوئی ہو۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور دراز قامت تھا۔ رنگت گندمی اور چہرے کے عضلات سے غصیلے پن کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن بدمعاشوں والے انداز میں کھلے ہوئے تھے اور اس نے گلے میں ایک مستطیل لاکٹ بھی پہن رکھا تھا۔ الغرض، اس پر ایک نگاہ ڈالنے سے ذہن میں کوئی خوش گوار تاثر نہیں ابھرتا تھا۔

اسد نے مختصر الفاظ میں شاکر کے بلاوے کا مقصد بیان کیا پھر اس کی رائے جاننے کے لیے پوچھ لیا۔ ”شاکر! آپ اس بلڈنگ کی کمیٹی کے صدر ہو جہاں قتل کی یہ واردات ہوئی ہے۔ آپ سے زیادہ باخبر اور کوئی نہیں ہوسکتا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو آپ وقوعے کے روز مجھے بلڈنگ میں نظر آئے اور نہ ہی بعد میں مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس عدم دلچسپی کی کوئی خاص وجہ؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”آپ جسے عدم دلچسپی کہہ رہے ہیں، میری نظر میں وہ محض ایک اتفاق ہے۔“

”اتفاق...!“ اسد نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیسا اتفاق؟“

”پہلی بات تو یہ کہ جس رات کامران کا قتل ہوا، اس کی اگلی صبح مجھے ایک ضروری کام سے حیدرآباد جانا پڑ گیا تھا۔“ شاکر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اسی لیے مجھے آپ نے جائے وقوعہ پر کہیں نہیں دیکھا۔ جب میں اس شام حیدرآباد سے واپس آیا تو مجھے اس واقعے کی خبر ہوئی۔ دوسری بات...“ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمام حالات جان کر اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ آپ بالکل اطمینان بخش انداز میں تفتیش کو آگے بڑھا رہے ہیں لہٰذا میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ نہ تو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرتا ہوں اور نہ ہی اپنے معاملات میں مجھے دوسروں کی مداخلت پسند ہے۔“

شاکر کے انداز نے اسد کو سمجھا دیا کہ وہ کس مزاج کا آدمی ہے۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جاننا چاہا۔ ”آپ کے خیال میں کامران کو کون قتل کرسکتا ہے؟“

”اس کا واضح جواب دینا تو میرے اختیار میں نہیں۔“ اس نے فلمی ولن کے انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میری نظر میں کامران کوئی اچھا لڑکا نہیں تھا۔ میں اسے آوارہ اور بدمعاش ہی کہہ سکتا ہوں۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی الٹے سیدھے لوگوں کے ساتھ ہی تھا...“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

”ہوسکتا ہے، کسی نے کوئی دشمنی نکالنے کے لیے چپکے سے اسے ٹھکانے لگا دیا ہو۔ آس پاس کی عمارتوں کی چھتیں ہماری بلڈنگ کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ لڑکے ایک چھت سے دوسری چھت پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اس قسم کا کام اور بھی آسان ہوجاتا ہے۔“

”آپ اپنی بلڈنگ کی کمیٹی کے صدر ہیں۔“ اسد نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کا فرض بنتا ہے کہ اپنی بلڈنگ کی چھت کی باؤنڈری کھنچوادیں تاکہ غیر متعلقہ افراد کی کود پھاند رک جائے۔“



”یہ آئیڈیا میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔“ وہ چشمے کے پیچھے سے بڑی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”لیکن پرابلم یہ ہے کہ چھت کی باؤنڈری کھنچوانے کے لیے بلاکس کی چنائی کروانا پڑے گی جس کے لیے بلاکس، سیمنٹ، ریت، بجری، مزدور اور ان کی اجرت چاہیے ہوگی... اور یہ تمام کام صرف اور صرف پیسے سے ہوسکتے ہیں۔ کمیٹی کا صدر ہونے کا مطلب نہیں کہ میں اپنی جیب سے یہ کارِ خیر کرتا پھروں۔“

”اپنی جیب سے کیوں؟“ اسد نے کہا۔ ”آپ اس مقصد کے لیے بلڈنگ کے رہائشیوں سے کلیکشن کر سکتے ہیں۔“

”کلیکشن!“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”مینٹی نینس کے چار سو روپے دیتے ہوئے تو لوگوں کی جان جاتی ہے۔ ایکسٹرا کلیکشن کون دے گا؟ پانی والی ایک موٹر خراب پڑی ہے، پانی والے زیرِ زمین ٹینکوں کی صفائی پچھلے پانچ سال سے نہیں ہوئی۔ صحن کی لائٹس کا معاملہ بھی پچھلے کئی ماہ سے لٹکا ہوا ہے۔“ وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں۔ یہاں تو مسائل کی ایک قطار لگی ہوئی ہے۔“

اسد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

صاعقہ سے پہلی ہی ملاقات میں اسد کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ تھوڑی سی بھی کوشش کرے گا تو اسے بہ آسانی اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ مرد تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس پر فریفتہ ہوسکتی تھی تاہم اسد، صاعقہ سے کوئی باقاعدہ عشق وغیرہ لڑانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو اسے اعتماد میں لے کر ایک مہرے کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ لڑکی ہے بڑے کام کی...!

اسد نے اپنی حرکات وسکنات سے صاعقہ کو یقین دلا دیا کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ دونوں میں موبائل فون کے نمبروں کا تبادلہ ہوگیا۔ صاعقہ کی بے باکی اور آزاد خیالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسد، کامران کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اگلے روز صاعقہ کو ایک قریبی ریسٹورنٹ میں بلایا پھر فریدہ اور شاکر سے ہونے والی اپنی ملاقاتوں کے بارے میں اسے تفصیلاً بتادیا پھر پوچھا۔

”اگر میں سلمٰی پر ہاتھ ڈالوں اور وہ کامران سے اپنے تعلقات کا اعتراف نہ کرے تو کیا تم گواہی دینے کے لیے شاکر کا سامنا کرسکتی ہو؟“

صاعقہ نے بے دھڑک جواب دیا۔ ”ہاں۔“

☆☆☆

اسی روز شام میں اسد نے فریدہ آنٹی سے ملاقات کی اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں آپ کے خیالات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ حالات و واقعات کامران کے قاتل کے حوالے سے شاکر علی کی جانب اشارہ کررہے ہیں۔“

”تو آپ جلدی سے شاکر کو کامران کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیں۔“ فریدہ نے بے ساختہ کہا۔

فریدہ جب اس سے پہلے اسد سے ملی تھی تو اس نے صرف اتنا بتایا تھا، سلمٰی اور کامران میں پیار محبت کا کوئی چکر چل رہا تھا، اس نے واضح الفاظ میں شاکر کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اسد نے اس کے انداز سے بھانپ لیا تھا کہ وہ شاکر کو قطعی پسند نہیں کرتی اور اس وقت اس نے بے ساختہ جس خواہش کا اظہار کیا تھا، اس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا تھا۔

فریدہ کے برجستہ جواب نے اسد کا کام آسان کردیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متذبذب لہجے میں بولا۔ یہ اس کی سراسر اداکاری تھی۔

”اس کو گرفتار تو میں کرلوں لیکن ایک قباحت ہے...!“

”کیسی قباحت؟“ فریدہ نے پُراشتیاق نظر سے اسد کو دیکھا۔

”اس کی گرفتاری کے لیے مجھے آپ کی گواہی کی ضرورت ہوگی۔“

”کس قسم کی گواہی؟“

”آپ اس امر کی عینی شاہد ہیں کہ کامران اور سلمٰی کے درمیان عشق بازی جاری تھی۔“ اسد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر میں اس معاملے کو اوپن کرتا ہوں تو آپ کو اس بات کی گواہی دینا ہوگی جو کچھ آپ نے بلڈنگ کی چھت پر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

”لیکن شاکر...؟“ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

”شاکر کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ اسد نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اگر آپ میری ہدایات پر عمل کریں گی تو شاکر آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔“

فریدہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے، میں گواہی دوں گی...!“

☆☆☆

اسد طریقے سلیقے سے کام کرنے کا عادی تھا!

وہ عام پولیس والوں سے بہت مختلف تھا اور مشکوک افراد کی خوامخواہ پکڑ دھکڑ کے سخت خلاف تھا۔ وہ مطلوبہ بندے کو اپنی نظر میں رکھتا تھا اور ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کے بعد ہی اس پر پکا ہاتھ ڈالتا تھا اور پھر اسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا تھا۔ اسی لیے ابھی تک اس نے شاکر اور عدنان کو براہِ راست چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ کامران کے قاتل کے حوالے سے اس نے ان دونوں کے ناموں پر سرخ دائرہ لگا رکھا تھا۔

اسد نے ایک مناسب سا موقع دیکھ کر صاعقہ سے ملاقات کی۔ اس کے مہربان رویے سے صاعقہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ اس پر بُری طرح مرمٹا ہے حالانکہ اسد نے اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ بہرحال، اسد کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ صاعقہ اس کے بارے میں کیا سوچتی تھی۔ وہ ان ملاقاتوں سے محض کامران کے قاتل کو کلیئر کر کے اس تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صاعقہ اس وقت خاصے خوش گوار موڈ میں تھی اور اسد کی طرف سے رومینٹک گفتگو کی توقع کر رہی تھی مگر اسد نے بڑی ہوشیاری سے اپنے مطلب کی بات شروع کر دی۔ وہ صاعقہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

''میری اب تک کی تحقیق کے مطابق، کامران ایک فلرٹ لڑکا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر وہ سلمٰی کی طرف چلا گیا۔ یقیناً تم سے پہلے بھی مختلف لڑکیوں کے ساتھ اس کے عاشقانہ تعلقات رہے ہوں گے۔ اور اگر وہ مزید زندہ رہتا تو سلمٰی کو ''بائے بائے'' کہہ کر وہ کوئی اور دنیا دریافت کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ میں نے تو یہاں تک بھی سنا ہے کہ اس نے اپنی سگی بھابی کو بھی نہیں بخشا تھا۔''

اسد نے دانستہ اپنی بات کو ایک خاص موڑ پر لا کر چھوڑا تھا تاکہ صاعقہ کے ذہن کا حال اس پر عیاں ہو سکے اور ایسا ہی ہوا بھی۔ صاعقہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے بولی۔

''کامران کے اپنی بھابی بشریٰ کے ساتھ مراسم تھے یا نہیں، اس بارے میں تو میں کنفرم نہیں ہوں لیکن وہ اپنے بھائی کا اکثر ذکر کیا کرتا تھا۔''

''کیسا ذکر؟'' اسد نے پوچھ لیا۔

''وہ بتایا کرتا تھا کہ عدنان کو اس کے حوالے سے اپنی بیوی پر شک ہے۔'' صاعقہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''کامران کے مطابق، عدنان کے خیال میں بشریٰ بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی۔''

''کیا کبھی تم نے کامران سے اس امر کی تصدیق چاہی تھی؟'' اسد نے استفسار کیا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس حوالے سے بہت تجسس تھا۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟''

''چٹا انکار...!''

☆☆☆

صاعقہ اور فریدہ کو اپنی مٹھی میں کرنے کے بعد اسد نے چند ہنگامی اقدامات کا فیصلہ کیا اور شاکر کے گھر پہنچ گیا۔ اس دوران میں رحمت نے جان توڑ کوشش کر کے اسد کی مطلوبہ معلومات اسے فراہم کر دی تھیں لہٰذا وہ زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔

اسد نے شاکر کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ بھڑے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔ ''آپ کس بنا پر مجھ پر کامران کے قاتل ہونے کا شبہ کر رہے ہیں؟''

''کامران تمہاری عزت کے ساتھ کھلواڑ کر رہا تھا۔'' اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔''

''عزت سے کھلواڑ!'' شاکر نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟''

اسد نے اس کے نازیبا الفاظ کا قطعاً برا نہیں منایا اور نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں اسے سلمٰی اور کامران کے عشق کی روداد سنا دی جس میں اس نے ان کی چھت پر ملاقاتوں کا خصوصی ذکر کیا۔ یہ سارا قصہ سن کر شاکر آگ بگولا ہو گیا۔ اس وقت اس کی حالت دیدنی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ اسد کو کچا چبا ڈالے گا لیکن اسد کے ذہن میں یہ تمام تر امکانات موجود تھے لہٰذا وہ ہر قسم کی تیاری کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔

''میری بیٹی پر اتنا گھناؤنا الزام!'' شاکر نے طیش کے عالم میں کہا۔ ''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا...؟''

''میرے پاس اپنی بات کی تصدیق کے لیے تین ٹھوس ثبوت ہیں۔'' اسد نے اٹل لہجے میں کہا۔

''کون سے تین ثبوت؟'' شاکر نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''نمبر ایک فریدہ آنٹی، نمبر دو صاعقہ اور نمبر تین سلمٰی۔''



اسد نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''فریدہ اور صاعقہ اس بات کی گواہ ہیں کہ سلمٰی، کامران کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی اور وقوعے کی رات بھی وہ بلڈنگ کی چھت پر کامران کے ساتھ موجود تھی اور سلمٰی...'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سلمٰی اس امر کی تصدیق کرے گی کہ صاعقہ اور فریدہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہیں۔ اگر میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو تم اپنی بیٹی کو یہاں بلاؤ۔ میں صاعقہ اور فریدہ کو بلواتا ہوں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

شاکر قاتلانہ نظر سے اسد کو گھورنے لگا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک پبلک پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

صاعقہ کو گھر سے نکلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اس کا باپ اسحاق روزگار کے سلسلے میں دبئی گیا ہوا تھا اور ماں سے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسد سے ملنے چلی آتی تھی۔ ویسے وہ پہلے بھی اپنی دوستوں وغیرہ سے ملنے گھر سے نکلتی رہتی تھی لہٰذا یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کی والدہ جمیلہ کوئی سخت گیر عورت نہیں تھی۔

اس روز صاعقہ خاصی بن ٹھن کر اسد سے ملنے آئی تھی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے نیلے رنگ کا ایک ہلکا لباس پہن رکھا تھا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک بڑی نفاست سے لگائی تھی اور ایک سائیڈ کے بالوں کو اس نے اپنے مخصوص انداز میں چہرے پر ڈال رکھا تھا جبکہ اسد نے حسبِ معمول بلیو جینز پر ایک اوپن شرٹ پہن رکھی تھی تاہم اس جھولتی ہوئی شرٹ کے پیچھے، جینز کے بیلٹ میں اس نے ایک فلی لوڈڈ گن کو اڑس رکھا تھا تاکہ کسی بھی نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال سے فوری طور پر نمٹا جا سکے۔

''آپ گزشتہ روز شاکر کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔'' صاعقہ نے پوچھا۔ ''کیا اس نے کامران کے قتل کا اقرار کر لیا ہے؟''

''نہیں!'' اسد نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''میں نے اس سے کڑی پوچھ گچھ کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کامران کے قتل میں براہِ راست اس کا کوئی ہاتھ نہیں لہٰذا میں نے اسے چھوڑ دیا ہے لیکن اپنے ایک خاص بندے کو اس پر نظر بھی مقرر کر دیا ہے جو مجھے اس کی سرگرمیوں کی باقاعدہ رپورٹ دیتا ہے۔''

''آپ نے کس بنا پر یہ یقین کر لیا کہ شاکر براہِ راست کامران کے قتل میں ملوث نہیں؟'' صاعقہ نے اپنے ذہن کی الجھن دور کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

اسد نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول کامران کی موت وقوعے کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت ہے جب شاکر اپنے دوستوں کے ساتھ جائے وقوعہ سے پانچ کلومیٹر کی دوری پر موجود تھا۔ وہ لوگ رات دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک مصروفِ گفتگو رہے تھے پھر شاکر کی وہاں سے واپسی ہوئی تھی۔ وہ لگ بھگ ایک بجے رات گھر پہنچا تھا۔ میں نے شاکر کے دوستوں کو تھانے بلا کر فرداً فرداً ان کا بیان بھی لیا ہے اور ان کے بیانات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ جب کامران کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو شاکر جائے واردات سے خاصے فاصلے پر موجود تھا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے...'' صاعقہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''شاکر نے یہ کام اپنے کسی آدمی سے کرایا ہو؟''

''میرے ذہن نے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا۔'' اسد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے تو میں شاکر کی نگرانی کروا رہا ہوں۔''

''صورتِ حال خاصی الجھی ہوئی ہے۔'' صاعقہ نے بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ کیس تاش کے چار اِکوّں کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔'' اسد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''پوائنٹ اسکورنگ گیم...!''

''آپ نے تو بات کو اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔'' صاعقہ نے کہا۔

اسد اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''حکم کا اِکاّ شاکر کے ہاتھ میں ہے، جبکہ اینٹ اور چڑیا کے اِکےّ تمہارے پاس اور پان کا اِکاّ ہوا میں معلق ہے۔ اگر یہ اِکےّ شاکر کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کے پلڑے کا وزن بڑھ جائے گا اور میں یہی نہیں چاہتا ہوں۔''

صاعقہ نے آنکھیں سکیڑ کر اسد کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی!''

''پوائنٹ اسکورنگ... گیم آف نمبرز۔'' اسد نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''سلمٰی شاکر کی بیٹی ہے۔ مشکل وقت میں وہ بالآخر اپنے باپ ہی کا ساتھ دے گی۔ یہ اِکاّ شاکر کے ہاتھ میں ہے۔ فُلمٰی تمہاری دوست ہے اور کامران سے بھی تمہاری دوستی رہی ہے لہٰذا دو اِکےّ تمہارے پاس ہیں۔ اور میں دیکھ رہا

ہوں ایک اِکّا آزادانہ حرکت کررہا ہے یعنی بشریٰ... ہمیں بشریٰ کو اپنے قابو میں کرنا ہوگا تاکہ جلد از جلد کامران کے قاتل تک رسائی حاصل کی جاسکے۔"

صاعقہ اب بھی اسد کی بات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکی تھی تاہم اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "ہم بشریٰ پر کس طرح قابو پاسکتے ہیں؟"

اسد رازدارانہ انداز میں بتانے لگا۔ "تمہیں فوری طور پر بشریٰ سے میل جول بڑھا کر اس کے دل میں اترنا ہوگا۔ تم یہ جاننے کی کوشش کروگی کہ ان میاں بیوی کے درمیان آج کل کیا چل رہا ہے۔ خاص طور پر تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ بشریٰ اور کامران کے تعلقات کی حقیقت کیا تھی۔ عدنان کا اپنی بیوی کے کردار کے حوالے سے شک کس حد تک درست تھا۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ کام بہ آسانی کرلوگی...!"

"میں آپ کی امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔" صاعقہ نے پُرعزم انداز میں کہا۔ "آپ کو میری کوشش سے مایوسی نہیں ہوگی اسد صاحب!"

اسد توصیفی نگاہ سے اسے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

اسد تھانے میں بیٹھا معمول کے کام نمٹا رہا تھا کہ فریدہ آنٹی کا فون آگیا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ اسد کے استفسار پر اس نے بتایا۔

"میں نے اپنا کچھ پرانا فرنیچر اور دیگر سامان زینے والے دروازے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ اس میں اچانک آگ بھڑک اٹھی ہے۔ لوگوں کی مدد سے خیر آگ پر تو قابو پالیا گیا ہے لیکن میرا سامان جل کر مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہے۔"

"مجھے اس واقعے کا دلی افسوس ہے۔" اسد نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "بتائیں، اس صورتِ حال میں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"اگر آپ کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو..." فریدہ نے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔ "تو شاکر کو پکڑ کر پھانسی دے دیں۔"

"شاکر کا آتشزدگی کے اس واقعے سے کیا تعلق؟" اسد نے بے ساختہ پوچھا۔

فریدہ نے جلے کٹے انداز میں جواب دیا۔ "میرا سامان کئی سال سے وہاں پڑا ہوا تھا۔ شاکر کو اس پر اعتراض تو تھا لیکن اس نے کبھی میرے سامان کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر جب سے میں نے آپ کے کہنے پر اس کے خلاف گواہی دی ہے، وہ مجھے خوں خوار نظر سے گھورتا رہتا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ یہ آگ اسی نے لگوائی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اسد نے فریدہ کی اشک شوئی کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس واقعے کی تحقیق کراتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اسد نے رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک اوپن ائیر ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ صاعقہ خاصی ہراساں اور خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ اسد نے پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے۔ تم کافی پریشان نظر آرہی ہو؟"

"پریشانی والی بات ہے، پریشان تو نظر آؤں گی ہی...!"

"آخر ہوا کیا ہے؟" اسد کے سوال میں الجھن بھی شامل ہوگئی۔

"جب سے میں نے کھلم کھلا گواہی دی ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "کوئی بے ہودہ، انتہا پسند شخص ہمارے گھر فون کرکے امی کو مسلسل دھمکیاں دے رہا ہے۔"

"کس نوعیت کی دھمکیاں؟" اسد نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ میری امی کو باور کرانے کی کوشش کررہا ہے کہ میرا چال چلن ٹھیک نہیں۔" صاعقہ نے بتایا۔ "اگر امی نے مجھے کنٹرول نہیں کیا تو وہ دبئی فون کرکے ابو کو میری سرگرمیوں کے بارے میں بتا دے گا۔ اس نے میرے چہرے پر تیزاب ڈالنے کی بھی دھمکی دی ہے۔ امی اس کمینے کی باتوں سے سخت خوف زدہ ہیں۔"

"تمہارے خیال میں وہ کم بخت کون ہوسکتا ہے؟" سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسد نے اس کی رائے لینا چاہی۔

"وہ شاکر کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا... میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی اوچھی حرکتیں اسی کے اشارے پر ہورہی ہیں۔" صاعقہ پورے تیقن سے بولی۔ "میں نے اور فریدہ آنٹی نے سلمٰی اور کامران کے تعلقات کی گواہی دے کر اس کی انا اور غرور کو چکنا چور کردیا ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ سامنے آکر تو وار نہیں کرسکتا، اسی طرح کے حربے آزما کر ہمیں ذہنی اذیت میں مبتلا کررہا ہے۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" اسد نے تائیدی انداز میں کہا۔ "فریدہ نے بھی کچھ اسی طرح کی شکایت کی ہے۔"

"اسد! میں بہت خوف زدہ ہوں۔" وہ سراسیمہ لہجے



میں بولی۔ "یوں محسوس ہوتا ہے، کوئی مسلسل میرے تعاقب میں لگا ہو۔ یہاں بیٹھے ہوئے بھی یہی لگ رہا ہے کہ کوئی میری نگرانی کررہا ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" اسد نے اس کا ذہن بٹانے کی غرض سے کہا پھر پوچھا۔ "میرے کام کا کیا ہوا۔ کیا تم بشریٰ سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہوئیں؟"

صاعقہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتانے لگی۔ "میں نے بشریٰ کے دل کا حال جان لیا ہے۔ اس کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ واقعات کے مطابق، کامران اور بشریٰ کے تعلقات کے حوالے سے عدنان کا شک بالکل درست تھا۔ وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی لیکن جب کامران میری طرف جھک گیا تو بشریٰ اس سے ناراض ہوگئی تھی لیکن ظاہر ہے، ایک گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنے دیور کی مخالفت نہیں کرسکتی تھی لہٰذا عدنان کے ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کررہی تھی۔"

صاعقہ کی مفصل رپورٹ نے اسد کے ذہن میں اس خیال کو خاصا پختہ کردیا کہ بیوی کی بے وفائی اور بھائی کی بے حیائی کو دیکھ کر عدنان کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتا تھا۔

وہ ریسٹورنٹ سے اٹھے اور پارکنگ کی جانب بڑھ گئے۔ اسی وقت اسد نے ایک مشکوک شخص کو اپنی گاڑی کے نزدیک منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ اسد تیز قدموں سے اس جانب بڑھا تو وہ شخص ٹھٹک گیا، پھر اس نے ایک سمت دوڑ لگا دی۔

اسد نے جینز کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی گن نکال لی اور بھاگتے ہوئے شخص کا نشانہ لے کر تحکمانہ انداز میں غرایا۔ "رک جاؤ... ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

اسد کی دھمکی کا اس بھگوڑے پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ جان کی پروا کیے بغیر بھاگتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے غائب ہوگیا۔ اسد نے گن کو دوبارہ جینز کی بیلٹ میں لگا لیا۔ صاعقہ نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ شاکر کا آدمی ہوگا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" اسد نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں شاکر اور اس کے تمام گرگوں سے اچھی طرح نمٹ لوں گا۔"

صاعقہ مطمئن ہوگئی۔

☆☆☆

ابتدا میں اسد نے آہنی راڈ کے حوالے سے عدنان سے کچھ کہا تھا لیکن اس نے صاف انکار کردیا تھا جبکہ بشریٰ نے بڑے وثوق کے ساتھ اسے بتایا تھا کہ مذکورہ آہنی راڈ (آلۂ قتل) کو اس نے وقوعے سے چند روز پہلے کچن میں، سنک کے نیچے بنی کیبنٹ کے اندر رکھے دیکھا تھا اور اب صاعقہ نے جو رپورٹ دی تھی اس کی روشنی میں عدنان سے کڑی پوچھ تاچھ ضروری ہوگئی تھی، چنانچہ اسد نے اسے تھانے بلا لیا۔

اسد نے جب آہنی راڈ کے حوالے سے عدنان پر دوبارہ جرح شروع کی اور اس بات پر زور دیا کہ وقوعے سے چند روز پہلے وہ راڈ عدنان کے کچن میں پائی گئی تھی تو وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا اور بڑے ہی جارحانہ انداز میں اس نے اسد سے کہا۔

"لوگ اسی لیے پولیس پر اعتماد نہیں کرتے کہ آپ بلاجواز عوام کو تنگ کرتے ہو۔ میرا چھوٹا بھائی قتل ہوگیا۔ ابھی تک آپ نے اس کے قاتل کو گرفتار نہیں کیا اور الٹا مجھے تھانے بلا کر ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ابھی تک تو میں خاموش بیٹھا تھا لیکن میں محسوس کررہا ہوں کہ آپ کے خلاف باقاعدہ ایک نیچر لگانا پڑے گا۔"

"آپ اپنا یہ شوق ضرور پورا کیجیے گا۔" اسد نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن فی الحال میرے سوال کا جواب دیجیے۔ آلۂ قتل، وقوعے سے چند روز پہلے آپ کے گھر کے کچن میں کیا کررہا تھا؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا اسد سے سوال کر ڈالا۔ "کیا آپ نے ہمارے کچن میں جھانک کر دیکھا تھا کہ آلۂ قتل وہاں رکھا ہوا ہے؟"

"نہیں!" اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی رسان سے جواب دیا۔

"پھر..." عدنان نے بپھرے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "پھر آپ کس بنا پر اتنا بڑا دعویٰ کررہے ہیں؟"

"یہ بات مجھے آپ کی بیوی بشریٰ نے بتائی ہے۔" اسد نے سنسناتے ہوئے لہجے میں انکشاف کیا۔ "اس نے خود اپنی آنکھوں سے مذکورہ آہنی راڈ کو کچن میں رکھا دیکھا تھا..."

وہ بے یقینی سے اسد کو دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "کیا واقعی یہ سب کچھ بشریٰ نے آپ کو بتایا ہے؟"

"ہاں۔" اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔ "اور آپ کی بیوی کا یہ بھی خیال ہے کہ کامران کو اس آہنی راڈ کی مدد سے آپ ہی نے قتل کیا ہے۔"

"کک... کیا...؟" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "مم... میں ایسا کیوں کروں گا؟ کامران میرا چھوٹا بھائی تھا۔

میں اس کی زندگی کا چراغ کیسے گُل کرسکتا ہوں... کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ کا وہی چھوٹا بھائی آپ کی بیوی کو گمراہ کررہا تھا۔" اسد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بشریٰ، کامران کے ساتھ ملوث ہو کر آپ سے بے وفائی کی مرتکب ہورہی تھی۔ آپ کو ان دونوں کے تعلقات کی بھنک مل گئی تھی اور آپ نے اس حوالے سے بشریٰ کو نہ صرف ڈانٹ ڈپٹ کی تھی بلکہ اسے مار پیٹ کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ اگر آپ شرافت سے اپنے جرم کا اقرار نہیں کریں گے تو بشریٰ بھری عدالت میں آپ کے خلاف گواہی دے گی۔"

عدنان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ بے دریغ اپنی بیوی کو گالیاں بکنے لگا۔ طیش کے عالم میں وہ بشریٰ کو برے برے القابات سے بھی نواز رہا تھا۔ اس دوران میں اس نے بشریٰ کی بے وفائی کو بھی ہائی لائٹ کیا اور آخر میں بڑے جذباتی مگر مائل انداز میں کہا۔

"اگر مجھے قتل ہی کرنا ہوتا تو میں پہلی فرصت میں اپنی بدکردار بیوی کو موت کے گھاٹ اتارتا جس نے نہ صرف یہ کہ میری عزت کا پاس نہیں رکھا بلکہ مجھے پھنسانے کے لیے ایک گہری سازش کررہی ہے۔ میں یہاں سے جانے کے بعد سب سے پہلا نیک کام یہی کروں گا کہ بشریٰ کو بڑے دردناک انداز میں..."

"آپ کو یہاں سے جانے ہی کون دے گا۔" اسد نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چٹانی لہجے میں کہا۔

عدنان کے خوفناک عزائم کے پیشِ نظر ہر احتیاط اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اسد نے اسے لاک اپ میں بند کردیا تھا لیکن اس کا یہ عمل اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس نے عدنان کو کامران کا قاتل ڈکلیئر کردیا تھا بلکہ وہ عدنان کو اپنی تحویل میں رکھ کر ایک نفسیاتی کھیل کھیلنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ عدنان کے جذباتی ڈائیلاگ نے اسد کو اس کے حق میں اور بشریٰ کے خلاف سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

اسد بشریٰ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا اور بڑے ڈرامائی انداز میں اسے بتایا۔ "میں نے تمہارے شوہر کو کامران کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔ مجھے اس کے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت حاصل ہوگئے ہیں کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا سے نہیں بچا سکتی۔ وہ اس جرم میں سیدھا سیدھا تختے پر چڑھ جائے گا۔"

اسد کی چلی ہوئی یہ نفسیاتی چال ایک سو ایک فیصد کامیاب رہی۔ شوہر کی سزا کا ذکر سن کر بشریٰ کی آنکھوں اور چہرے پر تفکر یا پریشانی کے بجائے اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔ یہ تاثرات اس حقیقت کے غماز تھے کہ بشریٰ کو عدنان کے پھانسی لگنے سے بے حد خوشی ہوگی۔ اسد نے اس کیس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے، بشریٰ کو حوالات میں عدنان سے ہونے والی گفتگو اور اس کے خوف ناک عزم سے باخبر رکھتے ہوئے بڑے سفاک انداز میں کہا۔

"ویسے تو عدنان کے بچنے کی کوئی امید نہیں لیکن تمہارا فرض بنتا ہے کہ اس موقع پر اس کے لیے کسی تگڑے وکیل کا بندوبست کرو۔ آخر، وہ تمہارا شوہر ہے...!"

"جی... میں کوشش کرتی ہوں۔" وہ منمنائی۔

☆☆☆

بشریٰ نے آئندہ روز بہت کوشش کی مگر بہ اندازِ دگر!

اسد اس کی طرف سے کھٹک چکا تھا لہٰذا وہ بہ ذاتِ خود اس کی خفیہ نگرانی پر مامور رہا۔ اس طرح وہ ایک روز تھانے سے باہر رہ کر صحافی برادری کی ٹیلی فونک اور بہ نفسِ نفیس یلغار سے بھی محفوظ رہنا چاہتا تھا کہ عدنان کو حوالات میں بند کرنے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس روز اسد نے بشریٰ کی ایک ایک بیرونی حرکت اور عمل کو واچ کیا۔ وہ بھی لگ بھگ پورا دن گھر سے باہر ہی رہی تھی لیکن ایسی سرگرمیوں میں مصروف... جس سے عدنان کے شک کو تقویت حاصل ہوئی تھی۔

اسد نے واضح طور پر نوٹ کیا کہ بشریٰ نے اپنے شوہر کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے کسی وکیل کے دفتر تک رسائی حاصل نہیں کی اور نہ ہی عدنان کے کسی مخلص اور ہمدرد شخص سے رابطہ کیا۔ بجائے اس کے وہ ایسی سرگرمیوں میں مصروف نظر آئی جن کا تعلق عدنان کی موت کے بعد کے معاملات سے تھا۔

گویا وہ اس بات پر بے حد خوش تھی کہ عدنان کو پھانسی ہو جائے گی۔

☆☆☆

اسد یہ بات اچھی طرح محسوس کرچکا تھا کہ عدنان کو اپنی بیوی کی بے وفائی کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا یہ جان کر اسے ذہنی صدمہ پہنچا تھا کہ بشریٰ نے اپنی راڈ کے حوالے سے جھوٹ بول کر اسے کامران کے قتل میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ پوری دال ہی کالی ہے، اسد نے بشریٰ کو گرفتار کرکے کڑی تفتیش شروع کردی۔

بشریٰ نے صنفِ نازک ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی معصومیت کے ساتھ اسد کو اپنی راڈ کے حوالے سے یہ



فریب بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ نرم خو پولیس آفیسر تفتیش کے دوران میں کتنا جابر اور سفاک ہوجاتا ہے۔ اسد کے تفتیشی ہتھکنڈوں کے سامنے وہ زیادہ دیر ٹک نہ سکی اور اس نے اپنے دیور کامران کے قتل کا اقرار کرلیا۔

اقبالی بیان دیتے ہوئے اس نے گلوگیر آواز میں اسد کو بتایا کہ کامران نے محبت کا فریب دے کر اس کی عزتِ نفس کو مجروح کیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اسے چھوڑ کر صاعقہ میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس کے پندار کو ٹھیس پہنچی۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد کامران صاعقہ کو بھول کر سلمیٰ کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے لگا تو وہ کامران کی فطرت کو اچھی طرح سمجھ گئی۔ اس دوران میں عدنان کو کامران کے ساتھ اس کے تعلقات کی خبر ہوگئی تھی اور عدنان کو جب بھی موقع ملتا، اسے ذلیل کرتا رہتا تھا اور یہ ساری ذلت اور بے عزتی کامران کی وجہ سے تھی۔ عدنان کے آئے روز کے رویے سے وہ اس سے بھی نفرت کرنے لگی تھی۔ جب اس کی ہمت اور برداشت کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اس نے بہ یک وقت دونوں بھائیوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کامران رات کی تاریکی میں چھت پر سلمیٰ سے ملنے جاتا ہے لہٰذا ایک رات وہ بھی دبے قدموں چھت پر پہنچ گئی۔ آہنی سلاخ کو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب سلمیٰ وقوعے کی رات کامران کے پاس سے رخصت ہوئی تو بشریٰ نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ اس نے کامران کے عقب سے آہنی راڈ کا ایسا بھرپور وار کیا تھا کہ وہ تیورا کر ڈٹ میں جا گرا۔ بشریٰ نہیں جانتی تھی کہ کامران اس وار کے بعد زندہ بچ جائے گا یا صفحۂ ہستی سے رخصت ہوجائے گا تاہم اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ کسی نے اسے یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بعد ازاں عدنان کو کامران کے قتل میں ملوث کرنے کے لیے اس نے آہنی راڈ کچن میں موجود کی کاڈرامار چایا تھا۔

☆☆☆

اسد کی اب صاعقہ سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ ملاقات کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ اسد کو اس سے جو کام لینا تھا وہ لے چکا تھا۔ وہ بیوی بچوں والا ایک سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ ٹین ایجر والے چونچلے وہ افورڈ نہیں کرسکتا تھا تاہم صاعقہ نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ دن میں ایک آدھ مرتبہ اس کا فون آجاتا تھا۔

ایک روز رحمت نے اسد سے کہا۔ "سر جی! آپ بڑے یاد آتے ہیں...!"

رحمت کا اشارہ صاعقہ والے معاملے کی طرف تھا۔ اسد نے برجستہ جواب دیا۔ "ہاں، وہ تو میں ہوں۔ اگر میں اس موقع پر سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کروں گا تو بعد میں بے وفا کہلاؤں گا اور بے وفائی کا انجام تم نے دیکھ لیا ہے نا، بشریٰ اور عدنان کے کیس میں...؟"

"جی، سرجی!" رحمت نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اسد نے کہا۔ "صاعقہ کو جب یہ پتا چلے گا کہ میں فیملی والا ہوں تو وہ خود ہی مجھ سے مایوس ہوجائے گی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر رحمت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "بلکہ تم میرا ایک کام کرو۔"

"حکم سرجی۔" رحمت نے فرماں برداری سے کہا۔

"بتائیں کیا کام ہے؟"

"تم صاعقہ کو کسی طرح یہ باور کرادو کہ میرے حوالے سے وہ اپنا وقت برباد نہ کرے۔" اسد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں سرجی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ابھی کرکے دکھاتا ہوں..."

اسد ایک دم جذباتی ہوگیا۔ "رحمت! تم اور تمہاری باتیں مجھے بہت یاد آئیں گی۔"

"سر!" رحمت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ نے واقعی پوکیس ڈیپارٹمنٹ کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"اٹل فیصلہ!" اسد نے حتمی لہجے میں کہا۔ "لیکن کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینے کے بعد۔ دعا کرو، ایسا موقع مجھے جلد ہی مل جائے۔"

"میں دعا کروں گا سرجی...!" رحمت نے بے ساختہ کہا۔

☆☆☆

چند روز کے بعد رحمت کی دعا قبول ہوگئی!

اسد کے سینئرز نے ایک چیلنج کیس اس کے سپرد کیا اور اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس معرکے میں سرخروئی حاصل کرلی۔ محکمہ اسد کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا مگر وہ محکمے کو چھوڑنے کا ٹھوس فیصلہ کرچکا تھا لہٰذا اس کے پایۂ استقامت میں ذرا سی لرزش پیدا نہ ہوئی۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ کو "اللہ حافظ" کہنے کے بعد اسد ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا بلکہ اس نے ایک ذاتی ادارہ قائم کیا ہے جس میں وہ کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے کام کرتا ہے۔ وہ کسی کا حکم ماننے پر مجبور نہیں۔ وہ خود ہی اپنا باس ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ محکمۂ پولیس کو بعض اوقات، اسد کے ادارے سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے...!

# رُخِ تقدیر

سلیم فاروقی

خواہشات کا حصول ہی انسان کو آگے بڑھنے پہ مجبور کرتا ہے۔ ایک ایسے ہی نوجوان کی داستان جس کی زندگی میں اچانک ہی ایک طوفان آگیا ...اور پے در پے وہ ایسے حالات کا شکار ہوتا چلا گیا کہ دشمن بھی اس کی ہمت و استقلال کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

**جبر کا ہر انداز مسترد کردینے والے نوجوان کی فن کاریاں**

میں آپ کو اپنا اصلی نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ مجھے نام و نمود کا شوق نہیں ہے اور میرا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جو بہت معروف ہے۔ آپ میرا فرضی نام عامر خان سمجھ لیں۔ اس لیے نہیں کہ میں بھارتی اداکار عامر خان کا پرستار ہوں بلکہ مجھے یہ نام پسند ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے؟

میں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہوں، یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میرے ڈیڈی کا شمار ملک کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان کے علاوہ ان کا کاروبار دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ ہماری کئی ٹیکسٹائل ملز ہیں، دنیا کے مختلف شہروں میں ہوٹلز کی ایک چین ہے۔ دو سال پہلے ڈیڈی نے ایک بینک بھی قائم کیا ہے۔ اس کی برانچز بھی ملک کے کئی شہروں میں ہیں اور ڈیڈی کا پلان ہے کہ آئندہ تین سال تک وہ خلیجی ریاستوں اور سعودی عرب کے علاوہ اس کی برانچز دنیا کے کئی بڑے شہروں میں قائم کریں گے۔

مجھ سے بڑے طاہر بھائی ڈیڈی کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میری اور ان کی عمر میں آٹھ سال کا فرق ہے۔ ان سے صرف ایک سال چھوٹی شمائلہ ہے۔

ہم دونوں کے درمیان بہت ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ میری چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مما کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میں صرف ایک سال کا تھا۔ میں نے ان کی صرف تصویریں دیکھی ہیں۔ وہ بہت حسین اور گریس فل تھیں۔ شمائلہ میں ان کی بہت جھلک آتی ہے بلکہ وہ مما سے زیادہ خوب صورت ہے۔ یوں سمجھ لیں، ایک طرح سے اس نے مجھے ماں بن کر پالا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں شمائلہ باجی سے بہت زیادہ مانوس تھا۔

میں نے ان دنوں آٹھویں جماعت کا امتحان دیا تھا۔

ڈیڈی مجھے او لیول اور اے لیول کے بعد ایم بی اے کرانا چاہتے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ میں بھی طاہر بھائی کی طرح کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔

میں اپنی کلاس بلکہ اسکول کا ذہین ترین طالبِ علم تھا۔ میں نے ''اولیول'' میں داخلہ لے لیا۔

اسی زمانے میں شمائلہ باجی کے لیے ایک رشتہ آگیا۔ رشتے تو خیر ان کے پہلے بھی بہت سے آئے تھے لیکن کوئی ڈیڈی کو پسند نہیں آیا اور کوئی طاہر بھائی کے معیار پر پورا نہیں اترا۔

عرفان بھائی کا رشتہ ڈیڈی کو بھی پسند آ گیا اور طاہر بھائی کو بھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھایا۔

شاید اس لیے کہ اس کا اور شمائلہ باجی کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ وہ خاصا قبول صورت اور اچھے اخلاق آدمی تھا لیکن سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ امریکا میں مقیم تھا۔ ظاہر ہے، شادی کے بعد شمائلہ باجی کو بھی امریکا جانا پڑتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے وہ رشتہ پسند نہیں آیا تھا یا پھر عرفان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی۔

امریکا میں اس کے دو فائیو اسٹار ہوٹل تھے لیکن دولت میں بھی وہ ہمارا ہم پلہ تو دور کی بات ہے، پاسنگ بھی نہیں تھا۔

میں تو ان دنوں ڈیڈی اور طاہر بھائی کی نظروں میں بچہ تھا، تین میں نہ تیرہ میں۔ رہیں شازیہ بھابی تو انہیں تو وہی کچھ کہنا تھا جو ان کا شوہر کہتا۔ میری رائے کون پوچھتا اور اسے کیا اہمیت دیتا۔

عرفان بھائی اور شمائلہ باجی کا رشتہ پکا ہو گیا۔ وہ دو مہینے کے لیے آئے تھے اور شادی کر کے باجی کو اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتے تھے۔ اس تصور ہی سے میری جان پر بن گئی تھی کہ



اب شمائلہ باجی مجھ سے ہزاروں میل دور چلی جائیں گی۔ مجھے ان سے اتنی والہانہ محبت تھی کہ میں اکثر چھپ چھپ کر روتا تھا۔

ایک دن شمائلہ باجی نے مجھے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ گھبرا گئیں اور بولیں۔ ''عامر! کیا بات ہے؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو؟ کیا ڈیڈی یا طاہر بھائی نے کچھ کہا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر کیا بات ہے؟ کوئی گاڑی پسند آگئی ہے یا... کوئی اور چیز۔ مجھے بتاؤ میرے بھائی، ابھی تو میں یہاں موجود ہوں۔''

میری آنکھوں سے مزید آنسو بہنے لگے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''باجی! دکھ تو یہی ہے کہ اب آپ چلی جائیں گی تو میں کیا کروں گا... آپ کے بغیر میں کیسے رہوں گا؟''

''احمق لڑکے!'' شمائلہ باجی نے میری پیٹھ پر ایک دھپ لگایا۔ پھر ان کی بھی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بولیں۔ ''مجھے تو ایک نہ ایک دن اس گھر سے رخصت ہونا ہی تھا۔ تم ایسے روؤ گے تو میرا کیا بنے گا؟ ویسے بھی میں نے آج تک اپنی فیملی کے کسی مرد کو یوں لڑکیوں کی طرح روتے نہیں دیکھا۔'' پھر وہ مجھ سے لپٹ کر اتنا روئیں کہ میں اپنا رونا بھول کر انہیں تسلی دینے لگا۔

انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''وعدہ کرو عامر کہ اب تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ پھر امریکا یہاں سے دور ہی کتنا ہے؟'' انہوں نے یوں کہا جیسے گوجرانوالہ کی بات کر رہی ہوں۔ ''تم سال بھر میں دو تین چکر تو لگا ہی سکتے ہو؟''

میں تین کیا ہر مہینے امریکا کا ایک چکر لگا سکتا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ وہ جانے لگیں تو میں نے کہا۔ ''باجی! ایک بات بتائیں۔ عرفان بھائی آپ کو کیسے لگتے ہیں؟''

ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا، پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''اچھے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔

ڈیڈی، عرفان بھائی کے والد کو جانتے تھے۔ امریکا میں ان کے دو فائیو اسٹار ز ہوٹلز تھے۔ پھر وہ تو ہر بات کو کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ امریکا اور یورپ میں فائیو اسٹار ز ہوٹلز کی ایک چین قائم کریں گے۔ عرفان بھائی اس کاروبار میں ان کے بہت کام آسکتے تھے۔

آخر وہ دن بھی آگیا کہ شائلہ باجی رخصت ہو کر سات سمندر پار چلی گئیں۔

میری تو گویا دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ وہ میری بہن بھی تھیں، دوست بھی تھیں اور سب سے بڑھ کر وہ میری ماں تھیں۔ انہوں نے مجھے کبھی امی کے نہ ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ شاز یہ بھابی بھی میرا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن شائلہ باجی کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد میں کئی ہفتے مضطرب و بے کل رہا۔ پھر آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آگئی۔ یوں بھی وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔

طاہر بھائی کے بچے ٹیٹا اور شانی بھی مجھ سے بہت مانوس تھے۔ وہ ہر وقت میرے آگے پیچھے گھومتے تھے اور کہتے تھے۔ ''چاچو! ہماری موسم سرما کی چھٹیاں ہو جائیں پھر ہم سب پھوپھو سے ملنے چلیں گے۔''

شائلہ باجی سے ٹیلی فون پر تقریباً روزانہ ہی بات ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ تم اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دو۔ اے لیول میں تمہارے نمبر کم نہیں آنا چاہئیں۔

میں ایک مرتبہ پھر دل و جان سے پڑھائی میں لگ گیا۔ اسی دوران میں کئی دفعہ میں نے امریکا کا چکر بھی لگایا لیکن مجھے عرفان بھائی کا سرد رویہ پسند نہیں آیا۔ شائلہ باجی کے چہرے پر بھی وہ شادابی نہیں تھی۔

اس وقت تک وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھیں۔ میں پیار سے اسے بلی کہتا تھا۔

میں نے ''اے لیول'' شان دار نمبروں کے ساتھ پاس کیا تو شائلہ باجی سے ملنے امریکا گیا۔ اب ان کی فیملی میں نئی کا اضافہ ہو چکا تھا اور بلی تو تلی زبان میں بولنے لگا تھا۔

عرفان بھائی کا رویہ پہلے کی طرح سرد تھا اور شائلہ باجی کے چہرے کی شادابی مزید کم ہوئی تھی۔

حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ وہ نیویارک کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ میری اطلاع کے مطابق عرفان بھائی کروڑ پتی تھے، وہ بھی ڈالرز میں۔ وہ کم از کم اپارٹمنٹ کے بجائے کوئی معقول بنگلا تو لے ہی سکتے تھے۔ پھر مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ شائلہ باجی بھی ایک ہوٹل سنبھالتی تھیں۔

جس لڑکی کے آنکھ کے ایک اشارے پر ملازمائیں دوڑ پڑتی ہوں، جو پانچ کنال کی وسیع و عریض کوٹھی میں رہتی ہو، وہ اس ماحول میں کیسے خوش رہ سکتی تھی۔ دونوں بچوں کے لیے انہوں نے ایک نینی اور گورنس رکھ دی تھی۔ جولیا بہت اچھی اور مخلص لڑکی تھی۔ وہ واقعی دونوں بچوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔

میں پاکستان واپس آیا تو ڈیڈی نے مجھے بھی اپنے ساتھ کاروبار میں گھسیٹ لیا۔

مجھے تو کاروبار کی الف ب کا علم بھی نہیں تھا لیکن میں نے پیدا ہوتے ہی گھر میں وہی ماحول دیکھا تھا اس لیے مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

ایک سال بعد ڈیڈی کے ایک دوست چودھری نذیر صاحب انگلینڈ سے آئے تو وہ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ ''اے لیول'' میں اتنے شان دار نمبروں سے کامیاب ہونے کے بعد میں نے تعلیم چھوڑ دی۔ انہوں نے ڈیڈی کو قائل کیا کہ عامر کو اب بھی یو کے، یا یو ایس اے کی کسی بھی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا۔ یہ وہاں سے ایم بی اے کر کے آئے گا تو تمہارے کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا۔

ہمارے پاس تو اب بھی اتنی دولت تھی کہ ہماری تین چار پشتیں بغیر کچھ کیے بہت عیاشی سے زندگی گزار سکتی تھیں۔ میں ایم بی اے کر کے ''بل گیٹس'' یا بھارتی ارب پتی ''متل'' تو نہیں بن سکتا تھا، ہاں اس کاروبار کو بڑی اچھی طرح آگے بڑھا سکتا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ صاف انکار کر دوں لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اگر امریکا کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں تو شائلہ باجی کے نزدیک ہو جاؤں گا۔

میں نے وہاں کی کئی یونیورسٹیز میں اپلائی کیا اور مجھے کیلی فورنیا کی ایک بہترین یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

میں نے یہ بات شائلہ باجی سے چھپائی تھی۔ میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔



روانگی کے وقت ڈیڈی اور طاہر بھائی نے مجھے نصیحتیں کیں۔

☆☆☆

جہاز نے نیویارک کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر لینڈ کیا تو وہاں بہت شدید سردی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان لوگوں نے تمام گرین پاسپورٹس ہولڈرز کی علیحدہ سے ایک قطار بنا رکھی تھی۔ مجھ سمیت وہاں انیس پاکستانی قطار میں موجود تھے اور اس وقت ہمارا کوئی پُرسانِ حال بھی نہیں تھا۔

ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بہت غصے سے بزنس کلاس میں آئے تھے، بات بات پر قومی ائرلائن کے انتظامات میں کیڑے نکالتے رہے تھے، ائرہوسٹس کو فضول میں پریشان کیا تھا اور خود کو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھ رہے تھے۔ اس وقت وہ بھی بے بسی بلکہ ذلت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

اس قطار میں میرا نمبر ساتواں تھا۔ مجھ سے آگے ایک نوجوان کھڑا تھا جو اس صورتِ حال پر بری طرح کڑھ رہا تھا۔ وہ خاصا خوش شکل اور خوش پوش نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

جب دس منٹ تک کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

مجھ سے پہلے اس نوجوان کی کھوپڑی آؤٹ ہو چکی تھی۔ وہ قطار میں سے نکلا اور امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچ گیا جہاں صرف اس وقت ایک اناڑی لڑکی اپنے کاغذات چیک کرا رہی تھی۔ کاؤنٹر پر خوب روسی خوش اخلاق ایک امریکن دوشیزہ موجود تھی۔

''یس!'' اس نے چہرے پر دلکش مسکراہٹ بکھیر کر پوچھا۔

جواب میں نوجوان نے اپنا پاسپورٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

پاسپورٹ دیکھ کر اس حسینہ کی خوش اخلاقی سرد مہری میں تبدیل ہوگئی اور اس نے کہا۔ ''آپ کے لیے سامنے والی قطار ہے۔''

''کیا مطلب ہے؟'' نوجوان بلند آواز میں بولا۔ ''تم فالتو بیٹھی ہو اور ہمیں خوامخواہ پریشان کر رہی ہو۔ میں تمہارے آفیسر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ ان کا آفیسر خود ہی اس طرف آگیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''کیا پریشانی ہے؟''

''امیگریشن کے چار چار کاؤنٹرز خالی پڑے ہیں، پھر آپ لوگ ہمیں کیوں پریشان کر رہے ہیں؟'' نوجوان نے چیخ کر کہا۔

''وہ کاؤنٹرز آپ کے لیے نہیں ہیں اور براہِ مہربانی آہستہ آواز میں بات کرو!'' آفیسر نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ تو زیادتی ہے آفیسر!'' میں نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔ ''اس فلائٹ کے تقریباً تمام مسافر فارغ ہو چکے ہیں۔ کیا ہم نے ائرپورٹ فیس نہیں دی ہے یا ہم بغیر ویزے کے یہاں آئے ہیں؟ ہمارا وقت بھی اتنا ہی قیمتی ہے جتنا دوسروں کا ہے۔'' میری آواز آہستہ آہستہ کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی تھی۔

ہم دونوں کو دیکھ کر دوسروں نے بھی ہمت کی اور وہ بھی بلند آواز میں امیگریشن اور کسٹم والوں کو برا بھلا کہنے لگے۔

ہنگامہ وہاں کچھ زیادہ ہی بڑھا تو ایک کمرے سے سوٹ میں ملبوس ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف تھا اور ہونٹوں میں موٹا سا ایک سگار دبا ہوا تھا۔

''کیا پریشانی ہے؟'' اس نے باری باری ہمیں گھورتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تو سب سے بڑی پریشانی آپ کی تمباکو نوشی ہے۔ پلیز اپنا سگار بجھا دیں۔ مجھے دھوئیں سے الرجی ہے، ویسے بھی پبلک پلیسز پر تمباکو نوشی نہیں ہوتی۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور تازہ سلگایا ہوا سگار فرش پر پھینک کر اپنے جوتے سے مسل دیا اور بولا۔ ''آپ جانتے ہیں، یہاں شور شرابا کر کے آپ قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں؟''

''مجھے آپ قانون کیا سکھا رہے ہیں مسٹر آفیسر!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ تو خود ابھی قانون کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پبلک پلیسز پر تمباکو نوشی الاؤ نہیں ہے۔ میرے کیمرے میں آپ کا یہ غیر قانونی منظر محفوظ ہے۔''

''آپ ایڈووکیٹ ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ضرورت پڑی تو میں یہ ثابت بھی کر دوں گا کہ میں کیا ہوں۔ اگر آپ پاکستانیوں کے ساتھ امتیاز برتنا چاہتے ہیں تو یہاں بڑے بڑے حروف میں لکھ کر لگا دیں کہ پاکستانی اپنی لائن الگ بنائیں۔''

''یو بلڈی پاکستانی! یو...''

''مت بھولو کہ تمہاری پوری گفتگو میں ریکارڈ کر رہا ہوں، یو باسٹرڈ وھائٹ ڈاگ!''

وہ بپھر کر میری طرف بڑھا۔ اسی وقت میرے ساتھ کھڑے ہوئے نوجوان نے اپنے سیل فون کا کیمرا آن کر دیا۔ وہ امیگریشن کا کوئی اعلیٰ افسر تھا۔ ایسی گفتگو اور وہ بھی کسی پاکستانی سے سننے کا تصور اس نے کب کیا ہوگا؟ وہ کیمرے کی پروا کیے بغیر میری طرف بڑھا اور مجھے تھپڑ مارنا چاہا۔ میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑی اور اس کے چہرے پر اتنی زور

سے تھپڑ مارا کہ اس کی آواز ائرپورٹ کے فرسٹ فلور تک گئی ہوگی۔ میں بھی اسی کی طرح دراز قامت تھا لیکن وزن میں وہ مجھ سے دگنا تھا۔

ائرپورٹ پر موجود لوگوں نے یہ منظر انتہائی حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔ پھر لمحوں میں ائرپورٹ سیکیورٹی نے مجھے اور اس نوجوان کو حراست میں لے لیا اور ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

چند منٹ بعد وہاں پولیس بھی آگئی اور سوال وجواب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا نام یوسف ہے اور وہ کمپیوٹر انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وہاں آیا ہے۔

میں نے پولیس والوں کو بتایا کہ پہل تمہارے آفیسر نے کی تھی۔ ''پہلے تو اس نے قانون... کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سگارنوشی کی، مجھے سگار کے دھوئیں سے الرجی ہے۔ میرے منع کرنے پر اس نے مجھے گالیاں دیں اور مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ میرے پاس ان تمام واقعات کی وڈیو اور آڈیو موجود ہے۔'' میں نے انسپکٹر سے کہا۔... ''اگر آپ مجھے گرفتار کررہے ہیں تو میں وہ وڈیوز اور آڈیوز کورٹ میں پیش کروں گا۔''

''میں وہ وڈیوز اور آڈیوز سننا چاہتا ہوں۔'' پولیس سارجنٹ نے کہا۔

''میں اپنے وکیل کے بغیر اب کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے گرفتار کرو اور پولیس اسٹیشن لے چلو۔''

''کیا کہتے ہو مسٹر الفرڈ؟'' پولیس سارجنٹ نے چقندر جیسے چہرے والے آفیسر سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے وہ ابھی مجھے ذبح کردے گا لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہاں کی کورٹس آزاد ہیں اور میرے پاس آڈیوز، وڈیوز اور گواہوں کی صورت میں اتنے ثبوت تھے کہ وہ خود مصیبت میں پڑ جاتا۔

اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور سارجنٹ سے کہا۔ ''یہ غیر ملکی ہیں اور پہلی دفعہ یہاں آئے ہیں اس لیے میں انہیں معاف کرتا ہوں۔''

''آپ لوگ جاسکتے ہیں۔'' سارجنٹ نے کہا۔

اس ہنگامے کی وجہ سے امیگریشن اور کسٹم کا عملہ بھی متحرک ہوگیا تھا اس لیے امیگریشن اور کسٹم کے تمام معاملات منٹوں میں نمٹ گئے۔

میں ٹرالی میں اپنا سامان لے کر باہر نکلنے لگا تو سگار پینے والے آفیسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں دیکھ لوں گا، یو...'' وہ شاید گالی دیتے دیتے رک گیا۔

''ضرور دیکھنا۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو اب آتا جاتا ہی رہوں گا۔ میرے پاس مٹی پل ویزا ہے لیکن صرف دیکھنا، اپنی زبان قابو میں رکھنا ورنہ...'' یہ کہہ کر میں وہاں سے نکل گیا۔

باہر یوسف سواری کے انتظار میں موجود تھا۔ اب یہ بھی اتفاق تھا کہ اسے بھی اسی یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا جس میں مجھے ملا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اسکالرشپ پر تعلیم حاصل کرنے آیا تھا اور میں ذاتی طور پر!

میں نے وہاں سے ٹیکسی پکڑی تو یوسف نے کہا۔ ''ٹیکسی تو یہاں بہت مہنگی ہے عامر... ابھی یونیورسٹی کی بس آنے والی ہے۔ فضول خرچی سے کیا فائدہ؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں ٹیکسی کا کرایہ شیئر نہیں کروں گا۔''

میں نے راستے میں اسے بتایا۔ ''یہاں میری ایک بہن بھی رہتی ہے۔ اس کے دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ سچ پوچھو تو میں نے اپنی بہن ہی کی وجہ سے یہاں داخلہ لیا ہے۔''

میں نے اسے یونیورسٹی ڈراپ کیا اور اپنی بہن کے گھر روانہ ہوگیا۔

میں اس سے قبل بھی شائلہ باجی کے گھر آچکا تھا۔ وہ ایک کثیر المنزلہ عمارت کے سولہویں فلور پر رہتی تھیں وہاں کے لحاظ سے وہ لگژری فلیٹ تھا۔ کھلے کھلے اور کشادہ تین بیڈ رومز، لاؤنج، ڈرائنگ و ڈائننگ روم، اٹیچ باتھ رومز، امریکن کچن لیکن فلیٹ تو بہرحال فلیٹ ہی ہوتا ہے۔ میں وسیع و عریض بنگلے میں رہنے کا عادی تھا۔ فلیٹ کتنا ہی خوب صورت اور لگژری ہو، مجھے دڑبا ہی لگتا تھا۔

شائلہ باجی اچانک مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ شام ہو چکی تھی اس لیے ہوٹل سے واپس آچکی تھیں۔ وہ دیر تک مجھ سے ڈیڈی، طاہر بھائی اور دوسرے لوگوں کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ ان کے چہرے پر اب بھی اداسی کے سائے تھے۔ میں نے بچوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی گورنس جولیا کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ عرفان بھائی ابھی واپس نہیں آئے تھے۔

وہ مجھ سے بولیں۔ ''تم تھکے ہوئے ہو، خاصا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔ تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا بناتی ہوں۔''

وہ جانے لگیں تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔



''شائلہ باجی! مجھے ایک بات بتائیں... لیکن سچ سچ بتائیے گا۔''

وہ کچھ گھبرا سی گئیں، پھر سنبھل کر بولیں۔ ''پوچھو، میں نے اس سے پہلے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے؟''

''آپ عرفان بھائی کے ساتھ خوش تو ہیں؟''

انہوں نے نظریں جھکا لیں اور بولیں۔ ''میں بہت خوش ہوں۔ عرفان میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' انہوں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش بھی کی۔

''دیکھیں، آپ پھر مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے سر پر ہاتھ رکھ کے کہیں کہ آپ خوش ہیں۔''

''میں... خوش تو ہوں... تم نے دیکھا نہیں کہ...''

کال بیل کی آواز پر ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ جولیا اور بچے واپس آگئے تھے۔ دونوں بچے مجھے دیکھ کر لپٹ گئے۔ بیلی زیادہ بولنے لگا تھا لیکن منی ابھی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بولتی تھی۔ مجھ سے بولی۔ ''ماما... آئی لائت... (لائک) یو... یو آر...'' وہ اٹک کر کچھ سوچنے لگی۔

میں پاکستان سے ان کے لیے بہت سے گفٹ لایا تھا۔ ان میں زیادہ تر ایسی چیزیں تھیں جو امریکا میں نہیں ملتیں۔ میں شائلہ باجی اور عرفان بھائی کے لیے بھی بہت سے گفٹ لایا تھا۔ جولیا کے لیے بھی میں نے کچھ پاکستانی گفٹ خرید لیے تھے۔ وہ سیدھی سادی لڑکی وہ گفٹ لے کر اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''شکریہ آپ کا سر عامر! شکریہ بہت شکریہ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔''

''یہ سب کمال بچوں کا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے ان بچوں سے بہت محبت ہے۔ تم ان کی گورنس ہو، میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔''

اسی وقت عرفان بھائی گھر آگئے۔ انہوں نے بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا۔ ''او ہو، آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔ کیسے ہو عامر؟ پاکستان میں سب خیریت ہے نا؟''

''شکر الحمدللہ!'' میں نے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں اور... پاکستان میں بھی سب خیریت ہے۔''

''تم تو اپنی بہن سے ملنے آئے ہو گے۔'' انہوں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں کہاں لفٹ کراؤ گے؟''

''میں اس دفعہ کسی سے ملنے نہیں آیا بلکہ ایم بی اے کرنے آیا ہوں۔ مجھے یہاں کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔''

عرفان بھائی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ سنبھل کر بولے۔ ''بہت اچھا! ایم بی اے کرنے کے بعد تم ڈیڈی کے لیے زیادہ مددگار ثابت ہوسکو گے۔''

''میں نے تمہارے لیے بیڈ روم درست کر دیا ہے۔ ویسے بھی وہ کمرا خالی ہی تھا۔ ایک کمرا بچوں کا ہے، دوسرا ہمارا بیڈ روم ہے۔ تیسرا بیڈ روم تمہارے کام آجائے گا۔''

''اور جولیا؟'' میں نے کہا۔ ''وہ کہاں سوتی ہے؟''

''ہمارا لاؤنج بہت بڑا ہے۔ جولیا شروع ہی سے لاؤنج میں سوتی ہے۔''

☆☆☆

دوسرے دن میں سو کر اٹھا تو گھر میں سوائے جولیا کے کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''صاحب اور میڈم تو صبح آٹھ بجے ہی نکل جاتے ہیں، بچے اسکول جا چکے ہیں۔ آپ ناشتے میں کیا لینا پسند کریں گے؟''

''صرف دو سلائس اور دو ہاف بوائلڈ ایگ۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ''بیلی تو خیر اسکول جانے کے قابل ہوگیا ہے حالانکہ پاکستان کے لحاظ سے ابھی وہ بھی چھوٹا ہے لیکن منی؟''

''منی صرف ایک گھنٹے کے لیے جاتی ہے تاکہ وہ اسکول کے ماحول سے آشنا ہو جائے۔ آپ ناشتا کریں، میں ابھی اسے لے آؤں گی۔''

''میں ناشتا کرلوں گا، تم اسے جا کر لے آؤ۔''

اس نے رسٹ واچ دیکھی اور بولی۔ ''او کے سر! اس کے آنے کا وقت تو ہوگیا ہے۔''

میں ناشتے سے فارغ ہو کر کافی پی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''ہیلو!''

دوسری طرف کوئی امریکن تھا۔ وہ بغیر یہ جانے نان اسٹاپ شروع ہوگیا کہ دوسری طرف کون ہے۔ وہ تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ''مسٹر ارفون (عرفان) تم ابھی تک گھر میں گھسے بیٹھے ہو، پارٹی یہاں ویٹ کررہی ہے۔ تمہارے بغیر میں ڈیل فائنل کیسے کرسکتا ہوں۔ پھر تم یہ بھی بھول گئے کہ آج سیٹرڈے ہے۔ تم نے ابھی تک سیٹرڈے نائٹ کا پروگرام بھی فائنل نہیں کیا کہ کس کلب میں جانے کا ارادہ ہے؟ میں نے دو تین پارٹیز کو گھیرا ہے۔''

''مسٹر! آپ جو کوئی بھی ہیں پہلے یہ معلوم تو کرلیں کہ آپ صحیح آدمی سے بات کررہے ہیں؟''

''سوری مسٹر... یو آر ناٹ ارفون؟ (عرفان) آپ کو پریشان کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ اس میں قصور مجھ سے زیادہ رانگ نمبر کا ہے، سوری اگین۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ

منقطع کردیا۔

ایک منٹ بعد پھر بیل بجی۔ میں جانتا تھا کہ دوسری طرف وہی باتونی امریکن ہوگا اس لیے میں نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ ہاں سی ایل آئی کے ذریعے اس کا نمبر ضرور نوٹ کرلیا۔

پھر کئی دفعہ بیل بجی، ہر دفعہ اسکرین پر اس کا نمبر نظر آیا لیکن میں نے نظر انداز کر دیا۔ ہاں، اس کی پہلی کال مٹادی۔

میرا خیال تھا کہ وہ عرفان بھائی کا کوئی آدمی ہوگا۔ انہوں نے کسی پارٹی سے ڈیل کی ہوگی جسے وہی فائنل کر سکتے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہفتے کی رات، کلب اور پارٹیز! پھر میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ سیٹرڈے نائٹس تو وہاں کے کلچر کا حصہ ہیں۔ عرفان بھائی کی آنکھوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ وہ ڈرنک بھی کرتے ہیں۔

میں اخبار لے کر بیڈروم میں آگیا۔

تھوڑی دیر بعد جولیا، نینی کو لے کر آگئی۔ نینی جتنی پیاری تھی اتنی ہی شرارتی بھی تھی۔ وہ میرے ساتھ یوں چپکی ہوئی تھی کہ اپنی کورنس کو بھی بھول گئی تھی۔

نیگرو ہونے کے باوجود جولیا خاصی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ کے بجائے گندمی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی ماں نیگرو اور باپ سفید فام تھا۔

مجھے اپنی ای میل چیک کرنا تھی۔ میں نے کمپیوٹر آن کیا تو پاس ورڈ کی وجہ سے وہ آن نہیں ہوا۔ لوگ عموماً اپنی ڈیٹ آف برتھ، اپنے بچوں کے نام، بیوی کے نام یا پھر کاروبار کے حساب سے کوڈ ورڈز ڈالتے ہیں۔

مجھے عرفان بھائی کی ڈیٹ آف برتھ یاد تھی لیکن کمپیوٹر نے اسے قبول نہیں کیا۔

اسی وقت جولیا آگئی اور بولی۔ ”مسٹر عامر! مجھے پاس ورڈ معلوم ہے۔ اگر آپ وعدہ کریں کہ یہ بات آپ کسی کو نہیں بتائیں گے تو میں کوڈ ورڈز بتا دیتی ہوں۔“

”تمہیں اگر مجھ پر اعتبار ہے تو بتا دو ورنہ رہنے دو... میں باہر جا کر انٹرنیٹ کیفے میں ای میل چیک کرلوں گا۔“

”آپ اچھے انسان ہیں۔ مجھے آپ پر اعتبار بھی ہے۔“ جولیا نے کہا۔ ”اس کمپیوٹر کا کوڈ ورڈ ہے H20۔“

”H20؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”یعنی پانی؟“

پھر میں نے پاس ورڈ میں H20 لکھا تو کمپیوٹر آن ہو گیا۔ میں نے ای میل چیک کی، کوئی ایسی ضروری میل نہیں تھی۔

میں نے ای میل کے ذریعے وصول ہونے والا ایک ایڈریس نوٹ کرنے کے لیے دراز کھولی تو مجھے اس میں ایک خوب صورت ڈائری نظر آئی۔ ریڈ کلر کی اس ڈائری کا کور ویلوٹ کا تھا۔ پہلے میں نے ڈائری نکالنے کا ارادہ کیا لیکن کسی کی ڈائری پڑھنا یوں بھی اخلاقی جرم ہے اس لیے میں نے دراز بند کردی اور کمپیوٹر بند کردیا۔

پھر جولیا صفائی کرتی رہی اور میں اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں اسے اصل میں شائلہ باجی کے بارے میں کریدنا چاہ رہا تھا اور وہ ہر بار موضوع بدل کر دوسری بات شروع کر دیتی تھی۔ وہ خاصی ذہین لڑکی تھی اور بات چیت کرنے کے فن سے آگاہ تھی۔

میں نے بھی اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ ہاں، یہ سوچ سوچ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری نازونعم میں پلی بہن یہاں آکر کام کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ عرفان بھائی سے اس موضوع پر بات کروں گا۔ کم از کم انہیں اس بات پر راضی کرلوں گا کہ وہ فلیٹ چھوڑ کر کسی اچھے علاقے میں کوئی بنگلا خرید لیں۔ میں انہیں رقم دینے کو بھی تیار تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ اگر عرفان بھائی وہاں کے انتہائی پوش علاقے میں کوئی وسیع و عریض بنگلا پسند کرتے تو بھی رقم کم نہ پڑتی۔

تھوڑی دیر بعد جولیا بیلی کو بھی لے آئی۔ اس نے آتے ہی اپنی ٹیچرز کے اور اسکول کے قصے چھیڑ دیے۔ میں اس کا دل رکھنے کو دلچسپی سے وہ قصے سنتا رہا۔ پھر جولیا نے اس کے کپڑے تبدیل کرائے، اسے لنچ کرایا اور بیڈ روم میں بھیج دیا۔

☆☆☆

وہ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے سیل فون پر وقت دیکھا، اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کا جگ خالی تھا۔ شاید جولیا پانی رکھنا بھول گئی تھی۔

میں سیل فون ہی کی مدھم روشنی میں کمرے سے باہر آیا اور کچن کی طرف چلا۔

شائلہ باجی کے کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گویا وہ لوگ ابھی تک سوئے نہیں تھے۔

میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ عرفان بھائی کے منہ سے اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”اب یہ عامر کی مصیبت اور نازل ہوگئی ہے۔ کوئی پرائیویسی ہی نہیں ہے۔“

”عامر کی کلاسز شروع ہو جائیں گی تو اس کے پاس اتنا



وقت ہی کب ہوگا کہ وہ ہمیں ڈسٹرب کرے۔“ شائلہ باجی نے کہا۔

”رہے گا تو سر پر سوار۔“ عرفان بھائی نے یوں کہا جیسے وہ شائلہ باجی کا بھائی نہیں بلکہ دور دراز کا کوئی ایسا رشتے دار ہو جو ان کے ٹکڑوں پر پڑ گیا ہو۔

میں پانی پیے بغیر دبے قدموں کمرے میں لوٹ گیا۔ اس وقت گویا میرے پورے جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ عرفان بھائی کو کھری کھری سنا دوں لیکن شائلہ باجی کی وجہ سے میں نے ضبط کیا اور باتھ روم میں جا کر شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا۔

نہانے سے میری طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ نہ جانے ڈیڈی اور طاہر بھائی کو اس عرفان میں ایسی کیا بات نظر آئی تھی کہ انہوں نے شائلہ باجی جیسی ہیرا لڑکی کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنی حرکتوں اور باتوں سے تو وہ مجھے کمی لگتا تھا۔

وہ رات میں نے جیسے تیسے گزاری اور صبح ہی صبح باہر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

”دس بجے سے پہلے پہلے آجانا۔“ عرفان بھائی نے کہا۔ ”جولیا نینی کو لینے جاتی ہے۔ اس کے سوا کوئی فالتو گاڑی نہیں ہے۔“

”میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔ وہاں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔“

میں ایک بریف کیس میں اپنے کاغذات، چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈز لے کر باہر آگیا۔ امریکا جیسے ملک میں گاڑی کا ہونا بہت ضروری تھا۔ پھر مجھے عرفان بھائی کی یہ بات دل کو لگ گئی تھی۔ جولیا، نینی اور بیلی کو ٹیکسی سے لاسکتی تھی۔ شائلہ باجی نے یہ بات دبے لفظوں میں کہی بھی لیکن میں اس وقت تک گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

گھر سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ دنیا بھر میں ٹیکسی ڈرائیونگ پر سکھوں ہی کا راج ہے۔ مجھے بھی ایک سردار جی ملے۔

”جی سر! ویئر یو وانٹ ٹو گو؟“ انہوں نے اپنی پنجابی ٹچ والی انگریزی میں کہا۔

”سردار جی! اتھے کوئی وڈا شو روم ہے؟“ میں نے پنجابی میں کہا۔

سردار اچھل پڑا۔ ”میکے ملیئے توں تے اپنے پنجاب دا جمپا ہے۔ احمد سروں آیا ہے؟“

”نہیں سردار جی! میں لاہور سے آیا ہوں۔“

”اوئے، تو نے تو سویرے سویرے دل خوش کر دیا۔ شوروم سے کوئی گاڑی رینٹ پر لینی ہے؟“

”نہیں سردار جی! مجھے گاڑی خریدنا ہے، زیرو میٹر!“

”اوہو جی تو تو مجھے پاکستان کا کوئی بزنس مین لگ رہا ہے۔ کون سی گاڑی خریدنی ہے؟“

”بی ایم ڈبلیو!“ میں نے اطمینان سے کہا۔

سردار جی ایک دفعہ پھر اچھل پڑے۔ ”بی ایم ڈبلیو! زیرو میٹر؟“ انہوں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں سردار جی! زیرو میٹر۔“ میں نے کہا۔

”میری ایک مانے گا؟“ سردار جی آپ سے اچانک تو پر آگئے۔ ”تو بی ایم ڈبلیو کے بجائے کوئی وڈی گڈی کریسلر یا کوئی دوسری گاڑی خرید لے۔ بی ایم ڈبلیو یہاں بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ بھگوان نہ کرے کوئی بات ہوئی یا گاڑی کہیں بچ ہوگئی تو وہ ایک دم نظروں میں آجائے گی۔ آگے تیری مرضی۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا پھر اس فیصلے کو مسترد کر دیا۔ وہ امریکا تھا۔ وہاں گاڑی چھوٹی ہو یا بڑی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”کوئی بات نہیں سردار جی! اصل میں مجھے شروع سے بی ایم ڈبلیو چلانے کی عادت ہے۔“ میں نے کہا۔

یہ بات سو فیصد سچ بھی تھی۔ ڈیڈی کے پاس بی ایم ڈبلیو تھی جسے میں اکثر ڈرائیو کرتا تھا ورنہ میرے پاس تو جدید ماڈل کی پراڈو تھی۔ میں تو صرف عرفان بھائی کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے ان کی چھکڑا گاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری سوچ بچکانا تھی لیکن میری کھوپڑی کبھی کبھی اسی طرح الٹ جاتی تھی۔

سردار جی نے مجھے نیویارک کے ایک بہت بڑے شوروم کے سامنے اتار دیا اور کہا کہ میں انتظار کر رہا ہوں، ڈیل فائنل ہو جائے تو مٹھائی کھا کر جاؤں گا۔

خوب صورت سی ایک سیلز گرل نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ امریکا میں کپڑوں کی شدید قلت ہے۔

”یس سر!“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بی ایم ڈبلیو چاہیے تو وہ چند لمحے غور سے میرا جائزہ لیتی رہی کہ یہ نوجوان گاڑی لینے آیا ہے یا محض وقت پاس کرنے... پھر اس نے مجھے اپنے منیجر کے حوالے کر دیا۔

شوروم میں نئی گاڑیوں کے علاوہ ایک استعمال شدہ

گاڑی بھی تھی۔ وہ صرف چھ ہفتے استعمال ہوئی تھی۔ منیجر نے مجھے ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ گاڑی ہر لحاظ سے موزوں ہے لیکن مجھے زیرو میٹر گاڑی چاہیے تھی۔

آخر پنک کلر کی چمچماتی ہوئی ایک بی ایم ڈبلیو مجھے پسند آ گئی۔

مختصر کپڑوں والی حسینہ نے مجھے ٹیسٹ ڈرائیو کی دعوت دی۔ باہر سردار جی موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ٹیسٹ ڈرائیو لے کر ابھی آتا ہوں، آپ اگر انتظار کر سکتے ہیں تو کر لیں ورنہ...

''جا تو ٹیسٹ ڈرائیو لے... میں ادھر ہی ہوں۔''

وہ بی ایم ڈبلیو کا نیا ماڈل تھا۔ سیلز گرل نے مجھے اس کے مختلف فنکشنز سمجھائے اور کچھ دیر بعد یہ گاڑی نیویارک کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

مجھے وہ گاڑی پسند آ گئی۔ میں نے بینک کے ذریعے ادائیگی کی۔ منیجر نے وعدہ کیا کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر گاڑی کے کاغذات بنوا دے گا۔

میں نے باہر آ کر سردار جی سے کہا کہ مجھے کم از کم ایک گھنٹے تک نیویارک کی سیر کرانیں۔ خاص طور پر وہ علاقے دکھائیں جہاں پاکستانی اور انڈین کھانے، مٹھائیاں وغیرہ ملتی ہیں۔

سردار جی مجھے لے کر ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں کا منظر بالکل گوال منڈی جیسا تھا۔ وہاں ہم نے پائے کھائے، لسی پی اور وعدے کے مطابق سردار جی کو نہ صرف مٹھائی کھلائی بلکہ ایک ڈبا پیک بھی کرا دیا کہ یہ میری طرف سے بھابی کے لیے ہے۔

سردار جی نے اپنا سیل نمبر مجھے دے کے کہا۔ ''نیویارک میں کوئی بھی تکلیف ہو، کبھی بھی ضرورت پڑے تو مجھے کال کر لینا۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے بھی انہیں اپنا سیل نمبر دے دیا۔ میں نے روانگی سے پہلے ہی انٹرنیشنل رومنگ کھلوا لی تھی۔

شوروم واپسی پر میری گاڑی کے کاغذات تیار تھے۔

میں نے سردار جی کو کرایہ دینا چاہا تو وہ برا مان گئے۔

ان تمام مراحل میں یونیورسٹی جانے کا وقت نہیں تھا۔ یوں بھی ابھی داخلے میں دو دن باقی تھے۔

اس دن میں نے دل کھول کر بی ایم ڈبلیو پر نیویارک کی سڑکیں ناپیں۔ پھر اچانک ایک روڈ پر مڑا تو وہاں کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے نیگرو نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا حیران کیوں ہوا تھا؟ شاید میری چمچماتی ہوئی بی ایم ڈبلیو دیکھ کر... کیونکہ وہ علاقہ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔

میں سوچے سمجھے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ وہاں ہر موڑ پر، ہر گلی پر، ہر فٹ پاتھ پر مجھے سیاہ فام ہی نظر آئے۔

اچانک مجھے یاد آ گیا کہ یہ ہارلم کا علاقہ ہے اور یہاں نیگروز کا راج ہے۔ امریکا جیسی پولیس بھی اس علاقے میں جاتے ہوئے گھبراتی ہے۔

میں نے سوچا کہ گاڑی کو یوٹرن دوں اور تیزی سے واپس نکل جاؤں لیکن وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں گاڑی کو یوٹرن دیا جا سکتا۔ وہاں کی گلیاں بھی نسبتاً کم کشادہ تھیں۔ پھر میں نے یہی سوچا کہ گاڑی کو کسی گلی میں ریورس کر کے دوبارہ مین روڈ پر لے آؤں۔ وہاں مجھے ایسی کوئی گلی بھی نہیں مل رہی تھی۔ ایک گلی میں دو تین سنی لوڈنگ ٹرکس کھڑے تھے، اس سے اگلی گلی میں نیگرو بیچ عجیب و غریب قسم کا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ میں اس چکر میں کافی آگے نکل آیا۔ آگے بائیں ہاتھ پر ایک نسبتاً چوڑی سڑک تھی۔

میں نے گاڑی روکی اور اسے احتیاط سے ریورس کر کے اس روڈ پر لے گیا۔

ابھی میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں سے وہاں کئی لمبے تڑنگے اور خوف ناک چہروں والے نیگروز نمودار ہوئے۔ ان میں سے دو نے گاڑی کے سامنے کھڑے ہو کر میرا راستہ روکا۔ تیسرا میری طرف آیا تو میں نے اپنی سائیڈ کا شیشہ اتار دیا اور پوچھا۔ ''یس جنٹل مین! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''جنٹل مین؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟''

''میں یہاں اجنبی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور راستہ بھٹک کر یہاں نکل آیا ہوں۔''

''تم تو مجھے پولیس یا کسی ایجنسی کے آدمی لگتے ہو۔'' سیاہ فام نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں باس کے پاس چلنا پڑے گا۔ کوئی اجنبی اتنی قیمتی گاڑی میں ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔''

''او کے چلو... میں اس کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔''

میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ اس نے بھرپور نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ ''ویسے جس نے بھی تمہیں سلیکٹ کیا ہے سمجھ دار آدمی ہے۔ چہرے سے فلمی ہیرو لگتے ہو، جان بھی خوب بنا رکھی ہے اور تم جھوٹ بول رہے ہو کہ تم یہاں اجنبی ہو۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم امریکن ہو۔ خیر، اس کا فیصلہ تو باس ہی کرے گا۔'' اس نے میرے



ہاتھ سے گاڑی کی چابی لیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''اس کی تلاشی لو۔''

دو آدمیوں نے بہت مہارت سے میری تلاشی لی لیکن میرے پاس سے سوائے میرے بٹوے اور ایک فونٹین پین کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ بٹوے میں شاید چار، ساڑھے چار ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ میرے کاغذات، کریڈٹ کارڈز اور چیک بکس بریف کیس میں تھیں جو میں نے گاڑی کی عقبی نشست پر رکھا تھا۔ وہ شاید جھٹکے سے پھسل کر سیٹ سے نیچے گر گیا تھا۔

پھر وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر لے کر کچھ دور چلنے کے بعد دائیں طرف مڑ گئے۔ ان لوگوں نے گنز چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر مجھے ''کلاسیکل بلیکس کلب'' کا نیون سائن نظر آیا جسے انہوں نے مختلف انداز میں CBC لکھ رکھا تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کراچی کے علاقے لیاری میں ہوں۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ لوگ نیلی جینز اور شرٹس میں تھے اور گدھا گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں کے بجائے منی لوڈنگ ٹرک اور سوزوکیاں چلا رہے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ پر سرسری سی ایک نظر ڈالی اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے جیسے یہ ان کے لیے کوئی معمول کی بات ہو۔

کلب میں داخل ہونے کے بعد دو آدمیوں نے ایک دفعہ پھر میری تلاشی لی لیکن ان لوگوں نے میرے بٹوے میں موجود ایک چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔

''باس کہاں ہے؟'' مجھے لانے والے ایک گن بردار نے کہا۔

''باس تو اس وقت ہال میں ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہاں اس وقت ایڈی اور فریڈ کا بہت زبردست مقابلہ چل رہا ہے۔''

میں الجھ کر رہ گیا۔ ''مقابلہ چل رہا ہے؟''

میں ابھی مقابلے کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے لے کر ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے تقریباً وسط میں باکسنگ رنگ ٹائپ کا اسٹیج بنا ہوا تھا اور اردگرد بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اس علاقے میں وہ پہلی جگہ تھی جہاں مجھے کچھ سفید فام بھی نظر آئے۔

میرے پوچھنے پر گن بردار نے بتایا کہ وہ جو بلیو سوٹ اور وائٹ شرٹ میں ہے، وہی باس ہے۔ وہ تقریباً چھ فٹ چار انچ اور تقریباً دو سو چالیس پونڈز کا مضبوط ہاتھ پیروں والا نیگرو تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور شخصیت میں وقار تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسی کو باس ہونا چاہیے، گن بردار نے بتایا کہ ایڈی وہ ہے جو اس وقت بری طرح پٹ رہا ہے اور فریڈ اسے زندہ چھوڑنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ ان دونوں کے مقابلے پر لاکھوں ڈالرز کی شرط لگی ہوئی ہے۔ باس کے ساتھ جو سفید فام بیٹھے ہیں، ان لوگوں نے بھی شرطیں لگا رکھی ہیں۔ وہ بھی انڈر ورلڈ کے لوگ ہیں۔

باس نے مجھ پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالی، پھر مقابلہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ گویا اس کے لیے بھی لوگوں کو یوں گن پوائنٹ پر دیکھنا روزمرہ کا معمول تھا۔

ان کالوں نے مجھے ایک کونے میں کھڑا کر دیا۔ وہاں سے بھی مجھے اسٹیج صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں لڑاکے لہولہان تھے۔ ان میں سے ایڈی کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ فریڈ کی طرح مضبوط تن و توش کا شخص تھا اور مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنی موت سے پہلے شکست تسلیم کر لے گا۔ مجھے وہ منظر دیکھ کر رومن بادشاہ یاد آ گئے جو کسی انسان کو بھوکے شیر سے لڑا کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ میں نے وہ سب کچھ فلموں میں دیکھا تھا لیکن یہاں تو حقیقت میں ایک جیتے جاگتے شخص کی جان جانے والی تھی۔ ایڈی کا پورا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور اس کے سر سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ فریڈ نے اپنے حریف پر دو تین کاری وار مزید کر دیے تو وہ مر جائے گا۔ اس کا حریف ایڈی ادھ موا ہو رہا تھا لیکن ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے انداز سے لگ بھی نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی شکست تسلیم کرے گا۔ میں نے سوچا، اس مقابلے کو رکوا دوں لیکن میں تو خود وہاں ایک طرح سے ان سیاہ فاموں کا قیدی تھا۔

ہارلم کے اس علاقے میں میرا تمام مارشل آرٹ، میری تمام مہارت اور نشانے بازی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ میں غالباً آپ کو بتانا بھول گیا کہ بروس لی کی فلمیں دیکھ دیکھ کر مجھے بھی مارشل آرٹ کا شوق چرایا تھا اور صرف چودہ سال کی عمر سے میں نے مارشل آرٹ کی تربیت شروع کر دی تھی۔ میرا شوق دیکھتے ہوئے ڈیڈی نے پہلے میرے لیے ایک چائنیز کوچ کا بندوبست کیا، پھر تین سال بعد ایک کورین کوچ مجھے یہ فن سکھانے لگا۔ اس کورین نے مجھ پر اتنی محنت کی تھی کہ میرے جسم کو فولاد بنا دیا تھا لیکن فولادی جسم بلٹ پروف تو نہیں ہوتا۔ اس لیے میں خاموشی سے کھڑا وہ خونی مقابلہ دیکھتا رہا۔

آخر فریڈ کے ایک پنچ سے ایڈی فرش پر گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ریفری نے دس تک کاؤنٹ کیا اور فریڈ کو فاتح قرار دے دیا۔

ایڈی کو وہاں سے اسٹریچر پر اٹھا کر لے جایا گیا۔

فریڈ کے حامیوں نے فلک شگاف نعرے لگائے۔ جو لوگ شرط جیتے تھے، وہ ایک طرف بنے ہوئے کاؤنٹر سے اپنی اپنی رقم لے رہے تھے۔

جب وہ ہنگامہ قدرے سرد ہوا تو باس میری طرف متوجہ ہوا اور اس شخص سے پوچھا جو مجھے گن پوائنٹ پر لایا تھا۔ ”کیا بات ہے الفرڈ... یہ نوجوان کون ہے اور تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”یہ مجھے کسی ایجنسی کا ایجنٹ لگتا ہے باس!“ الفرڈ نے کہا۔ ”یہ کافی دیر سے ہمارے علاقے میں نئی بی ایم ڈبلیو میں چکر لگا رہا تھا۔“

اس کی بات سن کر باس ہنس پڑا۔ ”تمہاری کھوپڑی میں عقل کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہے۔ کس کی جرأت ہے کہ وہ میرے علاقے میں یوں کھلے عام چکر لگائے؟“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”میں اس شہر تو کیا اس ملک میں بھی اجنبی ہوں باس! راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلا تھا۔ واپسی پر تمہارے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔“

”لیکن تمہاری جیب سے کوئی شناختی علامت نہیں نکلی؟“ باس نے کہا۔

”تمہارا یہ آدمی اگر غور سے میری گاڑی کا جائزہ لیتا تو اسے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا وہ بریف کیس مل جاتا جس میں میرے کاغذات ہیں۔ ممکن ہے سیٹ سے پھسل کر سیٹ کے نیچے گر گیا ہو۔“

”تمہارا تعلق ترکی سے ہے؟“ باس نے پوچھا۔

”میرا تعلق پاکستان سے ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اور پڑھنے کے ارادے سے یہاں آیا ہوں۔“

باس نے گھور کر الفرڈ کو دیکھا اور بولا۔ ”اچھی طرح گاڑی کی تلاشی لو اور بریف کیس لے کر آؤ۔ لگتا ہے، اب تمہیں ریٹائرمنٹ کی ضرورت ہے۔“

الفرڈ پٹے ہوئے کتے کی طرح باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد میرا بریف کیس لے کر واپس آ گیا۔

اس وقت تک وہاں رش کم ہو چکا تھا اور باس کے خاص آدمی ہی ہال میں رہ گئے تھے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایڈی کی حالت بہت خراب ہے لیکن خطرے سے باہر ہے۔ اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔

بریف کیس میں نمبروں والا لاک تھا۔ میں نے بریف کیس کھولا اور سارے کاغذات نکال کر باس کے سامنے رکھ دیے۔ اس میں میرا پاسپورٹ، چیک بکس، کریڈٹ کارڈز، یونیورسٹی کے فارم اور داخلہ لیٹر بھی کچھ موجود تھا۔ اسی میں گاڑی کے کاغذات بھی تھے۔

باس نے ایک ایک کاغذ کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”تم واقعی پاکستانی ہو۔ ہرڈا کیومنٹس میں تمہارا نام عامر خان ہے۔ کیا تم پاکستان کے کسی بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کے بیٹے ہو؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔ میرے ڈیڈی پاکستان کے چند بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنا کاروبار اب یورپ اور امریکا تک پھیلانا چاہتے ہیں۔“

”تم اگر واقعی غلطی سے ادھر نکل آئے ہو تو میں پہلی غلطی ہمیشہ معاف کر دینے کا عادی ہوں۔“

”میں نے آپ کو بتایا نا کہ مجھے یہاں کے راستوں کا بالکل علم نہیں ہے۔ میں واقعی غلطی سے ادھر نکل آیا تھا۔ اب یقین کرنا یا نہ کرنا آپ پر منحصر ہے۔ ہاں، آئندہ میں یہ غلطی نہیں دہراؤں گا۔“

”تم نے کبھی سی بی سی کا نام سنا ہے؟“

”میں نے یہ نام ابھی باہر نیون سائن پر پڑھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”الفرڈ! عامر کی گاڑی باہر نکالو اور اس کے حوالے کر دو۔“ باس نے کہا۔

میں بریف کیس اٹھا کر چلنے کو تیار ہو گیا۔

”تم ایسے نہیں جاؤ گے؟“ باس نے کہا۔ ”اب یہاں آئے ہو تو میں تمہیں اپنے کلب کی سیر کرا دوں۔ یہاں بہترین کیسینو ہے، دنیا کی بہترین شرابیں یہاں ملتی ہیں۔ یہاں آنے والے مہمانوں کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ آج تم میرے مہمان ہو اس لیے یہاں تم سے کسی بھی قسم کی کوئی رقم وصول نہیں کی جائے گی۔“

وہ مجھے ایک دوسرے ہال میں لے گیا۔ وہاں ایک طرف بہت بہترین قسم کا بار تھا، انواع و اقسام کی شرابیں تھیں اور نیم برہنہ نیگرو لڑکیاں تتلیوں کی طرح وہاں موجود لوگوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھیں۔

باس نے مجھے وہسکی کی آفر کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں بہت پارسا تھا یا شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ میں نے اس وقت ڈرنک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

باس نے ایک نیگرو لڑکی کو حکم دیا۔ وہ میرے لیے چکن بروسٹ، سینڈوچز، کولڈ ڈرنکس اور نہ جانے کیا کیا لے آئی۔



باس مجھے یہاں سے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک طرف رولٹ ٹیبل تھی، کئی ٹیبلو پر لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

میں نے باس کا دل رکھنے کو رولٹ ٹیبل پر قسمت آزمائی اور پانچ سو ڈالرز ہار کر وہاں سے ہٹ گیا۔

ایک ٹیبل پر پنجہ لڑانے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک سیاہ فام تھا اور دوسرا سفید فام۔ سفید فام نے ایسی بنیان پہن رکھی تھی جیسی ویٹ لفٹر پہنتے ہیں۔ اس کے مسلز ابھرے ہوئے تھے اور جسامت سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ پابندی سے جم جانے کا عادی ہے۔ اس نے دو منٹ سے بھی کم وقت میں سیاہ فام کا ہاتھ گرا دیا اور فاتحانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں نے اس مقابلے پر بھی شرطیں لگا رکھی تھیں اور ڈالرز کا لین دین ہو رہا تھا۔

میرے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ میں اس سفید فام کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری کھوپڑی کبھی کبھی اسی طرح الٹ جاتی تھی۔ فرنانڈو نے مجھے بتایا تھا کہ یہ البرٹ یہاں کا چیمپئن ہے اور کم بخت روزانہ ہزاروں ڈالرز لے کر یہاں آتا ہے۔

اس سفید فام البرٹ نے مجھے حیرت اور حقارت سے دیکھا، پھر بولا۔ ”تم مجھ سے پنجہ لڑاؤ گے... تم؟“

”میرے خیال میں اس وقت میرے سامنے تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہی ہے کہ میں تم سے پنجہ لڑاؤں گا۔“

”اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا ہاتھ زندگی بھر کے لیے ناکارہ ہو جائے تو ضرور لڑاؤ۔“ البرٹ نے کہا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر اپنا کوٹ اتارا، ٹائی کھولی اور اسے کرسی کی پشت پر ڈالنے والا تھا کہ قریب صورت سی ایک پُرکشش لڑکی نے وہ چیزیں میرے ہاتھ سے لے لیں۔ میں نے شرٹ بھی اتار کر اسے دے دی اور البرٹ کے سامنے بیٹھ گیا۔

البرٹ نے حیرت سے میرے جسم کو دیکھا، میرے بازوؤں کے مسلز کا جائزہ لیا، پھر وہ تیار ہو گیا۔

”ایک منٹ!“ میں نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم یہاں کے چیمپئن ہو؟“

”تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔“ البرٹ نے فخریہ انداز میں کہا۔

”او کے! پھر کوئی شرط ہو جائے۔“ میں نے کہا۔ ”میں بغیر شرط کے کوئی مقابلہ نہیں کرتا۔ پھر یہ قول تمہارے ہارا ہاتھ زندگی بھر کے لیے ناکارہ ہو سکتا ہے۔ بیٹ تو ضروری ہے۔“

”بولو... کیا لگاتے ہو؟“ اس نے کہا۔

میں نے گاڑی کی چابی نکال کر اس کے سامنے ڈال دی، پھر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”اتنی تمہاری اوقات نہیں ہے اس لیے شرط بھی تم ہی طے کرو۔“

اس نے چند لمحے غور کیا۔ دل ہی دل میں حساب لگایا پھر بولا۔ ”پچاس ہزار ڈالرز!“

”بس!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”چلو، یہ بھی قبول ہیں۔“

البرٹ کا پنجہ واقعی بہت سخت تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا ہاتھ کسی شکنجے میں جکڑ گیا ہو۔

البرٹ کے چہرے پر بھی حیرانی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ پاکستانی نوجوان بھی اتنی طاقت رکھتا ہوگا۔ اس موقعے پر مجھے اپنے کورین کوچ کی محنت کا خیال آیا۔ وہ مجھے تین تین میل ہاتھوں کے بل دوڑایا کرتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پیچھے سے میرے دونوں پیر پکڑ لیتا اور مجھے ہاتھوں کے بل دوڑاتا۔ اس سے میرے بازوؤں میں زبردست طاقت پیدا ہو گئی تھی۔

وہ قد و قامت اور تن و توش میں مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔

ہم دونوں نے ہاتھ ٹیبل کے بیچ میں رکھے اور وہاں موجود ایک سیاہ فام کے اشارے پر مقابلہ شروع ہو گیا۔

اس سے پنجہ لڑاتے ہوئے مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ وہ شخص بلا کا طاقتور تھا اور اگر وہ چیمپئن تھا تو بجا طور پر اس کا حق دار تھا۔ اس نے اپنے جسم کی پوری قوت اپنے دائیں ہاتھ میں منتقل کر دی اور میرا ہاتھ گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے کوچ نے نصیحت کی تھی کہ اگر مقابل تم سے زیادہ طاقتور ہو تو پہلے اسے اچھی طرح تھکا دو۔

ایک لمحے کو تو مجھے بھی محسوس ہوا کہ البرٹ میرا ہاتھ گرا دے گا کیونکہ وہ پوری قوت سے میرا ہاتھ گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح میرا ہاتھ گرا دے۔

میں نے اب تک اپنی توانائی بچا رکھی تھی اور صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔ جب مجھے احساس ہو گیا کہ البرٹ اب تھک چکا ہے، اس کا سانس پھول چکا ہے اور اب اس کے ہاتھ میں مزید طاقت نہیں ہے تو میں نے زور لگا کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اسے ایک ہی جھٹکے میں گرا دیا۔

وہاں ایک شور بلند ہو گیا۔

البرٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم نے بے ایمانی سے میرا

ہاتھ گرایا ہے۔"

"ہر کم ظرف ہارنے والا یہی کہتا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سیدھی طرح شرط کے پیسے نکالو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

اس نے اچانک میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ "تم نے مجھے کم ظرف کہا؟"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس طرح کی اوچھی حرکت پر اتر آئے گا۔ میں بے خیالی میں مار کھا گیا تھا۔ اس کا تھپڑ اتنا زبردست تھا کہ میں کرسی سے الٹ کر گر گیا۔

وہاں موجود کئی نیگروز نے گنز نکال لیں۔ ان کا رخ البرٹ کی طرف تھا۔

میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اشارے سے ان لوگوں کو روک کے بولا۔ "اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے، اس سے میں ہی نمٹوں گا۔"

باس کے اشارے پر وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے اچانک اپنے پیر سے البرٹ پر کرسی اچھال دی۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ میرے لیے اتنی سی مہلت کافی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ایک اسٹیٹ پنچ رسید کر دیا لیکن ہاتھ ہلکا ہی رکھا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی پیشانی کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔

پنچ کھاتے ہی وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح تیورا کر فرش پر گر گیا۔ اب یا تو وہ واقعی بے ہوش ہو گیا تھا یا جان بوجھ کر زمین پر گرا ہوا تھا تاکہ وہ مزید پٹائی سے بچ جائے۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" باس نے کہا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

ہم ایک دوسرے کمرے میں جا بیٹھے۔ باس بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس البرٹ نے میرے کلب کا ماحول خراب کر دیا تھا۔ ہمیشہ مجھے ہزاروں ڈالرز کی زک پہنچا کر یہاں سے جاتا تھا۔"

"تم اس کے آنے پر پابندی کیوں نہیں لگا دیتے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میری مجبوری سمجھ لو۔" باس نے کہا۔ "فرنانڈو کسی بھی معاملے میں مجبور نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات اسے بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں فرنانڈو... سوری باس!"

"آئی ڈونٹ مائنڈ! تم مجھے فرنانڈو کہہ سکتے ہو۔ میرے دوست مجھے فرنانڈو ہی کہتے ہیں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ البرٹ نیویارک کے انڈر ورلڈ ڈان ڈونالڈ کا آدمی ہے۔ اگر میں اس پر سختی کروں گا تو فضول کی ایک گینگ وار شروع ہو جائے گی۔ ابھی تو ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ چل رہا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے معاملے میں نہیں بولتے۔ بس یہی وجہ ہے کہ البرٹ یہاں میرے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔"

"ڈونالڈ کا ٹھکانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ البرٹ بہت کینہ توز آدمی ہے۔ وہ تمہیں وہاں دیکھے گا تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

کافی وقت گزر گیا تھا اس لیے میں نے باس سے اجازت چاہی تو اس مرتبہ اس نے انکار نہیں کیا۔

فرنانڈو (باس) مجھے چھوڑنے گاڑی تک آیا۔ اس نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا اور اس کی پشت پر ایک نمبر لکھ کر بولا۔ "یہ میرا پرسنل نمبر ہے۔ یہ نمبر صرف چار لوگوں کے پاس ہے۔ تم اگر کبھی ضرورت محسوس کرو تو مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتے ہو۔"

میں نے اسے اپنا سیل نمبر دینا چاہا تو اس نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے کاغذات اور سیل سے پہلے ہی تمہارا نمبر لے چکا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے بھولو گے نہیں۔"

پھر اس نے الفرڈ سے کہا۔ "عامر کے ساتھ جاؤ اور اسے ہارلم کے علاقے سے باہر نکال کر آؤ۔ یہاں تو ہر آدمی اپنے طور پر ڈان ہے۔ بی ایم ڈبلیو دیکھ کر کسی کی بھی رال ٹپک سکتی ہے۔"

الفرڈ میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "سر! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کا تعلق بھی انڈر ورلڈ سے ہے ورنہ..."

"میرا تعلق کسی انڈر ورلڈ سے نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ورنہ میں یوں کھلے عام کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ انڈر ورلڈ کے لوگ اتنے غیر محتاط نہیں ہوتے۔"

☆☆☆

میں گھر پہنچا تو اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس کمپلیکس کے ساتھ ہی ایک پارکنگ لاٹ تھا۔ وہ پارکنگ لاٹ اصل میں اردگرد کے دو تین کمپلیکس کے لیے تھا۔ فوراً ہی پارکنگ لاٹ کا ایک ملازم وہاں آ گیا اور بولا۔ "سر! اگر گاڑی پارک کریں گے تو آپ زحمت نہ کریں، گاڑی میں پارک کر دوں گا۔"

میں نے اسے دس ڈالر کا ایک نوٹ ٹپ کے طور پر دیا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے کہا کہ میں گاڑی کی چابیاں



...ی گارڈ کو پہنچا دوں گا۔ اپنا فلیٹ نمبر بتا دیں۔

"میں مسٹر عرفان کا مہمان ہوں۔" میں نے کہا۔

پھر میں جوں ہی گیٹ سے اندر داخل ہوا، مجھے عرفان ...نظر آ گئے۔ وہ اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ ...دیکھتے ہی وہ غصے سے بولے۔ "کہاں چلے گئے تھے تم؟ ...نے رو رو کر اپنی جان آدھی کر لی ہے۔ مجھے خود بھی فکر ...آج تو تمہاری کوئی ایسی مصروفیت بھی نہیں تھی۔ اگر کہیں ...بھی تھا تو کم سے کم سیل فون پر انفارم کر سکتے تھے لیکن تمہارا ...فون ہی آف تھا۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں مجھے ...باتیں سنا دیں۔

"میں دراصل... ایک دوست کے پاس رک گیا تھا۔ ...اس نے ڈنر پر روک لیا۔ میرا سیل فون نہ جانے کیسے اور ...آف ہو گیا۔ سوری عرفان بھائی... آپ کو میری وجہ سے ...تکلیف پہنچی۔"

"یہ گاڑی بھی کیا تمہارے اسی دوست کی ہے؟" عرفان ...نے شاید مجھے بی ایم ڈبلیو سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

"یہ گاڑی میری ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے آج ...خریدی ہے۔"

"ویری گڈ!" انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "گویا باپ ...کی محنت کی کمائی یوں عیاشی میں اڑائی جا رہی ہے؟" وہ پھر ...اپنے پرانے روپ میں آ گئے۔ "اتنی مہنگی گاڑی لینے کی کیا ضرورت تھی؟ تم یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو یا اپنے باپ کی دولت لٹانے؟"

میں نے بہت مشکل سے ضبط کیا کہ میرے منہ سے کوئی تلخ جملہ نہ نکل جائے۔ میں نے کہا۔ "میں شوروم میں گیا تھا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں یہ گاڑی پسند آ گئی۔ پاکستان میں بھی میں یہی گاڑی استعمال کرتا تھا۔"

"اچھا، اب اوپر چلو۔ شائلہ کو غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ وہ تمہیں ابھی تک دودھ پیتا بچہ سمجھتی ہے۔" ان کے لہجے میں طنز تھا یا غصہ، مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔

شائلہ باجی مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑیں۔ انہوں نے مجھے بے بھاؤ کی سنائیں اور دھمکی دی کہ آئندہ اگر اس قسم کی غیر ...ذمے داری کا ثبوت دیا تو ڈیڈی اور طاہر بھائی کو سب کچھ بتا ...دوں گی۔

میں نے اس وقت انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے ...نیویارک میں ایک بنگلا بھی کرائے پر لے لیا ہے اور اس کی ...ایڈوانس منی بھی دے دی ہے۔ میں شاید آپ سے بھی ذکر کرنا بھول گیا کہ گاڑی لینے کے بعد میں نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ پہلے زور دیتا رہا کہ میں کوئی اپارٹمنٹ لے لوں لیکن مجھے تو اپارٹمنٹ سے الرجی تھی۔ اس نے مجھے دو بنگلے دکھائے، ان میں ایک بنگلا مجھے پسند آ گیا۔ اس کا کرایہ زیادہ تھا لیکن بنگلا بہت خوب صورت تھا۔ خاص طور پر اس کی لوکیشن بہت اچھی تھی۔ پھر اس کا لان بھی بہت خوب صورت تھا۔ فرنشڈ بنگلا تھا اور اب مجھے صرف وہاں شفٹ ہونا تھا۔

شائلہ باجی کی ڈانٹ سن کر میں بیڈروم میں چلا گیا۔ میں نے سوچا، بنگلے کے بارے میں انہیں کل کسی وقت بتاؤں گا ورنہ ابھی تو یہ سختی سے انکار کر دیں گی۔

حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ جولیا بھی ابھی تک جاگ رہی تھی اور وہ بھی فکرمند نظر آ رہی تھی۔

جولیا میرے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی۔ شائلہ باجی جانتی تھیں کہ میں سونے سے پہلے دودھ ضرور پیتا ہوں۔ اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بولی۔ "مسٹر عامر! آپ سے ایک بات پوچھوں... آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

میں نے چونک کے اسے دیکھا اور کہا۔ "پوچھو۔"

"آپ کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟... آپ کے... چہرے پر... نیل پڑے ہوئے ہیں... ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی... نے آپ کو تھپڑ مارا ہے... انگلیوں کے نشانات بالکل واضح ہیں... میڈم نے تو شاید غصے اور فکرمندی میں اس بات پر غور نہیں کیا لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں یہ نشان دیکھ لیے تھے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے جولیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "واقعی میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اب مجھے کوئی ایسا ٹوٹکا بتاؤ کہ یہ نشان جلد از جلد ختم ہو جائیں۔"

"میرے پاس ایک کریم ہے۔ وہ لگانے سے یہ نشان کل شام تک ختم ہو جائیں گے۔"

"مجھے وہ کریم لا دو۔" میں نے کہا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ شائلہ باجی اور عرفان بھائی صبح چلے جاتے تھے، پھر ان سے رات ہی کو ملاقات ہوتی تھی۔

جولیا کی کریم نے حیرت انگیز اثر دکھایا اور صبح ہوتے ہوتے وہ نشانات معدوم ہو گئے۔ اس کم بخت البرٹ کا ہاتھ بہت سخت تھا لیکن یہ سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی کہ وہ خود بھی اب کسی اسپتال میں پڑا مجھے گالیاں دے رہا ہوگا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بنگلے کے بارے میں شائلہ باجی کو ہوٹل جا کر اطلاع دے دوں۔ وہاں وہ زیادہ شور شرابا نہیں کریں گی۔

میں فلیٹ سے نکلنے لگا تو جولیا مسکرا کر بولی۔ "مسٹر عامر! نئی گاڑی مبارک ہو۔ یہاں تو یہ گاڑی بڑے انڈسٹریلسٹ

رکھتے ہیں یا پھر عرب ملکوں سے آنے والے شاہی خاندان کے افراد!''

''تھینک یو جولی!'' میں نے اسے پہلی دفعہ جولیا کے بجائے جولی کہہ کر مخاطب کیا۔

پہلے میں یونیورسٹی گیا۔ وہاں میں نے اپنا فارم جمع کرایا۔ ایک سمسٹر کی فیس دی اور یونیورسٹی کا آئی ڈی کارڈ لے کر روانہ ہوگیا۔ کلاسز شروع ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے۔

وہیں میری یوسف سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بہت والہانہ انداز میں مجھ سے ملا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے یوسف! تم مجھے کچھ پریشان... بلکہ کچھ نہیں، بہت زیادہ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ کوئی پرابلم ہے؟ پاکستان میں تو سب خیریت ہے؟''

''عامر، ایسی تو کوئی...''

''دیکھو یوسف! مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔'' میں نے کہا۔ ''تم اگر واقعی مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو مجھے اپنی پریشانی بتاؤ، شاید میں اسے حل کرسکوں۔''

''عامر! تم تو جانتے ہو کہ میں یہاں اسکالرشپ پر آیا ہوں۔ اس میں صرف فیس اور بورڈنگ کے اخراجات ہیں۔ یہ لوگ مزید دو سو ڈالرز مانگ رہے ہیں۔ یونیورسٹی اس سال ہر غیر ملکی طالب علم سے دو سو ڈالرز فی سمسٹر وصول کرے گی۔ اب بتاؤ، فوری طور پر میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں۔ اگلے سمسٹر تک تو میں کہیں نہ کہیں کوئی پارٹ ٹائم جاب کر کے اس رقم کا بندوبست کرلوں گا۔''

''بس اتنی سی بات ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم فوری طور پر مجھ سے دو سو ڈالرز لے لو۔ جب تمہارے پاس ہوں تو مجھے لوٹا دینا۔ یہ میں تم پر کوئی احسان نہیں کررہا ہوں بلکہ قرض دے رہا ہوں۔''

''لیکن عامر...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا داخلہ نہ ہو اور تمہاری اسکالرشپ بے کار ہو جائے؟''

اس نے بہ مشکل تمام مجھ سے وہ پیسے لیے۔

وہاں سے میں اسٹائل اینڈ کمفرٹ فائیو اسٹار ہوٹل پہنچا۔ شمائلہ باجی کے ہوٹل کا یہی نام تھا۔ وہ اپنے آفس میں تھیں اور بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کے کہا۔

''اچھے موقعے پر آئے ہو عامر... پہلے تو تم کیک کھاؤ۔''

''کیک کس خوشی میں؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''ہے ایک بہت بڑی خوش خبری!'' شمائلہ باجی نے مسکرا کے کہا۔ ''عرفان نے تو اسی خوشی میں آج دونوں ہوٹلز کے اسٹاف کو ڈنر پر انوائٹ بھی کیا ہے اور انہیں چار چار ہفتے کا بونس بھی دیا ہے۔''

''پھر تو واقعی کوئی بڑی خوش خبری ہے۔'' میں نے کیک کھاتے ہوئے کہا۔ ''اب جلدی سے بتادیں کیا خوش خبری ہے؟''

''ہمارے ہوٹلز کی سروسز اور کوالٹیز دیکھتے ہوئے منسٹری آف ٹورازم اور ہوٹلز مینجمنٹ نے ہمارے دونوں ہوٹلوں کو سیون اسٹار کا درجہ دے دیا ہے۔ اب ہم اپنے اس کاروبار کو مزید پھیلا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں منسٹری اور گورنمنٹ سے ہمیں ہر طرح کی سہولت ملے گی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ہنس کے کہا۔ ''گویا میرا یہاں آنا مبارک ثابت ہوا۔ دیکھ لیں، میں جہاں جاتا ہوں وہاں کے لوگوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔'' میں نے انہیں چھیڑنے کو کہا۔

''منہ دھو رکھو۔'' شمائلہ باجی نے منہ بنایا۔ ''یہ سب عرفان کی اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس میں زیادہ دخل عرفان کی پی آر کا ہے۔ خیر چھوڑو یہ سب... تم بھی آج کے ڈنر میں انوائٹ ہو بلکہ تم تو میزبان ہو گے۔''

''میں ضرور شریک ہوتا لیکن...''

''لیکن کیا؟'' شمائلہ باجی نے میرا کان پکڑلیا۔

''لیکن اب تو اس ڈنر کے تمام انتظامات میں آپ کا ہاتھ بھی بٹانا پڑے گا۔''

میری بات پر شمائلہ باجی ہنسنے لگیں۔

پھر میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس بھی ایک خوش خبری ہے۔ یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہوگیا ہے اور میں نے نیویارک کے پوش ایریا میں ایک بنگلا رینٹ پر لے لیا ہے۔

''کیا؟'' شمائلہ باجی نے منہ بنا کر کہا۔ ''تم اب ہم سے علیحدہ رہو گے؟''

''ہاں شمائلہ باجی!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس دن میں رات میں پانی پینے اٹھا تو میں نے آپ کی اور عرفان بھائی کی باتیں سن لی تھیں۔ یہ ہے تو بہت غیر اخلاقی حرکت لیکن اپنا ذکر سن کے میں رک گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کے گھر میں کوئی ٹینشن ہو۔ عرفان بھائی کو احساس مت ہونے دینا کہ میں نے ان کی کوئی بات سنی ہے۔ ہاں، میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہر ویک اینڈ آپ کے اور بچوں کے ساتھ گزاروں گا۔''

شمائلہ باجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بولیں۔ ''میں بھی کیسی بہن ہوں کہ اپنے بھائی کو بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔''



''کم آن!'' میں نے کہا۔ ''میں ویسے بھی وہاں نہیں رہتا۔ آپ جانتی ہیں، مجھے فلیٹ کی زندگی سے نفرت ہے۔ میں کسی لگژری اپارٹمنٹ میں بھی نہیں رہ سکتا۔ پتا نہیں کیوں، مجھے کوفت ہوتی ہے۔''

''میں نے تو عرفان سے کئی بار کہا کہ وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کے کوئی اچھا سا بنگلا لے لیں لیکن وہ راضی ہی نہیں ہوتے۔''

''ویسے ڈیڈی کا بھی یہی ارادہ ہے کہ وہ یورپ اور نیویارک میں ہوٹلز کی ایک چین قائم کریں گے۔ جب میں آیا تو وہ اس فزیبلٹی پر کام کررہے تھے۔''

شمائلہ باجی ایک دم سنجیدہ ہوگئیں اور بولیں۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ہوٹلز بھی ڈیڈی کے ہیں۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں لیکن یہ بات عرفان کے علم میں نہ آئے۔ شادی کے وقت ان کا کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ہوٹل میں جی ایم تھے۔ اس سے پہلے کیلی فورنیا میں ان کے دو ہوٹلز تھے جو وہ جوئے میں ہار چکے تھے۔''

''جوئے میں؟'' میں ان کے ہر انکشاف پر حیرت زدہ ہورہا تھا۔

''ہاں، عرفان کو جوئے کی بھی لت ہے۔ اپنے دونوں ہوٹلز وہ فلیش میں ہار چکے ہیں۔ ان ہوٹلز کے لیے سرمایہ ڈیڈی نے فراہم کیا ہے لیکن دونوں ہوٹلز میرے نام پر ہیں اس لیے اب تک محفوظ ہیں۔ اس کے باوجود عرفان ہر ویک اینڈ پر ایک بڑی رقم جوئے میں ہار جاتے ہیں۔''

''ہار جاتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا وہ ہارنے ہی کے لیے کھیلتے ہیں؟''

''جواری ہمیشہ جیتنے کے لیے کھیلتا ہے۔'' شمائلہ باجی نے کہا۔ ''لیکن جہاں وہ کھیلتے ہیں وہاں ایک سے ایک شارپر موجود ہے۔ ممکن ہے کلب ہی نے شارپرز کو ملازم رکھا ہو، ایسا دنیا بھر میں ہوتا ہے۔ اکثر ویک اینڈ میں تو عرفان لاس اینجلس جا کر بھی قسمت آزمائی کرتے ہیں لیکن خالی ہاتھ، منہ لٹکائے واپس آتے ہیں۔''

اچانک شمائلہ باجی نے ٹشو پیپر سے اپنے آنسو صاف کیے اور سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

چند لمحے بعد عرفان بھائی اندر داخل ہوئے۔ دروازے کی طرف میری پشت تھی لیکن شمائلہ باجی نے شیشے کے دروازے میں سے انہیں دیکھ لیا تھا۔

وہ بہت والہانہ انداز میں مجھ سے ملے اور بولے۔ ''عامر! تمہارا آنا ایک طرح سے ہمارے لیے مبارک ثابت ہوا۔''

''یہی بات میں شمائلہ باجی کو سمجھا رہا تھا تو یہ نہیں مان رہی تھیں۔ عرفان بھائی! بہت بہت مبارک ہو۔''

☆☆☆

شام تک میں اپنے بنگلے میں شفٹ ہوگیا۔ رات کو شمائلہ باجی کے ہوٹل میں ڈنر تھا۔ مجھے کام تو خیر کیا کرنا تھا، میں تو بس ایویں شریک ہوگیا۔

ڈنر سے واپسی پر میں نے وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے سوچا، پاکستان میں اس وقت دن ہوگا۔ میں ڈیڈی اور طاہر بھائی سے بات کرنا چاہتا تھا۔

میں نے نمبر ملایا تو ریسیور شازیہ بھابی نے اٹھایا۔ میری آواز سن کے وہ شکایتیں کرنے لگیں ''تمہیں اب ہمارا خیال آیا ہے۔ دونوں بچے دن رات تمہیں یاد کرتے ہیں۔ طاہر بھی بات بات پر یاد کرتے ہیں۔ ڈیڈی بھی اور میں بھی... اور تم وہاں بی ایم ڈبلیو میں عیاشیاں کررہے ہو۔''

''تو یہ بی ایم ڈبلیو کی خبر آپ تک پہنچ گئی؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''گاڑی تو یہاں بہت ضروری ہے بھابی۔''

''گاڑی سے اچھا ہیلی کوپٹر ہے۔'' بھابی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اچھا، یہ طنز بعد میں کیجیے گا، پہلے ڈیڈی اور طاہر بھائی سے بات کرادیں۔''

اچانک لائن پر ٹینا آگئی اور بولی۔ ''واہ چاچو! آپ تو وہاں جا کے ہمیں بھول ہی گئے۔ اب بھی ہمارے بجائے پاپا اور دادا جان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، شانی لائن پر آگیا۔ دو تین منٹ اس سے بات کرنے بلکہ اسے منانے میں لگے۔

پھر ڈیڈی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو عامر!''

''السلام علیکم ڈیڈی!''

''وعلیکم السلام! تم وہاں پڑھنے گئے ہو یا...''

''میں نے یہاں داخلہ لے لیا ہے ڈیڈی۔'' میں نے بتایا۔ ''دو دن بعد کلاسز شروع ہو جائیں گی۔ ہاں، آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ڈیڈی نے کہا۔ ''عرفان کے دونوں ہوٹل سیون اسٹارز ہو گئے ہیں۔ میں نے بھی یورپ اور امریکا میں ہوٹل قائم کرنے کی فزیبلٹی بنائی ہے۔ جب تک تم تعلیم سے فارغ ہو گے، میں ابتدائی کام شروع کرا دوں گا۔ وہاں کے کاروبار کی دیکھ بھال اب تم ہی کرو گے۔''

''نہیں ڈیڈی! مجھے یہاں کی زندگی بالکل پسند نہیں

ہے۔ یہ کام بھی آپ عرفان بھائی ہی کے حوالے کر دیں۔ آخر پہلے بھی تو وہ آپ کے دو ہوٹل کامیابی سے چلا رہے ہیں۔"

"عامر!" ڈیڈی نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں یہ بات معلوم ہو ہی گئی ہے تو اب اسے آئندہ کبھی زبان پر نہ لانا۔ میں نے عرفان کو صرف سرمایہ فراہم کیا تھا۔ باقی تو اسی کی محنت ہے۔ ویسے میں اگلے مہینے... نیویارک آرہا ہوں۔ سنا ہے تم نے وہاں کوئی بنگلا لیا ہے اور بی ایم ڈبلیو بھی خریدی ہے؟"

"جی ڈیڈی! یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ میں نے اسی وجہ سے کیا ہے کہ آپ اور طاہر بھائی اکثر نیویارک آتے رہتے ہیں۔ اب آپ کے لیے گاڑی تو ضروری تھی۔"

"باتیں مت بناؤ عامر!" ڈیڈی نے کہا۔ "میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔"

پھر میرے پوچھنے پر ڈیڈی نے بتایا۔ "طاہر اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔ کسی کلائنٹ سے میٹنگ کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔ تم اس سے بات کرنا چاہتے ہو تو اس کے سیل فون پر کال کرو۔"

انہوں نے ایک دفعہ پھر مجھے بے شمار نصیحتیں کیں، وہاں کی آوارہ لڑکیوں سے بچنے کی ہدایت کی کہ وہ ایشیائی خاص طور پر پاکستانیوں اور انڈینز کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہیں اور پھر زندگی بھر بلیک میل کرتی ہیں۔ انہوں نے کھل کر تو نہیں کہا لیکن اشاروں کنایوں میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ وہاں کی پروفیشنل لڑکیاں ایڈز کے جراثیم لے کر گھومتی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا۔ "ہاں، وہاں ہارلم کے علاقے کی طرف بھی مت جانا۔"

مجھے ان کی بات پر ہنسی آگئی۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ میں نہ صرف ہارلم کے علاقے میں جا چکا ہوں بلکہ وہاں کئی گھنٹے گزار چکا ہوں۔

☆☆☆

"تمہیں اپنے کلب میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔" فرنانڈو نے کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب تم یہاں کا رخ بھی نہیں کرو گے لیکن تم واقعی جی دار آدمی ہو۔"

"میں اس وقت تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں فرنانڈو!" میں نے کہا۔

"بولو۔" فرنانڈو سنجیدہ ہو گیا۔ "میرے بس میں ہوا تو میں تمہارا وہ کام ہر قیمت پر کروں گا۔"

"مجھے شارپنگ سیکھنا ہے۔" میں نے کہا۔

"شارپنگ؟" فرنانڈو حیرت سے بولا۔ "یعنی کارڈز کے معاملے میں ہیر پھیر؟"

"ہاں، یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" فرنانڈو نے پوچھا۔ "تمہیں پیسے کی تو یقیناً ضرورت نہیں ہے... اور اگر پیسا ہی کمانا ہے تو اس کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"نہیں فرنانڈو۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف شارپنگ سیکھنا ہے۔ وہ بھی کسی انتہائی ماہر سے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

فرنانڈو چند لمحے تک سوچتا رہا پھر اس نے الفرڈ کو بلایا اور کہا۔ "وانگ یو کو کال کرو اور اسے یہاں بلالو۔"

"او کے باس!" الفرڈ نے کہا۔

"وانگ یو کی عمر اس وقت تقریباً اسّی سال ہوگی۔" فرنانڈو نے کہا۔ "لیکن پورے امریکا میں اس وقت تمہیں اس سے بہترین شارپر نہیں ملے گا۔ پہلے وہ میرے ہی کلب میں کھیلتا تھا لیکن اب بڑھاپے کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں رعشہ آگیا ہے اس لیے اتنی مہارت سے شارپنگ نہیں کر سکتا۔" پھر وہ مسکرا کے بولا۔ "اس دن تو تم نے انکار کر دیا تھا لیکن آج میں انکار نہیں سنوں گا۔ میرے پاس دنیا کی بہترین شیمپین ہے۔" اس نے نہ جانے کہاں سے کوئی بٹن دبایا۔ فوراً ہی ایک الہڑ سی سفید فام، نیم برہنہ لڑکی تیزی سے لہراتی ہوئی آگئی۔ فرنانڈو نے اسے وہسکی لانے کو کہا اور کہا کہ مسٹر عامر ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی خدمت اب تمہارے ذمے ہے۔

چند منٹ میں اس حسینہ نے شیمپین اور دیگر لوازمات کا اہتمام کر دیا۔ میں نے ابھی پہلا پیک ہی لیا تھا کہ الفرڈ نے وانگ یو کی آمد کی اطلاع دی۔ فرنانڈو نے اسے یہیں بھیجنے کا کہا۔

وانگ یو بوڑھا آدمی تھا لیکن اپنی جسامت سے اسّی سال کا نہیں لگتا تھا۔ اس نے جھک کر فرنانڈو کو تعظیم دی اور بولا۔ "بہت دن بعد یاد کیا ماسٹر! لیکن میں ابھی تک اپنے رعشے کا علاج کرا رہا ہوں اور کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔"

"وانگ یو! اگر کوئی بالکل نیا آدمی تم سے شارپنگ سیکھنا چاہے تو وہ کتنے عرصے میں یہ فن سیکھ سکتا ہے؟"

"یہ تو سیکھنے والے کی مہارت، ذہانت اور پھرتی پر منحصر ہے ماسٹر!" وانگ یو نے کہا۔

"تمہارا ہونے والا شاگرد تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔" فرنانڈو نے میری طرف اشارہ کیا۔

وانگ یو نے غور سے میرا جائزہ لیا پھر میرے نزدیک



کر بولا۔ "سر! آپ ذرا اپنی انگلیاں مجھے دکھائیں۔"

میں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔ اس نے میری انگلیوں کا جائزہ لیا۔ ہر انگلی کے جوڑ کا جائزہ لیا پھر "آپ کے ہاتھ اور انگلیاں تو موزوں ہیں، اب بات آپ کی ذہانت اور پھرتی کی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میں ...وں خصوصیات بھی موجود ہوں گی ورنہ باس کبھی آپ کی ...رش نہ کرتا۔ اگر آپ مجھے چار گھنٹے روز دیں تو میں آپ کو ...ینے میں شارپنگ سکھادوں گا۔"

"اس کے لیے تمہیں عامر کے گھر جانا ہوگا۔" فرنانڈو ...نے کہا۔ "عامر سے وقت طے کر لو۔"

"میں فوری طور پر وقت تو تمہیں نہیں بتا سکتا، ہاں اپنی ...س طے کرلو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں؟" وانگ یو نے کہا۔ "باس ...نے اتنے عرصے بعد مجھے یاد کیا ہے، یہی میری فیس ہے لیکن ...پ کو ایک بات بتا دوں، میں اپنے شاگردوں پر بہت سختی ...رنے کا عادی ہوں۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" فرنانڈو مسکرا کر بولا۔ "وانگ ...بہت سخت گیر استاد ہے۔ اس کی سختی تو تمہیں برداشت کرنا ...ے گی۔"

"میں اس سے پہلے بھی ایک چائنیز اور ایک کورین ...تاد کی بہت شدید سختیاں برداشت کر چکا ہوں۔ کارڈز کے ...کھیل میں کیا سختی ہوگی۔"

پھر وانگ یو نے مجھے اپنا سیل نمبر دیا اور کہا۔ "جب بھی ...آپ کے پاس وقت ہو، مجھے کال کر لیجیے گا۔ ہاں، کارڈز کا ...ایک نیا پیکٹ ڈیلی منگوانا مت بھولیے گا۔"

فرنانڈو کے شدید اصرار پر مجھے لنچ بھی وہاں کرنا پڑا۔

☆☆☆

وانگ یو نے میری ٹریننگ شروع کر دی۔ اس کے ...وں میں رعشہ تھا اس کے باوجود مجھ جیسا آدمی بھی اس کی ...لاکی نہیں پکڑ پاتا تھا۔ اس نے مجھے کارڈز شارپنگ کے ...ایسے طریقے سکھائے کہ میں حیران رہ گیا۔

اس کا سب سے بڑا کمال کارڈز کی شفلنگ تھا۔ وہ اسی ...میں اتنی پھرتی سے کارڈ سیٹ کرتا تھا کہ کارڈز کٹنے ...کے بعد بھی کبھی کبھار ہی بگڑتے تھے۔

اسی دوران میں پاکستان سے ڈیڈی آگئے۔ میں ...ورسٹی بھی باقاعدگی سے جا رہا تھا اور وہاں بھی میری بہت ...اچھی پوزیشن تھی۔

ڈیڈی مشکل سے تین دن وہاں رکے پھر یورپ کی طرف نکل گئے۔

میرے پھر وہی شب و روز شروع ہو گئے۔ صبح یونیورسٹی، دوپہر کو آرام، سہ پہر کو یونیورسٹی کے کام کا ریویزن اور چھ بجے سے لے کر دس بجے تک وانگ یو کے ساتھ ٹریننگ!

اس دوران میں اس نے مجھے بعض اوقات بری طرح جھڑکا بھی... میری انگلیوں اور کلائیوں پر چھڑی بھی ماری لیکن وہ بہرحال میرا استاد تھا۔

دو مہینے سے بھی کم عرصے میں وانگ یو نے کہہ دیا کہ میں نے تمہیں وہ سب کچھ سکھا دیا ہے جو میں جانتا ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں پورے دو مہینے تک پریکٹس کراؤں گا۔

اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ کھیل شروع کرنے سے پہلے اپنے رولز اور ریگولیشنز طے کر لینا چاہئیں۔ بلائنڈ چال کی کوئی حد نہیں ہوگی ورنہ دو تین چالوں کے بعد ہی لوگ شور مچاتے ہیں کہ اپنے کارڈز اٹھاؤ۔ ہمیشہ جوکر شو کر کے کھیلنا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب سب لوگوں کو پتّے بانٹ دیے جائیں تو پیکٹ رکھنے سے پہلے اس کا آخری کارڈ کھول دیا جائے۔ وہ کارڈ جوکر کہلاتا تھا۔

وہ دُگی، تگی، پنجا کوئی بھی پتا ہو سکتا تھا۔ اب اگر ان ہی پتّوں کی ٹریل تمہارے پاس ہو تو وہ اکوں کی ٹریل سے بھی بڑی ہوگی۔ عموماً جواری اس چکر میں مار کھاتے ہیں۔ اکّوں کی ٹریل لے کر وہ داؤ پر داؤ لگاتے رہتے ہیں اور آخرکار کنگال ہو کر اٹھتے ہیں۔

جب میں وانگ یو کے خیال میں بالکل پرفیکٹ ہو گیا تو وہ اپنے ساتھ چند شارپرز لے کر آیا۔ وہ صرف میرا ٹیسٹ لینا چاہتا تھا۔ ان سے میرا کھیل دیکھنے کے بعد وانگ یو نے مجھے ایک طرح سے گرین سگنل دے دیا کہ تم اب ہر طرح سے تیار ہو۔

میرے یونیورسٹی کے دوست اکثر گھر پر آجاتے تھے۔ خوب ہلا گلا رہتا تھا۔ ہفتے میں ایک دن ہم باربی کیو کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس گیدرنگ میں یوسف بھی آجاتا تھا۔ وہ کمپیوٹر جینئس تھا اور اپنا زیادہ وقت کمپیوٹر کے سامنے ہی گزارتا تھا۔

انہی میں کچھ لڑکے لڑکیاں ایسے تھے جو کارڈز کے بھی شوقین تھے۔ مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں نے ایک ویک اینڈ پر کارڈز کا پروگرام بھی رکھ لیا۔

وہ سب کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ تھے لیکن اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کھیلتے تھے کہ ان سے شارپنگ کی جاتی۔

میں نے محض اپنی پریکٹس جاری رکھنے کے لیے یہ

پروگرام رکھا تھا۔

کارڈز کی نئی گڈی کھولی گئی۔ ان میں ایک لڑکی انجلی کی سب ہی تعریف کررہے تھے کہ وہ کارڈز، خاص طور پر فلیش میں ماہر ہے۔ وہ انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ امریکن لڑکیوں کے برعکس اس کے بال لمبے لمبے تھے اور کمر تک آتے تھے۔ یونیورسٹی کے کئی لڑکے اس پر مرتے تھے لیکن وہ میری طرف مائل تھی۔ یہ خودستائشی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میرا چھ فٹ دو انچ قد، کسرتی جسم، سرخ و سفید رنگت اور براؤن بال دیکھ کر لڑکیاں میری طرف مائل ہو جاتی تھیں پھر میری گفتگو اور پرسنالٹی بھی ایسی تھی کہ صنفِ نازک کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھی۔

انجلی نے کارڈز شفل کیے۔ میں غور سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ معمولی سی شارپنگ جانتی تھی۔

اس نے کارڈز بانٹے تو حسبِ معمول میں نے تین بلائنڈ چالیں چلیں، پھر میں نے پتے اٹھالیے۔ میرے پاس تین کنگ تھے۔ میں بہت غور سے انجلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے پتے لگائے ہیں۔ ایک چال مزید چلنے کے بعد میں نے پتے پھینک دیے۔

انجلی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خود تین اکے لیے بیٹھی ہوگی۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنی بڑی ٹریل پر صرف ایک چال چل کر پیک ہو جاؤں گا۔ وہ بازی انجلی نے جیت لی۔

دوسری بازی میں بھی اس نے پتے لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے وانگ یو کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ایسی جگہ سے کارڈ کاٹے کہ اس کے سب پتے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

ہم لوگ بہت چھوٹے پیمانے پر کھیلتے تھے۔ ایک دن کارڈز کا کھیل جاری تھا کہ اچانک عرفان بھائی وہاں آگئے۔ کارڈز دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے۔

میں نے پتے بانٹے اور اپنے سب دوستوں سے ایک ایک دو دو چالیں چلنے کے بعد اشارے سے پتے پھکوا دیے۔ عرفان بھائی کے پاس کوئن کی ٹریل تھی۔

وہ چال پر چال لگا رہے تھے۔ میرے پاس کنگ کی ٹریل تھی۔ میں بھی ہر دفعہ چال ڈبل کر دیتا تھا۔ آخر انہوں نے کارڈز شو کرنے کو کہا۔ میں نے اپنے کارڈز شو کیے اور ٹیبل پر جمع ہونے والی رقم سمیٹ لی۔

پھر میں نے عرفان بھائی سے کہا۔ ”عرفان بھائی! یہ تو اسٹوڈنٹ ہیں۔ یہاں کہیں بڑے پیمانے پر فلیش نہیں ہوتا... یہاں کوئی بڑا کیسینو نہیں ہے؟“

عرفان بھائی نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولے۔ ”تمہیں جوئے کی لت کب سے لگ گئی؟“

”کالج کے زمانے میں کچھ دوستوں نے مجھے یہ لت لگا دی تھی... لیکن پلیز آپ شائلہ باجی یا ڈیڈی کو مت بتائیے گا۔“

”تم اچھا کھیلتے ہو۔“ عرفان بھائی نے کہا۔ ”دو تین بڑے بڑے کیسینوز تو ہیں لیکن وہاں بہت بڑے پیمانے پر جوا ہوتا ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔ ”میں بھی کوئی کنگال تو نہیں ہوں۔ دو چار لاکھ ڈالرز تو لگا ہی سکتا ہوں۔“

”دو چار لاکھ ڈالرز؟“ عرفان بھائی نے حیرت سے کہا۔ ”تم کیا اپنے ڈیڈی کی ساری کمائی یہاں جوئے میں اڑانے آئے ہو؟“

”عرفان بھائی! میں کھیلتا ضرور ہوں لیکن آج تک کبھی ہارا نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ناممکن!“ عرفان بھائی نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہاں دو تین کیسینوز تو ایسے ہیں جہاں نہ صرف امریکا کے کروڑ پتی بلکہ کچھ عرب ممالک کے شیوخ بھی کھیلتے ہیں۔ کیا تم ان لوگوں کے ساتھ کھیل سکتے ہو؟“

”بالکل کھیل سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے، اگلے ہفتے۔ میں تمہیں ایک کیسینو میں لے جاؤں گا۔ ان لوگوں نے مجھ سے لاکھوں ڈالرز جیتے ہیں۔“

☆☆☆

وہ کیسینو واقعی بہت شان دار تھا۔ عرفان بھائی شاید وہاں اکثر جاتے رہتے تھے اس لیے وہاں کے ڈیلر اور عملے کے دوسرے لوگ ان سے بہت عزت سے بات کررہے تھے۔

”فی الحال کتنے کے چپس لو گے؟“ عرفان بھائی نے پوچھا۔

”ایک لاکھ ڈالرز کے!“ میں نے یوں کہا جیسے سو روپے کی بات کی ہو۔

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولے۔ ”تم اتنی رقم صرف ایک رات میں ہارنے کو تیار ہو؟“

”میں نے کہا نا کہ میں کم سے کم تین لاکھ ڈالرز کا کھیل کھیلوں گا۔“ میں نے کہا۔



کیسینو کے ایک آدمی نے ہمیں ایک ٹیبل پر بٹھا دیا۔ اس پر دو بھدے جسم اور گنجے سروں والے امریکن، ایک انڈین اور دو عرب بیٹھے تھے۔ جھٹا آدمی مجھے ان سب سے الگ لگ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیسینو کا ملازم ہے۔

میں نے اپنے چپس اپنے سامنے رکھ لیے۔ اس دن عرفان بھائی محض تماشائی تھے۔

کارڈز بانٹنے سے پہلے میں نے کہا۔ ”میں جتنی مرضی بلائنڈ چال چلوں، کوئی زور نہیں دے گا کہ اپنے پتے دکھاؤں۔ دوسری بات یہ کہ میں جو کر شو کر کے کھیلتا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ شرط منظور ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں نہیں کھیلوں گا۔“

”او کے! یہ بھی کھیل کے اصول ہیں۔“ کیسینو کے ملازم نے کہا۔ ”اس میں رسک زیادہ ہے لیکن لوگ کھیلتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہے؟“ اس نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔

کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔

کارڈز کی نئی گڈی کھولی گئی اور احتیاطاً اسے باری باری نئی لوگوں نے شفل کیا۔ شفلنگ میں ایک عرب بہت ماہر تھا۔ پھر کھیل شروع کرنے کا قرعہ فال بھی اسی کے نام نکلا۔ اس نے پھر کارڈز بہت مہارت سے شفل کیے اور ہتھیلی پر رکھ کے درمیان میں کر دیے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر انہیں ایسی جگہ سے کاٹا کہ اگر اس نے پتے لگائے بھی ہوتے تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

کارڈز تقسیم ہونے کے بعد اینٹ کا اٹھا جوکر کے طور پر کھلا۔ میں نے حسبِ معمول بلائنڈ چال دینا شروع کیں۔ پانچ چالوں کے بعد باری باری سب نے اپنے کارڈز اٹھا لیے۔ عرفان بھائی نے میرے کان میں کہا۔ ”اپنے کارڈز اٹھالو۔“

میں نے ان کا گھٹنا دبا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ عرب نے ایک چال چلی دی۔ میں نے پھر بلائنڈ چال چلی۔ اس مرتبہ اس کی رقم دگنی تھی۔ عرب نے پھر ایک چال چلی لیکن اسے مزید دگنی رقم دینا پڑی۔

میں نے پتے اٹھا لیے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بازی میں نہیں جیتوں گا۔ میرے پاس کارڈز بھی بہت بکواس قسم کے تھے۔ میں وہ بازی ہار گیا۔

دوسری بازی میں، میں نے دو بلائنڈ چال کے بعد ہی کارڈز اٹھا لیے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے پاس ستوں کی ٹریل تھی اور ستا ہی جوکر کے طور پر کھلا تھا۔ اس بازی میں ایک عرب کی جگہ ایک انڈین شریک ہوا تھا۔ وہ شکل ہی سے بدمعاش لگ رہا تھا اور اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے سوا سب کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس کے چہرے پر جدید فیشن کی ڈاڑھی تھی اور آنکھوں پر چشمہ تھا۔

دوسرے لوگ پیک ہوتے گئے۔ آخر میں صرف وہ امریکن اور میں ہی رہ گئے۔ میں نے اپنے کارڈز عرفان بھائی کو بھی نہیں دکھائے تھے۔ میں ہر دفعہ چال ڈبل کر دیتا تھا۔ انڈین بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس کوئی بڑی ٹریل چال ہے۔ مجھے کیا پروا تھی؟ میرے پاس تو اس وقت سب سے بڑے پتے تھے۔

میں نے اتنی چالیں چلیں کہ میرے چپس ختم ہو گئے۔ کیسینو کے ملازم نے مجھے مزید ایک لاکھ ڈالرز کے چپس لا دیے۔

اسی وقت ایک انڈین لڑکی ٹہلتی ہوئی آئی اور کھیل دیکھنے کے لیے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے مزید پچاس ہزار ڈالرز لگا دیے۔

اب انڈین کے چہرے پر کچھ جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ اس نے بھی مزید دس ہزار ڈالرز کی چال چلی۔ میں نے چال دگنی کر دی۔

اس کے پاس شاید چپس کم تھے یا مزید رقم نہیں تھی ورنہ وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے چپس گن کر میری طرف بڑھائے تو اس کے سامنے محض دس بارہ چپس ہی رہ گئے۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ ”شو!“

میں نے اپنے کارڈز شو کیے اور ٹیبل پر لگا ہوا چپس کا ڈھیر سمیٹنے لگا۔

”ایک منٹ!“ انڈین نے کہا۔ ”تم ان ستوں کی ٹریل پر اتنا اکڑ رہے تھے... چپس کو ہاتھ مت لگانا۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے سامنے پتے پھینک دیے۔

وہ اکوں کی ٹریل تھی۔

”انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس جوکر کی ٹریل ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ ستا جوکر ہے؟“

”یہ کون سا کھیل ہے؟“

”کھیل کے رولز اینڈ ریگولیشنز پہلے ہی طے ہو چکے ہیں۔“ میں نے کہا اور سارے چپس سمیٹ لیے۔

اچانک بائیں جانب سے ایک اور انڈین نمودار ہوا یا پھر ممکن ہے، وہ پاکستانی ہو۔ اس نے اچانک ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ”اس کیسینو میں بے ایمانی نہیں چلتی۔ یہاں شرفا

کھیلتے ہیں۔'' اس نے ریوالور لہرا کر کہا۔ ''چپس واپس کرو۔''

لڑکی نے سریلی سی ایک چیخ ماری اور وہاں سے گرتی پڑتی بھاگ گئی۔

''بے ایمانی تو تم کر رہے ہو؟'' میں نے کہا اور اچانک اپنا بیگ اس کے چہرے پر اچھال دیا۔ پھر میں نے اسے موقع نہیں دیا اور دو ہی پنچ میں اسے ڈھیر کر دیا۔

عرفان بھائی اس ساری صورت حال سے بہت پریشان تھے۔

فوراً ہی کیسینو کی سیکیورٹی کے لوگ وہاں آ گئے۔ انڈین کا یہ کہنا تھا کہ وہ کھیل میں بعد میں شامل ہوا تھا اس لیے اسے اس شرط کا علم نہیں تھا کہ جوکر کی ٹریل سب سے بڑی ہوتی ہے۔

''او کے!'' میں نے کہا۔ ''کارڈز تو تم نے بانٹے تھے نا؟'' میں نے ایک عرب کو اشارہ کیا اور کہا۔ ''آپ ذرا اس گڈی میں سے چوتھا اکا نکال کر دکھا دیں۔'' میں نے انڈین کو چوتھا اکا اپنی شرٹ کی آستین میں رکھتے دیکھ لیا تھا۔ اگر میرے پاس جوکر کی ٹریل نہ ہوتی تو شاید میں بہت پہلے اس کی یہ بے ایمانی پکڑ لیتا۔

میری بات سن کر انڈین کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس کا ساتھی تو میرے پنچ کھا کر ابھی تک انا گنیل پڑا تھا۔

میری نظریں انڈین پر تھیں۔ وہ ذرا بھی حرکت کرتا تو میں اسے دبوچ لیتا۔ میں اب اس کے بالکل نزدیک جا کھڑا ہوا تھا۔

عرب نے اعلان کیا کہ ان کارڈز کی تعداد 53 ہے اور ان میں حکم کا اکا نہیں ہے۔

''اب بولو، بے ایمانی کون کر رہا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''شرافت سے خود ہی وہ پتا نکال دو ورنہ میں نے نکالا تو تمہارا حشر بھی اپنے ساتھی جیسا ہوگا۔''

''میرے پاس کوئی کارڈ نہیں ہے۔'' انڈین نے کہا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں ان سب لوگوں کے سامنے تمہاری تلاشی لوں؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کارڈ نکالو ورنہ...''

میرے تیور دیکھ کر اس نے بادل ناخواستہ اپنی شرٹ کی آستین میں چھپا ہوا حکم کا اکا نکال لیا۔

یہ دیکھتے ہی کیسینو کی سیکیورٹی کے لوگ اسے دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔

میں نے تمام چپس سمیٹ کر بیگ میں رکھے اور کاؤنٹر پر جا کر انہیں کیش کرایا تو وہ ڈھائی لاکھ ڈالرز تھے۔

کیسینو کا منیجر میرے پاس آ گیا اور بولا۔ ''سر! میں اس ناخوش گوار واقعے کی معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی یہاں تشریف لائیں گے۔''

میرے پاس خاصا بڑا بیگ تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ میں وہاں سے خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ عرفان بھائی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ اگر تم ہر ہفتے یہاں آتے رہے تو میرا سارا نقصان چند مہینوں میں پورا ہو جائے گا۔

میں نے کیسینو کے پورٹر کو اپنی گاڑی کی چابی دی اور اسے گاڑی کا نمبر اور میک بتا کر کہا کہ میری گاڑی یہاں پورچ میں لے آئے۔

میں اتنی بڑی رقم لے کر پارکنگ لاٹ میں نہیں جا سکتا تھا۔ چور، اچکے اور لٹیرے عموماً پارکنگ لاٹ ہی میں اپنے شکار کا انتظار کرتے ہیں۔

مجھے خطرہ تھا کہ وہ بدمعاش انڈین یا اس کے ساتھی کیسینو سے باہر مجھ پر حملہ کر کے رقم چھیننے کی کوشش کریں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

میں نے عرفان بھائی کو ان کے فلیٹ پر چھوڑا اور رقم کا بیگ بھی ان کے حوالے کر دیا کہ میں صبح کسی وقت لے لوں گا۔

پھر عرفان بھائی نے کئی مرتبہ کیسینو چلنے کو کہا لیکن ان دنوں میرے سیمسٹر چل رہے تھے اس لیے میں اپنی پڑھائی میں لگا ہوا تھا۔

میں پیپر دے کر فارغ ہوا تو پھر نیویارک، نیوجرسی، نیو آرک اور دوسرے شہروں کی سیر شروع کر دی۔

☆☆☆

میں اس دن شائلہ باجی کے ہوٹل کے سامنے سے گزر رہا تھا تو بے اختیار وہاں رک گیا۔

باجی اپنے آفس میں نہیں تھیں۔ میں آفس میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے ہوٹل میں ایک عجیب سی ہلچل کا احساس ہوا۔

شائلہ باجی آئیں تو وہ مجھے بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے باجی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے ہوٹل کو ایک اور اعزاز نصیب ہوا ہے لیکن یہ کام بہت زیادہ ذمے داری کا ہے۔'' شائلہ باجی نے کہا۔

''مجھ سے صاف الفاظ میں بات کیا کریں۔'' میں جھنجلا گیا۔ ''کیا ہوٹل فور سٹین اسٹار ہو گیا یا...''

''صدرِ پاکستان نجی دورے پر یہاں آ رہے ہیں۔''

باجی نے کہا۔ ''وہ ہمارے ہوٹل میں قیام کریں گے۔''

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ تم پریشان کیوں ہو؟ ہمارے ہوٹل کو میڈیا کی مزید کوریج مل جائے گی۔''

''مجھے پریذیڈنٹ کی سیکیورٹی کی فکر ہے۔'' شائلہ باجی نے کہا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ آج کل وہ کس مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔''

''تو سیکیورٹی بڑھا دو بلکہ مزید دو چار سیکیورٹیز ایجنسیز کی خدمات حاصل کرلو۔''

''میں نے ہوٹل کی سیکیورٹی بڑھا دی ہے۔ ہمارا چیف سیکیورٹی آفیسر میجر طارق انتہائی ذمے دار آدمی ہے۔ وہ آرمی کا ریٹائرڈ کمانڈو ہے۔ اس کے علاوہ کیپٹن نعیم بھی بہت بہترین سیکیورٹی آفیسر ہے۔ وہ بھی آرمی کا ریٹائرڈ کمانڈو ہے۔ ان کے انڈر میں جتنے لوگ ہیں، سبھی بہت چاق و چوبند اور ذمے دار ہیں۔ سوائے چند ایک کے، سبھی پاکستانی ہیں۔''

''تمہیں چاہیے کہ تم یہاں کی کسی اچھی سیکیورٹی ایجنسی کی سروسز بھی ہائر کرلو۔ صدر کو اس وقت واقعی بہت زیادہ سیکیورٹی کی ضرورت ہے۔''

''میں نے میجر طارق سے کہا تھا۔'' شائلہ باجی نے کہا۔ ''لیکن اس کا خیال ہے کہ ہمارے پاس جتنے لوگ ہیں سب ہمارے اعتماد کے ہیں..... نئے لوگوں کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔''

''تم ایسا کرو کہ جس فلور پر صدر صاحب قیام کریں، وہاں عام آدمی کے جانے پر پابندی لگا دو۔ اس فلور کی لفٹ اور زینوں کے پاس سیکیورٹی کے دو دو آدمی کھڑے کردو اور وہاں جانے والے اپنے ہر آدمی کو بھی خصوصی پاس جاری کرو۔ چاہے وہ عرفان بھائی ہوں یا میں ہوں۔''

''کیا تم بھی آنا چاہتے ہو؟'' شائلہ باجی نے کہا۔

''ہاں، اپنے ملک کے سربراہ سے ملنے اور اسے دیکھنے کا شوق تو مجھے بھی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''اس کے لیے تم ان لوگوں کے لیے خصوصی کارڈز پرنٹ کرانا جو صدر صاحب کے فلور تک جائیں گے۔ اس پر عام اسٹیمپ نہیں ہوگی بلکہ امبوزڈ اسٹیمپ ہوگی۔ وہ اسٹیمپ ایسے الفاظ میں بنوانا کہ یہاں کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ مثلاً درمیان میں گلاب اور کناروں پر ایس، آر ایس، یعنی شائلہ اور شائلہ!''

''تم تو اچھے خاصے سراغ رساں ہو۔'' شائلہ باجی نے ہنس کر کہا۔ ''میجر طارق کی جگہ تمہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''اچھا یہ بتاؤ، صدر صاحب کب تشریف لا رہے ہیں؟''

''وہ پرسوں صبح یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، آج رات اور کل میں یہاں کے سارے سیکیورٹی معاملات چیک کرلوں گا۔ میجر طارق اور کیپٹن نعیم سے بھی مل لوں گا۔ اس وقت تو مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ گیا۔

☆☆☆

میجر طارق تقریباً چالیس سال کی عمر کا چاق و چوبند شخص تھا۔ اس کا جسم کسرتی اور قد درمیانہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ وہ اپنے اردگرد کی ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔ اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ وہ تین سال قبل ہی آرمی سے ریٹائر ہوا تھا۔ آرمی کے ایس ایس جی گروپ میں تھا اس لیے اس کی حربی مہارت کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ''عامر صاحب! لگتا ہے، آپ کا تعلق بھی آرمی کے ایس ایس جی گروپ سے ہے۔''

''یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟'' میں نے ہنس کے پوچھا۔

''آپ کی جسامت اور باڈی لینگویج دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے، پھر آپ نے میڈم کو جو اسپیشل پاس پرنٹ کرانے کا مشورہ دیا ہے وہ تو میرے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔'' پھر اسے کچھ خیال آیا، اس نے بیل بجا کر پیون کو بلایا اور بولا۔ ''عامر صاحب میرے مہمان ہیں، انہیں اچھی سی کافی پلاؤ۔ اور ہاں، وہ جو کوریڈور میں گملے رکھے ہیں ان میں ایک گملا مختلف کیوں ہے؟''

''سر! اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ صبح وہ گملا ٹوٹ گیا تھا۔ کیپٹن صاحب نے ویسا ہی ایک دوسرا گملا منگوا کر وہاں رکھوا دیا۔''

''ٹھیک ہے، تم جا کر اچھی سی کافی لاؤ۔''

میں اس کی باریک بینی پر حیران رہ گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''پرانے گملے پر ہلکا سا ایک اسکریچ پڑ گیا تھا۔ اس گملے پر کوئی اسکریچ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس گملے کو تبدیل کیا گیا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں شائلہ باجی اور عرفان بھائی کے انتخاب کو سراہا۔ انہیں میجر طارق کی صورت میں واقعی ایک زبردست چیف سیکیورٹی آفیسر مل گیا تھا۔

پھر اس نے مجھے کیپٹن نعیم سے ملایا۔ دراز قد کا یہ نوجوان بھی خاصا چاق و چوبند تھا اور ہر طرح سے سیکیورٹی کا اہل تھا۔



وہ میجر کے مقابلے میں خاصا ہنس مکھ تھا۔ سیکیورٹی کے دیگر عملے میں مجھے حوالدار دلاور خان پسند آیا۔ اس کا تعلق پاکستان کے شمالی علاقے سے تھا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں سچا اور کھرا آدمی لگا۔

پھر میجر نے مجھے ساتویں منزل دکھائی جہاں صدر صاحب کو قیام کرنا تھا۔ ہوٹل میں دو لفٹیں تھیں۔ ان میں سے ایک لفٹ میجر نے صرف ساتویں منزل کے لیے مخصوص کر دی تھی اور دوسری لفٹ کو ڈائریکٹ کرا دیا تھا۔ وہ ساتویں منزل پر رکے بغیر اوپر نکل جاتی تھی۔ آنے جانے کے لیے زینے بھی تھے۔ وہاں بھی اس نے سیکیورٹی کے زبردست انتظامات کیے تھے۔ لفٹ کے پاس بھی دو سیکیورٹی آفیسر کھڑے تھے اور اس وقت لفٹ کی نگرانی بھی دو سیکیورٹی آفیسر کر رہے تھے جو ڈائریکٹ کردی گئی تھی۔ کوریڈور میں بھی اس نے ایسی جگہ سیکیورٹی کا بندوبست کیا تھا جہاں سے ہر طرف نظر رکھی جاسکتی تھی۔ میں اس کے انتظامات سے متاثر بھی ہوا اور مطمئن بھی ہوا۔

شام تک کارڈ..... آگئے۔ میں نے براسو کی امبوزڈ اسٹیمپ ایک دوسری جگہ سے بنوائی تھی۔ اس اسٹیمپ کے علاوہ کارڈ پر شائلہ باجی یا طارق میں سے کسی ایک کے سائن ضروری تھے۔ امبوزڈ اسٹیمپ کا علم کسی کو بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں سے بنوائی گئی ہے۔

میجر طارق نے اپنے انتہائی خاص آدمیوں کو وہ خصوصی کارڈز تقسیم کر دیے۔ وہ کارڈز ایک ٹیپ کے ذریعے ان ملازمین کو اپنے گلے میں ڈالنے کی ہدایت تھی۔

ویٹرز میں بھی سیکیورٹی کے آدمی موجود تھے۔

صدر صاحب صبح سویرے پہنچ گئے۔ میڈیا سے یہ خبر چھپائی گئی تھی ورنہ ہوٹل پر پریس والوں کا ہجوم لگ جاتا۔ وہ عام فلائٹ سے نیویارک آئے تھے اور بغیر کسی پروٹوکول کے ہوٹل تک پہنچے تھے۔

میں اس دن صبح ہی صبح ہوٹل پہنچ گیا تھا۔ بیلی اور نینا بھی ضد کر کے شائلہ باجی کے ساتھ آگئے تھے۔ شائلہ باجی نے ایک خصوصی کارڈ مجھے بھی دیا تھا۔ ایک اپنے لیے بنایا تھا اور ایک عرفان بھائی کو دیا تھا کیونکہ میجر کو سختی سے ہدایت تھی کہ اگر بغیر خصوصی کارڈ کے میڈم یا عرفان صاحب اوپر جانا چاہیں تو انہیں بھی نہ جانے دیا جائے۔

صدر صاحب نے ہم سے اور عملے سے باری باری ملاقات کی پھر وہ اپنے سویٹ میں چلے گئے۔ ناشتا انہوں نے فلائٹ میں کرلیا تھا اس لیے انہوں نے صرف کافی طلب کی۔ کافی پینے کے بعد ان کے سیکریٹری نے میجر طارق کو ہدایت دی کہ صدر صاحب اب چار بجے تک آرام کریں گے کیونکہ وہ طویل سفر کر کے آئے ہیں۔ پانچ بجے ان کی ایک اہم میٹنگ تھی۔

اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ گویا اب ہمارے پاس ساڑھے چھ گھنٹے تک کا وقت تھا۔

میں اس وقت شائلہ باجی کے آفس ہی میں بیٹھا تھا۔ وہاں عرفان بھائی اور دونوں بچے بھی موجود تھے۔

عرفان بھائی نے کہا۔ ''شائلہ! میں یہاں موجود ہوں۔ تم ذرا دوسرے ہوٹل کا ایک چکر لگا لو۔ وہاں بھی کچھ معاملات دیکھنے ہیں۔''

شائلہ باجی جانے کے لیے اٹھیں تو دونوں بچے بھی ضد کرنے لگے کہ ہم بھی مما کے ساتھ جائیں گے اور راستے میں آئس کریم کھائیں گے۔

بیلی نے کہا۔ ''آج ہم عامر ماما کی گاڑی میں جائیں گے۔ بی ایم ڈبلیو میں بیٹھ کر بہت مزہ آتا ہے۔''

میں نے گاڑی کی چابی نکال کر شائلہ باجی کو دے دی۔

عرفان بھائی نے کہا۔ ''شائلہ! وہاں زیادہ دیر مت لگانا۔ بس جو ضروری کام ہوں انہیں نمٹا کر فوراً آجانا۔''

میجر طارق نے ان گاڑیوں کی ونڈ اسکرین پر بھی خصوصی اسٹیکرز لگوائے تھے جو ہوٹل کی پارکنگ اور پورچ میں داخل ہوسکتی تھیں۔

شائلہ باجی دونوں بچوں کے ساتھ چلی گئیں۔

عرفان بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''عامر! اب تو تم سیمسٹر سے فارغ ہو گئے ہو۔ اب کسی ویک اینڈ پر کیسینو کا پروگرام بنالو۔''

''ہاں عرفان بھائی!'' میں نے کہا۔ ''اب پروگرام بن سکتا ہے۔''

☆☆☆

شائلہ باجی کو گئے ہوئے پچیس منٹ ہو گئے تھے۔ اچانک عرفان بھائی کے سیل فون کی بیل بجی انہوں نے نمبر دیکھا، پھر الجھے ہوئے انداز میں فون ریسیو کرلیا۔ ''ہیلو.... جی ہاں عرفان بول رہا ہوں.. کیا! تم ہو کون؟... تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوئی؟ تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو؟... ہاں...'' وہ خاموش ہو کے دوسری طرف کی بات سننے لگے... ''کتنے آدمی... لیکن کیوں... اچھا دھمکیاں مت دو۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

''کون تھا عرفان بھائی؟'' میں نے مضطرب ہو کر

پوچھا۔ میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

"کسی نے شائلہ اور بچوں کو گاڑی سمیت اغوا کر لیا ہے۔" عرفان بھائی نے فکرمندی سے کہا۔

"کیا!" میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "اغوا کر لیا ہے لیکن کیوں؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہمارے دو آدمی وہاں آئیں گے۔ انہیں ساتویں منزل کے آفیشل کارڈز دے دینا۔ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو یا کسی بھی ایجنسی کو ہرگز مت دینا ورنہ تمہاری بیوی اور بچے زندہ نہیں ملیں گے۔ یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لو۔ پولیس کو اطلاع دو، میں باری باری تمہارے بچوں اور بیوی کی لاش بھجوا دوں گا۔ گاڑی مجھے بونس میں ملی ہے۔"

میں مضطرب ہو کر ٹہلنے لگا۔ میں نے عرفان بھائی سے کہا۔ "میجر طارق کو بلا کر اس واقعے کی اطلاع دیں تاکہ وہ مزید چوکنا ہو جائے۔"

"اغوا کرنے والوں نے کہا ہے کہ اس واقعے کی اطلاع کسی کو بھی نہ دی جائے... اپنے سیکیورٹی اسٹاف کو بھی نہیں۔" عرفان بھائی کے لہجے میں تشویش تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب کیا کروں؟"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "میجر طارق ہمارے اعتماد کا آدمی ہے۔ اسے بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر اس کا تعلق پولیس یا کسی سیکیورٹی ایجنسی سے نہیں ہے بلکہ ہوٹل کے سیکیورٹی اسٹاف سے ہے۔ آفیشل کارڈز پر سائن تو وہی کرے گا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" عرفان بھائی نے کہا۔

ان کا ذہن اگر ماؤف تھا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ ایک طرف ان کی بیوی اور بچوں کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف صدر کی زندگی کو خطرہ تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی میجر طارق سے مل کر آتا ہوں۔" میں نے انہیں تسلی دی اور باہر نکل گیا۔

میں کوریڈور میں پہنچا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ اسکرین پر سردار جی کا نام اور نمبر تھا۔ وہی سردار جی جنہوں نے مجھے بی ایم ڈبلیو دلائی تھی۔

"ست سری اکال سردار جی!" میں نے کہا۔ "آج میری یاد کیسے آ گئی؟"

"صاحب جی! آج سویرے سویرے نیو جرسی کیوں جا رہے ہیں۔ کوئی خاص کام ہے۔ آپ تو مجھے بھول ہی گئے۔"

"نیو جرسی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، میں نے ابھی آپ کی گاڑی دیکھی ہے۔ اس گاڑی کو تو میں ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ آپ کی حویلی بھی شاید آپ کے ساتھ ہے۔"

"سردار جی! اس وقت وہ گاڑی کہاں ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ میری ٹیکسی سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔"

"میری بات غور سے سنیں سردار جی!" میں نے کہا۔ "اس گاڑی میں میری بہن اور بچوں کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ آپ اس کا پیچھا کریں اور صرف یہ معلوم کر لیں کہ وہ گاڑی کہاں جاتی ہے۔ بہت احتیاط سے پیچھا کیجیے گا۔ ان لوگوں کو شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے آس پاس ان کی کوئی اور گاڑی بھی موجود ہو۔"

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں صاحب جی!" سردار جی نے کہا۔ "ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میری گاڑی پرانی ضرور ہے لیکن دوڑ نے میں جیٹ فائٹر سے کم نہیں ہے۔ ابھی تو وہ مناسب رفتار سے چل رہے ہیں۔ اگر انہوں گاڑی بھگانے کی کوشش بھی کی تو مجھ سے بچ نہیں سکیں گے۔ اچھا رب راکھا۔"

"رب راکھا سردار جی! میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔"

پھر مجھے فرنانڈو کا خیال آیا۔ میجر طارق سے ملنے سے پہلے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا اس لیے ٹہلتا ہوا کوریڈور سے برآمدے میں نکل آیا۔ میں نے فرنانڈو کا خصوصی نمبر بھی اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا تھا۔

میں نے اس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل بجتی رہی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ مجھے یقین تھا کہ فرنانڈو اس وقت سو رہا ہو گا۔ ممکن ہے اس کا سیل بھی سائیلنٹ پر لگا ہو۔

میں نے دوبارہ کوشش کی۔ دوسری مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ دو منٹ بعد میں نے پھر کوشش کی، اس مرتبہ تین بیل بجنے کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا لیکن دوسری طرف سے کوئی نسوانی آواز آئی۔ "یس!"

"فون فرنانڈو کو دو۔"

"باس تو ابھی سو رہے ہیں۔" لڑکی نے خمار آلود لہجے



میں کہا۔

"سو رہے ہیں تو انہیں اٹھا دو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "میں عامر بول رہا ہوں۔ جلدی کرو ورنہ فرنانڈو تمہاری کھال میں بھس بھروا دے گا... یہ بہت ضروری ہے۔"

کچھ دیر دوسری طرف سے کچھ آوازیں آتی رہیں، پھر فرنانڈو کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ "ہاں عامر! خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے۔" میں نے کہا اور مختصراً اسے سب کچھ بتا دیا۔

"تم ایسا کرو، نیو جرسی کی طرف نکلو... میں بھی نکل رہا ہوں۔ اپنی گاڑی کا نمبر مجھے بتا دو اور سیل فون پر مجھ سے رابطے میں رہنا۔ تم اکیلے ہی آنا، میرے ساتھ البتہ میرے تین بہترین فائٹرز ہوں گے۔ وہ تین آدمی تیس آدمیوں پر بھاری ہیں۔ بس ایک دفعہ مجھے اس جگہ کا علم ہو جائے جہاں انہوں نے تمہاری بہن اور بچوں کو رکھا ہے۔"

میجر طارق اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ شاید میرے چہرے پر پریشانی اور اضطراب کے آثار کچھ زیادہ ہی تھے۔

میں نے اسے مختصراً شائلہ باجی اور بچوں کے بارے میں بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کا سراغ مل گیا ہے ورنہ وہ بھی میرے ساتھ جانے کی کوشش کرتا۔ یہاں بھی کسی ذمے دار آدمی کی موجودگی ضروری تھی۔

"آپ فکر مت کریں... ان کے جو آدمی یہاں آئیں گے وہ صدر صاحب تک کبھی نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"یہ بات آپ کسی کو بھی نہیں بتائیں گے... نعیم کو بھی نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنی ذمے داریوں سے واقف ہوں۔ جب ان کارڈز پر میرے سائن نہیں ہوں گے تو سیکیورٹی کا اسٹاف انہیں ساتویں منزل پر نکلنے بھی نہیں دے گا۔"

"کارڈز پر سائن تو کیپٹن نعیم بھی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سائن تو کر دے گا لیکن امبوزڈ اسٹیمپ کہاں سے لے گا؟"

میجر طارق سے فارغ ہو کر میں دوبارہ شائلہ باجی کے فلیٹ میں آیا۔ وہاں عرفان بھائی بوکھلائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے شائلہ باجی کی گاڑی کی چابیاں لیں اور عرفان بھائی سے کہا کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے تک لوٹ آؤں گا۔

"تم پولیس اسٹیشن تو نہیں جا رہے ہو؟" عرفان بھائی نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ شائلہ باجی اور بچوں کی مجھے بھی اتنی ہی پروا ہے۔ وہ آپ کی بیوی ہیں تو میری بہن بھی ہیں۔ میں ان کی زندگی کیسے خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں گاڑی کی چابی لے کر جلدی سے باہر نکل گیا۔

شائلہ باجی کے پاس جدید ماڈل کی کرولا تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر فرنانڈو سے رابطہ کیا اور اسے شائلہ باجی کی گاڑی کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "یہ سفید لیکسٹ ماڈل کی ٹویوٹا ہے۔ میں نیو جرسی کے لیے نکل چکا ہوں۔"

پھر میں نے سردار جی کا نمبر ملایا۔ انہوں نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی اور بولے۔ "صاحب جی! اب وہ گاڑی نیو جرسی کے پوش ایریا کی طرف جا رہی ہے۔ لو جی! وہ گاڑی ایک بنگلے میں داخل ہو گئی ہے۔ وہ لوگ باجی اور بچوں کو شاید یہیں رکھیں گے۔ میں تھوڑی دیر وہاں رک کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ پھر آپ کو بتاتا ہوں۔"

"سردار جی! آپ وہیں کسی ایسی جگہ ٹھہریں جہاں آپ ان کی نظروں میں نہ آ سکیں۔ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

"ابھی ابھی ایک ڈبل کیبن پک اپ بھی بنگلے میں داخل ہوئی ہے۔ اس میں شاید چار پانچ آدمی موجود ہیں۔" سردار جی نے کہا۔

"آپ مجھے صرف راستہ سمجھائیں میں آ رہا ہوں۔"

"نیو جرسی میں داخل ہونے کے بعد آپ مین روڈ پر چلتے رہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک راؤنڈ اباؤٹ ہے۔ وہ کراس کرنے کے بعد سیدھے چلے جائیں۔ دائیں ہاتھ پر نیویارک انویسٹمنٹ بینک ہے۔ اسی لین میں آگے جا کر فورتھ اسٹریٹ پر بائیں ہاتھ پر مڑ جائیں۔ میں آپ کو وہیں ملوں گا۔"

میں نے یہ ساری معلومات فرنانڈو کو دے دیں۔ فرنانڈو نے کہا۔ "اس ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا... اس ڈبل کیبن پک اپ میں کتنے آدمی تھے؟"

"اس کا خیال ہے کہ ڈرائیور سمیت چار یا پانچ آدمی تھے۔"

"یہ مسلح تھے؟"

"یہ تو اس نے نہیں بتایا اور مسلح بھی ہوں گے تو باہر سے بھلا کیسے نظر آ سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

''میری بھی عقل ماؤف ہو گئی ہے جو تم سے ایسے سوالات کر رہا ہوں۔'' فرنانڈو نے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو... میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ میں بلیک کلر کی سیڈان میں ہوں۔''

☆☆☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے میجر طارق کی بھی فکر تھی کہ وہ جوش میں آ کے کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے یا عرفان بھائی ہی حوصلہ ہار جائیں اور پولیس کے پاس چلے جائیں۔ میں بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اس بینک تک پہنچ گیا جس کا حوالہ سردار جی نے دیا تھا۔

فرنانڈو کی بلیک سیڈان وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے مجھے ہاتھ... سے رکنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''اپنی گاڑی یہیں پارک کر دو اور میری گاڑی میں آ جاؤ۔''

میں نے بینک کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کی اور فرنانڈو کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سردار جی مقررہ جگہ پر موجود تھے۔ میں نے سیڈان ان کے پاس رکوائی تو وہ میرے ساتھ فرنانڈو کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور آہستہ سے بولے۔ ''صاحب جی! یہ کالا آپ کے ساتھ کیسے ہے؟ یہ تو ہارلم کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔''

''یہ میرا دوست ہے سردار جی... اور اس وقت صرف میری دوستی میں یہاں آیا ہے۔ آپ ایسا کریں، یہیں رک کر ہماری واپسی کا انتظار کریں۔''

میں دوبارہ سیڈان میں بیٹھا تو فرنانڈو نے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے اپنی اپنی گنز پر سائیلنسر تو فٹ کر لیے ہیں؟''

''یس باس!'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

''ہماری گاڑی میں اور کون کون سے ہتھیار ہیں؟''

''ہمارے پاس تین یوزی رائفلیں ہیں، ان پر بھی سائیلنسر فٹ ہیں۔ چار ہینڈ گرینیڈز اور دو دھوئیں کے بم بھی ہیں۔ اس کے علاوہ گیس کا ایک سلینڈر ہے۔''

''گیس کا سلینڈر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اس سلینڈر میں بے ہوش کرنے والی نہایت زود اثر قسم کی گیس ہوتی ہے جو انسان کو سیکنڈوں میں بے ہوش کر دیتی ہے۔''

''بس اب دو ہی چیزوں کی کمی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ٹینک اور اینٹی ائر کرافٹ گنز!''

میری بات پر فرنانڈو ہنسنے لگا اور بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ اس موقع پر بھی تمہاری حسِ مزاح زندہ ہے۔ تم واقعی آہنی اعصاب کے مالک ہو۔'' پھر وہ سنجیدہ ہو کے بولا۔ ''ویسے یہ دو چیزیں بھی موجود ہیں۔ میرے پاس جو یوزی رائفلز ہیں، وہ بہت اسپیشل ہیں۔ ان کی رینج بہت دور تک ہے۔ ان پر بھی میں نے سائیلنسر فٹ کرا دیے ہیں۔ میری یہ گاڑی جو دیکھنے میں عام سی سیڈان ہے گن میٹرپل سے بنی ہوئی ہے۔ اس کی باڈی اور شیشوں پر بھی تھری کی گولی کا اثر بھی نہیں ہوگا۔ اگر میں اسے کسی بنگلے کی دیوار سے ٹکرا دوں تو مضبوط سے مضبوط دیوار بھی ریت کی طرح ڈھے جائے گی۔ اس کی باڈی میں معمولی سا صرف ڈینٹ پڑے گا۔ اب بولو کس چیز کی کمی ہے؟''

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم اس اسٹریٹ کے بنگلا نمبر 263 تک پہنچ گئے۔ یہی ہمارا مطلوبہ بنگلا تھا۔ بہ قول سردار جی کے شمائلہ باجی اور بچوں کو اسی بنگلے میں لایا گیا تھا۔

ڈرائیونگ فرنانڈو خود ہی کر رہا تھا۔ وہ گاڑی کو سیدھا لیتا چلا گیا اور گاڑی کو اسٹریٹ کے دوسرے کارنر پر روک دیا۔

''پہلے ہمیں اس بنگلے کے عقب کا جائزہ لینا چاہیے شاید یہاں سے بنگلے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ہو۔ داخل تو ہم مین گیٹ سے بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس صورت میں ٹکراؤ کی نوبت آ جائے گی۔ سسٹر اور بچے بھی اندر ہیں۔ انہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

وہ گاڑی سے نیچے اترا تو میں بھی اتر گیا۔

اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''تم لوگ یہیں گاڑی میں بیٹھو اور اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ ٹہلنے والے انداز میں بنگلے کی پشت کی طرف بڑھا۔ یہ گویا ایک قسم کی گندی گلی تھی لیکن وہاں گندی گلیوں کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ گلیاں بھی خاصی صاف ستھری ہوتی ہیں۔

ہمارے مطلوبہ بنگلے کی باؤنڈری وال میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ سے بیس فٹ تک بلند تھی۔ اس کے اردگرد درخت بھی نہیں تھا۔ وہاں ایک آہنی دروازہ بھی تھا جو مقفل تھا۔ وہاں صرف کمند ڈال کر داخل ہوا جا سکتا تھا لیکن دن دیہاڑے کمند ڈالنے والے کو بنگلے والوں سے پہلے پولیس دھر لیتی۔ لمحے بھر کو مجھے مایوسی ہوئی۔

پھر اچانک میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے ساتھ والے بنگلے کی نہ صرف باؤنڈری وال برائے نام تھی بلکہ اس میں گھنا سا ایک درخت بھی تھا جس کے ذریعے ہم اندر داخل ہو سکتے تھے۔ میں نے فرنانڈو کو یہ بات بتائی تو وہ بھی خوش ہو گیا اور بولا۔ ''عامر! ایسے موقعے پر تمہارا دماغ خوب کام کرتا ہے۔''

فرنانڈو نے سیل فون نکالا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت کی



کہ گاڑی اندر گلی میں لے آئیں۔

فوراً ہی اس کی سیڈان گلی میں آ گئی۔

اس نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔ ''الفرڈ! تم اس بنگلے کے اندر جاؤ اور وہاں کا جائزہ لے کر آؤ۔ یہ ضرور دیکھنا کہ وہاں سے دوسرے بنگلے تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟''

الفرڈ اچھلا، اس نے دیوار کے سرے دونوں ہاتھوں میں تھامے اور دوسرے ہی لمحے اندر چلا گیا۔ ہم لوگ بے تابی سے اس کا انتظار کرتے رہے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا اور بولا۔ ''باس! ویسے تو دوسرے بنگلے میں داخلے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے لیکن اس بنگلے سے ایک زینہ اوپر جا رہا ہے۔ وہاں سے ممکن ہے کوئی راستہ مل جائے۔ اس بنگلے میں ایک بوڑھی عورت اور مرد کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی ملازم بھی ہو لیکن مجھے نظر نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اندر جاتا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' فرنانڈو نے کہا۔

''الفرڈ! تم ہمارے ساتھ آؤ۔ تم اس بوڑھے اور عورت کا خیال رکھنا۔ گاڑی سے رائفلیں نکال لو۔'' اس نے ایک رائفل مجھے دی، دوسری اپنے شانے سے لٹکائی پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''تم یہاں کی نگرانی کرنا اور کوئی بھی خلافِ معمول بات ہو تو سیل فون پر مجھے بتا دینا۔''

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں اس بنگلے کے اندر تھے۔

الفرڈ عقبی برآمدے کے نزدیک ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں زینے کی طرف بڑھ گئے۔ زینے میں لکڑی کا بہت مضبوط دروازہ تھا۔ فرنانڈو نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ لاک ہے۔ اس نے جیب سے باریک سا ایک تار نکالا اور لمحوں میں دروازے کا لاک کھول لیا۔

پھر ہم دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے زینہ چڑھنے لگے۔ ہمارے ہاتھوں میں سائیلنسر لگی گنز تھیں اور شانوں پر رائفلیں جھول رہی تھیں۔ یوزی رائفل عام رائفل کے مقابلے میں بہت ہلکی پھلکی تھی۔ وزن سے تو وہ بالکل کھلونا رائفل لگتی تھی۔ وہ لمبائی میں بھی چھوٹی تھی لیکن اس وقت اس کی نال پر سائیلنسر لگا تھا اس لیے اس کی لمبائی قدرے بڑھ گئی تھی۔

بنگلے کی چھت پر ایک کونے میں پرانا ساز و سامان، فرنیچر اور کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔

میں دبے قدموں اس بنگلے کی طرف بڑھا جس میں شمائلہ باجی اور بچے تھے۔ بڑے میاں کے بنگلے کی چھت کی دیوار بھی زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس بنگلے کی چھت کی دیوار بھی بلند تھی۔ اس سے ہمیں ایک فائدہ ہوا۔ بڑے میاں کی چھت کی دیوار پر پاؤں رکھ کر ہم دوسرے بنگلے کی چھت پر آسانی سے جا سکتے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ دونوں بنگلوں کی دیواریں الگ الگ تھیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ اس بنگلے کی دیوار چھ فٹ کی بلندی تک تھی۔ دوسری دیوار اس سے دگنی تھی لیکن اب ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔

فرنانڈو پیٹھ کے بل جھک گیا اور مجھ سے بولا۔ ''میری پیٹھ پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ جاؤ تاکہ ہلکی سی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ دوسری طرف ممکن ہے ان کا کوئی آدمی بیٹھا ہو۔''

میں نے ایسا ہی کیا پھر اوپر پہنچ کر فرنانڈو کو ہاتھ کے سہارے سے اوپر کھینچ لیا۔

یہاں سے ہم بہت محتاط انداز میں دوسری دیوار پر چڑھے۔

وہ چھت بالکل سپاٹ تھی۔ آخری سرے پر ایک کمرا تھا جہاں کوئی انتہائی بھدّی اور مکروہ آواز میں گا رہا تھا۔ سگریٹ کی بو سے مجھے اندازہ ہوا کہ گانے والا کوئی گھٹیا قسم کا سگریٹ بھی پی رہا ہے۔

مجھے یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ کمرے سے باہر آ گیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ کمرے سے باہر آیا تو اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دوں گا۔

ہم دونوں بہت محتاط انداز میں اس چھت پر اتر گئے۔ گانے والا اب کوئی دوسرا گانا پہلے سے بھی زیادہ بے سرے انداز میں گا رہا تھا۔

ہم دبے قدموں اس کمرے کی طرف بڑھے۔ وہ بیڈ پر آرام سے لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا اور گا رہا تھا۔ اس کا ریوالور پاس ہی رکھا تھا۔

ہم اچانک اس کے سر پر جا پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر یوں حیران رہ گیا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیے ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور اٹھاتا، فرنانڈو نے بڑھ کر اس کا ریوالور اٹھا لیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''کون ہو تم؟ اور میرے بنگلے میں کس کی اجازت سے داخل ہوئے ہو؟''

وہ سہم کر رہ گیا اور بولا۔ ''ہمیں تو رمیش یہاں لایا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے تاوان کے لیے ایک انڈین عورت اور اس کے بچوں کو اغوا کیا ہے۔ تمہیں صرف چوکیداری کرنا ہے۔''

''کیا اس نے یہ کہا تھا کہ یہ بنگلا اس کا ہے؟'' فرنانڈو نے پوچھا۔

"یہ تو اس نے نہیں بتایا تھا۔"

"بنگلے میں اور کتنے آدمی ہیں؟"

"رمیش کے علاوہ پانچ آدمی اور ہیں۔" وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔ "اگر اس لڑکی اور بچوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو آٹھ آدمی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔" یہ کہہ کر فرنانڈو نے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کردیا۔ پھر بیڈ کی چادر پھاڑ کر اس کی پٹیوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور کپڑے کا ایک گولہ منہ میں بھی ٹھونس دیا۔

اس سے فارغ ہو کر ہم زینے کی طرف بڑھے جس کا راستہ اس کمرے کے باہر دوسری سمت سے تھا۔

ہم دبے قدموں نیچے اترے تو زینے کے پاس بھی ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہاں ایک کمرا تھا جو خالی تھا اردگرد کوئی آواز بھی نہیں تھی۔

اس کی پشت زینے کی طرف تھی۔

ہم نے ابھی آدھا زینہ ہی طے کیا تھا کہ اس نے گھوم کر ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی فرنانڈو کی بے آواز گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔

ہم دونوں تیزی سے نیچے اترے اور اس کی لاش اوپر زینے میں گھسیٹ لائے۔ اس کے زخم سے بہنے والے خون سے فرش پر دھبا پڑ گیا تھا لیکن ہم اس دھبّے کا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ فرنانڈو نے اس کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے بڑا اور چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا۔ فرنانڈو نے چابیوں کا وہ گچھا اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اب ہمیں لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ آوازیں دور تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بولنے والے کافی دور سے بول رہے ہوں۔

اس کمرے سے ملحق دوسرا کمرا تھا۔ میں نے محتاط انداز میں دروازہ کھول کر جھانکا، اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں اور فرنانڈو اس کمرے میں داخل ہوگئے۔

اس کمرے کا دروازہ کوریڈور میں تھا۔ اصل مرحلہ اب شروع ہونے والا تھا۔ کوریڈور میں یقینی طور پر ایک یا دو آدمی ہوں گے پھر مجھے خیال آیا کہ ان کے دو آدمی تو ہم نے ناکارہ کردیے ہیں۔ اب صرف چار آدمی ہوں گے، ان میں سے ایک یا دو گیٹ پر ہوں گے۔ ایک شمائلہ باجی اور بچوں کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ کوریڈور میں اگر ہوا بھی تو ایک آدمی ہوگا۔ میں اچانک فرش پر لیٹ گیا اور کرالنگ کرتا ہوا کوریڈور میں نکلا۔ یہ گُر بھی مجھے میرے کورین کوچ نے سکھایا تھا۔ کسی جگہ اگر خطرہ ہو تو ہمیشہ کرالنگ کرتے ہوئے باہر نکلو۔ باہر والے کو امید نہیں ہوگی کہ کوئی فرش پر رینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے۔ وہ اگر دیکھ بھی لے گا تو لمحے بھر کو حیران ہوگا۔ ہمیں اس کی حیرانی سے فائدہ اٹھانا ہے۔ میں کوریڈور میں نکلا تو وہاں میرے اندازے کے مطابق ایک آدمی موجود تھا اور سامنے ہی بیٹھا تھا۔

وہ حیران ہوئے بغیر جھپٹ کر میرے پاس آیا اور بولا۔ "کون ہو تم؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتا، فرنانڈو کی گولی اسے بھی چاٹ گئی۔ فرنانڈو نے تیزی سے اسے کمرے میں کھینچ لیا۔

پھر ہم کوریڈور میں چلتے ہوئے اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہاں ایک کھڑکی بھی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اس پر کوئی پردہ بھی نہیں تھا۔ میں اور فرنانڈو وہاں بیٹھ گئے۔

اندر سے ببلی کی آواز آئی۔ "دیکھو، تم میری مما کو کھول دو۔ میں پرامس کرتا ہوں کہ اب کچھ نہیں کروں گا۔"

"میری مما کو مارنا بھی مت۔" نینی نے کہا۔ "میں بھی اب نہیں روؤں گی۔"

"ارے تمہاری مما تو بہت آرام سے بیٹھی ہیں۔ بس اب تھوڑی ہی دیر کی تو بات ہے۔ آؤ، میں تمہیں کارڈز کا ایک کھیل سکھاؤں۔"

"مجھے نہیں سیکھنا۔" ببلی نے کہا۔

"دیکھو، یہ کارڈ کے چاروں اکّے ہیں۔" ہم کھسکتے ہوئے کچھ آگے بڑھ گئے۔ کمرے کے کھلے دروازے میں سے ہمیں وہ لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی۔ شمائلہ باجی اور بچوں کے علاوہ وہاں دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ وہی انڈین تھا جو کیسینو میں مجھ سے الجھ پڑا تھا اور جس کی آستین سے چوتھا کارڈ برآمد ہوا تھا۔

"دیکھو، تم یہ کارڈ اس طرح لگاؤ گے تو کاٹنے والا چاہے جیسے بھی کاٹے، یہ تینوں اکّے تمہارے ہی حصے میں آئیں گے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو اکّے آتے ہیں۔ اس لیے احتیاطاً میں چوتھا اکّا اپنے کوٹ یا شرٹ کی آستین میں چھپا لیتا ہوں تاکہ ٹریل مکمل ہو سکے۔"

میں نے جھانک کر دیکھا۔ شمائلہ باجی ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں نے ان کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے اور دونوں پیر کرسی کے ساتھ باندھے ہوئے تھے۔



"چھوڑو، یہ بچے نہیں سیکھیں گے... تم سیکھو جانِ من!" اس نے نہایت اوباش انداز میں شمائلہ باجی سے کہا۔ "تمہارا شوہر تو پکا جواری ہے۔ میں تمہیں یہاں روکنے کے بدلے میں یہ ٹپ دے رہا ہوں۔"

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا، نہ کوئی آواز نکالنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا اور اچانک سامنے آگیا۔ کارڈز اس کے ہاتھ سے اچھل کر شمائلہ باجی پر گر گئے۔ چوتھا اکّا البتہ اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

دوسرے آدمی نے شاید کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تھی۔ فرنانڈو کی ایک ہی گولی نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔

دونوں بچے چیختے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔

"عامر ماما! ان لوگوں نے مما کو بہت مارا ہے، دیکھیں باندھ بھی دیا ہے۔"

"ابھی بالکل چپ رہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "باہر بھی ان کے آدمی موجود ہیں۔ تمہاری آواز سن کر وہ اندر آسکتے ہیں۔ میں پہلے ان سے نمٹ لوں پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

دونوں بچے خاموش ہوگئے۔ فرنانڈو چیتے کی طرح چوکنا تھا... اس کی ساری توجہ اب باہر کی طرف تھی۔ اس نے پسٹل کے بجائے اب رائفل اپنے شانے سے اتار لی تھی۔

میں نے شمائلہ باجی کے ہاتھ پاؤں کھولے تو وہ مجھ سے لپٹ کر بلکنے لگیں اور بولیں۔ "عامر! وہ صدر صاحب..."

"وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ اب ہم وہیں جائیں گے۔ ان لوگوں نے اپنے دو آدمی وہاں بھیجے تھے لیکن صدر صاحب ابھی آرام کر رہے ہوں گے۔ ہم اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"اپنے آدمیوں کو اندر بلاؤ۔" میں نے رمیش سے کہا۔ "باہر کتنے آدمی ہیں؟"

"گیٹ پر صرف دو آدمی ہیں۔" رمیش نے کہا۔

"اور باقی آدمی؟" فرنانڈو نے تلخی سے پوچھا۔

"ایک آدمی چھت پر تھا۔ دوسرا زینے کے پاس ہے۔"

"ان کی فکر چھوڑو... تم باہر والوں کو اندر بلاؤ ورنہ وہ بھی بے موت مارے جائیں گے اور تم بھی۔"

"شنکر، مرلی!" رمیش نے بلند آواز میں کہا۔ "ذرا اندر آؤ۔"

میں اور فرنانڈو دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔

وہ دونوں جونہی اندر آئے، ہم نے انہیں گن پوائنٹ پر لے لیا۔

ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

میں نے اپنے حریف کے سر پر اسٹیٹ پنچ رسید کردیا۔ چٹاخ کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے چارہ اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ رمیش کے کہنے پر چند ڈالرز کمانے یہاں آگیا ہوگا۔

فرنانڈو نے بھی اپنے حریف کو ٹھنڈا کردیا۔

میں رمیش کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ہلکا سا وار کیا تو وہ بے ہوش ہوگیا۔ میں نے اسی رسّی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے جس سے ان لوگوں نے شمائلہ باجی کو باندھ رکھا تھا۔

فرنانڈو نے اپنا سیل فون نکالا اور الفرڈ سے کہا۔ "باہر جاؤ اور اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ گاڑی مین گیٹ کی طرف لے آئیں، حالات قابو میں ہیں۔"

وہ سیل فون رکھ کر باہر نکلا اور گیٹ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ گارڈ روم سے دیو نما ایک نیگرو برآمد ہوا۔ اس کا قد بلاشبہ ساڑھے چھ فٹ سے بھی زیادہ ہوگا۔ وہ وزن اور چوڑائی میں مجھ سے دگنا تھا۔ فرنانڈو کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہوگا۔ اس نے فرنانڈو کو کمر سے پکڑا اور کھلونے کی طرح اچھال دیا۔ اس کی رائفل بھی اچھل کر دور جا گری۔

میں نے شمائلہ باجی اور بچوں کو اندر ہی رہنے کا اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ اپنی رائفل سیدھی کرتا، وہ گویا اڑتا ہوا مجھ پر آپڑا۔ اس قد و قامت اور تن و توش پر اس کی پھُرتی قابلِ توصیف تھی۔ اس نے رائفل مجھ سے چھین کر دور پھینک دی جیسے سخت گیر استاد لڑاکا بچوں کے ہاتھ سے چھڑی چھین کر پھینک دیتے ہیں۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اردگرد کی کوئی بھاری دیوار مجھ پر آگری ہو۔

مجھے اپنے کورین کوچ کی ہدایت یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ ایسے موقع پر بالکل پُرسکون ہو کر سوچو اور خوامخواہ کی زور آزمائی میں اپنی توانائی ضائع مت کرو۔

میں پرسکون ہو کے سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے فرنانڈو نظر آرہا تھا جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید اس کے پیر میں شدید چوٹ آئی تھی یا پھر فریکچر ہوگیا تھا۔

وہ سیاہ فام دیو میرے یوں پڑے رہنے سے یہ سمجھا کہ

میں اس کے منوں بلکہ ٹنوں وزنی بوجھ سے بے ہوش ہو گیا ہوں۔

''جگا!'' رمیش نے پکارا۔ ''اس کو چھوڑ، مجھے کھول... وہ اب کبھی نہیں اٹھے گا۔''

سیاہ فام دیو نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور مجھ پر سے اٹھنے لگا۔ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لیں کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ وہ جونہی اٹھا، میں نے پوری قوت سے اپنا خوف ناک مکا اس کے گھٹنے پر رسید کر دیا۔

اسے زیادہ اثر تو نہیں ہوا مگر وہ کچھ حیرت زدہ سا ہو گیا۔ اسی حیرت کا فائدہ اٹھا کر میں نے پھر پوری قوت سے اسی جگہ وار کیا۔

یہ وار کارگر رہا۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ سی نکلی اور وہ میرے ہی اوپر گرنے والا تھا کہ میں پھرتی سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اب میں اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو نشانہ بنایا اور پوری قوت سے کک اس کے سر پر رسید کر دی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی کھوپڑی چیخ جائے گی لیکن وہ تو بے ہوش بھی نہیں ہوا اور کروٹ بدل کر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔

میں اس کی قوتِ برداشت اور پھرتی پر اش اش کر اٹھا۔ یہ قوتِ برداشت تو اللہ کی عطیہ کردہ تھی۔ اس میں اس دیو کا کوئی کمال نہیں تھا... یا کمال تھا تو صرف یہ کہ وہ لڑنے بھڑنے کے فن سے خوب واقف تھا۔

''میں ایک ٹانگ سے بھی تجھ جیسے چوہے کو مسل سکتا ہوں۔'' اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''تو پھر مسل دے... دیر کیوں کر رہا ہے؟''

اس نے نہ جانے کہاں سے اچانک چوڑے اور چمک دار پھل کا ایک خنجر نکال لیا اور بولا۔ ''میں اس خنجر سے تیرے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ تیرا نام و نشان مٹ جائے گا۔''

وہ خنجر لے کر اچانک ایک ٹانگ سے مجھ پر جھپٹا۔ مجھے اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کا خنجر واقعی میرے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ میں انتہائی پھرتی سے دائیں طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا لیکن ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کے باوجود وہ گرا نہیں۔

میں نے اچھل کر پوری قوت سے اس کی پشت پر فلائنگ کک رسید کر دی۔ پھر زمین پر گرتے ہوئے ایک زبردست راؤنڈ کک اور ماری جو اس کے چہرے پر پڑی کیونکہ وہ میری فلائنگ کک سے گر رہا تھا۔ میری فلائنگ کک اور راؤنڈ کک نے اس کے سب کس بل نکال دیے۔



ٹھیک ہوں۔ پیر میں معمولی تکلیف ہے، وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

فرنانڈو کے بے حد اصرار پر میں نے اسے اور اس کے صرف دو ساتھیوں کو ساتھ لیا۔ میری بی ایم ڈبلیو بھی وہیں موجود تھی۔ میں فی الحال اسے باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ ویسے میں نے فرنانڈو کے ایک آدمی سے کہا۔ ''یہ گاڑی فی الحال تم فرنانڈو کے گھر لے جاؤ۔ میں بعد میں لے لوں گا۔''

پھر میں فرنانڈو کی گاڑی میں شائلہ باجی کی گاڑی تک آیا۔ فرنانڈو اور اس کے دو ساتھیوں کو ساتھ لیا اور انتہائی تیز رفتاری سے نیویارک کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہوٹل میں اب تک سب کچھ معمول پر تھا۔ سیکیورٹی کا قلعہ اپنی اپنی جگہ مستعد تھا۔

کیپٹن نعیم بھی مستعدی سے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ مجھے میجر طارق نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے نعیم سے پوچھا۔

''میجر طارق کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی کچھ دیر پہلے تو یہیں تھے۔ وہ بھلا کہاں جائیں گے سر! یہیں ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اسی وقت مجھے عرفان بھائی نظر آئے۔ وہ بہت مضطرب نظر آ رہے تھے لیکن میں ابھی انہیں بھی شائلہ باجی اور بچوں کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے وہ اسسٹنٹ میں یہ اطلاع کسی اور کو دے دیتے۔

میں صدر کے دشمنوں کو ننگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔

''کیا ہوا عامر! تم کہاں گئے تھے؟'' عرفان بھائی نے پوچھا۔

''میں اپنے کچھ ایسے دوستوں سے ملنے گیا تھا جو نیویارک کی تقریباً ہر خبر رکھتے ہیں۔ انہیں بھی علم نہیں کہ آج کی عورت اور بچوں کا اغوا ہوا ہے۔ میں نے تو شائلہ باجی کا لیے بغیر پوچھا تھا۔''

پھر میں ٹہلتا ہوا باہر نکلا اور لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچا۔ وہاں موجود سیکیورٹی افسر نے میرا کارڈ چیک کیا مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ صدر صاحب ابھی تک آرام کر رہے تھے۔ ظاہر ہے، وہ بیس بائیس گھنٹے سفر کر کے آئے تھے۔ اتنا آرام تو ضروری تھا۔

اچانک مجھے حوالدار دلاور حسین نظر آیا۔ میں نے اسے اپنی طرف بلایا اور پوچھا۔ ''دلاور! میجر صاحب نظر نہیں آ رہے ہیں۔ تم نے انہیں دیکھا ہے؟''

''سر! میجر صاحب کو میں نے کیپٹن صاحب کے ساتھ بیسمنٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے میجر صاحب نظر نہیں آئے۔''

''بیسمنٹ کہاں ہے اور اس میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیسمنٹ کا راستہ زینے کے ساتھ ہی ایک کمرے سے نیچے جاتا ہے۔ وہاں عموماً ہوٹل کے استعمال کا سامان رکھا جاتا ہے۔ چادریں، تولیا، صابن، ٹوتھ پیسٹ، ٹشو پیپر وغیرہ۔''

''وہاں بھی کوئی سیکیورٹی افسر ہوتا ہے؟''

''وہاں صرف ایک چوکیدار ہوتا ہے لیکن کیپٹن صاحب نے آج خصوصی طور پر وہاں سپاہی رام سنگھ کی ڈیوٹی لگائی ہے۔''

''رام سنگھ!'' میں نے کہا۔ ''کیا ہماری سیکیورٹی میں ہندو بھی ہیں؟''

''سر! ہمارے اسٹاف میں ہندو، مسلمان، سکھ، کرسچن سبھی ہیں۔ ہر وہ آدمی جو سیکیورٹی کی میرٹ پر پورا اترتا ہے، وہ اسٹاف میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسٹاف میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔''

''ٹھیک ہے تم اپنی ڈیوٹی سنبھالو اور بہت زیادہ ہوشیار رہنا۔''

اسے ہدایت کر کے میں لفٹ کی طرف بڑھا۔ کیپٹن نعیم اوپر آ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور کوریڈور میں آگے بڑھ گیا۔

میں وہاں سے بیسمنٹ میں پہنچا تو وہاں سیکیورٹی آفیسر

## ''ثبوت''

دو بچے ایک دوسرے پر اپنے اپنے باپ کے زیادہ امیر ہونے کا رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر دلیلیں دے رہے تھے۔ آخر ایک بچہ بولا۔ ''میرے ابا تمہارے ابا سے زیادہ امیر ہیں... وہ تمہارے ابا سے زیادہ چیزوں کی قسطیں دیتے ہیں۔''

## ''غلط فہمی''

مریض: ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے طاقت کی جو گولیاں دی تھیں وہ سب کی سب میں باقاعدگی سے کھا رہا ہوں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا... میں اب بھی اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر: ہو سکتا ہے تمہاری خوراک میں کوئی گڑبڑ ہو۔ آج کل کیا کھا رہے ہو؟

مریض: اچھا... تو ان گولیوں کے علاوہ مجھے کھانا بھی کھانا تھا؟

سپاہی رام سنگھ موجود تھا۔

میں اندر جانے لگا تو اس نے ادب سے کہا۔ ”سر! اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”تم رام سنگھ ہو؟“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے نہیں جانتے؟“

”جانتا ہوں سر!“ رام سنگھ نے ادب سے کہا۔ ”لیکن میں آرمی کا آدمی ہوں، صرف حکم کا پابند ہوں۔ مجھے آرڈر ملا ہے کہ بیسمنٹ کے اندر کوئی نہیں جائے گا۔“

”یہ آرڈر تمہیں کس نے دیا ہے... میجر طارق نے؟“

”نہیں سر! سیکنڈ ان کمانڈ کیپٹن نعیم نے۔“

”یہ میرا پاس ہے۔“ میں نے اسے اپنا خصوصی پاس دکھایا۔

”یہ تو سر ساتویں منزل پر جانے کا پاس ہے۔ بیسمنٹ میں جانے کا تو نہیں ہے۔“ اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

اب مجھے اس پر آہستہ آہستہ غصہ آرہا تھا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”رام سنگھ! تم جانتے ہو، میں اس ہوٹل کا مالک ہوں۔ تم مجھے ہوٹل کے کسی بھی حصے میں جانے سے نہیں روک سکتے۔“

”یہ بات آپ کیپٹن نعیم سے کہیں سر!“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”میرا راستہ چھوڑو۔ تمہیں تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے... اور آج کے بعد خود کو فارغ سمجھو۔ جاؤ یہاں سے!“

”لیکن سر! ابھی تو میں ڈیوٹی پر ہوں۔ میں کیپٹن صاحب ہی کو چارج دے کر جاؤں گا۔“

اس کی ہٹ دھرمی پر مجھے کچھ شبہ ہونے لگا کہ وہ مجھے اندر جانے سے کیوں روک رہا ہے۔ اندر ہوٹل میں استعمال کا عام سامان ہی تو ہے، وہاں کوئی اسلحہ خانہ تو تھا نہیں... پھر وہ مجھے کیوں روک رہا تھا؟ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں ابھی اور اسی وقت اندر جاؤں گا۔

میں ایک دفعہ پھر آگے بڑھا۔ رام سنگھ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

میری کھوپڑی ایک دم گھوم گئی۔ میں نے جھنجلا کے کہا۔ ”تمہاری اتنی جرأت... تم مجھے طاقت کے زور سے روکو گے؟“

اس نے اچانک ریوالور نکال لیا... اور بولا۔ ”سر! میرا تو کام ہی یہ ہے۔ آپ خاموشی سے واپس چلے جائیں اور کیپٹن نعیم سے بات کریں۔“

”کیپٹن نعیم سے تو میں بعد میں بات کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن فی الحال تو تم اس پر توجہ دو، وہ کیا ہے؟“ میں نے اس کی پشت کی طرف اشارہ کیا۔

یہ بہت پرانی اور فرسودہ تکنیک تھی لیکن یہ تکنیک اب بھی اکثر کام آجاتی ہے۔

اس نے گھوم کر دیکھا تو میں نے اسے پھر موقع نہیں دیا۔ میری کک اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑی اور راؤنڈ کک اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک ہی کک میں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کا ریوالور اٹھا کر جیب میں ڈالا اور اسے گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے گیا۔

پھر میں نے بیسمنٹ کا جائزہ لیا۔ وہاں ہوٹل میں استعمال ہونے والی اشیا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کونے میں پرانا اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، ردی اخبارات اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پڑی تھیں۔

مجھے وہاں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ رام سنگھ واقعی حکم کا غلام تھا اور اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ اس بے چارے کے ساتھ زیادتی کر کے مجھے افسوس ہو رہا تھا۔

میں واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک کھٹکا سا ہوا جیسے کوئی چیز گری ہو۔

میں آواز کی سمت متوجہ ہو گیا۔ وہ خشک دودھ کا ایک ڈبا تھا جو نہ جانے کیسے ریک سے گر گیا تھا۔ میں اسے دوبارہ اٹھانے کے لیے جھکا تو حیران رہ گیا۔

مجھے وہاں میجر طارق نظر آیا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ تھا۔ اس نے نہ جانے کیسے خشک دودھ کا وہ ڈبا گرایا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ منہ سے ٹیپ ہٹایا اور حلق میں ٹھنسا ہوا کپڑے کا گولہ نکالا تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

بیسمنٹ ہی میں ایک طرف چھوٹا سا ایک فریج تھا جو غالباً چوکیدار کے لیے تھا۔ میں نے وہاں سے پانی کی ایک بوتل نکالی اور میجر طارق کو دی۔ وہ ایک ہی سانس میں آدھی سے زیادہ بوتل پی گیا۔

جب وہ بولنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”مائی گاڈ! چار بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ نعیم کہاں ہے؟“ اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”میں نے اسے ساتویں منزل پر دیکھا تھا۔“

”سپاہی رام سنگھ یہاں ڈیوٹی پر تھا... وہ کہاں گیا؟“

”میں نے اسے ناک آؤٹ کر کے ایک طرف ڈال دیا ہے۔“



”اسے اسی طرح ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیں بلکہ میں خود ہی اسے باندھ دیتا ہوں۔“

اس نے بہت پھرتی سے رام سنگھ کے ہاتھ پاؤں باندھے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور ٹیپ لگا دیا۔

”بات کیا ہے میجر صاحب!“ میں نے پوچھا۔

”یہ بہت بڑی سازش ہے عامر صاحب! اس میں کیپٹن نعیم سمیت کئی لوگ شامل ہیں۔ فی الحال تو ہمیں صدر صاحب کو اس سازش سے بچانا ہے۔ اس کی تفصیلات میں بعد میں بتاؤں گا۔ چار بجنے میں اب صرف چھ منٹ باقی ہیں۔ اغوا کرنے والوں نے اب تک اپنے آدمیوں کو بھیج دیا ہوگا۔ میں پہلے تو انہیں روکوں گا۔“

ہم دونوں تیزی سے باہر نکلے اور آفس میں پہنچے۔ عرفان بھائی آفس ہی میں بیٹھے تھے۔ میجر طارق کو دیکھ کر وہ لمحے بھر کو حیران ہوئے پھر بولے۔ ”تم کہاں تھے میجر؟ میں کب سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں؟“

ان کے سامنے دو بدمعاش قسم کے آدمی بیٹھے تھے۔

عرفان بھائی نے کہا۔ ”یہ دونوں آدمی ان لوگوں نے بھیجے ہیں جن کے قبضے میں شائلہ اور بچے ہیں۔ میں انہیں اپیشل پاس دے رہا ہوں۔“

”سر! نئے پاس بنانے کی کیا ضرورت ہے، میں ان لوگوں کے پاس انہیں دے دوں گا جو پہلے سے یہاں ڈیوٹی پر ہیں۔ نئے پاس بننے میں دیر لگے گی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ صدر صاحب وقت کے کتنے پابند ہیں۔ میں انہیں کیپٹن نعیم کے حوالے کر کے آتا ہوں۔ وہی انہیں پاس دلوا دے گا۔“ پھر وہ ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ ”آیئے آپ لوگ... میرے ساتھ آئیں۔“

”ہماری ایک بات سن لیں میجر صاحب! اگر ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی تو شائلہ میڈم اور بچے بھی خیریت سے نہیں رہیں گے۔“

”ارے یار! یہ دھمکیاں میں صبح سے سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم لوگوں کو جو کچھ کرنا ہے کرو اور میری بہن اور بچوں کو چھوڑو۔“

میں ان دونوں کو لے کر بیسمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ میجر طارق بھی تھا اور خاصا حیران تھا کہ میں انہیں وہاں کیوں لے جا رہا ہوں؟

”یہ تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“ ان میں سے ایک بدمعاش بولا۔

”تمہیں اپنے کام سے غرض ہے تو سوالات مت کرو۔

## ”اطمینان“

باپ: مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا ہے کہ کلاس میں تمہیں سب سے پیچھے بٹھایا جاتا ہے۔

بیٹا: آپ پریشان نہ ہوں ڈیڈی! ہماری کلاس میں لڑکے چاہے آگے ہوں یا پیچھے... انہیں ایک ہی لیکچر سننے کو ملتا ہے۔

## ”تصدیق طلب“

ریستوران میں ایک صاحب میز کے نیچے اوندھے پڑے الٹیاں کر رہے تھے۔ ویٹر ریستوران کے منیجر کو ساتھ لیے ان کے پاس پہنچا تو منیجر نے جھکتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ”کیا آپ ہی وہ صاحب ہیں جو کھانے کے خراب ہونے کی شکایت کر رہے تھے؟“

مجھے بھی اپنی بہن اور بچوں کی فکر ہے ورنہ تم جیسوں کو تو میں چیونٹی کی طرح مسل دیتا ہوں۔“

وہ دونوں استہزائیہ انداز میں ہنسے۔ تن و توش میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ تھے اور اپنی چال ڈھال ہی سے فائٹر لگ رہے تھے۔

میں انہیں باتوں میں لگا کر بیسمنٹ میں لے گیا اور میجر طارق سے کہا۔ ”ان دونوں کی تصویروں کا مسئلہ ہے۔ کارڈ پر تصویر بنی تو ہے۔ خیر، انچارج تو آپ ہی ہیں۔ انہیں کسی ایسی تصویر کے کارڈز ایشو کریں جن پر کوئی غور نہ کر سکے۔ کیپٹن نعیم کو سنبھالنا آپ کا کام ہے۔“

پھر میں انہیں ایک ایسے روم میں لے گیا جو مین ڈور سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس کمرے میں بیڈ، ٹیبلز، ٹاولز، مختلف صابن اور اسی طرح کا دوسرا سامان ریک میں رکھا تھا۔

مجھے اچانک بیسمنٹ کے دروازے کا خیال آیا۔ وہاں کوئی بھی آسکتا تھا۔ میں نے میجر طارق سے کہا۔ ”جب تک میں انہیں کارڈز اور ہوٹل سیکیورٹی کی یونیفارم ایشو کروں، آپ پلیز بیسمنٹ کا دروازہ بند کر دیں۔ سیکیورٹی کا کوئی آدمی آگیا تو پرابلم ہو جائے گی۔ ابھی تک تو میٹنگ کے بارے میں صرف چند لوگوں کو علم ہے۔“

میجر طارق نے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا اور بیسمنٹ کا دروازہ لاک کرنے چلا گیا۔

”تم لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار تو ہوگا؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”تم فضول میں وقت ضائع کر رہے ہو؟“ ان میں سے ایک بدمعاش بولا۔ ”ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ ہتھیار لے کر یہاں آتے۔ ہتھیار تو تم لوگ خود ہی ہمیں دے دو

گے۔ ہم آخر سیکیورٹی آفیسر ہیں۔"

"لیکن تم صدر صاحب پر گولی چلاؤ گے تو اس کے دھماکے سے دوسرا سیکیورٹی اسٹاف دوڑ پڑے گا۔ ان میں سے کسی کو بھی اصل صورتِ حال کا علم نہیں ہے۔ وہ لوگ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیں گے۔"

"ہم بین الاقوامی دہشت گرد ہیں۔" ان میں سے ایک بولا حالانکہ وہ شکل سے کسی گلی محلے کا چھوٹا موٹا بدمعاش لگ رہا تھا۔ "ہمارے پاس ایسا خوف ناک زہر ہے کہ زبان پر لگتے ہی آدمی مر جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک قطرہ صدر کے کپ میں کافی ہوگا۔"

"سائنائڈ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، شاید اس زہر کا یہی نام ہے۔" اس نے جواب دیا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ خود کو بین الاقوامی بدمعاش کہہ رہا تھا اور اسے دنیا کے سب سے خوف ناک زہر سائنائڈ کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔

اس وقت تک میجر طارق واپس آ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بیسمنٹ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

ان میں سے اسی بدمعاش نے اپنی رسٹ واچ دیکھی جو زہر کی بات کر رہا تھا، پھر چونک کر تلخ لہجے میں بولا۔ "سوا چار ہو رہے ہیں، تم نے اب تک ہمیں یہاں روک رکھا ہے۔ کیا تمہیں اپنی بہن اور بچوں کی زندگی پیاری نہیں ہے؟ صدر کو شام کی چائے سرو کی جا چکی ہوگی۔"

"اب میں تمہاری بھی تو خاطر مدارات کروں گا۔" یہ کہہ کر اچانک میں نے وہ ریوالور نکال لیا جس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ "اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے۔" پھر میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ... جلدی کرو۔"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔" وہی بدمعاش بولا۔

میں نے اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ "دیوار کی طرف منہ کرو ورنہ اب میں تھپڑ کے بجائے گولی ماروں گا۔"

ان دونوں نے فوراً دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

"میجر! ان کی تلاشی لو۔" پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ "میں شائلہ باجی اور بچوں کو لے آیا ہوں۔ ان کا سر غنہ رمیش میری قید میں ہے۔"

میجر طارق نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر گویا اس کے جسم میں بجلیاں بھر گئیں۔ اس نے بہت مہارت سے ان دونوں کی تلاشی لی۔

ان دونوں کے پاس واقعی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ البتہ اس "بین الاقوامی دہشت گرد" کی جیب سے چھوٹی سی ایک شیشی برآمد ہوئی۔

میجر نے اس کا کور کھول کر اسے سونگھا اور بولا۔ "یہ سائنائڈ ہے سر!"

"اب اس کا ایک ایک قطرہ انہیں پلا دو۔" میں نے کہا۔ "انہیں زندگی میں کبھی پولیو نہیں ہوگا بلکہ پولیو کیا، کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ دونوں اچانک "دہشت گرد" سے معصوم بن گئے۔ "ہم سے تو رمیش نے کہا تھا کہ کام کرنے کے کے تمہیں ایک ایک لاکھ ڈالرز دوں گا۔ وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی کیونکہ کیپٹن ورما ہمارا آدمی ہے۔"

"کون کیپٹن ورما؟" میجر نے حیرت سے پوچھا۔

"کیپٹن نعیم ہی کیپٹن ورما ہے۔"

ان سے پوچھ گچھ پھر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اچانک دونوں کو ایک ایک پنچ رسید کیا اور انہیں بھی سپاہی رام سنگھ کی طرح باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔

پھر ہم لوگ بہت عجلت میں ساتویں منزل پر پہنچے۔

میجر کو دیکھتے ہی کیپٹن کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کبھی حیرت سے مجھے اور کبھی میجر کو دیکھ رہا تھا۔

وہاں حوالدار دلاور حسین موجود تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "دلاور! کیا صدر صاحب اٹھ چکے ہیں؟"

"جی سر! وہ تو شام کی چائے بھی پی چکے ہیں۔ اب تو شاید وہ میٹنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔"

وہ ان کی نجی میٹنگ تھی اور کچھ لوگ ان سے ملنے وہیں آ رہے تھے۔

"کیپٹن!" میجر طارق نے سرد لہجے میں کہا۔ "آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔"

اس نے کیپٹن کا ہاتھ پکڑ کے لفٹ میں کھینچ لیا۔

لفٹ میں اس وقت صرف ہم تینوں ہی تھے۔ کیپٹن نے کہا۔ "تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ البتہ میڈم شائلہ اور بچوں کی زندگی کی اب کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔"

"اپنے ملک کے صدر پر میں ایسی دس بیٹیاں قربان کر سکتا ہوں ورما۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

وہ اپنا نام سن کر بری طرح چونک اٹھا اور بولا۔ "مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا... صدر بغیر سیکیورٹی کے کیسے آ سکتا



ہے۔ تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے۔"

اسی دوران میں لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ چکی تھی۔

لفٹ سے نکلتے ہی ورما میجر سے ہاتھ چھڑا کر کوریڈور میں بھاگا۔

میں اور میجر اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

وہ اچانک اس طرف مڑ گیا جہاں ایک قطار میں ہوٹل کے باتھ رومز تھے۔ وہ ایک باتھ روم میں گھس گیا۔

میجر طارق نے باتھ روم کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔

اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے شانے سے دروازے پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ دروازہ ٹوٹ کر اندر جا گرا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ باتھ روم خالی تھا حالانکہ ورما ہم دونوں کے سامنے اسی باتھ روم میں داخل ہوا تھا۔

اچانک مجھے میجر کی کراہ سنائی دی۔ میں جھپٹ کر مڑا۔ ورما اسے زخمی کر کے باہر بھاگ رہا تھا۔ اسے وہاں کے راستوں کا علم تھا۔ وہ نہ جانے کس دروازے سے باہر نکل گیا۔ میجر طارق نے مجھ سے کہا۔ "میری فکر چھوڑیں سر! میں ٹھیک ہوں۔ آپ اس ورما کو پکڑیں۔ وہ را کا بہت گھاگ اور خوف ناک ایجنٹ ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سنا تو تھا لیکن شکل سے پہچانتا نہیں تھا۔"

میں میجر کو اسی حال میں چھوڑ کر باہر بھاگا۔ باہر سیکیورٹی والے بھی حیران کھڑے تھے لیکن میجر نے انہیں بالکل کمانڈو کی طرح زیرِ ٹریننگ کیا تھا، ان میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

میں نے ایک سیکیورٹی آفیسر سے کہا۔ "تم میجر صاحب کو دیکھو... وہ زخمی ہو گئے ہیں، انہیں مدد کی ضرورت ہے۔ ...وہ کیپٹن صاحب کہاں گئے؟"

"کیپٹن صاحب تو لفٹ میں گئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں جھپٹ کر لفٹ کی طرف بڑھا۔ وہ لفٹ ساتویں منزل کے لیے مخصوص تھی۔

ساتویں منزل پر بھی مجھے ورما نظر نہیں آیا۔

میں نے حوالدار دلاور سے پوچھا۔ "کیپٹن صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو صاحب' اندر صدر صاحب کے روم میں گئے ہیں۔"

میں وحشت زدہ ہو کر اندر بھاگا اور سارے ایجی کیٹس پروٹوکول بالائے طاق رکھتے ہوئے دھڑام سے دروازہ کھول دیا۔

## "انتظار"

مولوی صاحب ایک سیاسی کارکن کی عیادت کے لیے اسپتال گئے۔ اسے تصادم میں ایک مخالف سیاسی پارٹی کے کارکن نے زخمی کر دیا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے عفو و درگزر کے موضوع پر ایک طویل لیکچر دیا پھر کہا۔ "میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ تم حملہ آور کو معاف کر دو۔"

سیاسی کارکن نے کراہتے ہوئے کہا۔ "آپ صرف مجھے اسپتال سے فارغ ہو لینے دیں... اس کے بعد آپ حملہ آور کے لیے دعا کیجیے گا۔"

ورما کے ہاتھ میں پسٹل تھا جس کا رخ صدر صاحب کی طرف تھا۔ دروازے کے دھماکے سے اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور فائر کر دیا۔ اس کا ریوالور بے آواز تھا۔ میں اگر پھرتی سے زمین پر گر نہ جاتا تو گولی میرے سینے میں پیوست ہو جاتی۔

وہ دوسرا فائر کرنے والا تھا کہ میں نے وہاں رکھا ہوا پانی کا جگ اٹھا کر اس کے چہرے پر دے مارا۔ اس نے اپنا چہرہ بچا لیا لیکن پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

ورما نے مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن دراصل اس بزدل نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔

وہ پھرتی سے لفٹ میں گھس گیا۔

میں نے دلاور سے کہا۔ "دلاور! اب تم میجر صاحب کے سوا کسی کو بھی کمرے میں گھسنے مت دینا۔" یہ کہہ کر میں زینوں کی طرف بھاگا کیونکہ لفٹ میں تو ورما تھا۔ میں ایک ایک چھلانگ میں دو اور تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ ورما اب تک نکل چکا ہوگا۔ ظاہر ہے، ساتویں منزل کے زینے سے مجھے پہنچنے میں لفٹ کے مقابلے میں دگنے سے زیادہ وقت تو لگا ہوگا۔

ایک سیکیورٹی آفیسر نے بتایا کہ کیپٹن صاحب ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔

میں بھی باہر بھاگا۔ ورما اس وقت تک پارکنگ لاٹ سے اپنی گاڑی نکال چکا تھا۔

میں فرنانڈو اور الفرڈ کو تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ دونوں اپنی سیڈان میں ہوٹل کے باہر موجود تھے۔ میں بھاگتا ہوا باہر نکلا اور الفرڈ سے کہا۔ "وہ جو بلیک کلر کی ٹویوٹا کراؤن جا رہی ہے اس کا پیچھا کرو۔ میں ہر قیمت پر اس شخص کو زندہ پکڑنا

چاہتا ہوں۔"

"الفرڈ!" فرنانڈو نے کہا۔ "گاڑی ذرا تیز چلاؤ۔ میں اس گاڑی کا نمبر نوٹ کرلوں، پھر میں اس شخص کو زمین کی تہ سے بھی کھود نکالوں گا۔"

الفرڈ نے خوف ناک حد تک گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی۔ وہ زگ زیگ انداز میں ڈرائیونگ کرتا ہوا بالکل ورما کی گاڑی کے پیچھے پہنچ گیا۔

فرنانڈو نے اس کا نمبر نوٹ کیا پھر جیب سے سیل فون نکال کر کسی کو کال کرنے لگا۔ "ہیلو سارجنٹ برونو! کیا حال ہیں؟ یار! مجھے ایک گاڑی کو پکڑنا ہے۔ ایک شخص میرے پیسے لے کر بھاگا ہے۔ وہ تمہارے ہی علاقے میں آرہا ہے۔ اسے کسی بھی قیمت پر روکو اور مجھے فوراً انفارم کرو۔"

پھر اس نے مزید تین چار کالز کیں اور انہیں بھی یہی ہدایات دیں، پھر مجھ سے بولا۔ "اب اس گاڑی کو نیویارک تو کیا پورے یوایس میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ وہ جس طرف جارہا ہے، وہاں سے نکلنے والے ہر راستے پر میں نے ٹریفک سارجنٹس اور اپنے خاص آدمیوں کو وہ نمبر لکھوا دیا ہے۔ وہ جہاں بھی مڑے گا، کوئی ٹریفک سارجنٹ یا میرا کوئی آدمی اس کے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔"

"تم یہ بتاؤ اب تمہارے گھٹنے کی تکلیف کیسی ہے؟"

"میں اب بالکل نارمل ہوں۔" فرنانڈو نے کہا۔ "الفرڈ ایک پین کلر جیل اور ٹیبلٹس لے آیا تھا۔ میں نے تمہارے ہی ریسٹورنٹ میں کافی پی اور دوبارہ باہر آگیا۔ حالانکہ الفرڈ نے مجھ سے کہا بھی کہ گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے ہم کچھ دیر ریسٹورنٹ میں ریسٹ کرلیں گے لیکن میں نے انکار کردیا۔ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ میں ابھی تمہیں کال کرنے ہی والا تھا کہ تم خود ہی آگئے۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ تم اسٹوڈنٹ کے روپ میں کسی پاکستانی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ ہو۔ پلیز عامر... برا مت ماننا۔"

"یہی بات وہ ورما بھی کہہ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"کون ورما؟"

میں نے اسے بتایا۔ "انڈیا کا ایک ٹرینڈ کمانڈو آرمی آفیسر مسلمان بن کر ہوٹل کی سیکیورٹی کا اسسٹنٹ چیف آفیسر بنا ہوا تھا۔ ہوٹل میں اس وقت پاکستان کی ایک انتہائی اہم شخصیت موجود ہے۔ یہ سارا جھگڑا ان لوگوں نے اس شخصیت کو نشانہ بنانے کے لیے بنایا تھا۔ اگر تم سے میری دوستی نہ ہوتی تو میں کبھی اس سازش پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔"

فرنانڈو کے سیل کی بیل بجی تو میں خاموش ہوگیا۔

فرنانڈو بولا۔ "ہاں روزی! کیا خبر ہے؟... ویری گڈ... اب اسے چھوڑنا مت... مائیک سے کہو کہ وہ اسے اپنے ٹھکانے پر لے جائے۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔"

"کیا ہوا... کیا ورما پکڑا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میرے علاقے میں بچ سکتا تھا؟ میری ایک کارکن روزی نے اسے پکڑ لیا۔ تفصیل تو اب وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگی۔ میں نے اسے مائیکل کے ٹھکانے پر بھیج دیا ہے۔"

"مائیکل کہاں رہتا ہے، ہارلم میں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے مائیکل ہارلم میں نہیں بلکہ یہیں نزدیک ہی رہتا ہے۔ مشکل سے پانچ منٹ کی ڈرائیو ہے۔"

اس وقت میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ دوسری طرف سردار جی تھے۔

"ہاں سردار جی! سب خیریت تو ہے؟"

"اوئے ادھر تو رب کی کرپا سے سب ٹھیک ہے، تو بتا... تو تو خیریت سے ہے؟" وہ پھر اپنے پرانے موڈ میں بول رہے تھے۔ "میں ابھی تک بہن جی اور بچوں کے ساتھ ان کے فلیٹ پر ہوں۔ ابھی انہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ لے تو بہن جی سے بات کر!" فوراً ہی شائلہ باجی کی آواز آئی۔ "عامر! تم کہاں ہو اور کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور میں نے دشمنوں کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔"

"میں عرفان سے بات کرلوں؟" شائلہ باجی نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، بس تھوڑی دیر صبر کرو، پھر سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔ ویسے بھی سردار جی وہاں موجود ہیں۔ تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے سردار جی کو کھانا وغیرہ تو کھلایا ہے نا؟"

"تم ان کی فکر مت کرو۔ میں نے ہر طرح سے ان کا خیال رکھا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ میں بس آدھے گھنٹے کے اندر اندر پہنچ رہا ہوں۔ جہاں تم نے اتنا صبر کیا ہے، وہاں آدھا گھنٹہ اور سہی۔"

میں نے رابطہ منقطع کیا تو الفرڈ ایک بنگلے کے سامنے گاڑی روک رہا تھا۔ اس نے ہارن دیا تو گیٹ کھل گیا۔ الفرڈ نے گاڑی بنگلے میں داخل کردی۔

یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ پورچ میں ورما کی بلیک ٹویوٹا کھڑی تھی۔

ہم لوگ گاڑی سے اترے تو پورچ میں ایک سیاہ فام نے ہمارا استقبال کیا۔ فرنانڈو نے بتایا کہ یہی مائیکل ہے



"لیکن کیوں؟ میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔ حکومت کو ہزاروں ڈالرز ٹیکس دیتا ہوں۔"

اس دوران میں مائیکل بھی پچھلا دروازہ کھول کر پھرتی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پھرتی سے گن نکالی اور ڈرائیور کے پہلو سے لگا دی۔ "یوں ہم اسے گن پوائنٹ پر اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔"

جب ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ورما کو رکھا گیا تھا تو وہ ہوش میں تھا اور روزی اور مائیکل کو گالیاں دے رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا اور اسے چپ لگ گئی۔

"مجھ سے کہاں بھاگ سکتے ہو ورما؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو خیر غیر ملک ہے۔ میں تو تمہیں تمہارے ملک سے بھی پکڑ لاتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ سو فیصد درست ہے۔ تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے؟"

"میرا تعلق آئی ایس آئی سے ہے یا سی آئی اے سے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنے بارے میں سوچو۔ اب تمہیں اور رمیش کو اس سائنٹڈ کا ایک ایک قطرہ پینا ہوگا جو ہم ہمارے صدر کو پلانے والے تھے۔"

"اس کے پیچھے ماسٹر مائنڈ کوئی اور ہے۔" ورما نے کہا۔

"مجھے ماسٹر یا ہیڈ ماسٹر مائنڈ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میری نظروں میں تو تم دونوں ہی ہو۔ اب تو تمہیں یہ پینا ہی پڑے گا۔"

"اگر میں تمہیں اس آدمی کا نام بتا دوں تو؟"

"تب بھی موت تمہارا مقدر ہوگی ورما! میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ یوں تو تم کسی کا بھی نام لے سکتے ہو۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تمہیں صدر امریکا نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ میں جانتا ہوں تمہارا تعلق راسے ہے اور را کے ایجنٹ انتہائی مکار ہوتے ہیں۔ تم مجھ سے کسی بھلائی کی توقع مت رکھنا۔ میں مسلمان ہوں اس لیے تم سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کرسکتا۔ ہاں، اگر تم نے نام بتا دیا تو تصدیق کرنے کے بعد ایک قطرہ اسے بھی پلا دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"تو پھر سنو، مجھے یہاں کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے یہودی مالک نے اس کام کے دس کروڑ ڈالرز دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ فنڈز پرسنٹ ادائیگی کر بھی چکا ہے۔"

"اس کمپنی اور شخص کا نام بتاؤ۔ میں تصدیق کرنے کے بعد اسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"اس شخص کا نام ہے ڈیوڈ گراہم... اپنے حلقے میں ڈی جی کے نام سے مشہور ہے۔"

...ں نے بہت پرتپاک انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"مہمان کے کیا حال ہیں؟" فرنانڈو نے پوچھا۔ اس ...اؤں میں اب شاید برائے نام تکلیف تھی کیونکہ وہ بہت ...ولی سائنٹڑا کر چل رہا تھا۔

"مہمان اس وقت بندھا پڑا ہے اور عالم بالا کی سیر ...رہا ہے۔ وہ بہت زیادہ شور شرابا کر رہا تھا۔ میں نے اسے ...ہوش کر کے باندھ دیا۔"

"روزی کہاں ہے؟" فرنانڈو نے پوچھا۔

"روزی بھی یہیں ہے باس۔"

ایک شعلہ جوالہ نے برآمدے میں نمودار ہو کر کہا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ نرم و نازک اور ماڈل ٹائپ لڑکی ...ورما کو کیسے پکڑ لیا۔

یہی سوال اس سے الفرڈ نے کیا۔

"باس! جب آپ کا پیغام ملا تو میں ایسی جگہ کھڑی ہوگئی ...ں سے اس نمبر کی گاڑی پر نظر رکھ سکوں۔ ایسے وقت مجھے ...ق سے مائیکل نظر آگیا۔ میں نے اسے بھی بلا لیا اور بتایا ...باس کو ایک گاڑی کی تلاش ہے۔ گاڑی والا باس کے ...ں ڈالرز لے کر فرار ہوگیا ہے۔

"اچانک مجھے وہ بلیک ٹویوٹا نظر آگئی۔ میں نے مائیکل کو ...اس کی طرف متوجہ کیا اور گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ ...تو جانتے ہیں باس! پھر وہ مجھ سے کہاں بچ سکتا تھا۔"

"میں جانتا ہوں۔" فرنانڈو نے کہا۔ "تم بہترین ...یور ہو اور گاڑی چلاتی نہیں بلکہ اڑاتی ہو۔"

"میں نے گاڑی کو اسپیڈ دی اور کچھ دور اس کے پیچھے ...کے بعد اس کے برابر پہنچ گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ...بھی ڈرائیونگ میں مہارت رکھتا ہے۔ میں نے چیخ کر ...کہ گاڑی روکو، اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ...س میڈم! مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے کیا؟'

"تم گاڑی تو روکو، تم میرا پرس چھین کر فرار ہوئے ہو۔"

"میں نے مائیکل کو نیچے کی طرف چھپا دیا تھا۔

"اس شخص نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا۔ مس، آپ ...ہی ہوئی ہے۔ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔"

"تم گاڑی روکتے ہو یا میں پولیس کو کال کروں؟"

...نے یہ کہہ کر مزید احوال بھی تفصیلاً بیان کیا۔

...ورما نے جھنجلا کر گاڑی روک دی۔ روزی نے بھی اپنی ...ایک طرف لگائی اور اتر کر اس کی گاڑی کی طرف ...پھر اس نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی اور ...پولیس اسٹیشن چلو۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" فرنانڈو نے کہا۔ "ایسا کوئی شخص امریکا میں نہیں ہے۔"

"میں نے اس کی بات پر کب یقین کیا ہے۔ موت سامنے ہو تو اچھے اچھے سورما بھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

☆☆☆

ہم لوگ اس وقت فرنانڈو کے کلب میں بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے کرسیوں سے بندھے رمیش اور ورما بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ "تم لوگوں کی کوئی آخری خواہش ہے تو بتادو۔"

دونوں کی آنکھوں میں دحشت ناچ رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

سائنائڈ کی بوتل میری جیب میں تھی۔ میں نے فرنانڈو سے کہا۔ "ان کے لیے ایک ایک کپ کافی منگوادو، اب اس عمر میں یہ صرف پولیو کے قطرے پیتے کیا اچھے لگیں گے؟"

فرنانڈو کی ایک ویٹرس کافی لے آئی۔ میں نے فرنانڈو سے ایک ڈراپر بھی منگوالیا اور اس میں بہت معمولی مقدار میں سائنائڈ لے کر دونوں کے کپ میں ایک ایک قطرہ ٹپکا دیا۔ وہ کافی پینے پر آمادہ نہیں تھے۔ میں نے باری باری دونوں کی ناک پکڑی تو سانس لینے کے لیے انہوں نے منہ کھول دیے۔

اسی لمحے میں نے گرم گرم کافی ان کے حلق میں اتار دی۔ لمحوں میں وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔

"ان کی لاشوں کو ایسی جگہ ٹھکانے لگانا کہ کسی کو ان کا سراغ نہ مل سکے۔"

"میں نے اسٹیل کی ایک چھوٹی سی فیکٹری کھول رکھی ہے۔" فرنانڈو نے کہا۔ "میں ان دونوں کی لاشوں کو اسی کی بھٹی میں پھینک دوں گا۔ ان کی ہڈیوں تک کا پتا نہیں چلے گا۔"

میری بی ایم ڈبلیو وہیں تھی۔ میں نے اپنی گاڑی لی اور فرنانڈو سے آئندہ بھی ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

میں ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں ہر چیز معمول پر ہے۔ صدر صاحب اپنی پرائیویٹ میٹنگ سے فارغ ہو چکے تھے اور وہ کئی بار میرے بارے میں پوچھ چکے تھے۔

میں دروازہ ناک کر کے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بولے۔ "مجھے میجر طارق نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اگر ٹھیک وقت پر نہ آتے تو آج میں بھی نہیں ہوتا۔"

"موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے سر!" میں نے کہا۔

"لیکن تم جیسا آدمی یہاں ضائع کیوں ہو رہا ہے، تم میں ایک جذبہ ہے، ایک جنون ہے... تمہیں تو پاکستان آرمی میں ہونا چاہیے۔"

"میری بھی یہی خواہش تھی سر!" میں نے کہا۔ "لیکن میرا کاروبار اتنا پھیل گیا ہے کہ میرے پاس بالکل فرصت نہیں ہے۔ ہمارے ملک کو انڈسٹری اور فارن ایکسچینج کی بھی تو اشد ضرورت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو!" صدر صاحب نے کہا۔ "میں آج رات دو بجے کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ڈنر میرے ساتھ کرو۔"

پھر میں نے شائلہ باجی اور بچوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ عرفان بھائی باجی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ بے چارے تو شائلہ باجی اور بچوں کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔

کھانے کے دوران میں صدر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "اس کیپٹن کا کیا ہوا؟ کیا نام تھا اس کا... ہاں، ورما۔"

"سر! جو انجام ایسے لوگوں کا ہونا چاہیے۔"

کھانے کے بعد صدر صاحب نے خاص طور پر ہدایت کی۔ "میرا یہ وزٹ بالکل ذاتی اور خفیہ تھا۔ میڈیا کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ بس، عامر مجھے رخصت کرنے ائرپورٹ جا سکتا ہے۔"

☆☆☆

اس دن ویک اینڈ تھا اور شائلہ باجی اور بچوں کے ساتھ ساتھ عرفان بھائی بھی وہاں موجود تھے۔

ہم لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ بلی کارڈز کی ایک گڈی لے آیا اور ہم سے بولا۔ "میں آپ کو کارڈز کا ایک کھیل دکھاتا ہوں۔ کارڈز میں بانٹوں گا اور میرے پاس تین اکے آئیں گے۔"

عرفان بھائی اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور بلی کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ الٹ کر گر گیا۔ "آئندہ میرے سامنے بھی کارڈز کی بات نہ کرنا۔" وہ بپھر کر بولے۔ "میں نے جوئے سے توبہ کر لی ہے۔ اب تم جوا کھیلو گے؟"

میں نے آگے بڑھ کر بلی کو اٹھایا اور اس سے کہا۔ "پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا! یہ اچھے لوگوں کا کھیل نہیں ہے۔"

شائلہ باجی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ جولی بھی اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ اس واقعے نے کم سے کم عرفان بھائی کا جوا تو چھڑا دیا تھا۔





طریقت علامہ محترم شاہ محمد ہاشم الصدیقی القادری التاجی الہاشمی



المعروف ایس۔ ایم۔ قادری

چیئرمین اسماء الحسنیٰ فاؤنڈیشن (ویلفیئر ٹرسٹ)

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہ وحق سبحانہ کو زیبا ہیں۔ کہ جس نے کن فیکون سے ...فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے ...مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدس نے ...شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان ...ملتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الٰہی ابد تک ہمارے روشن ...کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و ...اور تا قیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔ تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنیٰ اور اسوۂ حسنہ سے تر و تازگی ...اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام سے اپنی عقل و قلوب کو روشن کریں۔ دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع ...جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور و آگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا ...مالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنیٰ کے محقق و دیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ ...سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام ...اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ملکی و غیر ملکی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں ...اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ...یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط و کتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے ...حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں ...کے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط و کتابت فیض حاصل کر رہے ہیں

www.smqadri.com.pk

☆☆-----------------------☆☆

...۔ آزاد کشمیر

"پاپا...! آپ کا کالم طویل عرصے سے پڑھتا ہوں بلکہ سچ ...ب یہ عادت میں شامل ہو گیا ہے۔ میری حوصلہ افزائی ...جولی...کالم نے کی ہے کہ میں بھی آپ سے اپنے مسائل بیان ...کم... میری منگنی میرے ماموں کے گھر ہوئی ہے۔ گزشتہ ...میں شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے وہ ...سنبھل نہیں پائے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ رخصتی ...اور لڑکی کے لئے کسی قسم کے جہیز کا بندوبست مت ...بلکہ مسجد میں نکاح کر کے شربت کے پیالے پر رخصت کر دیں مگر وہ نہیں مانتے کہ ہماری غیرت کا سوال ہے۔ جبکہ ساری برادری والے بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ اسی طرح رخصتی کر دو، مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ اس سلسلے میں ہماری راہ نمائی فرمائیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی دعاؤں کا طالب۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل و شعور اور ایک دوسرے کے کام آنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یا سلام یا جامع یا فتاح" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر جلد شادی کیلئے لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

☆نقش شب قدر☆

O ماہ رمضان المبارک خیروبرکت اور انسانی ترقی اور درجات کے لئے مخصوص ہے۔اس ماہ مبارک میں جس قدر عبادت الٰہی اور درود شریف کا معمول اختیار کیا جائے خیروبرکت، آخرت کی ترقی اور نجات کے لئے بہترین ہے۔اس ماہ مبارک میں نماز تراویح تہجد کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔اور زیادہ سے زیادہ درود شریف کا ورد کیا کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس مبارک ماہ میں بطور خاص عالم انسانیت کی جانب متوجہ ہوتی ہیں۔ماہ رمضان المبارک میں جس قدر ذکر الٰہی کا بندوبست کیا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم ایک تجربہ شدہ عمل لکھتے ہیں۔ یہ عمل شب قدر کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ گزشتہ سالوں میں جن بہن بھائیوں نے اس عمل کو پوری شرائط کے ساتھ مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک احمد مصطفےٰ ﷺ کے طفیل ان کی حاجات پوری کیں۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام خلوص نیت سے لیا جائے گا۔ کاموں میں آسانی اور مشکلات سے نجات ہوگی۔ جو بہن بھائی جس مقصد کے لئے بھی کریں گے۔ آئندہ رمضان تک وہ مقصد ضرور پورا ہو گا۔ انشاء اللہ۔ یہ عمل رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر شروع کریں۔ یہ عمل سورۃ القدر کا انتہائی جلیل القدر عمل ہے۔ جو کہ تیسویں پارے میں ہے۔

طریقہ: اول سب سے پہلے دو رکعت نماز حاجت ادا کیجئے، پہلی رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورۃ القریش اور دوسری رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورہ نصر پڑھیں اور اپنے مقاصد کے لئے دعا کریں۔ (یہ نماز حاجت پہلے دن پڑھیں) اس کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان اس سورہ مبارک کو یعنی سورۂ القدر صحت قرات کے ساتھ 286 مرتبہ پڑھیں اور اول وآخر ۱۱ مرتبہ درود ابراہیمی کا ورد کریں۔ اور یہی عمل نماز فجر کے بعد کیجئے۔ 28 روز اس عمل کو بلاناغہ کیجئے۔ 29 ویں روز بعد نماز عصر زعفران اور عرق گلاب کو ملا کر سیاہی بنائیں اور اس سورۂ مبارکہ کو اعراب کی صحت کے ساتھ ایک سفید کاغذ پر لکھ کر محفوظ کرلیں۔ اور مغرب کے وظیفے کے بعد دم کر کے حفاظت سے رکھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے رحم وکرم کا نظارہ کیجئے۔ بعد عمل اس سورہ کو ہمیشہ ۱۶ مرتبہ اول وآخر ۱۱ مرتبہ درود شریف ابراہیمی کے ساتھ ورد میں رکھیں۔ انشاء اللہ جملہ مقاصد حل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسا دست غیب کھلے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ اس عمل میں یہ خیال رہے کہ کوئی ناغہ نہ ہو۔ جگہ تبدیل نہ ہو۔ اور وقت وظیفہ خوشبو کا استعمال رہے۔ اس وظیفے کی اجازت عام ہے۔ یہ زندگی میں درپیش تمام مقاصد کے لئے پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اپنی مصروفیات کے باعث اس عمل کو خود نہیں کر سکتے تو -/1500 روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ نقش عید کے بعد کوریئر کے ذریعے ارسال کر دیا جائے گا۔

ثمینہ۔ کراچی

O محترم! آپ کا کالم پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے کڑی دھوپ میں سے سائے میں آ گئے ہوں آجکل کوئی کسی کی اتنی پروا نہیں کرتا ہے آپ کے کالم میں ذاتی طور پر پہلی مرتبہ حاضر ہوئی ہوں حالانکہ دعاؤں میں ہمیشہ آپ شامل رہتے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں اور ان کی عمریں بالترتیب 26 اور اٹھائیس سال ہوگئی ہیں لیکن ابھی تک رشتے کا کوئی سبب نہیں بن رہا ہے۔ کئی لوگوں سے مشورہ کیا کسی نے یہ بتایا کہ ان پر بندش ہے اور یہ حاسدوں کی کاروائی ہے میں آپ سے یہ عرض کروں کہ میری بیٹیاں ماشاء اللہ سیرت اور صورت دونوں میں یکتا ہیں۔ اور تعلیم کا زیور حتی المقدور موجود ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس معاشرے میں بچیوں کے رشتوں کے مسائل دن بدن پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں لوگوں کے منہ پھٹے ہوتے ہیں جہیز نہ لینے کے نام پر بھی فرمائش کی ایک میٹر لمبی فہرست تھما دی جاتی ہے۔ ایسے میں ہم سفید پوش طبقہ کہاں جائے اور کیا کرے؟ آپ اس سلسلے میں ہمارے حق میں دعا کریں کہ کوئی لوح بھی عنایت کریں۔ تاکہ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

آپ کی بہن۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسد اور بری نظر کے شر سے محفوظ ومامون رکھے (آمین) آپ ہرگز اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات سے مایوس نہ ہوں وہ انشاء اللہ ان کے لئے بہترین بر عنایت فرمائے گا۔ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ''یا لطیف یا فتاح یا جامع'' پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ لوح زہرہ آپ کی فرمائش پر ارسال کی جا رہی ہے۔ آپ کی دعاؤں اور محبتوں کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ سب دعا کرنے والے بہن بھائیوں کو سلامت رکھے اور سب کی تمام جائز خواہشات کو پورا فرمائے (آمین)

محبوب الحسن۔ جرمنی

O محترم! میں یہاں پر 10 سال سے ہوں اور یہاں کی ایک مشہور بیکری میں ملازم تھا 9 سال میں نے ملازمت کی لیکن کوئی اتا شہ نہ بنا پایا بالآخر پچھلے سال بغیر کوئی وجہ بتائے مجھے نوکری سے فارغ کر دیا گیا ایک سال سے مختلف جگہوں پر دھکے کھا رہا ہوں لیکن کوئی مستقل اور اچھا روزگار نہیں مل رہا ہے پاکستان میں 3 بہنیں غیر شادی شدہ ہیں جن کا فرض بھی ادا کرنا ہے ان کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے لیکن میں کچھ نہیں کر پا رہا ہوں دل کرتا ہے کہ خودکشی کرلوں لیکن گھر والوں کا خیال یہ گناہ کرنے سے روکے ہوئے ہے آپ کے کالمز بڑے شوق سے پڑھتا ہوں آپ سے اسماء الحسنیٰ کی روشنی میں مدد کی اپیل ہے۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ خیروعافیت رکھے۔ ''یا عزیز یا رافع'' ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول آخر 3 مرتبہ درود شریف آپ کیلئے لوح مشتری ارسال کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کبھی مایوس نہیں ہوتے وہ دنوں کے پھیر نے پر مکمل قادر ہے۔

محمد اویس۔ امریکہ

O محترم! آپ کے کالم کا پرانا قاری ہوں آپ کے کالم بڑے شوق سے پڑھتا ہوں بلکہ میں نے آپ کی ویب سائٹ www.smqadir.com.pk پر آپ کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے آپ جس طرح دین اسلام کی روشنی میں میرے جیسے پریشان حال لوگوں کی مدد فرماتے ہیں اس سے متاثر ہو کر اپنا مسئلہ تحریر کر رہا ہوں امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں گے۔ آج سے 5 سال پہلے میرے خالو نے مجھے یہاں پر اپنے سٹور پر کام کے لئے بلایا ٹکٹ اور باقی جملہ اخراجات کیلئے میں اپنا سب کچھ بیچ کر یہاں آیا ہوں پہلے سال تو خالو نے کچھ روپے میرے گھر والوں کو ارسال کیے لیکن 3 سال سے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا میں اپنے بوڑھے والدین اور جوان بہن کا واحد سہارا ہوں میرے خالو نے میرے تمام کاغذات بھی ضبط کیے ہوئے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر کسی قسم کی کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو ساری عمر کے لئے جیل کروا دیں گے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خالو میرے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے خالو میرے کاغذات میرے حوالے کر دیں اور مجھے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ یہاں پر پاکستانی تاجر نے مجھے کام کی آفر کی ہے اس سلسلے میں میری مدد کیجئے تاحیات آپ کا احسان مند رہوں گا۔

☆عزیزم! گھبرائیے نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یقیناً اس آزمائش سے نکالے گا۔ ''یا کریم یا فتاح'' ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ


## شرف ستار گان کی الواح

اپنے نام اور ستارے کے مطابق لوح بنوا کر کامیاب زندگی بسر کریں۔

### لوح شرف مریخ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مردانہ امراض، خواتین کے امراض، خون کی کمی، آسیب سے نجات، افسران بالا کی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

### لوح شرف زہرہ

تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر وحکیم، سیاستدان عورتوں کے امراض، انیزٹرڈ یکوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

### لوح شرف عطارد

علمی ترقی، حافظے میں اضافہ تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپورٹ تجارت اور کمیونیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

### لوح شرف قمر

پرانی جسمانی بیماریاں، نسوانی امراض، تسخیر، ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید ہے۔ غائبی قوتوں میں اضافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

### لوح شرف شمس

ترقی، عروج، بحر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے، جن کے زائچے میں شمس کمزور ہے ان کیلئے مفید ہے۔

### لوح شرف مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

### لوح شرف زحل

کاموں میں رکاوٹ، جائیداد کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، نحوست، جادو، آسیب سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

### لوح شرف سبع ستارگان

ساتوں ستاروں کا یکجا نقش

خیروبرکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علمی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیاں، جادو آسیب سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح بنوانے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر: 5168036-5167842

www.smqadir.com.pk

دعا کریں۔اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔آپ کے معاشی ائل اور دیگر مسائل کے لئے لوح سبع ستارگان ارسال کی ہی ہے اللہ تعالیٰ خیر وعافیت عطا فرمائے۔(آمین)

طان خان۔ناروے

محترم! اس پاک ذات کا دیا ہوا سب کچھ ہے زندگی کی ہر سائش میسر ہے محبت کرنے والی بیوی ہے روپے پیسے کی کوئی کمی ں۔زندگی کی 45 بہاریں دیکھ چکا ہوں شادی کو 17 سال ہو ے ہیں شادی کے فوراً بعد میں اپنے سسرال یہاں آ گیا پہلے ں اللہ تعالیٰ نے پیاری سی بیٹی سے نوازا اس کے بعد آج تک د نہیں ہوئی ہر طرح کا علاج و ٹیسٹ کروائے ڈاکٹروں کی ٹوں کے مطابق سب کچھ ٹھیک ہے ہر طرف سے مایوس ہو کر پ کے در پر دستک دی ہے مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنے در ے خالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گے۔آپ کی دعاؤں کا طالب۔

عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ پر اپنے فضل و کرم کی مزید فراوانی ائے۔(آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یاوارث لام" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف اولاد نہ کیلئے علاج درعقیم ارسال کیا جارہا ہے۔دعاؤں کا شکریہ۔

د اللہ۔کراچی

م! آپ سے بہن کی شادی کے لئے لوح زہرہ بنوائی تھی۔ پ کی دعا سے اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے بہن کی شادی وعافیت سے جہاں ہم چاہتے تھے وہاں ہوگئی ہے اب اس ح کا کیا کریں؟ اور ایک میرا ابھی مسئلہ ہے میں اپنی خالہ زاد کو د کرتا ہوں وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے لیکن میری والدہ نہیں تی ہیں کہ میری شادی ادھر ہو وہ سب لوگ تو رضامند ہیں دہ کوئی اپنی پرانی رنجش کو لے کر اس رشتہ سے انکار کر رہی ہیں پ پر مجھے بہت یقین ہے کوئی ایسا عمل یا لوح بتائیں کہ میری دہ خود ان کے ہاں میرا رشتہ لے کر جائیں۔

عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے تمام مسائل کو حل فرمائے مین) ایمان رکھئے کہ آپ جب بھی خلوص دل سے اس کو یں گے وہ دامن مراد کو بھر دے گا۔ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ دہ نصر پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔آپ کی ئش پر آپ کیلئے لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے۔تحفے اور وں کا شکریہ۔

یز احمد۔سکھر

محترم! آپ کا کالم بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اس میں آپ جس طرح لوگوں کے مسائل کا حل بتاتے ہیں اس سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور اپنا ایک مسئلہ بھی ڈسکس کرنا چاہ رہا ہوں مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرے ماموں نے میری والدہ کے حصے کی زمین اپنے نام دھوکے سے کروالی ہے انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر میری والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے عدالت میں بیان دلوایا ہے جب ہمیں پتا چلا تو ہم نے بھی عدالت سے رجوع کیا لیکن مقدمے کو 7 سال ہو گئے ہیں تاریخوں پر تاریخ پڑ رہی ہیں لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا ہے ماموں جان بوجھ کر مقدمے کو لمبا کر رہے ہیں اب تو زمین کی قیمت کا آدھا حصہ مقدمے پر خرچ ہو چکا ہے آپ سے اس سلسلے میں مدد کی گزارش ہے۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ دین اور ایمان کو سلامت رکھے اور نیتوں میں اخلاص رکھے۔(آمین) ہر نماز کے بعد "یاکریم یافتاح" 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیں۔اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ مقدمے میں کامیابی کے لئے فتح نامہ ارسال ہے۔

نبیل۔لاہور

O محترم! میرے پاس الفاظ نہیں کہ کسی طرح آپ کا شکریہ ادا کروں شادی کے 4 سال بعد تک مختلف جگہوں پر پھرتا رہا کبھی کسی عامل کے پاس تو کبھی کسی پروفیسر کے پاس، کبھی کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس تو کبھی کسی اچھے حکیم کے پاس، روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے باوجود کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا اللہ بھلا کرے آپ کے ایک مرید نے آپ کا بتایا تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے ایک نقش علاج درعقیم بنا کر دیا تھا اب آپ کی دعا اور اس اللہ تعالیٰ کے کرم سے اللہ تعالیٰ نے چاند سا بیٹا دیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کا نام تجویز کریں۔اس مہربانی کے لئے میں آپ کے بے حد شکر گزار ہوں ایک چھوٹا سا تحفہ ارسال ہے قبول کیجئے گا۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی اولاد کو سعادت مند اور صالح بنائے۔(آمین) آپ اللہ کا پسندیدہ نام "عبداللہ" رکھیں۔دعاؤں اور تحفے کا شکریہ۔نماز کی پابندی فرمائیں۔

رضوان علی۔کراچی

O محترم! میں آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں اس نفسانفسی کے دور میں آپ جس طرح یہ کام سرانجام دے رہے ہیں اس کی جزا تو اللہ ہی آپ کو دے سکتا ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی و کامرانیاں عطا فرمائے (آمین) پچھلے 4 سالوں سے میرے ساتھ بھی ایک مسئلہ ہو رہا ہے میں جب بھی سونے کیلئے بستر پر لیٹتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے بستر پر سوئیاں لگی ہوئی ہیں حالانکہ بستر جھاڑ کر بچھایا جاتا ہے یہ مسئلہ میرے ساتھ پہلی تب پیش آیا جب میں اپنے چچا کے گھر شادی پر گیا تھا میں جب تک آیت الکرسی کا ورد نہ کروں مجھے نیند نہیں آتی اور سوئیاں چبھتی رہتی ہیں مجھے کوئی اس کا مستقل حل بتائیں۔

☆ عزیزم! آپ کے معاملے میں تھوڑا سا آسیبی مسئلہ درپیش ہے۔آیت الکرسی بکثرت پڑھا کریں۔حفاظت کے لئے لوح شفاء اور تعویز خاص ارسال کیا جارہا ہے۔نماز کی پابندی فرمائیں اور بکثرت "یاجبار" پڑھا کریں۔

محمد رحیم۔پشاور

O محترم! میرا بلڈنگ میٹریل کا کام ہے عرصہ 15 سال سے میں یہ کام کر رہا ہوں علاقے کی مشہور و معروف دکان ہونے کے باوجود حالات بہت خراب ہوتے جارہے ہیں یہ معاملہ پچھلے 1 سال سے شروع ہوا ہے جب میں نے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ میری بیٹی کی وجہ سے تھا جب سے وہ بیاہ کر سسرال گئی ہے معاشی معاملات تنگ سے تنگ ہوتے گئے ہیں آپ سے التجا ہے کہ مجھے معاشی معاملات کے لئے کوئی وظیفہ یا لوح عنایت فرمائیں۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے معاشی وسائل میں برکت عطا فرمائے۔(آمین) "یاوہاب یافتاح" بکثرت پڑھا کریں۔ معاشی ترقی اور خیر و برکت کے لئے لوح مشتری ارسال ہے۔نماز کی پابندی فرمائیں۔

گل خاں۔کوئٹہ

O محترم! آپ کا کالم میں پڑھا تو امید کی کرن جاگی میں ایک ہنس مکھ اور خوش شکل لڑکا تھا خاندان بھر کے لڑکے مجھ سے جلتے تھے اور لڑکیاں بات کرنے کو ترستی تھیں لیکن میں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا اور نہ کبھی خاندان کی کسی لڑکی سے دوستی رکھنے کی کوشش کی ہے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے لڑکیوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا ایک دن میری کزن نے مجھ سے اظہار محبت کیا لیکن میں نے بات ہنس کر ٹال دی وہ اس طرح کچھ عرصے تک اظہار کرتی رہی لیکن میں ہنس کر ٹال دیتا اور کہتا کہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتا میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا یہ بات اس کو بہت بری لگی اور اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ بچ گئی (یاد رہے میرے بھائی کے لئے اس کے رشتے کے بات چل رہی ہے) سچ پوچھیں تو اس واقعے کے بعد مجھے بھی اس سے محبت ہوگئی ہے آپ سے گزارش ہے کہ مجھے کوئی ایسا وظیفہ یا تو لوح بنادیں کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے آپ کا تاحیات احسان مند رہونگا۔

☆ عزیز بیٹے! اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ ... کی رائے کا احترام کریں۔"یالطیف یافتاح" بکثرت پڑھا کریں۔لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے۔

بشیر احمد۔انگلینڈ

O محترم! آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے 3 سال پہلے آپ سے لوح مشتری معاشی معاملات کے لئے بنوائی تھی آپ کی دعاؤں سے اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے اب حالات کافی اچھے ہوگئے ہیں اس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں یہی مسئلہ میرے بہنوئی کو بھی درپیش ہے پانچ وقت کے نمازی ہیں نہایت ہی ایماندار ہیں لیکن معاشی حالات بہت خراب ہیں کیا آپ ان کیلئے لوح مشتری بنادیں گے؟

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو تمام معاملات آسانی اور خیر و برکت عطا فرمائے۔ بہنوئی سے کہیں کہ بکثرت "یاغنی یافتاح" پڑھا کریں آپ کی فرمائش پر لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔ دعاؤں اور محبتوں کا شکریہ۔

محمد شبیر۔کراچی

O محترم! میری بیوی ایک چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہے میں نے اس کی ہر خواہش پوری کی لیکن یہ خواہش علیحدہ گھر لے کر دینے والی میرے بس میں نہیں اور نہ ہی میں اپنے والدین کو اکیلا چھوڑ سکتا ہوں کیونکہ ان کا اس دنیا میں میرے کوئی نہیں آپ کوئی ایسا وظیفہ یا لوح تجویز کیجئے کہ جس سے میری بیوی میرے والدین کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو جائے۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب "جمعتہ المبارک تعطیل" (براہِ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ایم۔قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو بعد نمازِ عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے
web:www.smqadri.com.pk

کر دعا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کے معاشی مسائل اور دیگر مسائل کے لئے لوح سبع ستارگان ارسال کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ خیر و عافیت عطا فرمائے۔ (آمین)

سلطان خان۔ ناروے

○ محترم! اس پاک ذات کا دیا ہوا سب کچھ ہے زندگی کی ہر آسائش میسر ہے محبت کرنے والی بیوی ہے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ زندگی کی 45 بہاریں دیکھ چکا ہوں شادی کو 17 سال ہو چکے ہیں شادی کے فوراً بعد میں اپنے سسرال یہاں آ گیا پہلے سال اللہ تعالیٰ نے پیاری سی بیٹی سے نوازا اس کے بعد آج تک امید نہیں ہوئی ہر طرح کا علاج و ٹیسٹ کروائے ڈاکٹروں کی رپوٹوں کے مطابق سب کچھ ٹھیک ہے ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کے در پر دستک دی ہے مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گے۔ آپ کی دعاؤں کا طالب۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ پر اپنے فضل و کرم کی مزید فراوانی فرمائے۔ (آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ ”یاوارث یاسلام“ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف اولاد نرینہ کیلئے علاج در عقیم ارسال کیا جا رہا ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

حمید اللہ۔ کراچی

محترم! آپ سے بہن کی شادی کے لئے لوح زہرہ بنوائی تھی۔ آپ کی دعا سے اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے بہن کی شادی خیر و عافیت سے جہاں ہم چاہتے تھے وہاں ہو گئی ہے اب اس لوح کا کیا کریں؟ اور ایک میرا بھی مسئلہ ہے میں اپنی خالہ زاد کو پسند کرتا ہوں وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے لیکن میری والدہ نہیں چاہتی ہیں کہ میری شادی ادھر ہو وہ سب لوگ تو رضامند ہیں والدہ کوئی اپنی پرانی رنجش کو لے کر اس رشتہ سے انکار کر رہی ہیں آپ پر مجھے بہت یقین ہے کوئی ایسا عمل یا لوح بتائیں کہ میری والدہ خود ان کے ہاں میرا رشتہ لے کر جائیں۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے تمام مسائل کو حل فرمائے (آمین) ایمان رکھئے کہ آپ جب بھی خلوص دل سے اس کو پکاریں گے وہ دامن مراد کو بھر دے گا۔ ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ نصر پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر آپ کیلئے لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے۔ تحفے اور دعاؤں کا شکریہ۔

پرویز احمد۔ سکھر

○ محترم! آپ کا کالم بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اس میں آپ جس طرح لوگوں کے مسائل کا حل بتاتے ہیں اس سے بے حد متاثر ہوا ہوں اور اپنا ایک مسئلہ بھی ڈسکس کرنا چاہ رہا ہوں مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرے ماموں نے میری والدہ کے حصے کی زمین اپنے نام دھوکے سے کروالی ہے انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر میری والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے عدالت میں بیان دلوایا ہے جب ہمیں پتا چلا تو ہم نے بھی عدالت سے رجوع کیا لیکن مقدمے کو 7 سال ہو گئے ہیں تاریخوں پر تاریخ پڑ رہی ہیں لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا ہے ماموں جان بوجھ کر مقدمے کو لمبا کر رہے ہیں اب تو زمین کی قیمت کا آدھا حصہ مقدمے پر خرچ ہو چکا ہے آپ سے اس سلسلے میں مدد کی گزارش ہے۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ دین اور ایمان کو سلامت رکھے اور نیتوں میں اخلاص رکھے۔ (آمین) ہر نماز کے بعد ”یاکریم یافتاح“ 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیں۔ اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ مقدمے میں کامیابی کے لئے فتح نامہ ارسال ہے۔

نبیل۔ لاہور

○ محترم! میرے پاس الفاظ نہیں کہ کسی طرح آپ کا شکریہ ادا کروں شادی کے 4 سال بعد تک مختلف جگہوں پر پھرتا رہا کبھی کسی عامل کے پاس تو کبھی کسی پروفیسر کے پاس، کبھی کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس تو کبھی کسی اچھے حکیم کے پاس، روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے باوجود کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا اللہ بھلا کرے آپ کے ایک مرید نے آپ کا بتایا تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے ایک نقش علاج در عقیم بنا کر دیا تھا اب آپ کی دعا اور اس اللہ تعالیٰ کے کرم سے اللہ تعالیٰ نے چاند سا بیٹا دیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کا نام تجویز کریں۔ اس مہربانی کے لئے میں آپ کے بے حد شکر گزار ہوں ایک چھوٹا سا تحفہ ارسال ہے قبول کیجئے گا۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی اولاد کو سعادت مند اور صالح بنائے۔ (آمین) آپ اللہ کا پسندیدہ نام ”عبداللہ“ رکھیں۔ دعاؤں اور تحفے کا شکریہ۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

رضوان علی۔ کراچی

○ محترم! میں آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں اس نفسا نفسی کے دور میں آپ جس طرح یہ کام سرانجام دے رہے ہیں اس کی جزا تو اللہ ہی آپ کو دے سکتا ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی و کامرانیاں عطا فرمائے (آمین) پچھلے 4 سالوں سے میرے ساتھ بھی ایک مسئلہ ہو رہا ہے میں جب بھی سونے کیلئے



بستر پر لیٹتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے بستر پر سوئیاں لگی ہوئی ہیں حالانکہ بستر جھاڑ کر بچھایا جاتا ہے یہ مسئلہ میرے ساتھ پہلی تب پیش آیا جب میں اپنے چچا کے گھر شادی پر گیا تھا میں جب تک آیت الکرسی کا ورد نہ کروں مجھے نیند نہیں آتی اور سوئیاں چبھتی رہتی ہیں مجھے کوئی اس کا مستقل حل بتائیں۔

☆ عزیزم! آپ کے معاملے میں تھوڑا سا آسیبی مسئلہ درپیش ہے۔ آیت الکرسی بکثرت پڑھا کریں۔ حفاظت کے لئے لوح شفاء اور تعویز خاص ارسال کیا جا رہا ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں اور بکثرت ”یاجبار“ پڑھا کریں۔

محمد نعیم۔ پشاور

○ محترم! میرا بلڈنگ میٹریل کا کام ہے عرصہ 15 سال سے میں یہ کام کر رہا ہوں علاقے کی مشہور و معروف دکان ہونے کے باوجود حالات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں یہ معاملہ پچھلے 1 سال سے شروع ہوا ہے جب میں نے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ میری بیٹی کی وجہ سے تھا جب سے وہ بیاہ کر سسرال گئی ہے معاشی معاملات تنگ سے تنگ ہوتے گئے ہیں آپ سے التجا ہے کہ مجھے معاشی معاملات کے لئے کوئی وظیفہ یا لوح عنایت فرمائیں۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے معاشی وسائل میں برکت عطا فرمائے۔ (آمین) ”یاوہاب یافتاح“ بکثرت پڑھا کریں۔ معاشی ترقی اور خیر و برکت کے لئے لوح مشتری ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

گل خان۔ کوئٹہ

○ محترم! آپ کا کالم میں پڑھا تو امید کی کرن جاگی میں ایک ہنس مکھ اور خوش شکل لڑکا تھا خاندان بھر کے لڑکے مجھ سے جلتے تھے اور لڑکیاں بات کرنے کو ترستی تھیں لیکن میں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا اور نہ کبھی خاندان کی کسی لڑکی سے دوستی رکھنے کی کوشش کی ہے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے لڑکیوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا ایک دن میری کزن نے مجھ سے اظہار محبت کیا لیکن میں نے بات ہنس کر ٹال دی وہ اس طرح کچھ عرصے تک اظہار کرتی رہی لیکن میں ہنس کر ٹال دیتا اور کہتا کہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتا میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا یہ بات اس کو بہت بری لگی اور اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ بچ گئی (یاد رہے میرے بھائی کے لئے اس کے رشتے کے بات چل رہی ہے) سچ پوچھیں تو اس واقعے کے بعد مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی ہے آپ سے گزارش ہے کہ مجھے کوئی ایسا وظیفہ یا تو لوح بنا دیں کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے آپ کا تاحیات احسان مند رہونگا۔

☆ عزیز بیٹے! اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ [illegible] کی رائے کا احترام کریں۔ ”یالطیف یافتاح“ بکثرت پڑھا کریں۔ لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے۔

بشیر احمد۔ انگلینڈ

○ محترم! آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے 3 سال پہلے آپ سے لوح مشتری معاشی معاملات کے لئے بنوائی تھی آپ کی دعاؤں سے اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے اب حالات کافی اچھے ہو گئے ہیں اس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں یہی مسئلہ میرے بہنوئی کو بھی درپیش ہے پانچ وقت کے نمازی ہیں نہایت ہی ایماندار ہیں لیکن معاشی حالات بہت خراب ہیں کیا آپ ان کیلئے لوح مشتری بنا دیں گے؟

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو تمام معاملات آسانی اور خیر و برکت عطا فرمائے۔ بہنوئی سے کہیں کہ بکثرت ”یاغنی یافتاح“ پڑھا کریں آپ کی فرمائش پر لوح مشتری ارسال کی جا رہی ہے۔ دعاؤں اور محبتوں کا شکریہ۔

محمد شبیر۔ کراچی

○ محترم! میری بیوی ایک چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر میکے چلی گئی ہے میں نے اس کی ہر خواہش پوری کی لیکن یہ خواہش علیحدہ گھر لے کر دینے والی میرے بس میں نہیں اور نہ ہی میں اپنے والدین کو اکیلا چھوڑ سکتا ہوں کیونکہ ان کا اس دنیا میں میرے کوئی نہیں آپ کوئی ایسا وظیفہ یا لوح تجویز کیجئے کہ جس سے میری بیوی میرے والدین کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو جائے۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب ”جمعتہ المبارک تعطیل“ (براہِ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ ایم۔ قادری 359-B فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارھویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو بعد نمازِ عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے
web:www.smqadri.com.pk

☆عزیزم! بیوی کنوری اور محبت سے اپنے مسائل اور معاشی کیفیت کا احساس دلائیے۔ ''یارافع یاعزیز'' بکثرت پڑھیں۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔ لوح تسخیر ارسال کی جارہی ہے۔

ذیشان حیدر۔ کراچی

O محترم! میں B.Com کا سٹوڈنٹ ہوں۔ اور یہ میرا آخری سال ہے لیکن پتا نہیں دل میں کیوں عجیب طرح کے خیالات آتے ہیں اور دل پڑھائی سے اچاٹ ہوتا جارہا ہے۔ کوئی حل بتائیں۔

☆''یاسلام یاعلیم'' کثرت سے پڑھا کریں۔ تعلیمی کامیابی کیلئے لوح عطاردارسال کی جارہی ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

سجاد حسن۔ واشنگٹن

O محترم! میں یہاں پر ایک ہوٹل میں ملازم ہوں آمدنی الحمدللہ بہت اچھی ہوجاتی ہے ہوٹل کا مالک پاکستانی ہے وہ خود تو بہت اچھے انسان ہیں لیکن ان کے منیجر جو ہیں ان کا رویہ سارے سٹاف کے ساتھ اچھا نہیں ہے بلاوجہ وہ بہانے بنا کر بہت بے عزتی کرتا ہے ایک دن میں نے اسے آگے سے جواب دیا تو اس نے مالک کو شکایت کی انہوں نے بات کو رفع دفع کردیا لیکن ابھی تک منیجر کے دل میں میرے لئے خار باقی ہے میں یہ نوکری نہیں چھوڑنا چاہتا آپ کوئی ایسا وظیفہ یا لوح عنایت فرمائیں کہ جس سے وہ میرے ساتھ اچھی طرح پیش آئے۔

☆عزیزم! ''یاکریم'' بکثرت پڑھا کریں۔ لوح تسخیر خاص ارسال ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔ دعاؤں کا شکریہ۔

شوکت علی۔ حیدرآباد

O محترم! میں نے کچھ عرصہ پہلے میڈیکل سٹور سٹارٹ کیا تھا اللہ کے کرم اور والدین کی دعاؤں سے کافی اچھا چل نکلا تھا لیکن جب سے میں نے شادی کی ہے تب سے سیل کم ہونا شروع ہوگئی ہے ایک عامل سے حساب لگوایا تو انہوں نے بتایا کہ یہ بیوی آپ کے لئے لکی نہیں آپ سے چھوڑ دیں تو حالات پہلے جیسے ہوجائیں گے لیکن میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں اور وہ مجھ سے۔ آپ اس سلسلے میں استخارہ کرکے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

☆عزیزم! خبردار فضول اور غیر شرعی تجاویز پر کبھی دھیان نہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر معاملے کو اپنی مرضی اور مصلحت کے تابع رکھا ہے۔ ''یاکریم'' بکثرت پڑھا کریں۔ خیروبرکت اور معاشی ترقی کیلئے لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

نبیل احمد۔ لاہور

☆محترم پیر طریقت آپ کے ہاں ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا میں شریک ہوا یقین جانیے دل و دماغ پرسکون ہوگیا اب میں انشاءاللہ ہر ماہ اس بابرکت محفل میں حاضر ہوں گا۔

بشارت۔ رائے ونڈ

☆سبحان اللہ! اتنی برکات والی محفل میں شریک ہونا ایک سعادت ہے جب سے پیر طریقت کی امامت میں نماز مغرب ادا کی دل چاہتا ہے ہر نماز آپ کی امامت میں ادا کروں اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رکھے (آمین)

ماجدہ۔ لاہور

☆اللہ تعالیٰ پیر طریقت کی عمر دراز فرمائے (آمین) ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ حل ہوگیا اب میں انشاءاللہ ہر ماہ باقاعدگی سے اس محفل میں شرکت کروں گی۔

ضروری گزارش

☆☆خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مخفف نام والے مخلوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھنے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کروانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کردیجئے۔ فون پر مسئلہ ڈسکس نہیں کیا جاتا جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھ دیں۔ بیرون ملک مقیم بہن بھائی صرف اپنا مکمل پتا ارسال کریں انہیں جوابی لفافہ ارسال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

O رابطہ، محمد حنیف، عابد علی، ساجد، عارف، اظہر خان، محبوب علی، ماجدہ بی بی، سدرہ، جمیل احمد، نسرین اختر، ماجدہ اشرف۔ متفرق شہر

☆آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۃ ملک، سورۃ یٰسین، آیت کریمہ کی جو چڑھائیاں ایصال ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابہؓ اجمعینؓ، سیدنا غوث الاعظمؒ جملہ مسلمین ومسلمات کیلئے ہدیہ کردیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں کو قبول ومقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصال ثواب حصول خیروبرکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں۔ کلمہ شریف، درود شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالم کی بارگاہ میں، بزرگان دین کیلئے پڑھائیوں کے ہدیئے بھیجے جائیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرمادیا کریں۔

☆☆.....☆☆

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاءاللہ 6 ستمبر بروز اتوار کو ہوگی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور مریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔